گھر کے ہر فرد کے لئے

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

قیمت 60 روپے

اکتوبر 2012

نگران اعلیٰ

معراج رسول

عمیرہ احمد، ناہید سلطانہ اختر، لبنیٰ عروج، نگہت سیما، قیصرہ حیات

و دیگر نامور قلمکاروں کی خوبصورت تحریریں اندرونی صفحات میں ملاحظہ کیجیے

مدیرہ اعلیٰ
عذرا رسول
مدیرہ
انجم انصار
معاون
آمنہ حماد



پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی





شعبہ اشتہارات
منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789 نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391
نمائندہ لاہور افراز علی نازش 0332-4214400 رانا اے حمید 0323-2895528
ماڈل: مہوش .... میک اپ: روز بیوٹی پارلر .... فوٹو گرافر: موسیٰ رضا
جلد 40 • شمارہ 07 • اکتوبر 2012 • زر سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •
پتا: پوسٹ بکس نمبر 662 کراچی 74200 • فون: 35895313(021) فیکس 35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com



کوئی بھی لڑکی دلہن بننے سے قبل کبھی یہ نہیں سوچتی ہوگی کہ وہ سسرال جا کر اپنی ساس سے لڑے گی یا اپنی نندوں سے نفرت کرے گی اور جیٹھانی، دیورانیوں سے مقابلے بازیاں کرے گی اور اسی طرح سسرال والے بھی کبھی اپنی بہو کو لانے سے پہلے یہ پروگرام نہیں بناتے ہوں گے کہ ہم اس پر ظلم کریں گے، اس کی خوشیوں کو ختم کریں گے یا میاں بیوی میں نفاق ڈالنے کی کوشش کریں گے مگر جب بد گمانیاں، غلط فہمیاں، لڑائی جھگڑوں کی شکل اختیار کرتی ہیں تو دونوں فریق ایک دوسرے پر ایسے ایسے الزام لگایا کرتے ہیں جس کو سن کر ماتھے پر پسینہ آجاتا ہے۔ مغرب کی طرح اب ہمارے ہاں بھی علیحدہ رہنے کا رواج شروع ہو چکا ہے مگر جہاں جوائنٹ فیملی سسٹم عمدگی کے ساتھ چل رہا ہے اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہاں کوئی کسی کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کیا کرتا ہے۔

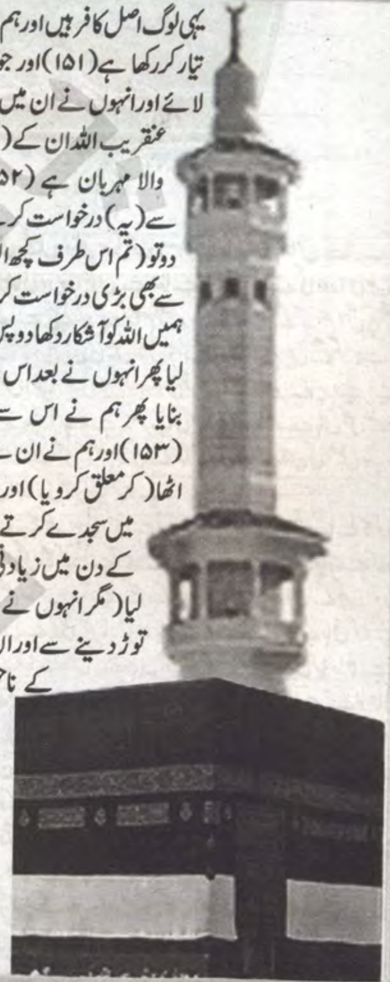
اگر آپ کی بہو چھٹی کے دن بارہ ایک بجے تک سوتی رہتی ہے تو آپ کو شور مچانے یا باتیں بنانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ آرام کرتی ہوئی اپنی بیٹی بھی تو اچھی لگا کرتی ہے تو بہو کیوں نہیں۔ اس کا بھی تو دل چاہتا ہے کہ وہ چھٹی کے دن دیر تک آرام کرے۔ اکثر کم فہم ساسیں ہر آئے گئے کے سامنے اپنی بہو اور اس کے گھر والوں میں کیڑے نکال کر یہ سمجھتی ہیں کہ جیسے انہوں نے کوئی تیر مار لیا ہو یا اپنے پرانے حساب بے باق کر دیے ہوں۔ یاد رکھیں جب کسی کو اپنا بنایا جاتا ہے تو اسے اس کی خوبیوں اور خامیوں سمیت قبول کیا جاتا ہے۔ اور اپنی بہو کو بے عزت کرنا ایسا ہی ہے جیسے آپ نے اپنی بیٹی کی خامیاں اور کوتاہیاں کسی دوسرے کو بتائی ہوں۔ محبت حاصل کرنے کے لیے پہلے اپنی بہوؤں سے محبت بھی کرنی چاہیے اور ان کی عزت بھی تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ آپ کی بہو آپ کی بیٹی بن کر نہ رہے۔ آزمائش شرط ہے...... کہ دوسرے کی زندگی اسے خود گزارنے دیں، اسے بھی یہ احساس نہ ہو کہ زندگی اس کی ہے اور گزار آپ رہی ہیں۔

اور اب ایک اہم بات... مہنگائی، ہوش ربا ہو چلی ہے۔ مویشیوں کے چارے سے امرا کے سامان تعیش تک، ہر شے اس کی زد میں ہے۔ ہمارے پرچوں کی اشاعت میں نیوز پرنٹ، آرٹ پیپرز، طباعت کی سیاہیاں، کمپیوٹر کے لوازم، ٹونر، ٹریسنگ پیپرز اور فلموں تک، تقریباً نوے فیصد اشیا درآمدی ہوتی ہیں۔ ایک طرف عالمی منڈی میں ان کی قیمتیں بڑھ رہی ہیں، دوسری طرف روپے کی قدر روز بروز گر رہی ہے۔ اس دہرے مالی دباؤ سے نکلنے کے دو ہی راستے ہیں۔ پرچوں کے صفحات دوسرے پرچوں کی طرح کم کیے جائیں یا قیمت بڑھائی جائے۔ ہمارے قارئین کی تشنگی موجودہ مواد سے بھی پوری نہیں ہوتی۔ ہم نے انتہائی مجبور ہو کر فیصلہ کیا ہے کہ اس شمارے سے قیمت 60 روپے فی پرچہ ہوگی۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے معزز قارئین ہماری مالی مجبوریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بحران کے حل میں تعاون فرمائیں گے۔

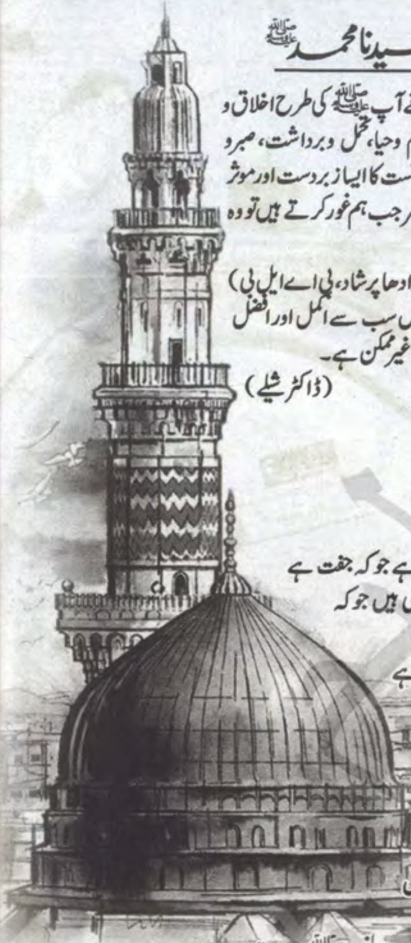
مدیرہ
انجم انصار

یہی لوگ اصل کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے(۱۵۱)اور جو لوگ اللہ پر اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے اور انہوں نے ان میں سے کسی میں تفریق نہ کی یہی لوگ ہیں جنہیں عنقریب اللہ ان کے (نیک کاموں کے) بدلے دے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے (۱۵۲) (اے نبی ﷺ) اہل کتاب (جو) تم سے (یہ) درخواست کرتے ہیں کہ تم ان پر آسمان سے کچھ لکھا ہوا اتار دو تو (تم اس طرف کچھ التفات نہ کرو) بے شک یہ لوگ موسیٰ سے اس سے بھی بڑی درخواست کر چکے ہیں یعنی انہوں نے (موسیٰ سے) کہا کہ ہمیں اللہ کو آشکار دکھا دو پس انہیں ان کے گناہ کے سبب سے بجلی نے لے لیا پھر انہوں نے بعد اس کے کہ ان کے پاس معجزے آچکے تھے گوسالہ بنایا پھر ہم نے اس سے درگزر کی اور موسیٰ کو صریح غلبہ عنایت کیا (۱۵۳)اور ہم نے ان سے عہد لینے کے لیے ان کے اوپر (کوہ) طور کو اٹھا (کر معلق کر دیا) اور ہم نے ان سے کہا کہ (شہر کے) دروازے میں سجدے کرتے ہوئے داخل ہو اور ہم نے ان سے کہا کہ ہفتے کے دن میں زیادتی نہ کرنا اور ہم نے ان سے مضبوط عہد لے لیا (مگر انہوں نے خلاف عہد کیا)(۱۵۴)پس ان کے اپنا عہد توڑ دینے سے اور ان کے اللہ کی آیتوں کا انکار کرنے سے اور ان کے ناحق انبیاء کو قتل کر دینے سے اور ان کے (اس) کہنے سے کہ ہمارے دلوں پر پردے (پڑے ہوئے) ہیں (حالانکہ پردے نہیں) بلکہ بسبب ان کے کفر کے اللہ نے ان پر مہر کر دی ہے لہذا وہ بہت کم ایمان لاتے ہیں (۱۵۵)اور بسبب ان کے کفر کے اور مریم پر ایک بڑا بہتان لگانے کے(۱۵۶)

(سورۂ نسا آیت نمبر ۱۵۱ تا ۱۵۶)



آنحضرت ﷺ کے اسمائے گرامی سیدنا محمد ﷺ



۱۱۔ابتدائے آفرینش سے آج تک کسی نے آپ ﷺ کی طرح اخلاق و مروت، تہذیب و شائستگی، متانت، سنجیدگی شرم و حیا، تحمل و برداشت، صبر و شکیب، ایفائے عہد، پابندی عہد، ہمدردی و موانست کا ایسا زبردست اور موثر ثبوت بہم نہیں پہنچایا۔ مذہبی تاثرات سے قطع نظر جب ہم غور کرتے ہیں تو وہ ہستی محامد و محاسن کا مجموعہ نظر آتی ہے۔

(راجا رادھا پرشاد، بی اے ایل بی)

۱۲۔محمد ﷺ گزشتہ اور موجودہ لوگوں میں سب سے اکمل اور افضل تھے اور آئندہ ان کی مثال پیدا ہونا محال اور قطعاً غیر ممکن ہے۔

(ڈاکٹر شیلے)

۵:الاعداد

اسم مبارک 'محمد': حروف: ۴

م+ح+م+د=

۴+۸+۴+۴=۲+۲ جفت

''محمد'' حضور ﷺ کا ذاتی اسم مبارک ہے جو کہ جفت ہے اور باقی تمام اسمائے گرامی، صفاتی اسمائے گرامی ہیں جو کہ جفت بھی ہیں اور طاق بھی۔

اللہ کے ذاتی نام کا عدد نکالیں تو وہ طاق ہے

مثلاً

ا+ل+ل+ہ=

۱+۳+۳+۵=۲+۱=۳ طاق

اللہ تعالیٰ کے بھی باقی تمام اسماء الحسنیٰ صفاتی ہیں جو جفت بھی ہیں اور طاق بھی لیکن ذاتی نام کا عدد 'طاق' ہے۔ اور قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے۔

قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسما النبی ﷺ سے اقتباس





عکس

قسط 15

عمیرہ احمد

آج کی زندگی تیز رفتار ہے، اس کے تجربے بڑی تیزی سے کرداروں کے نئے رخ سے متعارف کراتے ہیں۔ اس تیز رفتار زندگی میں چونکا دینے والے موڑ بھی ہوتے ہیں... اور پُراسراریت بھی... کہیں کرداروں کے حوالے سے تو کبھی ماحول کے حوالے سے... عمیرہ احمد کے اس ناول میں نہ صرف آپ تیز ترین، سنسنی خیز اور چونکا دینے والے موڑ دیکھیں گے بلکہ ان کی مہارانہ چابک دستی کے ساتھ ان کے کرداروں کی تہ داری کے بھی قائل ہو جائیں گے... یوں بھی اپنا عکس اور اپنا سایہ ہر شخص کے ساتھ رہتا ہے... مگر ان کی کہانیاں جدا جدا ہوتی ہیں... کہیں ایسا تو نہیں... ہماری یہ مایہ ناز مصنفہ... کوئی ایسا ناسور دکھانا چاہتی ہیں... جس کا آپریشن بھی ضروری ہو... بقول شاعر...

اس کائنات محبت میں ہم مثلِ شمس و قمر کے ہیں
اک رابطہ مسلسل ہے اک فاصلہ مسلسل ہے



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شیر دل ڈپٹی کمشنر کی پوسٹ پر فائز تھا اس کو سرکاری رہائش گاہ کے طور پر جو گھر ملتا ہے اس کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور تھیں کہ وہاں کئی بونے مقیم ہیں۔ شیر دل کی بیوی شہر بانو ان سب باتوں سے بہت خوفزدہ ہو جاتی ہے لیکن جب انہوں نے وہاں سکونت اختیار کی تو ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ خیر دین کی ایک ہی بیٹی تھی حلیمہ جسے طلاق ہو جاتی ہے۔ خیر دین اس کی دوسری شادی کرا دیتا ہے جس سے اس کی ایک بیٹی تولد ہوتی ہے، ایبک ڈپٹی کمشنر کی چھوٹی بہن منزہ کا بیٹا ہے وہ لوگ چھٹیاں گزارنے اپنے ماموں کے گھر آتے ہیں ایبک کی چڑیا سے دوستی ہو جاتی ہے وہ ایبک سے ٹینس کھیلنا سیکھتی ہے اور ایبک اس سے شطرنج میں ہارتا ہے تو انکل سے چڑیا کی تعریف کرتا ہے۔ شیر دل پروفیشنل کورس کے لیے سنگاپور جا رہا تھا تو شہر بانو نے امریکا جانے کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ شیر دل ٹرانسفر ہو کر عکس کی جگہ آیا تھا۔ شیر دل اور عکس لاہور میٹنگ اٹینڈ کرنے جاتے ہیں، مثال اور شہر بانو بھی شیر دل کے ساتھ تھیں وہ دونوں اگلی رات کی فلائٹ سے امریکا جانے والی تھیں۔ جواد کو پولیس نشے کی حالت میں پکڑتی ہے اور وہ عکس سے اپنا رشتہ ظاہر کرتا ہے۔ نیوز چینل پر یہ خبر بار بار آتی ہے۔ خیر دین کے خاندان نے ایف آئی آر کے جواب میں ایک مقامی ایم پی اے کی مدد لی جس کے حلقے میں وہ ووٹر تھے۔ خیر دین کو حوالات سے نکلوانے کے بعد چڑیا اور وہ گاؤں میں نہیں رکے۔ ایبک فاطمہ سے کہتا ہے کہ اس کی ممی اس سے ملنا چاہتی ہیں تو وہ حیران رہ جاتی ہے۔ ایبک کی والدہ اسے کہتی ہیں کہ وہ اپنی دوستی پہلے کی طرح رکھے فاطمہ کی روم میٹ فائزہ اسے بتاتی ہے کہ اس کی طرح ایبک کے بھائی ایزد نے بھی اس کی بہن سے اسی طرح فائدہ اٹھایا تھا۔ 26 سال بعد اس شیشے کو وہی دیکھ کر ایک رک گیا تھا۔ شیر دل حیران تھا کہ وہ عکس مراد علی کو پہچان نہیں پایا۔ عکس اسی گھر میں آگئی تھی لیکن وہ یہاں چڑیا بن کر رہنا نہیں چاہتی تھی عکس مراد بن کر رہنا چاہتی تھی۔ اس نے بغیر بتائے خیر دین کو بھی بلوا لیا تھا۔ چڑیا کے طفیل خیر دین کی زندگی میں فخر کے بہت سے لمحے آئے تھے یہ بھی ان ہی سے ایک تھا۔ عکس خیر دین کی زمین واپس لینے کے لیے کیس کرتی ہے۔ خیر دین پس و پیش سے کام لیتا ہے لیکن عکس اپنا حق چھوڑنا نہیں چاہتی۔ عکس، شہباز پر کیس کرتی ہے تو شیر دل اسے روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ منزہ، شہر بانو کو فون کر کے کہتی ہیں کہ وہ شیر دل کو سمجھائے کہ وہ عکس کو کیس کرنے سے منع کرے۔ خیر دین کی طبیعت خراب ہونے پر شیر دل انتظام کر کے عکس کو سنگاپور سے پاکستان بھیجتا ہے اور اپنا موبائل بھی عکس کو دے دیتا ہے۔ موبائل پر شہر بانو کا میسج آتا ہے تو عکس فون آنے پر شیر دل کو بتا دیتی ہے۔ موبائل پر کسی مسز فاروقی کی کال آتی ہے اور وہ عکس کے نام بتانے سے پہلے ہی کہتی ہے کہ وہ عکس مراد علی ہے۔ عکس حیران رہ جاتی ہے اور شیر دل کا دوبارہ فون آنے پر اسے بتاتی ہے۔ شرمین سسٹر ایلنس سے ملتی ہے اور ان کے سب بتانے پر شہباز سے پوچھتی ہے کہ اس نے چڑیا کے ساتھ کیا کیا تھا لیکن شہباز چڑیا کو جاننے سے ہی انکار کر دیتا ہے۔ بات اتنی بڑھتی ہے کہ شرمین شہباز سے علیحدگی اختیار کر لیتی ہے۔ شیر دل منزہ سے کہتا ہے کہ انہوں نے شہر بانو سے شیر دل کے منع کرنے کے باوجود بات کی اور شہر بانو نے شرمین کو سب بتا دیا۔ شہر بانو، شرمین سے پوچھتی ہے کہ اس نے طلاق کیوں لی لیکن شرمین بات ٹال دیتی ہے۔ شہر بانو بتاتی ہے کہ اس نے پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ خیر دین کی خرابی طبیعت کا سن کر حلیمہ بھی آجاتی ہے۔ عکس، حلیمہ سے جواد کے نہ ہونے اور خیریت نہ لینے پر افسوس کا اظہار کرتی ہے جواد کو فون کرتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ اس کی ممی یہ رشتہ ختم کرنا چاہتی ہیں۔ منزہ، بختیار شیر دل سے کہتی ہے کہ وہ عکس کو سسپنڈ کروائیں اور بختیار شیر دل یہ کام کر گزرتے ہیں۔ خیر دین کا دل عکس کے نکاح کی تقریب میں ویسے ہی خدشوں کا شکار تھا جیسے کسی بھی باپ کا اپنی بیٹی کی رخصتی کے وقت ہوتا ہے۔ شیر دل خیر دین کو دیکھنے اسپتال آتا ہے تو عکس اس کو منع کر دیتی ہے کہ وہ خیر دین کو کیس کے بارے میں کچھ نہ بتائے۔ شہر بانو واپس پاکستان آجاتی ہے شیر دل، بختیار شیر دل کو بتاتا ہے کہ شہباز حسین نے عکس کے ساتھ زیادتی کی تھی جب وہ نو سال کی تھی اس لیے شہباز حسین نے خیر دین کو جاب سے نکال دیا تھا۔ عکس، غنی حمید کو بتاتی ہے کہ اس کی منگنی ختم ہو گئی ہے، غنی حمید کیس کے حوالے سے کہتا ہے کہ وہ اس کی مدد کرے گا۔ خیر دین، بختیار شیر دل کو ایبک کے والد کے طور پر جانتا تھا لیکن اس کی بیوی کو دیکھ کر وہ چونک جاتا ہے۔ بختیار شیر دل، خیر دین سے معذرت کرتے ہیں۔ شہر بانو اور شیر دل کے درمیان عکس کی وجہ سے تلخ کلامی ہو جاتی ہے۔ خیر دین، عکس کو بتاتا ہے کہ بختیار شیر دل معذرت کے لیے آئے تھے۔ خیر دین، عکس سے کہتا ہے کہ اس نے بتایا نہیں کہ شیر دل کا تعلق شہباز حسین کے خاندان سے ہے اور نہ ہی اس کیس کے بارے میں۔ شہر بانو امریکا جانا چاہتی ہے تو شیر دل کہتا ہے کہ مثال اس کے ساتھ نہیں جائے گی۔ شہر بانو امریکن قونصلیٹ کی مدد حاصل کر کے مثال کو لے کر چلی جاتی ہے۔ عکس اور خیر دین، شہر بانو کے اس عمل پر حیران تھے۔

(اب آگے پڑھیں)

طغرل نے اس آئینے میں پہلے اپنے آپ کو دیکھا پھر اپنے عقب میں آئے شیر دل اور عکس کو دیکھا۔ اسے وہاں رکے دیکھ کر شیر دل بھی وہاں چند لمحوں کے لیے رک گیا تھا۔ عکس نے پلٹ کر ایک بار پھر باذل کا ہاتھ پکڑ لیا جس نے بڑی مہارت سے گاڑی سے نکل کر یہاں برآمدے میں آنے تک چند قدموں کے فاصلے میں دو بار اس سے اپنا ہاتھ چھڑایا تھا۔ اس پر قابو پانا صرف اسی کا کمال تھا۔

"تمہیں پتا ہے میں نے تمہاری ممی کو پہلی بار کہاں دیکھا تھا؟" عکس نے آئینے کے سامنے کھڑے شیر دل کو طغرل سے کہتے سنا۔

"کہاں پاپا؟" طغرل نے بڑی دلچسپی سے گردن موڑ کر باپ کو دیکھا۔

"اسی گھر میں۔" عکس کی نظریں آئینے میں شیر دل سے ملی تھیں۔ ان آنکھوں میں شیر دل کو حیرانی نظر آئی۔ وہ مسکرایا تھا اور وہ حیرانی پل بھر میں ایک کھلکھلاہٹ میں بدل گئی تھی۔ عکس ہنس پڑی تھی۔ اسے یاد آ گیا تھا شیر دل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس نے پہلی بار اسے اسی آئینے میں دیکھا تھا جب وہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ٹینس شاٹس کی پریکٹس کرتا تھا اور وہ برآمدے کے ایک ستون کے پیچھے چھپی اسے دیکھتی رہتی تھی...... کسی میکانیکی انداز میں اس نے بے اختیار گردن موڑ کر اس ستون کو دیکھا تھا۔ ستون اب بھی وہیں تھا لیکن اس کے گرد وہ بیل نہیں تھی شاید نمی کے اثرات کو روکنے کے لیے ان تمام بیلوں کو ستونوں اور دیواروں سے کاٹ کر الگ کر دیا گیا تھا جو کئی سال پہلے اس گھر کی شناخت تھیں۔ عکس نے بے اختیار ایک گہری سانس لی۔ گھر بہت بدل گیا تھا۔ اس کے باوجود وہ اس کی ایک، ایک چیز کو آج بھی آنکھیں بند کیے چھو کر بھی پہچان سکتی تھی۔ وقت زندگی کو کس طرح بہا کر لے جاتا ہے کہ انسان خود بھی اسے روکنے بیٹھے تو روک نہ سکے...... گزر جانے والے لمحوں کو گننے بیٹھے تو گنتی بھول جائے۔

"آپ مذاق کر رہے ہیں۔" نو سالہ طغرل نے پہلے اُلجھ کر پھر ہنس کر اسی آئینے میں دیکھتے ہوئے شیر دل سے کہا۔ اس کے تبصرے نے عکس کی توجہ ایک بار پھر اپنی طرف کھینچ لی۔

"کیوں؟" شیر دل نے طغرل سے پوچھا۔

"ممی اس مرر میں کیسے ہو سکتی ہیں؟" طغرل نے جیسے اپنی بے یقینی کی وضاحت کی۔

"دیکھو ابھی ہیں یا نہیں؟" شیر دل نے اس کی وضاحت کے جواب میں آئینے میں نظر آتی عکس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اطمینان سے پوچھا۔ طغرل نے آئینے میں عکس کو دیکھا۔ باپ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ واقعی آئینے میں تھی۔ طغرل اُلجھا پھر ہنس پڑا۔

"پاپا یہ تو ان کا reflection ہے۔" اس نے جیسے شیر دل کی کم علمی بتائی۔

"یعنی عکس ہے۔" شیر دل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

عکس تب تک ان کے قریب آ چکی تھی۔ اس نے شیر دل کے کندھے کو ہولے سے چھوتے ہوئے کہا۔ "تم بس کر دو اب...... کب تک اس بے چارے کو تنگ کرتے رہو گے۔ ذرا اسے سنبھالو تو پھر پتا چلے۔" اس نے باذل کا ہاتھ شیر دل کے ہاتھ میں دے دیا۔

شیر دل نے ایک نظر سات سالہ باذل کو دیکھا پھر جیسے کچھ احتجاجی انداز میں عکس سے کہا۔ "تم ہمیشہ مجھے مشکل چیلنج دیتی ہو۔"

"تم ہر آسان چیلنج کو بھی مشکل بنا لیتے ہو اپنے لیے۔" وہ اطمینان سے کہتے ہوئے آگے بڑھ آئی تھی۔ آج اس

آئینے کے سامنے کھڑے اس نے اس آئینے میں اپنے شوہر اور بچوں کے علاوہ کسی اور چیز کو کھوجنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ تلاش کئی سال پہلے ہی ختم ہوگئی تھی۔

''پاپا! آپ کیا مجھے اٹھا سکتے ہیں؟'' شیر دل کے ساتھ اندرونی دروازے کی طرف جاتے ہوئے باذل کے قدم تھمے اور اس نے بڑی معصومیت سے شیر دل سے پوچھا۔

''میں اٹھا سکتا ہوں لیکن اٹھاؤں گا نہیں۔'' شیر دل نے اُسے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''ممی اٹھا سکتی ہیں مجھے۔'' باذل نے جیسے باپ کی مردانگی کو چیلنج دیا جسے شیر دل نے انتہائی ڈھٹائی کے ساتھ نظر انداز کیا۔ عکس بڑی خاموشی کے ساتھ باپ بیٹے کی گفتگو سنتے ہوئے اندر کی جانب بڑھتی رہی۔

''تمہاری ممی اس گھر میں dwarfs (بونے) دیکھا کرتی تھیں جب وہ چھوٹی تھیں۔'' شیر دل نے چلتے چلتے یک دم جیسے کچھ یاد آنے پر طغرل کو بتایا۔

''Really mummy?'' طغرل چلتے چلتے بے یقینی کے عالم میں رک کر عکس کو دیکھنے لگا۔ وہ بھی ٹھٹک گئی تھی اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا تھا۔

''dwarfs...... بونے...... آئینہ......'' شیر دل نے اسے کیا یاد دلا دیا تھا۔ اسے وہ سات ساتھی بونے بھی یاد آگئے تھے۔ اس کے تصوراتی دوست...... لیکن جس برق رفتاری سے وہ یاد آئے تھے اسی برق رفتاری سے ان کے حلیے، حرکتیں اور نام یاد نہیں آئے تھے...... اس میں وقت لگا تھا...... اس میں اگلے دو دن لگ گئے تھے۔

''پاپا مذاق کر رہے ہیں۔'' عکس نے مدھم انداز میں طغرل کی حیران آنکھوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ شیر دل نے .... پلٹ کر جیسے پُرحیرت نظروں سے اسے دیکھا۔

''میں مذاق کر رہا ہوں؟ تم نے خود ہی تو مجھے بتایا تھا ایک بار کہ تم نے یہاں......'' عکس نے اس کی بات کاٹ دی۔

''بچپن کی بات تھی وہ اور بچپن میں انسان کو پتا نہیں کیا کیا وہم ہوتے رہتے ہیں۔'' وہ بڑی سہولت سے کہہ کر آگے بڑھ گئی تھی۔ شیر دل نے کچھ حیرانی سے اسے جاتے دیکھا۔

''پاپا، ممی نے really ہی dwarfs دیکھے تھے یہاں؟'' طغرل کا تجسس کم نہیں ہوا تھا۔

''اپنی ممی سے پوچھنا، وہ آپ کو بتائیں گی۔'' شیر دل بھی اسے ٹالتے ہوئے آگے بڑھ گیا تھا۔

☆☆☆

اس گھر میں عکس مراد علی کی وہ دوسری پوسٹنگ تھی۔ پورے دس سال کے بعد...... لیکن اس بار وہ وہاں کمشنر کی حیثیت سے آئی تھی۔ اس شہر کو ڈویژن کا درجہ حاصل ہو جانے کے بعد وہاں تعینات ہونے والی پہلی کمشنر...... کمشنر کی رہائش گاہ زیرِ تعمیر تھی اور اس کے زیرِ تعمیر ہونے کی وجہ سے ڈپٹی کمشنر کی سرکاری رہائش گاہ کو وقتی طور پر کمشنر ہاؤس کا سرکاری درجہ دے دیا گیا تھا۔ گھر میں سامان کی شفٹنگ کا کام پہلے ہی مکمل ہو چکا تھا لیکن یہ کام شیر دل کی نگرانی میں ہوا تھا۔ وہ آج پوسٹ ہونے کے بعد پہلی بار اس گھر میں آئی تھی اور عجیب بات یہ تھی کہ دس سال پہلے ہونے والی یہاں اپنی پہلی پوسٹنگ کی طرح وہ آج اس طرح جذباتی نہیں ہوئی تھی نہ ہی اتنی ایکسائٹڈ تھی...... شاید اس لیے کیونکہ اس کے نانا اس کے ساتھ نہیں تھے۔ اس بار وہ ایک قلعہ فتح کرنے وہاں نہیں آئی تھی۔

اس گھر کے ہال کمرے میں داخل ہوتے ہوئے عکس مراد علی نے عجیب سی اداسی محسوس کی۔ نانا اسے ایک بار

پھر بُری طرح یاد آنے لگے تھے۔ وہ آج ایک بار پھر اسے اس گھر میں کمشنر کے طور پر آتے دیکھتے تو بے حد خوش ہوتے۔ بہت سارے خواب صرف ان کے تھے اس کے حوالے سے...... جو صرف وہ دیکھتے تھے اور ان کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد عکس مراد علی کے نزدیک کامیابی کا مفہوم وہ نہیں رہا تھا جو نانا کی زندگی میں تھا۔

ہال کمرے میں کھڑی ان در و دیوار کو اداسی سے دیکھتے ہوئے وہ یک دم چونکی تھی۔ شیر دل نے اس کے کندھوں کے گرد اپنا بازو پھیلایا تھا۔ وہ اب اس کے بالکل قریب کھڑا تھا۔ اس لمس میں عجیب دلگیری تھی، کچھ کہے اور سنے بغیر بھی جیسے دنیا جہان کی گفتگو تھی...... ہر مرہم بننے والا پھایا محسوس ہونے والا لفظ......

ساری عمر وہ دونوں ایک دوسرے کی خاموشی کو اسی طرح پڑھتے رہے...... لفظوں کے بغیر...... اداسی کو بیرومیٹر کی طرح بھانپ لیتے تھے اور خفگی کو راڈار کی طرح...... اب بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

عکس مراد علی نے ایک شیر دل کے چہرے کو گردن موڑ کر دیکھا۔ اس نے اس کی نظریں محسوس کرتے ہی جیسے بڑی حیرانی سے اس سے کہا۔

''کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں۔'' وہ مسکرا دی۔ اس نے اس کے گال پر نظر آنے والے پلک کے ایک بال کو انگلیوں کی پوروں کی غیر محسوس حرکت سے ہٹایا تھا۔ زندگی میں ایسا جیون ساتھی بہت خوش قسمت عورتوں کے حصے میں آتا تھا۔ عکس مراد علی نے وہاں کھڑے چند لمحوں کے لیے جیسے عجیب تعجب سے سوچا۔ اس گھر میں اپنا بچپن گزارتے ہوئے اس نے جتنی بھی خواہشیں کبھی کی تھیں وہ تمام پوری ہوئی تھیں اور اس بات کا ادراک اسے عجیب وقت پر ہُوا تھا۔ یہ گھر خوش قسمتی اور بد قسمتی کا عجیب امتزاج لیے ہوئے تھا اس کے لیے۔

☆☆☆

شرمین اور فاروق نے شہر بانو کو ائر پورٹ پر ریسیو کیا تھا لیکن دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ شہر بانو نے بے حد تھکے ہوئے انداز میں مثال کو ماں کو پکڑا دیا تھا۔ وہ مثال کو بہلانے پُھسلانے یا ڈرانے کسی بھی چیز میں پورا راستہ کامیاب نہیں ہوئی تھی اور اب شرمین کی صورت میں اسے جیسے کچھ دیر کے لیے اپنا بوجھ اٹھانے کے لیے ایک اور کندھا مل گیا تھا لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ مثال شرمین سے بھی بہلنے والی نہیں تھی۔ ایک بچے کے طور پر بھی وہ صورتِ حال کی سنگینی کو بھانپ گئی تھی۔ وہ چند ہفتے پہلے والی مثال نہیں تھی جو خوشی خوشی امریکا اپنی نانی اور نانا کے پاس چھٹیاں گزارنے آئی تھی اور ائر پورٹ سے لے کر گھر تک شرمین کو پتا نہیں کیا کیا قصے سناتی رہی تھی۔ اس بار مثال، شرمین کی بے تحاشا کوششوں کے باوجود صرف اِس ایک جُملے کے سوا کچھ بولنے پر تیار نہیں تھی کہ اسے پاپا کے پاس جانا ہے۔ وہ پاپ کو مِس کر رہی تھی۔ فاروق خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کرتے رہے تھے۔ شہر بانو ان کے برابر والی سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے اس خوفناک خواب کے بارے میں سوچتی رہی تھی جو اس نے حقیقت میں دیکھا تھا۔ عقبی نشست پر شرمین، مثال کو لیے بیٹھی کسی طرح اس کو بہلانے کی کوششوں میں مصروف تھیں اور ہر بار اس کے منہ سے نکلنے والے جملے شہر بانو کے اعصاب پر جیسے ہتھوڑوں کی طرح برس رہے تھے۔ وہ مثال کو اپنی ''ساری فیملی'' سمجھ کر سمیٹ لائی تھی اور مثال کی ساری فیملی سمٹ کر جیسے شیر دل کی ذات پر آکر ٹھہر گئی تھی...... تو وہ...... خود وہ شہر بانو کہاں کھڑی تھی۔

اگلے دو دن شہر بانو اور شرمین کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی لیکن شرمین اسے یہ ضرور بتاتی رہی تھیں کہ

پاکستان سے کِس کِس کا کتنی کتنی بار فون آیا تھا اور امریکا میں ان کے کس کس رشتے دار نے شیر دل کی فیملی کے دباؤ پر ان سے رابطہ کیا تھا۔ شہر بانو نے کسی رَدِّعمل کا اظہار نہیں کا تھا۔ وہ جیسے عجیب گم صم سی حالت میں تھی۔ عجیب سوتی جاگتی کیفیت جس میں وہ اپنی زندگی کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو بار بار رکھ کر جوڑنے کی کوشش میں ہلکان ہوتی جارہی تھی کہ شاید کسی طرح وہ اس سارے معمّے کا کوئی حل، کوئی شکل نکال پاتی...... ہر بار وہ ناکام رہی۔ مثال کی حالت اب بھی ویسی ہی تھی صرف اب اگر کوئی فرق پڑا تھا تو یہ کہ وہ ہر وقت روتی نہیں رہتی تھی لیکن وہ بھی شہر بانو کی طرح کوئی کھلونا پکڑے کسی کونے میں بیٹھی رہتی پھر یک دم کسی بات پر ضد شروع کردیتی اور پھر کتنی کتنی دیر بیٹھ کر روتی رہتی۔ شہر بانو عجیب میکانیکی انداز میں اسے روتا دیکھتی رہتی۔ اسے کبھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ مثال کے اس طرح رونے کو اتنی سرد مہری کے ساتھ نظر انداز کرسکتی تھی، اس کی چیخ و پکار کے سامنے اس طرح بے حس ہوسکتی تھی لیکن وہ ہوگئی تھی۔

انسان بعض دفعہ اپنی ذات کے بہت سے پہلوؤں سے اس وقت آگاہ ہوتا ہے جب دوسرے اسے دیکھ لیتے ہیں۔ ان کا اس سے واسطہ پڑ جاتا ہے وہ اس پر بات کرنے لگتے ہیں اور تب انسان جیسے شاک کے عالم میں اپنی ذات کے اس پہلو کو دیکھتا ہے۔ حیران ہوتا ہے...... میں یہ کیسے کرسکتا ہوں؟ میں ایسا کس طرح ہوسکتا ہوں؟ لیکن سارا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ سوال بہت سارے ہوتے ہیں جواب نہیں...... جواب بس ایک ہوتا ہے...... اور وہ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا...... شہر بانو کو بھی نہیں مل پارہا تھا۔

''اب تم کیا کرنا چاہتی ہو؟'' دو دن کے بعد بالآخر شرمین نے ایک رات اس سے اس موضوع پر بات کی۔ وہ کچن صاف کررہی تھیں اور وہ کچن کاؤنٹر کے سامنے پڑے اسٹول پر کافی کا مگ لیے بیٹھی تھی۔

''پتا نہیں۔'' شرمین کو پتا تھا وہ کیا کہے گی۔ وہ بھی اس کے قریب کاؤنٹر کے دوسری طرف اسٹول پر آکر بیٹھ گئیں۔

''تم شیر دل کے ساتھ رہنا چاہتی ہو؟'' انہوں نے بالآخر ایک لمبی خاموشی کے بعد کہا۔

''نہیں۔'' جواب کسی توقف کے بغیر آیا تھا۔

''divorce چاہتی ہو؟'' شرمین نے اگلا سوال کیا۔

''شاید۔'' جواب اس بار بھی جلدی آیا تھا لیکن اُلجھن لیے ہوئے تھا اور اُلجھن کیوں تھی، شہر بانو کے پاس اس بات کا بھی جواب نہیں تھا۔

''آپ کیا سمجھتی ہیں مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' شہر بانو نے یک دم ماں سے پوچھا۔ شرمین اس کے سوال پر جیسے کچھ حیران ہوئی تھیں۔ شہر بانو نے زندگی میں بہت کم اہم فیصلے کرتے ہوئے ان سے پوچھا تھا۔ شیر دل سے شادی کے وقت بھی اس نے ماں سے مشورہ نہیں کیا تھا صرف اپنی خواہش اور فیصلہ انہیں بتایا تھا اور پھر ان کے مخالف دلائل کے باوجود وہ اپنے فیصلے پر قائم رہی تھی۔

''تمہیں یہ دیکھنا چاہیے کہ تم کیا چاہتی ہو؟ مثال کے لیے کیا بہتر ہے؟'' شرمین نے نپے تُلے انداز میں اس سے کہا۔

''آپ میری جگہ ہوتیں تو آپ کیا کرتیں؟'' اس نے ایک عجیب سوال کیا۔ شرمین اس کا چہرہ دیکھنے لگیں پھر انہوں نے کہا۔

''میرے لیے کسی بھی ایسے مرد کے ساتھ زندگی گزارنا مشکل ہوتا جو مجھ سے وفادار نہیں جو ایک دوسری عورت

کے ساتھ انوالوڈ ہو۔'' کسی دوسرے کی زبان سے شیر دل کی فردِ جرم کا سن کر اسے نہ چاہنے کے باوجود عجیب سی تکلیف ہوئی تھی...... اب بھی ہوئی تھی اور شاید ساری عمر ہونے والی تھی...... یہ کانٹا دل میں گڑا تھا ایڑھی میں چُبھا ہوتا تو نکل جاتا۔

''میں بھی نہیں رہ سکتی۔'' اس نے کافی کا مگ کاؤنٹر پر گھماتے ہوئے شرمین سے نظریں ملائے بغیر کہا۔ شیر دل اور اس کی بے وفائی اور اس کا کردار ڈسکس کرنا ان دونوں کے لیے آسان تھا...... جو چیز دونوں کے لیے مشکل تھی وہ شہباز حسین کو ڈسکس کرنا تھا۔ وہ چڑیا کے ساتھ ہونے والے اس واقعے کو ڈسکس کرنا تھا۔ شیر دل کی بے وفائی نے جیسے شہباز حسین کو مزید ذلیل و خوار ہونے اور اپنی اولاد کی نظروں میں گرنے سے بچالیا تھا۔ وہ دونوں دن رات شہباز حسین اور عکس اور ان تمام الزامات کے بارے میں سوچتے رہنے کے باوجود اس پر بات نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ شرمین، شہر بانو سے نہ شہر بانو شرمین سے...... شہباز حسین بُرا تھا اور شیر دل بھی بُرا ہی نکلا کیونکہ وہ بھی اسی خاندان کا مرد تھا...... شرمین کا نتیجہ اس کے اندیشوں کے مطابق ہی نکلا تھا لیکن وہ کوشش کرنے اور خواہش ہونے کے باوجود شہر بانو کو یہ بتانے کی ہمت نہیں کرسکی تھیں۔ شیر دل اور عکس کے درمیان موجود غیر اخلاقی تعلقات کو ایک فون کال کی وجہ سے وہ بہت پہلے جان گئی تھیں۔ وہ شہر بانو کی اذیت میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

دونوں میں سے کسی نے اس سلسلے میں مزید کوئی سوال جواب نہیں کیا تھا...... بس خاموشی سے وہ دونوں اسی طرح کچن کاؤنٹر کے اطراف اسٹول پر بیٹھی چپ چاپ کافی پیتی رہیں۔ اس کی کڑواہٹ زندگی کی کڑواہٹ کے مقابلے میں شیریں بن گئی تھی۔

☆☆☆

شیر دل نے زندگی میں کبھی سونے کے لیے خواب آور اَدویات کا استعمال نہیں کیا تھا لیکن شہر بانو اور مثال کے اس طرح گھر سے چلے جانے کے بعد وہ دو راتیں نہیں سو سکا تھا۔ سگریٹ پھُونکنے، کالز پر کالز ملانے کے علاوہ اس نے کچھ نہیں کیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا وہ آہستہ آہستہ insomnia (بے خوابی) کا مریض بننے والا تھا۔ اس کی زندگی سے گھر اور سکون نام کی چیزیں جیسے منٹوں میں نکل گئی تھیں اور اس کی ذمّے دار شہر بانو تھی۔ اس کے اقدام سے ملنے والا ابتدائی شاک اب شدید غصے میں تبدیل ہوچکا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس غصے کو شہر بانو پر نکالنے کے لیے اسے موقع نہیں مل رہا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ شہر بانو جلتی پر تیل چھڑکنے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرنے والی تھی۔

بختیار شیر دل نے شہر بانو کے ساتھ رابطہ کرنے میں ناکام ہوجانے اور شرمین کے ساتھ بار بار ہونے والی بات چیت کا کوئی نتیجہ نہ نکلنے پر بالآخر امریکا جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ اس معاملے کو طول دے کر اس کی سنگینی میں اضافہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے منیّرہ اور شیر دل کے ساتھ اپنی سیٹ ایر جنسی میں بُک کروائی تھی لیکن اس واقعے کے چوتھے دن وہ جب شام کو نیویارک کی فلائٹ لینے کے لیے ائرپورٹ پہنچے تو امیگریشن کاؤنٹر پر شیر دل کے پاسپورٹ کو ہاتھ میں لیتے اور کمپیوٹر پر چند بٹن دباتے ہی امیگریشن اہلکار نے شیر دل کو امریکن ایمبیسی کی طرف سے اس کے پانچ سالہ ملٹی پل ویزے کی منسوخی کی اطلاع اسے دے کر پاسپورٹ واپس اس کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ شیر دل کا رنگ سیکنڈز میں فق ہوا تھا۔ وہ پاسپورٹ پکڑے بغیر بے یقینی سے اس اہلکار کا چہرہ دیکھتا رہا۔ مثال سے ملنے اور اسے دیکھ پانے کی ایک آخری امید بھی پل میں غائب ہوگئی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ نہیں آیا تھا کہ اس واقعے کے بعد اس کا ویزا کینسل کیا جاسکتا تھا اور وہ بھی انفارم کیے بغیر...... اس کا ذہن جیسے ایک عجیب سے بلیک آؤٹ کا شکار ہوا

تھا۔ غصے، بے بسی اور نا امیدی کی ایک عجیب سی کیفیت...... ایک عجیب جنون خیز کیفیت...... اگر زندگی میں وہ کسی عورت کی دوبارہ شکل نہیں دیکھنا چاہتا تھا تو وہ شہر بانو تھی۔

خوش قسمتی سے بختیار اور منزہ کے ویزے کینسل نہیں ہوئے تھے اور شیر دل کے ویزے کے کینسل ہونے پر بہت اَپ سیٹ ہونے کے باوجود انہوں نے اپنے سفر کو ملتوی کرنے کے بجائے اسے جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ منزہ اس ساری صورت حال میں بالکل چُپ سادھے ہوئے تھیں۔ وہ اس ساری صورتِ حال کا ملبا کسی کے سر ڈالنا چاہتی تھیں لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ہر بار ایسی کسی کوشش میں وہ کامیاب نہیں ہو پا رہی تھیں۔ بختیار اور شیر دل نہ بھی کہتے...... کوئی بھی نہ کہتا تو بھی وہ جانتی تھیں یہ ساری تباہی ان کی وجہ سے آئی تھی۔ شیر دل کا گھر ان کے علاوہ کسی اور کی وجہ سے نہیں ٹوٹ رہا تھا۔ شرمین اور شہباز کا گھر بھی انہی کی ضد، جھوٹ اور شہباز کی بے جا اور بے وقت کی طرف داری سے ٹوٹا تھا لیکن وہ بھائی تھا اُن کا گھر ٹوٹنے کے بعد انہوں نے کبھی ایسی صورتِ حال میں اپنے کردار کو analyze نہیں کیا تھا نہ ہی کسی نے ان کے اوپر انگلیاں اٹھائی تھیں۔ وہ ساری عمر اسی ایک بات پر فخر کرتی رہی تھیں کہ ان سے جس حد تک ممکن تھا انہوں نے شہباز کی حمایت کی تھی اور اسے بچانے کی کوشش کی تھی۔

ایک شیر دل کا معاملہ دوسرا تھا۔ اس میں دنوں میں ان کے جھوٹ کُھل کر سامنے آ گئے تھے اور انہیں ایک اور شوہر کے ساتھ ساتھ اپنی دوسری اولاد کے سامنے بھی خفت اٹھانی پڑ رہی تھی۔ ان کی تنقید اور خفگی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ شیر دل کی حالت دیکھ رہی تھیں اور ایک ماں کے طور پر ان کا دل اس کی حالت پر کٹ رہا تھا لیکن جو ندامت اور غصہ انہیں اپنے آپ پر آنا چاہیے تھا، وہ شہر بانو اور شرمین پر آ رہا تھا۔ شہر بانو سے بھی زیادہ شرمین پر کیونکہ کہیں نہ کہیں انہوں نے اپنے آپ کو یہ یقین دلا لیا تھا کہ یہ جو کچھ ہو رہا تھا شرمین کی وجہ سے ہو رہا تھا ان کی برین واشنگ کی وجہ سے...... وہ ان کے خاندان سے بدلہ لینا چاہ رہی تھیں اور وہ اتنے سالوں بعد کامیاب ہو گئی تھیں۔ وہ امریکا بھی انہی شکوک و شبہات، غلط فہمیوں کے ساتھ پہنچی تھیں اور ان کی خفگی اور غصے میں اس وقت اضافہ ہو گیا تھا جب شرمین نے انہیں اپنے گھر بُلانے یا شہر بانو سے کہیں بھی ان کی ملاقات کروا دینے سے انکار کر دیا تھا۔ بختیار شیر دل ان کے ساتھ نہ ہوتے تو منزہ ایک بار پھر غصے میں کوئی مزید ہنگامہ کرتیں لیکن بختیار نے اس معاملے پر شرمین کے میاں فاروق سے بات کر کے انہیں کسی نہ کسی طرح شہر بانو کے ساتھ ایک ملاقات کروانے پر آمادہ کر لیا تھا۔ فاروق نے شرمین اور شہر بانو کو اس ملاقات پر کیسے تیار کیا تھا وہ ایک الگ کہانی تھی لیکن شہر بانو اور شرمین بالآخر ان لوگوں سے ملاقات پر آمادہ ہو گئی تھیں اور بختیار نے یہ خبر شیر دل کو پاکستان میں بھی پہنچا دی تھی۔

☆☆☆

''سجاد قادر'' عکس نے حلیمہ کے نام بتانے پر وہ نام دُہرا کر جیسے اپنی یادداشت تازہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے ذہن میں ایک دُبلے پتلے سانولے رنگ کے لڑکے کا تصور ابھرا تھا لیکن اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

''میں نام سے واقف ہوں لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی، مجھے شکل تک ٹھیک سے یاد نہیں اس کی۔'' اس نے حلیمہ سے کہا۔

''اچھا؟ لیکن اس کو تو بڑی اچھی طرح سے یاد ہو تم۔'' حلیمہ کو اس کی بات پر جیسے کچھ مایوسی ہوئی۔ ''لیکن خیر یہ تو ایسا کوئی بڑا مسئلہ نہیں، میں ان لوگوں سے بات کر کے ملاقات کروا دیتی ہوں تم دونوں کی۔'' حلیمہ نے اس سے کہا۔

''امی وہ دبئی میں کام کرتا ہے، میں یہاں پاکستان میں...... اور میرا اپنی جاب چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں۔''

عکس نے دوٹوک انداز میں حلیمہ کو اپنی ترجیحات بتا دی تھیں۔

''میں نے یہ بھی بات کی تھی ان لوگوں سے...... سجاد نے ایک دو سال تک واپس پاکستان آ جانا ہے۔ یہاں بڑے اچھے ہاسپٹلز سے آفرز ہیں اسے...... لیکن وہ شاید اپنا ہاسپٹل بنانا چاہتا ہے لاہور میں اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ مل کے...... وہ بھی ڈاکٹر ہے۔'' حلیمہ نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

''ٹھیک ہے، آپ ملاقات کروا دیں۔'' وہ کہہ کر حلیمہ کے پاس سے اٹھ گئی۔ شادی یک دم اسے ایک بوجھ محسوس ہونے لگی تھی۔ خاص طور پر ان اوپر نیچے بار بار ہونے والے حادثات کی وجہ سے...... ایک بار پھر سے کسی نئے آدمی سے ملنا کسی نئے آدمی کو جیون ساتھی کے طور پر دیکھنے کے لیے ملنا...... اپنے ذہن اور دل میں اس کے لیے گنجائش یا کوئی نرم جگہ نہ ہونے کے باوجود پیدا کرنے کی جدوجہد...... عکس مراد علی کہیں نہ کہیں اس ساری جدوجہد سے تنگ آ گئی تھی۔ اگر خیر دین اور حلیمہ کا دباؤ نہ ہوتا تو وہ کم از کم اس وقت پھر سے کسی نئے شخص سے ملنے کی کوشش نہ کر رہی ہوتی۔

اگلی صبح آفس میں آتے ہی اسے شیر دل کی چھٹی کی اطلاع ملی تھی۔ وہ ایک مہینے کے لیے چھٹی پر چلا گیا تھا۔ اسے یک دم اس کے حوالے سے مزید تشویش ہوئی تھی۔ بہت دیر تک وہ اس الجھن میں رہی تھی کہ اسے شیر دل سے بات کرنی چاہیے یا نہیں اور پھر جیسے اس نے اس سے بات کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا۔ اس کے موبائل پر کی جانے والی کال بے مقصد ثابت ہوئی تھی۔ اس کے دونوں نمبرز آف تھے۔ وہ کچھ دیر بیٹھی رہی پھر اس نے اپنے پی اے کو شیر دل کی رہائش گاہ پر اس کی موجودگی چیک کرنے اور اس کے موجود ہونے پر اس سے رابطہ کرانے کی ہدایات دی تھیں۔ پی اے کے جواب کے انتظار میں وہ اپنی میز پر پڑے ہوئے وہ تمام Invitation دیکھنے لگی جو شہر کی مختلف تنظیموں اور اداروں کی طرف سے مختلف تقریبات کی صدارت کے لیے اس کے پاس آتے رہے تھے۔ ٹرے میں پڑا وہ چوتھا کارڈ تھا جس کو ہاتھ میں لیتے ہی وہ رک گئی تھی۔ وہ اس کے اپنے کانونٹ اسکول کی طرف سے تھا...... سالانہ اسپورٹس ڈے کے انعقاد اور اس تقریب میں مہمانِ خصوصی کے طور پر اس کی شرکت کی دعوت...... اس نے سیکنڈز میں کارڈ پر لکھی تحریر پڑھی تھی اور پھر ایک نام پر رک گئی تھی۔ وہ اسکول کی پرنسپل سسٹر ایگنس فرانسس کا نام تھا۔ وہ خوشگوار حیرت کے ساتھ ان کا نام زیرِ لب دہرانے لگی۔ وہ ایک بار پھر اس کے اسکول کی پرنسپل کے طور پر وہاں موجود تھیں۔ اتنے سال گزر گئے تھے اور اتنے سالوں میں اس کانونٹ سے سسٹر ایگنس کے ٹرانسفر کے بعد اس کی دوبارہ ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی حالانکہ اسے بہت بار ان کا خیال آتا رہتا تھا۔ کئی بار خیر دین اور وہ بیٹھے ماضی کو یاد کرتے تو وہ دونوں سسٹر ایگنس کا ذکر بھی کرتے۔ بہت دفعہ اس نے خواہش بھی کی تھی کہ وہ کبھی کہیں ان سے ملاقات کر پاتی لیکن زندگی اتنی تیز رفتار رہی تھی کہ وہ خواہش کے باوجود ان کو ڈھونڈنے اور ان سے ملاقات کرنے کی کوشش کو عملی جامہ نہیں پہنا سکی تھی۔ انٹرکام اٹھا کر اس نے پی اے کا نمبر ملایا تھا۔ پی اے نے اس کی آواز سنتے ہی اسے شیر دل کے اپنی رہائش گاہ پر نہ ہونے کی اطلاع دے دی تھی۔ وہ لاہور میں تھا۔ اس نے پی اے کو لاہور میں اسے ٹریس کرنے کی ہدایات دینے کے بعد ہاتھ میں پکڑے کارڈ کے متعلق پوچھنا شروع کیا۔

''جی ان کا فون بھی آیا تھا دو بار اسی فنکشن کے حوالے سے آپ سے بات کرنا چاہتی تھیں لیکن آپ سیٹ پر نہیں تھیں۔'' پی اے نے اُسے سسٹر ایگنس کے حوالے سے بتایا۔ عکس نے اس فنکشن میں جانے کی بابت...... پی اے کو اسکول انتظامیہ کو آگاہ کرنے کی ہدایات دیں اور فون ایک بار پھر رکھ دیا۔ اس کا ذہن ایک بار پھر شیر دل میں اُلجھ

گیا تھا۔

☆☆☆

''شیر دل کا مسئلہ حل ہوا؟'' اس رات کھانے پر خیر دین نے ایک بار پھر وہ موضوع چھیڑ دیا تھا جو سارا دن اس کے ذہن پر سوار رہا تھا۔

''وہ ایک مہینے کی چھٹی پر چلا گیا ہے۔'' عکس نے کھانا کھاتے ہوئے خیر دین کو اطلاع دی۔

''اللہ خیر کرے...... تمہاری بات ہوئی اس سے؟'' خیر دین کو تشویش ہوئی۔

''دونوں موبائل نمبرز آف ہیں اس کے اور وہ لاہور میں ہے اپنے پیرنٹس کے گھر پر...... اس کے آپریٹر نے نمبر دیا ہے وہاں کا۔ میں نے پیغام چھوڑا ہے اس کے لیے...... اگر کل وہ کال نہیں کرتا تو پھر میں کروں گی اُسے کال۔'' عکس نے خیر دین کو تفصیل سے بتایا۔

''تم نے پہلے بھی اس سے بات کرنے کے لیے اس کی کال کا انتظار نہیں کیا تھا۔'' وہ خیر دین کی طرف سے آنے والے اس غیر متوقع سوال پر کچھ گڑبڑا گئی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ خیر دین اس کی اس تفصیلات میں سے کوئی ''حیران کُن تجزیہ'' نکال سکتا ہے۔

''نانا یہ اس کا اور اس کی بیوی کا معاملہ ہے، ایک پرسنل ایشو ہے، مجھے نہیں پتا کہ اسے اس مسئلے کو کسی دوسرے کے ساتھ ڈسکس کرنا اچھا لگے گا یا نہیں۔'' اس نے بالآخر خیر دین کے ساتھ اپنی الجھن شیئر کی۔

''تم اس کے ساتھ کچھ ڈسکس کرو یا نہ کرو کم از کم اس پریشانی میں اس کو حوصلہ تو دلا سکتی ہو ناں... بیوی تو اچھی تھی اس کی تم ہی کہا کرتی تھیں پھر یہ بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا۔'' خیر دین نے بات کرتے کرتے بات کا رخ بدل دیا اور جیسے عکس کو اس موضوع پر مزید کچھ کہنے سے بچا لیا۔

''ماں تو بہت اچھی عورت تھی شیر دل کی بیوی کی۔'' خیر دین اب شرمین کے بارے میں سوچتا ہوا بول رہا تھا۔ ''پتا نہیں ایسا کیا ہو گیا کہ اس طرح گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے اُس کی بیوی۔'' عکس کو خیر دین کی بات سنتے ہوئے مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی ایک عجیب طرح کا احساسِ جُرم ہونے لگا تھا۔ اگر خیر دین کو یہ پتا چل جاتا کہ وہ بھی کسی نہ کسی حد تک اس بگاڑ میں انوالو تھی تو پتا نہیں اس کا ردِعمل کیا ہوتا۔

''نانا سسٹر ایگنس دوبارہ اسی کانونٹ میں آ گئی ہیں۔'' عکس نے یک دم خیر دین کو اس موضوع سے ہٹانے کی کوشش کی۔

☆☆☆

سسٹر ایگنس کو اپنے آفس میں آ کر بیٹھے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی جب reception پر بیٹھے آفس اسسٹنٹ نے انہیں ایک اولڈ اسٹوڈنٹ کے بارے میں بتایا جو اُن سے ملنا چاہتی تھی۔ سسٹر ایگنس نے اپنے اسسٹنٹ کو پہلے اُن وزیٹرز کو اندر بھیجنے کے لیے کہا جو ایڈمیشن اور اپنے بچوں کے حوالے سے مختلف ایشوز ڈسکس کرنے آئے تھے اور اس اولڈ اسٹوڈنٹ کو انتظار کرنے کے لیے کہا۔ اسکول کے اکثر اولڈ اسٹوڈنٹس کتنی بار ان سے ملنے وہاں آ جایا کرتے تھے۔ یہ ہر روز نہیں ہوتا تھا لیکن یہ اکثر اوقات ہوتا تھا اور سسٹر ایگنس ایسی ملاقاتوں کو اپنی اپائنٹمنٹس میں سب سے نیچے رکھتی تھیں کیونکہ ایسی ملاقاتوں میں زیادہ تر گپ شپ ہوتی تھی یا پھر بعض اولڈ اسٹوڈنٹس اسکول میں اپنے بچوں یا فیملی کے بچوں کے لیے کچھ favours لینے کی کوشش کرتے

تھے...... آج بھی ہمیشہ کی طرح سسٹر ایگنس نے اس وزیٹر کو سب سے آخر میں رکھا تھا۔ بالآخر جب وہ اپنی باقی تمام ملاقاتوں سے فارغ ہو گئیں تو انہوں نے اسسٹنٹ سے اس اولڈ اسٹوڈنٹ کے بارے میں پوچھا۔

''وہ مجھ سے پوچھ کر چلی گئی تھیں کہ سسٹر کب تک فری ہو کر ان سے ملیں گی؟ میں نے کہا ''لنچ بریک کے بعد'' تو وہ کہہ رہی تھیں کہ وہ تب دوبارہ آ جائیں گی لیکن ابھی......'' اسسٹنٹ نے سسٹر ایگنس سے بات کرتے کرتے عکس مراد علی کو دوبارہ آفس میں آتے دیکھ لیا۔ وہ بالکل اس وقت پر آئی تھی جس وقت کا اسسٹنٹ نے اُسے بتایا تھا۔ اسسٹنٹ نے سسٹر ایگنس کو اس کی آمد کی اطلاع دی۔ ''ڈاکٹر عکس نام ہے۔'' اسسٹنٹ نے سسٹر ایگنس کے استفسار پر بتایا پھر عکس کو اندر جانے کے لیے کہا۔

''Good afternoon sister'' سسٹر ایگنس نے سر اٹھا کر اسے اندر داخل ہوتے دیکھا تھا اور پھر جیسے سیکنڈز میں اسے پہچان لیا۔

''عکس مراد علی۔'' انہوں نے اس کی greeting کا جواب دیتے ہوئے بے حد بے یقینی سے اس کا پورا نام لیا۔ عکس بے اختیار ہنس پڑی اسے کوئی زیادہ حیرانی نہیں ہوئی تھی۔ سسٹر ایگنس اس کے بچپن میں بھی اسکول میں پڑھنے والے سیکڑوں بچوں کو اسی طرح ان کا پورا نام لے کر یاد رکھا کرتی تھیں لیکن اب اس عمر میں بھی ان کی یادداشت کا اسی طرح شاندار ہونا ایک عام آدمی کے لیے حیران کُن تھا۔

''ڈاکٹر عکس مراد علی؟'' ٹیبل کے اوپر سے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے اب انہوں نے دوسری بار ستائشی انداز میں اس کا نام لیا تھا۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے سسٹر ایگنس کی اس ستائش آمیز حیرت پر مسکرا دی تھی۔ اس سے بڑی گرم جوشی سے باتیں کرتے ہوئے سسٹر ایگنس نے جیسے بغور اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ ایک سیاہ سوٹ کے اوپر ایک آف وائٹ ٹی کالرڈ جرسی پہنے اس دُبلی پتلی سانولی لڑکی میں انہیں وہی تنک اور تمکنت نظر آئی تھی جو اس ننھی بچی کی بھی شناخت تھی جس کی ملائم ریشمی آواز پر وہ جان چھڑکتی تھیں۔ ان آنکھوں کی چمک آج بھی اس کی ذہانت کو عیاں کر رہی تھی۔ اس حادثے کا کوئی رنگ انہیں اس مسکراتے ہوئے پُراعتماد چہرے میں کہیں نہیں دکھا تھا جس نے تب کئی مہینوں تک اس ننھے وجود کو کُملائے رکھا تھا۔ سسٹر ایگنس کو دلی خوشی ہوئی تھی۔ وہ اس ذہین لڑکی کو ایسا ہی دیکھنا چاہتی تھیں۔ مگر انہیں اندازہ نہیں تھا اس ذہین لڑکی نے اس سے زیادہ بڑے پہاڑ سَر کر لیے تھے جن پر وہ اس کا نام دیکھنا چاہتی تھیں۔ ٹیبل پر پڑا اس کا فون وہاں رکھے جانے کے چند ہی منٹ بعد بجنے لگا تھا جسے عکس نے بہت معذرت کرتے ہوئے فوری طور پر silent کیا تھا لیکن silent ہونے کے باوجود سسٹر ایگنس اس پوری گفتگو کے دوران بار بار اس فون پر جلتی بجھتی روشنیوں کا سیلاب دیکھتی رہیں وہ ہر چند منٹ بعد کسی میسج یا کال کا اعلان کر رہا تھا۔

''بہت busy ڈاکٹر ہو تم!'' سسٹر ایگنس نے مسکراتے ہوئے اس کے فون کی طرف اشارہ کیا۔

''میں پریکٹس نہیں کرتی سسٹر۔'' عکس نے ان کی بات پر ایک لمحے کے لیے اپنے فون کو دیکھا پھر ان سے کہا۔

سسٹر ایگنس کے تاثرات سیکنڈز میں بدلے تھے انہوں نے بہت خفگی سے اسے جھڑکنا شروع کر دیا تھا۔ عکس مسکراتے ہوئے ان کی ڈانٹ ڈپٹ سنتی رہی، اسے ان سے اسی بات کا خدشہ تھا۔ جب سسٹر ایگنس کی ناراضی زیادہ بڑھ گئی تو عکس نے انہیں اپنے موجودہ پروفیشن کے متعلق نرم آواز میں بتایا۔ سسٹر ایگنس چند لمحوں

کے لیے بھونچکا رہ گئی تھیں۔ شہر میں تعینات ہونے والی پہلی خاتون DCO کے بارے میں وہ واقف تھیں، نام سے بھی واقف تھیں اور چند دن پہلے انہوں نے...... اسے اسپورٹس ڈے...... پر دعوت دینے کے لیے کارڈ بھیجا تھا لیکن انہیں بالکل شائبہ نہیں ہوا تھا کہ وہ یہ عکس مراد علی ہوگی...... وہ جو اِن کے بالمقابل میز کے دوسری طرف پڑی دو کرسیوں میں سے ایک پر بڑی تمیز اور شائستگی سے کرسی کے ہتھوں پر بازو ٹکائے، گھٹنے جوڑے، پاؤں ملائے بالکل سیدھی پُشت کے ساتھ بے حد مؤدب انداز میں بیٹھی تھی۔ وہ اس شہر کی DCO تھی جو اپنے آفس میں ٹانگ پر ٹانگ رکھے ریوالونگ چیئر پر بے حد کرّوفر سے بیٹھتی تھی۔ کہیں پہنچنے پر لوگ اس کا باہر نکل کر استقبال کرتے تھے۔ وہ وزیٹرز روم میں بیٹھ کر انتظار کر کے اٹھ جانے کے بعد دوبارہ اسی طرح وہاں نہیں آجاتی تھی۔

''میں اسپورٹس ڈے پر آنا چاہتی تھی اس لیے میں نے سوچا میں آ کر آپ کو بتادوں اور آپ سے مل بھی لوں۔'' وہ اُسی انکسار سے سسٹر ایگنس کو بتا رہی تھی۔ سسٹر ایگنس کو چند لمحے واقعی کچھ سمجھ نہیں آیا تھا۔ ان کے ایکس اسٹوڈنٹس میں سے بڑے عہدوں پر پہنچنے والوں کی کمی نہیں تھی مگر زندگی میں کامیابی کے اوپر والے زینے پر کھڑے ہو کر بھی چلّا کر بات کرنے کے بجائے جُھک کر مدّھم آواز میں بات کرنے والے انہوں نے بھی بہت کم دیکھے تھے اگر خاندان، ذات برادری کو کہتے تھے تو پھر وہ کوئی خاندان نہیں رکھتی تھی اور اگر خاندانی اخلاقی اقدار اور تمیز و تہذیب کو کہتے تھے تو پھر سسٹر ایگنس نے ڈاکٹر عکس مراد علی سے بڑھ کر خاندانی کوئی نہیں دیکھا تھا۔

''بہت غلط فیصلہ تھا یہ!'' ابتدائی شاک سے نکل آنے کے بعد سسٹر ایگنس نے ایک بار پھر اسے ڈانٹنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ایک جھینپی ہوئی زیرِ لب مسکراہٹ کے ساتھ ان کی ڈانٹ ڈپٹ سنتی رہی اسے اندازہ تھا کہ وہ میڈیسن پریکٹس نہ کرنے پر اسے یہی کہیں گی۔ خیر دین کے بعد وہ دوسری شخص تھیں جن کے لیے میڈیسن مسیحائی تھی اور دنیا کا اور کوئی پروفیشن اس کے قریب بھی نہیں آسکتا تھا۔

''اور جب تک میں یہاں ہوں اگر میں آپ کے لیے، اسکول کے لیے کچھ بھی کر سکی تو پلیز مجھے ضرور بتائیے گا۔'' چائے پیتے ہوئے اُٹھنے سے چند لمحے پہلے اس نے سسٹر ایگنس سے کہا تھا۔ سسٹر ایگنس نے چند لمحوں کے توقف کے بعد اسکول کے عقب میں واقع ایک سرکاری پلاٹ کا ذکر کرنا شروع کیا جسے اسکول بہت عرصے سے اسکول کے گراؤنڈ میں توسیع کے لیے خریدنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ سسٹر ایگنس کو اب امید تھی کہ عکس مراد علی کے اس سیٹ پر ہونے کی وجہ سے اسکول بالآخر وہ پلاٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا اور اس پلاٹ کی شمولیت سے اسکول میں بچوں کے لیے گیمز کی بہتر سہولیات میسّر آسکیں گی۔ عکس نے خاموشی سے بغور سسٹر ایگنس کی بات سنی۔ وہ مطالبہ اور درخواست کوئی نیا مطالبہ نہیں تھا۔ اسکولز اور کالجز اپنی تقریبات میں مدعو کرنے کے بہانے عام طور پر ضلعی انتظامیہ کے سامنے اس طرح کے مطالبے پیش کرتے تھے یا پھر مختلف گرانٹس کے لیے درخواستیں......

''میں دیکھوں گی میں اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہوں لیکن مجھے نہیں لگتا کہ اس پلاٹ کے سلسلے میں، میں آپ کی کوئی مدد کر پاؤں گی۔'' عکس نے چائے کا خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے متانت سے سسٹر ایگنس کو بتایا۔ انہیں اس کے جواب نے حیران کر دیا تھا۔ وہ اپنی درخواست کے جواب میں ''انکار'' کی توقع عکس مراد علی کے

وہاں اس طرح آنے اور بیٹھنے کے بعد خواب میں بھی نہیں کر سکتی تھیں۔

''لیکن تم کر سکتی ہو تمہیں authority ہے اس کی۔'' سسٹر ایگنس نے اصرار کیا۔

''authority ہے لیکن rules کو violate کیے بغیر یہ ممکن نہیں ہے۔ یہ اسکول پرائیویٹ ہے۔ privilaged class کے لیے کام کر رہا ہے اور مالی طور پر بہت مستحکم ہے۔ کیتھولک بورڈ آف ایجوکیشن سے بہت زیادہ فنڈنگ بھی مل رہی ہے اسے...... اور قواعد وضوابط کے مطابق میں ایسے کسی ادارے کو سرکاری زمین الاٹ نہیں کر سکتی۔ یہ میں تبھی کر سکتی ہوں جب میں تمام rules کو بائی پاس کر دوں اور وہ میں نہیں کر سکتی۔ وہ زمین ویسے بھی اس علاقے کے ایک چلڈرن پارک کے لیے مختص ہے اور ضلعی انتظامیہ نے اس سال بجٹ میں اس کے لیے فنڈز رکھے ہیں چند مہینوں تک اس پر کام شروع ہو جائے گا۔'' سسٹر ایگنس نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اس کی بات سننے کے بعد کہا۔

''You know Dr. Aks Murad Ali...... اس اسکول کے بھی بہت سارے rules تھے لیکن میں نے تمہیں دوبارہ ایڈمیشن دِلانے کے لیے اور پھر تمہاری تعلیم کو ہر طریقے سے جاری رکھوانے کے لیے بہت سے rules کو violate بھی کیا تھا اور بائی پاس بھی۔'' انہوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے جتایا۔ انہیں اس کا انکار کَھلا تھا۔

''اگر آپ سسٹر ایگنس کی اسٹوڈنٹ رہی ہوتیں تو آپ کے لیے بھی rules کو violate کرنا میری طرح مشکل ہوتا۔'' جواب اُسی متانت اور ذہانت سے آیا تھا۔ سسٹر ایگنس بے اختیار لاجواب ہوتے ہوئے ہنس پڑیں۔ اس نے انہیں tribute نہیں کیا تھا لیکن ان کے لیے اپنے کیس کو argue کرنے کا کوئی موقع نہیں چھوڑا تھا۔

''تمہاری گاڑی کہاں ہے؟'' اُسے باہر چھوڑنے کے لیے آتے ہوئے سسٹر ایگنس نے اس سے پوچھا۔

''وہ گیٹ سے باہر ہے سسٹر۔'' عکس نے کہا۔

''میں گیٹ کھلوا رہی ہوں تم گاڑی اندر منگوالو۔'' سسٹر ایگنس نے اس سے کہا۔

''Thank you sister...... لیکن میں کبھی کسی اسکول یا کالج کے اندر گاڑی لے کر نہیں جاتی۔'' عکس نے جواباً ان سے کہا تھا۔

سسٹر ایگنس اس کے منع کرنے کے باوجود اسے پارکنگ تک چھوڑنے آئی تھیں اور پارکنگ میں اسے رخصت کرتے ہوئے انہوں نے عکس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ''I am very proud of you''
عکس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔ وہ مؤدب انداز میں ان کی بات سننے لگی۔

''میری خواہش ہے کہ تم اپنے اصولوں اور ویلیوز کو ہمیشہ اسی طرح رکھنا That is your real strength''

''I will'' وہ کہہ کر مسکرائی اور اس نے سسٹر ایگنس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ سسٹر ایگنس نے اسے اپنی سیاہ اسٹاف کار کی طرف بڑھتے دیکھا۔ جس کا ڈرائیور اب اس کے لیے دروازہ کھولے مستعد انداز میں کھڑا تھا۔ اس کے اندر بیٹھتے ہی اس کے سیکورٹی گارڈ نے ڈرائیور کی طرح اس کے برابر والی سیٹ سنبھال لی تھی۔ اس کی اسٹاف کار کے عقب میں موجود پولیس موبائل بھی حرکت میں آ گئی تھی۔ سسٹر ایگنس وہیں کھڑی اس کی گاڑی کو

پارکنگ سے سڑک اور پھر سڑک سے موڑ مڑ کر غائب ہوتے دیکھتی رہیں۔ یہ وہ تعظیم تھی جو وہ ایک ڈپٹی کمشنر کی کار کو نہیں دے رہی تھیں، نہ DC عکس مراد علی کو...... یہ وہ تعظیم تھی جو وہ انسانی ہمت، حوصلے، ثابت قدمی کی اس چھوٹی سی کہانی کو دے رہی تھیں جس کی ایک چشم دید گواہ وہ بھی تھیں۔ ایک چھوٹا سا کردار اس کہانی میں ان کا بھی تھا اور انہیں فخر ہوا تھا، واقعی فخر ہوا تھا۔

انہوں نے جس سُبک قدم، باوقار لڑکی کو سبز نمبر پلیٹ والی سرکاری گاڑی پر پولیس escort اور پروٹوکول کے ساتھ کچھ دیر پہلے وہاں سے جاتے دیکھا تھا اسے ایک ننھی بچی کے روپ میں اپنے نانا کی ایک پرانی سائیکل پر بیٹھے سردی، گرمی، برسات، خزاں، بہار کے ہر موسم میں وہاں اس سڑک پر آتے دیکھا تھا...... کئی بار...... اور بار بار...... چلچلاتی دھوپ میں پسینے میں شرابور سرخ چہرے کے ساتھ...... کہر آلود سردی میں خنکی سے یخ بستہ سرخ ناک اور سرخ گالوں کے ساتھ ٹھٹھرتے کانپتے...... اس پرانی سائیکل سے اس سرکاری گاڑی کا سفر اس انتخاب کا نتیجہ تھا جو انسان مصائب کے پہاڑ کے سامنے کانپتے پیروں پر کھڑے رہنے یا گھٹنوں پر گر جانے کی شکل میں کرتا ہے۔ سسٹر ایگنس کے پاس آج اپنے لیکچرز میں quote کرنے والی ایک اور مثال آگئی تھی۔

☆☆☆

بختیار اور منزّہ، شرمین اور شہر بانو کو کسی طرح واپس لے آنے پر تو کامیاب نہیں ہو سکے لیکن شہر بانو divorce کے لیے کیس فائل کرنے سے پہلے شیر دل سے فون پر بات کرنے پر تیار ہوگئی تھی۔ شیر دل کو تب تک شہر بانو کے حوالے سے کوئی خوش فہمی باقی نہیں رہی تھی۔ وہ اب اس سے بدترین سے بدترین حماقت کی بھی توقع کر رہا تھا اور بختیار سے یہ سن کر اُسے اس توقع کے باوجود شاک لگا تھا کہ وہ divorce کے لیے کیس فائل کرنے کا طے کر چکی تھی۔ کسی بھی پُرسکون شادی شدہ زندگی گزارنے والے مرد کو ان حالات میں اسی طرح کی کیفیات سے گزرنا پڑتا۔ شہر بانو سے وہ گفتگو اس کی شادی شدہ زندگی کو بچانے کا جیسے ایک آخری موقع تھا شیر دل کے لیے اور اس نے اپنے دل و دماغ کو ایک عجیب حالت میں پایا تھا۔ اسے شہر بانو کو اپنی زندگی میں دوبارہ واپس لانے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ محبت اور اعتماد نام کا وہ رشتہ جس میں وہ اتنے سالوں سے جُڑے ہوئے تھے وہ اتنی بُری طرح سے اور اتنی جگہوں سے ٹوٹا تھا کہ اب کم از کم شیر دل کو اس کو پھر سے جوڑ لینے کی کوئی خواہش نہیں تھی یا کم از کم فی الحال نہیں تھی لیکن اس کی مجبوری اور کمزوری وہ اولاد تھی جو شہر بانو کے پاس تھی۔ مثال اس کے پاس نہ ہوتی تو شیر دل، شہر بانو سے لاکھ محبت رکھنے کے باوجود بھی اس طرح کے حالات میں اس سے علیحدگی اختیار کرنے میں چند دن بھی نہ لگاتا۔

''اس سے بہت تحمل سے بات کرنا، وہ اس وقت عقل سے پیدل ہو رہی ہے لیکن تم سمجھ دار ہو، اس کا اتنا نقصان نہیں ہونا جتنا تمہارا ہوگا۔'' بختیار نے اسے شہر بانو سے بات کرنے سے پہلے بہت سمجھایا تھا۔ وہ شیر دل کی ذہنی وجذباتی کیفیت کو ایک باپ کے طور پر سمجھتے تھے۔ شیر دل نے انہیں کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ اس سے یہ سب نہ بھی کہہ رہے ہوتے تب بھی اسے پتا تھا نقصان کس کا ہو رہا تھا اور کس کا ہونے والا تھا۔

دوسرے دن بالآخر اس کی اور شہر بانو کی بات ہوگئی تھی۔ فون پر اس کی آواز سنتے ہی شیر دل کا خون کھولنے لگا تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی بات پر غصہ کرنے والا مرد نہیں تھا، نہ ہی انا اور خود پرستی کا مارا ہوا تھا لیکن اس

کے باوجود شہر بانو کے سامنے اسے ایک عجیب سی تضحیک اور ذلت کا احساس ہو رہا تھا اور تضحیک کے اس احساس کے ساتھ اس کے ساتھ نارمل، خوشگوار انداز میں بات کرنا بے حد مشکل تھا...... ہیلو کے تبادلے کے بعد کچھ دیر خاموشی رہی تھی۔ دونوں میں سے کسی نے ایک دوسرے سے حال احوال نہیں پوچھا تھا۔ بات کہاں سے شروع کی جائے یہ شیر دل کا مسئلہ تھا شہر بانو کا نہیں کیونکہ اسے شیر دل سے کچھ نہیں کہنا تھا نہ ہی مصالحت کی کوشش کرنی تھی۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی۔ اس فیصلے کو بدلنے کی کوشش کرنا شیر دل کی ذمے داری تھی۔ مرد کے لیے عورت کے سامنے جُھکنا ایک بہت مشکل کام ہوتا ہے اور خاص طور پر تب؛ جب غلطی عورت کی ہو اور جُھکنا پھر بھی مرد کو پڑ رہا ہو۔ یہ جیسے اس کے لیے کٹ مرنے کا مقام ہوتا ہے اور شیر دل کے سامنے آزمائش کا یہ پہاڑ لا کر کھڑا کر دیا گیا تھا۔

''شہر بانو میں patch up چاہتا ہوں جو بھی کچھ ہوا۔ Let's get over with it...... تم اگر چاہتی ہو کہ میں معذرت کروں...... تو میں، وہ کرنے پر بھی تیار ہوں لیکن واپس آجاؤ، ہم ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر یہ مسئلہ حل کر سکتے ہیں۔'' شیر دل نے زندگی میں کبھی تھوک کر نہیں چاٹا تھا اور اب اُسے چاٹنا پڑ رہا تھا۔ یہ چند جملے زبان سے ادا کرنے کے لیے اس نے جیسے اپنی انا اور عزتِ نفس نام کی چیزوں کا گلا گھونٹ دیا تھا۔

''کون سا مسئلہ؟'' ریسیور پر اس نے شہر بانو کو بے حد سرد مہری سے کہتے سنا۔ اس کی آواز میں کوئی شناسائی تھی نہ کوئی پچھتاوا۔ وہ اس سے یوں بات کر رہی تھی جیسے زندگی میں پہلی بار ایک شیر دل نام کے آدمی سے بات کر رہی ہو۔ ''تمہارے اور میرے بیچ کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں اور اگر کبھی تھا بھی تو ختم ہو چکا ہے۔ تم ایک اچھے لائف پارٹنر بننے کے قابل ہی نہیں تھے۔ میں نے تمہارا انتخاب کر کے غلطی کی اور اب وہ غلطی ٹھیک کرنا چاہتی ہوں۔'' اس نے شیر دل کے کہنے کے لیے جیسے کچھ چھوڑا ہی نہیں تھا۔ ایک کے بعد ایک جوتا اس کے منہ پر مارا تھا۔ اس نے پھر بھی ڈھیٹ بن کر اس سے کہا۔

''میں جانتا ہوں تم مجھ سے خفا ہو اور......'' شہر بانو نے بے حد تلخی سے اس کی بات کاٹ دی۔

''خفا؟...... میں تم سے خفا نہیں ہوں میں صرف اپنے آپ سے خفا ہوں، تمہارے ہاتھوں بے وقوف بننے کی وجہ سے...... اتنے سال تمہیں ایک وفادار شوہر سمجھنے کی وجہ سے۔'' شیر دل نے اس کی بات یک دم کاٹ دی۔

''میں تم سے ہمیشہ وفادار رہا ہوں شہر بانو...... اور مجھے اس حوالے سے کوئی احساسِ جُرم نہیں ہے۔'' شیر دل نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''ہاں، تمہیں کیوں کوئی احساسِ جُرم ہوگا۔ عکس مراد علی جیسی عورتوں کے ساتھ افیئر چلاتے ہوئے احساسِ جرم تھوڑی رکھتے ہیں۔ وہ تو فخر اور اعزاز کی بات ہوتی ہے۔''

''شہر بانو، عکس میری زندگی کا حصہ نہیں ہے، بہتر ہے تم اس پر بات نہ کرو...... تم اور مثال میری زندگی کا حصہ ہو۔'' شیر دل نے تحمل کا مظاہرہ کیا۔

''ہم تھے، اب نہیں ہیں۔'' اس نے شیر دل کو بات مکمل کرنے نہیں دی۔ ''میں نے تمہارے لیے وہ انتخاب آسان کر دیا ہے جو تم خود نہیں کر پا رہے تھے۔ تم مجھ سے نہیں، عکس سے محبت کرتے ہو وہ matter

کرتی ہے تمہارے لیے...... اس لیے تمہیں اس کے ساتھ رہنا چاہیے۔'' شہر بانو کے مؤقف میں اب بھی ذرا برابر تبدیلی نہیں آئی۔ شیر دل کو لگا وہ جیسے کسی پتھر سے سر پھوڑ رہا تھا۔ کچھ دیر وہ ہونٹ بھینچے بیٹھا رہا پھر اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے، تم اگر میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں تو میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا لیکن تم مثال کو اس طرح باہر نہیں لے جاسکتیں۔'' اس کے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی وہ غصہ جھلکنے لگا تھا جو وہ اپنے اندر دبائے پھر رہا تھا۔

''میں مثال کو اپنے ساتھ لا چکی ہوں اور میرا اسے واپس لانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' شہر بانو نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''تم بچے کی کسٹڈی شادی کے وقت مجھے لکھ کر دے چکے ہو۔''

''میں نے کسٹڈی تمہیں دی ہے، یہ نہیں کہا تھا کہ تم اسے اس طرح لے جاؤ اور پھر اس سے ملنے کے لیے مجھے تنگ کرو۔'' شیر دل نے دُرشتگی سے کہا۔ وہ اسے کہنا چاہتا تھا کہ وہ شادی کے وقت ان دو شرائط کو ماننے پر اب بُری طرح پچھتا رہا تھا۔

''میں چاہتی ہوں تم ہم دونوں کے بوجھ سے آزاد ہو جاؤ اور عکس کے ساتھ خوشی خوشی زندگی گزارو۔''

''شہر بانو میں شہباز حسین نہیں ہوں، میں مثال کو اس طرح کہیں رہنے نہیں دوں گا۔'' شیر دل نے ایک بار پھر اس کی گفتگو میں عکس کے حوالے سے کیے جانے والے طنز کو نظر انداز کیا تھا۔

''مثال تم سے نہیں ملنا چاہتی اور وہ تمہارے بغیر میرے ساتھ بہت خوش رہے گی۔'' شہر بانو نے بھی اسی سرد مہری سے کہا۔ وہ ایک موہوم آس جو اسے اِس حوالے سے تھی کہ وہ محبت کی بات کرے گا اسے اپنے تعلق کے حوالے سے واپس بلائے گا۔ اس سے کہے گا کہ وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا وہ پوری نہیں ہوئی تھی۔ شیر دل کے لہجے میں کہیں وہ حلاوت، وہ محبت، وہ طلب نہیں تھی جس پر وہ قربان ہو جاتی تھی۔

بالکل اس لمحے جب شیر دل اس سے کچھ کہنے لگا تھا اس نے شہر بانو کے ریسیور پر دور سے مثال کی آواز سُنی وہ شہر بانو سے پوچھ رہی تھی کہ کیا وہ شیر دل سے بات کر رہی تھی۔ اس کی آواز پر شیر دل بے اختیار بے تابی سے اپنا غصہ بھُول کر بولا۔

''میری بات کرواؤ اس سے۔''

''نہیں، میں تمہارے پاپا سے بات نہیں کر رہی، تم باہر جا کر کھیلو۔'' شہر بانو نے شیر دل کی بات کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے اس سے کہا۔

''میں تم سے کہہ رہا ہوں اس سے میری بات کرواؤ۔'' شیر دل اس بار اپنی آواز پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔

''میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں نہیں کرواؤں گی۔'' شہر بانو نے اُسی اکھڑ انداز میں کہا تھا۔ شیر دل اس کے انکار پر ہتھے سے اُکھڑ گیا۔ اس نے بلند آواز میں چِلّاتے ہوئے شہر بانو کو زندگی میں پہلی بار گالیاں دینا اور بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا تھا...... شہر بانو ریسیور ہاتھ میں لیے فق چہرے کے ساتھ بے یقینی کے عالم میں شیر دل کی گالیاں سنتی رہی۔ وہ اس مرد کو نہیں پہچانتی تھی جس کی آواز وہ فون پر اس وقت سن رہی تھی، گالی تو دور کی بات اس نے کبھی شیر دل کی بلند آواز تک نہیں سنی تھی۔ ڈانٹ ڈپٹ، خفگی نام کی ہر چیز سے ایک شیر دل نے اسے کبھی آشنا کیا ہی نہیں تھا اور اب وہ اس کے لیے وہ سارے الفاظ استعمال کر رہا تھا صرف اس لیے کیونکہ وہ

ایک عورت ہے...... بلکہ اسے اس وقت بھی عکس ہی کا خیال آیا تھا، وہ اب بھی یہ ماننے پر تیار نہیں تھی کہ وہ بہت جذباتی ہو کر سوچ رہی تھی اور شیر دل کا ردِّعمل اس کی غلطیوں کا نتیجہ تھا۔ آنسوؤں سے بھری آنکھوں کے ساتھ اس نے فون بند کر دیا تھا۔ پھر شیر دل کی بار بار آنے والی کالز کو بھی اس نے ریسیو نہیں کیا تھا۔ اس کے اور شیر دل کے بیچ اس دن کچھ باقی نہیں بچا تھا یا کم از کم شہر بانو کو یہی لگا تھا۔

☆☆☆

عکس بے یقینی سے خیر دین کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔ یوں جیسے اس کو یقین ہی نہ آ رہا ہو کہ یہ سب کچھ اس نے خیر دین کے منہ سے سنا تھا۔

''نانا یہ سب آپ سے شہر بانو کی ممی نے کہا؟'' اسے جیسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ شرمین امریکا سے کال کر کے خیر دین سے اس کے اور شیر دل کے حوالے سے بات کریں گی لیکن ایسا ہو چکا تھا۔ انہوں نے نمبر کہاں سے لیا تھا؟ اور یہ مشورہ کس کا تھا...... اس سے بھی بڑا سوال عکس کے لیے یہ تھا کہ انہوں نے اس کی ضرورت کیسے محسوس کی تھی۔ خیر دین بھی اسی کی طرح رنجیدگی اور صدمے کا شکار تھا اور اس کے ساتھ ساتھ حواس باختگی کا بھی...... چڑیا پہلی بار ان کے لیے کسی کے سامنے رُسوائی اور ندامت کا باعث بنی تھی۔ وہ بھی کس کے سامنے شہباز حسین کی سابقہ بیوی کے سامنے...... اور کس چیز کے لیے...... بھرے بازار میں جیسے ایک بار پھر کسی نے اس کی ریڑھی اُلٹا دی تھی۔ اور کچھ ویسی ہی حالت عکس کی ہو رہی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے نانا کے سامنے کبھی کوئی اس کی ایسی شکایت کرے گا اور اسے صفائی دینی پڑے گی۔

''نانا ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں شہر بانو کی ممی سے خود بات کر لوں گی۔ انہیں اور شہر بانو کو غلط فہمی ہو رہی ہے اور اس کی وجہ اس کیس پر شیر دل کی حمایت ہے اور کوئی بات نہیں ہے۔'' اس نے بالآخر خیر دین کو تسلی دینے کی کوشش کی تھی لیکن اس وقت وہ مکمل طور پر حواس باختہ تھی۔

''جواد کے گھر والوں نے شیر دل کی وجہ سے رشتہ ختم کیا تھا؟'' خیر دین نے اس کے سر پر جیسے ایک اور بم پھوڑا۔ پتا نہیں خیر دین آج کتنے انکشافات کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ وہ ایک بار پھر لفظ ڈھونڈنے کی جدوجہد کرنے لگی۔

''آپ سے کس نے کہا؟'' اس نے بہ مشکل خیر دین سے پوچھا۔

''شہر بانو کی ممی نے ہی بتایا۔'' عکس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ندامت سی ندامت تھی وہ امریکا میں بیٹھے ہوئے بھی سب کچھ جانتی تھیں۔

''نانا میں شیر دل سے محبت کرتی ہوں، میں زندگی میں ایک شیر دل سے زیادہ کسی کو نہیں چاہ سکتی لیکن مجھے اس کی زندگی کا ساتھی بننے کی تمنا نہیں ہے۔ یہ ایک خواب میں نے کبھی نہیں دیکھا۔'' اس کی آواز نہ چاہتے ہوئے بھی بھرّا گئی تھی۔ ''میں نے اس سے تب بھی شادی نہیں کی جب وہ غیر شادی شدہ تھا تو اب اس کا گھر توڑ کر اسے حاصل کرنے کی کوشش کیوں کروں گی میں......؟ میں نے آپ سے یہ نہیں سیکھا...... میں شہباز کا کوئی بدلہ شہر بانو سے نہیں لوں گی، نہ ہی آپ ایسا سوچیں، اس نے اپنے اعتراف سے خیر دین کو ششدر کر دیا تھا۔ اسے عکس سے اس اعتراف کی توقع تھی نہ اس کے اس طرح کمزور پڑنے کی۔

''میں شیر دل کو بُلوا کر اس سے بات کروں گا۔'' خیر دین کو خود سمجھ نہیں آئی کہ اس کے منہ سے یہ جملہ کیوں

نکلا تھا۔ وہ آخر شیر دل کو بُلوا کر اس سے کیا بات کر سکتا تھا۔

"نانا آپ اس سے کچھ بات نہیں کریں گے، نہ ہی اس سے کوئی شکایت کریں گے۔ وہ پہلے ہی بہت پریشان ہے۔ میں نہیں چاہتی اس کے لیے مزید شرمندگی کا کوئی ذریعہ بنے آپ کی کوئی شکایت یا بات......" عکس نے فوری طور پر خیر دین سے اختلاف کیا تھا۔

خیر دین بہت دیر چُپ چاپ اسے دیکھتا رہا پھر اس نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔ "تم پر بداعتمادی یا بے یقینی کا کوئی سوال ہی نہیں ہے میرے لیے چڑیا...... میں تم پر اندھا اعتماد کرتا ہوں لیکن اندھا نہیں ہو سکتا۔ شہر بانو کی ماں ایک اچھی عورت ہے۔ بہت احسانات ہیں اس کے ہم پر۔" عکس چُپ چاپ خیر دین کی بات سننے لگی۔ اس نے ساری زندگی خیر دین کو لوگوں کے احسانات گنواتے دیکھا تھا اور احسان فراموشی کو چُھپاتے۔ وہ اب بھی سننا چاہتی تھی کہ اس کے پاس شہر بانو کی ماں کے حوالے سے گنوانے کے لیے کون سے احسانات تھے۔

☆☆☆

شرمین کو بالکل توقع نہیں تھی کہ عکس انہیں خود کال کر سکتی ہے۔ بالکل اس طرح جیسے عکس کو اس کی خیر دین کو کال کی توقع نہیں تھی۔ کہیں نہ کہیں انہیں بھی یہی توقع تھی کہ وہ کبھی اتنی ہمت نہیں کر پائے گی کہ اس ایشو پر بات کرنے کے لیے انہیں بھی کال کرتی لیکن اس نے کر دی تھی۔

چند سیکنڈز کے لیے فون پر اس کا نام سننے پر انہیں سمجھ نہیں آیا تھا کہ وہ فون بند کریں' اس کی بات سننے سے انکار کریں یا اپنی بیٹی کی ازدواجی زندگی تباہ کرنے پر اس پر چلّائیں۔

"ہیلو۔" عکس نے انہیں اس طرح خاموش پانے پر بے ساختہ ان کی لائن پر موجودگی چیک کی تھی۔

"میں سُن رہی ہوں۔" شرمین نے بے حد سرد مہری کے ساتھ کہا۔ زندگی میں انہوں نے اپنے آپ کو اس سے زیادہ آکورڈ سچویشن میں کبھی نہیں پایا تھا۔

"مسز فاروق آپ کو میرے اور شیر دل کے حوالے سے جو غلط فہمی ہے، میں اسے کلیئر کرنا چاہتی ہوں۔" عکس نے کسی تمہید کے بغیر کہا تھا۔ "شیر دل ایک دوست ہے اور بیچ میٹ ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔" شرمین نے بے حد خفگی سے اس کی بات کاٹی تھی۔

"کولیگ اور بیچ میٹ... آدھی رات کو ایک دوسرے کے بیڈروم میں نہیں پائے جاتے۔" عکس سے بات نہیں ہو سکی۔ وہ اس پر بڑا سنگین الزام لگا رہی تھیں لیکن کس طرح۔

"میں آپ کی بات نہیں سمجھی۔" اس نے جیسے اپنے اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے ان سے کہا۔

"میں کیا کہہ رہی ہوں تم بہت اچھی طرح جانتی ہو۔ پچھلی بار جب تم سے میری بات ہوئی تھی تو کہاں تھی تم؟ کس کے فون پر تم نے مجھ سے بات کی تھی اور رات کے کس وقت کی تھی؟ تم سنگاپور میں شیر دل کے بیڈروم میں اس کے فون سے بات کر رہی تھیں اور تم مجھے کہہ رہی ہو کہ مجھے غلط فہمی ہوئی ہے، تمہاری یادداشت کمزور ہو گی میری نہیں۔" ایک زلزلہ وہ تھا جو ریسیور کے دوسری طرف موجود عکس نے اپنے گرد آتا محسوس کیا تھا اور دوسرا زلزلہ وہ تھا جو دروازے میں کھڑی شرمین کی باتیں سنتی ہوئی شہر بانو کے اندر آیا تھا۔ شرمین نے ایک بار بھی عکس کا نام نہیں لیا تھا لیکن وہ سیکنڈز میں ان کی مخاطب کو بُوجھ گئی تھی اور گفتگو کی نوعیت سننے کے بعد اسے لگا

تھا کہ وہ وہیں گر جائے گی۔ اس کے پاؤں یک دم جیسے مَن مَن بھر کے ہو گئے تھے۔ وہ شیر دل پر مسلسل عکس کے ساتھ افیئر کا الزام لگا رہی تھی۔ اس سے محبت کرنے پر اسے معتوب ٹھہرا رہی تھی لیکن وہ یہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ شیر دل اور عکس کا رشتہ کبھی ان حدوں کو چھو سکتا تھا۔ شیر دل اتنا گر سکتا تھا۔

شرمین کو آخری جملہ بولتے بولتے کمرے میں کسی اور کی موجودگی کا احساس ہوا تھا لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ گردن موڑنے پر انہیں کُھلے دروازے میں کھڑی شہر بانو نظر آئی تھی جس کا چہرہ اس طرح فق تھا جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے شرمین بھی فریز ہو گئیں پھر انہوں نے عکس سے کچھ بھی کہے بغیر لائن ڈسکنکٹ کر کے فون آف کر دیا تھا۔ انہوں نے شہر بانو کو سہارا لے کر کمرے کے دروازے کے ساتھ والی دیوار کے پاس پڑے صوفے پر بیٹھتے دیکھا۔ وہ جیسے خود کو گرنے سے بچا رہی تھی۔ شرمین سب کچھ چھوڑ کر بے اختیار لپک کر اس کے پاس آئی تھیں۔ اس کے پاس صوفے پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا، وہ بے حد سرد ہو رہا تھا۔

"تم ٹھیک ہو؟" شرمین نے بے ساختہ اس کے سرد پڑتے ہوئے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

"آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا یہ؟" اس نے جواباً جیسے بہ مشکل شرمین سے کہا تھا اس کی آواز جیسے کسی کھائی سے آ رہی تھی۔ وہ ماں کی طرف دیکھ بھی نہیں پا رہی تھی۔

"میں تمہیں اس تکلیف سے بچانا چاہتی تھی۔" شرمین نے رنج کے عالم میں اس سے کہا۔ "میں تمہارا وہ گھر بچانا چاہتی تھی جو تم نے بنایا تھا جس پر تمہیں اتنا ناز تھا۔" وہ اس کا مذاق نہیں اُڑا رہی تھیں لیکن شہر بانو کو یونہی لگا تھا جیسے شرمین نے ہنستے ہوئے اس کا مذاق اُڑایا تھا، جیسے ساری دنیا ہنستے ہوئے اس سے کہہ رہی تھی۔

"میں تمہارا وہ گھر بچانا چاہتی تھی جو تم نے بنایا تھا۔ جس پر تمہیں اتنا مان تھا۔" گھر...... کون سا گھر؟...... مان......کون سا مان؟...... رشتہ کون سا رشتہ......؟ اعتبار......کون سا اعتبار۔

کُھلے دروازے سے مثال اندر آئی تھی۔ ایک ٹیڈی بیئر ہاتھ میں پکڑے...... ماں اور شرمین کی کیفیت سے بے خبر...... اور اس نے اندر آتے ہی ہمیشہ کی طرح وہی ایک بات کہی تھی جو وہ صبح شام سیکڑوں بار دُہراتی تھی۔

"ممی مجھے پاپا کے پاس جانا ہے، میں ان کو مِس کر رہی ہوں۔" شہر بانو نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، پھر اس نے کہا۔

"تمہارے پاپا مر چکے ہیں۔" مثال نے عجیب خوف اور بے یقینی سے ماں کو دیکھا تھا۔ پھر شرمین کو......

☆☆☆

ایک زلزلے کی لپیٹ میں آئے ہوئے شخص کی طرح عکس نے شرمین کے فون بند کر دینے کے بعد بھی کئی بار اسے کال ملانے کی کوشش کی تھی۔ صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ اسے پہلی بار اب ہوا تھا اور ساتھ شیر دل کی پریشانی کا بھی...... وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ کسی بھی طرح سے کسی کی ازدواجی زندگی میں آنے والے بھونچال کا ذمے دار قرار دی جا سکتی تھی اور وہ بھی شیر دل کی زندگی میں......

اسے اندازہ نہیں تھا کہ شرمین نے خیر دین سے کیا کہا تھا...... کیا یہ سنگین اور گھٹیا الزام انہوں نے نانا کے

سامنے بھی دُہرایا تھا؟ اسے جیسے شرم آئی تھی لیکن اگر خیر دین سے شرمین نے ایسی کوئی بات کی ہوتی تو وہ اس کے بارے میں بھی پوچھتا۔ وہ جیسے مکڑی کے جالے کے تار میں اُلجھی لٹک رہی تھی، زندگی میں پہلی بار اس نے کسی سے اس طرح کی مدد لی تھی اور وہ مدد اب اس کے حلق میں ہڈی بن کر اٹک گئی تھی۔ وہ اب بُری طرح پچھتا رہی تھی کہ اس نے شیر دل کا فون استعمال کیوں کیا...... کرلیا تھا تو شرمین کی کال کیوں لی...... لیکن بعض دفعہ بدقسمتی انسان سے وہ کام کروا رہی ہوتی ہے جو وہ عام حالات میں کبھی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔

اس دن اس نے ایک بار پھر شیر دل سے رابطہ کرنے کی سرتوڑ کوشش کی تھی اور ایک بار پھر ناکام رہی تھی۔ اس کا سیل فون ہمیشہ کی طرح بند تھا اور اس کے والدین کی لاہور کی رہائش گاہ سے اس کے ''غیر موجود'' ہونے کی خبر کے علاوہ کوئی جواب نہیں آرہا تھا۔ عکس کو اب اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ اسے نظر انداز کررہا تھا اور اسے ہی نہیں شاید ساری دنیا کو نظر انداز کررہا تھا کیونکہ اس کی ازدواجی زندگی میں ہونے والے سارے مسئلے اس کی وجہ سے ہوئے تھے۔ شاید وہ یہ سمجھ رہا ہو کہ اس سے رابطہ مستقل طور پر منقطع رکھ کر وہ اس مسئلے کا حل نکال سکتا تھا۔

وہ ایک کے بعد ایک توجیہہ پیش کرتی اور اسے رد کرتی رہی پھر اس نے جیسے خود بھی یہی طے کیا تھا کہ وہ شیر دل سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کرے گی۔ اگر اس کو لگتا تھا کہ وہ اس کی مدد کے بغیر اس مسئلے کا حل نکال سکتا تھا تو پھر اسے شیر دل کو یہ کام کرنے دینا چاہیے تھا۔

''نانا آپ سجاد سے میری شادی طے کردیں۔'' شرمین سے ہونے والی گفتگو کے تیسرے دن رات کے کھانے کے بعد اس نے خیر دین سے کہا تھا۔ حلیمہ اگلے ویک اینڈ پر پاکستان سے واپس جارہی تھی اور اس نے اپنی سسرال سے فون کرکے اس صبح عکس سے سجاد کے سلسلے میں دوبارہ بات کی تھی۔ خیر دین اس کی بات پر حیران ہوگیا تھا۔

''لیکن تم تو پہلے ملنا چاہتی تھیں اس سے۔''

''ہاں لیکن اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ امی مل چکی ہیں اس سے...... آپ بھی مل لیں۔ اس کی فیملی ایک فنکشن میں مجھ سے مل چکی ہے۔ ہم دونوں کی ایک ملاقات کی اب زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ اگر آپ کو وہ ٹھیک لگتا ہے تو بس کافی ہے۔'' وہ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہی تھی اور اس کی یہ سنجیدگی خیر دین کو جیسے ہضم نہیں ہورہی تھی۔ شادی کے لیے اس طرح فوری طور پر مان جانا...... اور وہ بھی لڑکے سے ملے بغیر جبکہ اس سے پہلے وہ ہمیشہ ملے بغیر کسی بھی لڑکے سے شادی کے خلاف تھی اور خیر دین کو بھی ہمیشہ یہی مناسب لگا تھا کہ وہ لڑکے سے خود مل لے اگر اسے مناسب لگتا پھر ہی وہ لوگ بات آگے بڑھاتے۔

خیر دین نے اس سے وجہ پوچھنے پر اصرار نہیں کیا تھا۔ انہیں لگا تھا وہ شیر دل کے معاملے کی وجہ سے شادی میں جلدی کرنا چاہتی تھی۔ شرمین کے حوالے سے بھی ان دونوں کے درمیان اس ایک گفتگو کے علاوہ کوئی اور گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ عکس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ خیر دین سے شرمین کے ساتھ ہونے والی گفتگو کی تفصیلات جاننے پر اصرار کرتی، نہ ہی شرمین کے ساتھ ہونے والی اپنی گفتگو کو وہ خیر دین کے سامنے دُہرا سکتی تھی لیکن اسے یہ احساس ہوا تھا کہ شرمین نے شاید خیر دین سے اس واقعے کا ذکر کیے بغیر اس پر الزامات لگائے تھے اور اگر انہوں نے ایسا کیا تھا تو وہ اس کے لیے شرمین کی بہت احسان مند تھی اور احسان مندی کی بعض شکلیں مذاق سے کم

نہیں لگتیں۔

اگلے چند دنوں میں خیر دین نے سجاد کی فیملی کو بُلوا کر عکس کے نہ چاہنے کے باوجود اس کی اور سجاد کی ملاقات کروادی تھی۔ وہ ایک مناسب شکل صورت کا ایک اچھا قابل ڈاکٹر تھا اور اچھا بیک گراؤنڈ تھا اس کا......

عکس اور اسے دونوں کو اپنے پانچ سالہ دورِ تعلیم کے دوران کسی آمنے سامنے کی کوئی یادیں نہیں تھیں لیکن سجاد پھر بھی کلاس کی بہترین اسٹوڈنٹ کے طور پر اسے بہت اچھی طرح یاد رکھے ہوئے تھا اور اس حوالے سے اس کے لیے اچھی فیلنگز رکھتا تھا...... ایک اور مشکل مرحلہ آیا تھا اور ایک اور مشکل مرحلہ طے کرلیا تھا اس نے۔ اس بار منگنی کی کوئی باقاعدہ رسم نہیں کی گئی تھی صرف بات طے کرکے چند مہینوں بعد سجاد کے پاکستان کے اگلے وزٹ پر شادی کی تاریخ طے کردی گئی تھی۔

وہ جواد سے رشتہ طے ہوتے ہوئے خوش تھی لیکن سجاد سے نسبت طے ہوتے ہوئے اس نے ایک عجیب سی بے حسی محسوس کی تھی یوں جیسے یہ کوئی آفیشل ورک تھا...... اس کی زندگی کا اہم ترین فیصلہ نہیں تھا۔ وہ ناخوش نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ سب کچھ اس کی مرضی سے ہو رہا تھا لیکن وہ خوش بھی نہیں تھی یا کم از کم خوشی نام کی اس شے کو محسوس نہیں کرپارہی تھی جسے وہ محسوس کرنا چاہتی تھی۔ اور وہ اس کی ''وجہ'' جانتی تھی لیکن وہ اس وجہ کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتی تھی......

اگلے چند ہفتوں میں اسے شیر دل کی چُھٹی بڑھ جانے کا پتا چل گیا تھا۔ وہ اب چھ ماہ کے لیے چھٹی پر چلا گیا تھا اور اس کی سیٹ پر کسی اور کو تعینات کردیا گیا تھا۔ وہ اس سے بے نیاز رہنے کی کوشش کرنے کے باوجود بے نیاز نہیں رہ سکی تھی...... بے چینی اور اضطراب میں اس نے ایک بار پھر اس سے رابطے کی کوششیں شروع کردی تھیں اور ایک بار پھر ناکام رہی تھی۔ اس کے سیل فونز آف تھے اور یہ ایک تشویشناک بات تھی...... کوئی بھی مہینوں اپنے سیل فون آف نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ اپنے کسی بیچ میٹ سے رابطے میں نہیں تھا۔ اس نے چند بار اس کے والدین کے گھر پر خود فون کیا تھا لیکن ہر بار اسے یہی پتا چلا کہ وہ گھر پر نہیں ہے لیکن وہ کہاں ہے کب آئے گا اس کا اسے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ وہ دونوں اس سے پہلے بھی مہینوں ایک دوسرے سے رابطے میں نہیں رہتے تھے لیکن اس نے ایسا اضطراب اور وحشت کبھی محسوس نہیں کی تھی کیونکہ اسے شیر دل کی خیر خبر ملتی رہتی تھی، وہ کہاں

تھا کیا کر رہا تھا پتا چل جاتا تھا لیکن اب جیسے وہ صفحۂ ہستی سے ہی غائب ہو گیا تھا۔

تقریباً دو ماہ کے بعد بالآخر جیسے اس کی پریشانی دور ہو گئی تھی۔ وہ اس دن بھی شیر دل کے گھر کال کر رہی تھی لیکن ہمیشہ کی طرح فون آپریٹر نے ہی اٹھایا تھا۔ وہ نیا آپریٹر تھا اور اس نے اس کا تعارف لینے کے بعد شیر دل سے اس کی بات کروانے کے بجائے منزّہ کے ساتھ لائن ملا دی تھی۔ وہ منزّہ کی آواز سننے پر چند سیکنڈز عجیب گومگو کے عالم میں رہی جیسے طے نہ کر پا رہی ہو کہ اسے ان سے بات کرنی چاہیے یا نہیں اور پھر اس نے فون بند کر دیا تھا۔ وہ ایک نیا پنڈورا باکس نہیں کھولنا چاہتی تھی۔

چند ہی منٹوں بعد اس کا فون بجنے لگا تھا۔ اس نے فون اٹھا کر دیکھا اور اس کا دل یک دم جیسے خوشی سے اُچھلا تھا۔ وہ شیر دل کے گھر کا نمبر تھا وہاں سے کال بیک ہو رہی تھی یقیناً آپریٹر نے شیر دل کو اس کی کال کے بارے میں اطلاع دی تھی۔

اس نے بہت ایکسائٹمنٹ کے عالم میں فون اٹھایا، آپریٹر نے اسے اطلاع دی تھی کہ منزّہ اس سے بات کرنا چاہ رہی تھیں۔ وہ شش و پنج میں پڑی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ اُن سے بات کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرتی اس نے دوسری طرف سے ان کی آواز سن لی وہ اس بار اس کا نام لے کر اسے مخاطب کر رہی تھیں یعنی وہ جانتی تھیں کہ وہ کس کو کال بیک کروا رہی تھیں۔ اس نے بڑے محتاط سے انداز میں منزّہ سے علیک سلیک کی۔

”میں شیر دل کی خیریت دریافت کرنا چاہتی تھی۔ بہت دنوں سے اس سے بات نہیں ہوئی تھی کچھ آفیشل کام بھی تھا۔“ اس نے چھوٹتے ہی منزّہ کو بتایا اور ساتھ ہی جھوٹ بولنا بھی ضروری سمجھا۔

”شیر دل کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ دوسری طرف سے اسے منزّہ کی آواز بے حد بجھی ہوئی لگی تھی۔

”کیا ہوا؟“ اسے یک دم تشویش ہوئی۔

”نروس بریک ڈاؤن...... بہت زیادہ ڈپریسڈ ہے وہ...... ڈاکٹر نے ریسٹ کے لیے کہا تھا...... بار بار بیمار ہو رہا ہے وہ؟“

عکس تشویش سے سنتی رہی۔

”آپ اس سے میری بات کروا دیں۔“ اس نے اُن کی بات سننے کے بعد کہا۔ اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے انہوں نے کہا۔

”میں نے شیر دل سے کتنی بار کہا ہے کہ تم سے بات کرے یا مل لے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ کسی سے بھی بات نہیں کرتا...... کسی دوست سے نہیں ملتا۔ گھر سے نکلتا ہی نہیں۔ میں پورا ایک مہینہ اس کو ساتھ لے کے مری گزار کر آئی ہوں کہ کچھ بہتر ہو جائے گا لیکن چند دن ٹھیک رہتا ہے پھر دورے پڑنا شروع ہو جاتے ہیں تم اس سے ملنے کے لیے آؤ...... آ کر سمجھاؤ اُسے۔ تم سے تو بہت کلوز تھا۔“

عکس نے ان کی آواز میں اُتری بے بسی محسوس کی۔ وہ عام حالات میں کبھی اس سے مدد نہیں مانگ سکتی تھیں، کبھی اس سے یہ ساری گفتگو نہیں کر سکتی تھیں لیکن شیر دل کی حالت نے منزّہ کو جیسے عجیب خوف اور وسوسوں کا شکار کر دیا تھا۔

”میں آؤں گی اسے دیکھنے۔“ عکس نے ایک لمحے کے تذبذب کے بغیر کہا، کوئی دوسرا جواب اس کے پاس ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

اور اس نے وہاں جانے میں دیر نہیں کی تھی، وہ دوسرے دن آفس سے جلدی فارغ ہونے کے بعد لاہور چلی آئی تھی۔ منزّہ نے خلافِ توقع بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا تھا۔ ان سے گفتگو کے دوران عکس کی تشویش میں اضافہ ہو گیا تھا۔ منزّہ خود بھی شیر دل کی وجہ سے بہت زیادہ ڈپریسڈ تھیں۔ شیر دل کی وجہ سے ان کی سوشل سرگرمیاں تقریباً ختم ہو کر رہ گئی تھیں۔ وہ سائے کی طرح ہر وقت شیر دل کے ساتھ رہتی تھیں۔ انہوں نے شہباز حسین کو اسی Phase سے اسی تکلیف دہ انداز میں گزرتے دیکھا تھا اور وہ اپنی اولاد کو ویسے انجام سے بچانے کے لیے ہلکان ہو رہی تھیں۔ وہ رعونت اور غرور یک دم جیسے کہیں اُڑ گیا تھا جو منزّہ بختیار کی پہچان تھا۔ اس سے گفتگو کے دوران وہ کئی بار بات کرتے کرتے رو پڑی تھیں۔ شیر دل کی بیماری اُن کے اپنے اعصاب کو مفلوج کر رہی تھی اور اس پر ان کی اپنی فیملی کا اس سارے مسئلے کے لئے انہیں موردِ الزام ٹھہرانا اور وہ احساسِ جرم سے فرار کے لیے ڈوبتے کی طرح تنکے ڈھونڈتی پھر رہی تھیں۔ عکس مراد علی بھی ایسا ہی ایک تنکا تھا جس سے وہ اپنے بیٹے کی زندگی بچانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

ان سے بات چیت کے دوران ہی عکس کو یہ پتا چلا کہ شہر بانو اور شیر دل کی طلاق ہو گئی تھی، دونوں فیملیز کے کچھ مشترکہ دوستوں اور رشتے داروں کی لاکھ کوششوں کے باوجود شہر بانو نے طلاق کے لیے کیس فائل کر دیا تھا۔ نکاح نامے میں طلاق کا حق اور بچے کی کسٹڈی کا حق پہلے ہی اسے تفویض کیے جا چکے تھے اس لیے کیس کو اس کے حق میں ختم ہونے میں چند ہفتے لگے تھے۔ وہ بوجھل دل کے ساتھ منزّہ سے یہ سب سنتی رہی۔

تبھی وہ ڈرائنگ روم میں آ گیا تھا اور اس پر پہلی نظر ڈالتے ہی عکس کا دل مزید بوجھل ہو گیا تھا۔ منزّہ نے اس کی بیماری اور تکلیف کے بارے میں کوئی مبالغہ نہیں کیا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں اور کم و بیش پندرہ کلو وزن کی کمی کے بعد کوئی بھی اسے دیکھ کر صحت مند نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس کے گھنے سیاہ بالوں میں اب جگہ جگہ سفید بال دِکھ رہے تھے۔

”تم نے مجھے بتایا ہی نہیں کہ تم آ رہی ہو۔“ اس نے اندر آتے ہی بڑے معمول کے انداز میں مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے کہا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود جواباً مسکرا نہیں سکی۔

”کیسے اطلاع دیتی، تم نے تو فون ہی بند کیے ہوئے ہیں سارے۔“ اس نے عکس کی اس بات کا جواب

نہیں دیا تھا۔ ہاتھ میں پکڑا سگریٹ کا پیکٹ میز پر رکھتے ہوئے وہ خود اس کے ساتھ والے صوفے کے کونے میں بیٹھ گیا تھا۔

''تم لوگ باتیں کرو میں چائے بھجواتی ہوں۔'' منزّہ واضح طور پر انہیں اکیلے باتیں کرنے کا موقع دینا چاہتی تھیں۔

''میرا خیال ہے ہم لوگ باہر کا چکر لگا کر آتے ہیں، مجھے ایک دو کام بھی ہیں وہ بھی کرلوں گی۔'' عکس نے یک دم اٹھتے ہوئے کہا۔

''ہاں، ہاں ضرور بلکہ اچھا ہے شیر دل بھی بہت دنوں سے باہر نہیں نکلا، اسی بہانے اس کی بھی تھوڑی آؤٹنگ ہوجائے گی۔'' منزّہ نے ایک لمحے کا تامل بھی نہیں کیا تھا۔ شیر دل نے حیران اور الجھی نظروں سے ان دونوں کو دیکھا پھر جیسے بادلِ ناخواستہ وہ اٹھ گیا تھا۔

''کیا کام ہیں تمہیں؟'' اس نے گاڑی سڑک پر لاتے ہی عکس سے پوچھا تھا وہ گاڑی خود ڈرائیو کر رہا تھا۔

''تمہیں میری کالز اور میسجز مل رہے تھے نا؟'' عکس نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

''ہاں۔'' شیر دل نے کوئی بہانہ بنائے بغیر کہا۔

''اور تم نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔''

''فائدہ کیا تھا؟'' وہ سڑک کو دیکھتے ہوئے عجیب بے بسی سے بولا۔

''تم نے حالت دیکھی ہے اپنی؟''

''میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے عکس کی بات کاٹی اور گاڑی سڑک کے کنارے روک دی۔

''کیا ہوا؟'' عکس نے کچھ حیران ہوکر اس سے پوچھا۔

''تم ڈرائیو کرو، میں مین روڈ پر ڈرائیو نہیں کرسکتا۔''

''کیوں؟''

''میرا سر چکرانے لگتا ہے بہت ساری گاڑیاں اور ان کی اسپیڈ دیکھ کر دو دفعہ گاڑی مار چکا ہوں اور تم guest ہو میں نہیں چاہتا تمہیں ایمبولینس کی ضرورت پڑے۔'' وہ بات کو خوش دلی سے کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس نے ساتھ ہی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ عکس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے روکا۔

''مین روڈ پر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس کسی چھوٹے موٹے پارک میں چلو۔''

''شام ہو رہی ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔'' وہ چند لمحوں کے لیے ٹھٹکا تھا پھر دروازہ بند کر کے دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

اگلا موڑ مڑتے ہی بچوں کے ایک پلے ایریا کے سامنے اس نے گاڑی روک دی تھی۔

''آنٹی نے مجھے بتایا کہ تمہاری divorce......'' پارک کی ایک بینچ پر آکر بیٹھنے اور چند اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اس نے شیر دل سے کہنے کی کوشش کی۔ شیر دل نے اسے ٹوک دیا۔

''بس اب اس ایشو کے بارے میں بات مت کرنا...... کوئی اور بات کرو۔'' وہ جیسے تکلیف میں کراہا تھا یوں جیسے اس کے ہاتھ سے اس کا کوئی کھرنڈ کھرچا گیا تھا۔ عکس کا دل بُری طرح دُکھا۔

"جاب پہ واپس کیوں نہیں آ رہے؟" اس نے بات بدل دی۔
"آ جاؤں گا۔" اس نے اسی بیزاری سے کہا۔ وہ اب سگریٹ سلگا رہا تھا۔
"ٹینس کیسی چل رہی ہے تمہاری؟" اسے پہلی بار شیر دل کے لیے سوال ڈھونڈتے ہوئے دقت ہو رہی تھی۔
"چھوڑ دی۔" وہ ایک کش لیتے ہوئے ایک جھولے پر جھولتی بچی کو دیکھنے لگا، عکس نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا۔
"تم اتنے کمزور تو نہیں تھے شیر دل۔" عکس نے اس کی توجہ بٹائی۔
"میں سوچ رہا تھا اب تک تمہاری شادی ہو چکی ہو گی...... کافی مہینے گزر چکے ہیں۔" شیر دل نے اس کے سوال کے جواب میں اس سے بات بدل کر کہا۔ "میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے، کیسا ہے جواد؟"
"اگر تم میرے بھی سوالوں کا جواب نہیں دو گے تو میں بھی نہیں دوں گی۔"
"یہ تو بہت اچھا ہے سوال جواب کر کے کیا کرنا ہے ہم نے...... ایسے ہی خاموش بیٹھتے ہیں۔" وہ دوسرا سگریٹ نکالنے کے لیے پیک اٹھانے لگا جب عکس نے ہاتھ بڑھا کر اس سے پہلے پیک اٹھا لیا۔
"مشکل وقت ہے لیکن گزر جائے گا شیر دل۔" وہ اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا پھر اس نے بینچ کی پُشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔
"ہاں گزر جائے گا لیکن فی الحال نہیں گزر رہا۔"
"اس طرح گزارنے سے نہیں گزرے گا، تم جاب پر واپس آؤ۔"
"آ جاؤں گا، ساری زندگی گھر میں بیٹھ کے تو نہیں گزار سکتا میں۔" اس نے بیزاری سے کہتے ہوئے عکس کے ہاتھ سے سگریٹ کا پیک لینے کی کوشش کی۔
"مجھے استھما ہے تم اگر پھر بھی میرے پاس بیٹھ کر اسموکنگ کرنا چاہتے ہو تو لو کرو۔" عکس نے نرمی سے وہ پیک اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ جیسے کچھ دیر پیک ہاتھ میں لیے الجھتا رہا پھر اس نے پیک رکھتے ہوئے کہا۔
"تم جانتی تھیں میرے ساتھ کیا ہوا لیکن تم نے ایک بار بھی مجھے کال کر کے میرا حال پوچھنے کی زحمت نہیں کی۔" وہ بالآخر اپنے دل کا غبار نکالنے لگا تھا۔
"مجھے بہت دیر سے پتا چلا کئی دن بعد۔"
"جھوٹ مت بولو۔" شیر دل نے اسے ٹوکا۔
"تمہارا ذاتی معاملہ تھا یہ اور میں کیسے......"
"shut up" شیر دل نے اس بار پھر اس کی بات کاٹی۔
"تم اس وجہ سے خفا تھے مجھ سے؟" عکس نے بالآخر ایک گہری سانس لے کر کہا۔
"تم نے بھی مجھے چھوڑ دیا تھا...... تمہیں کم از کم مجھ سے پوچھنا تو چاہیے تھا۔"
"میں نے تمہیں کالز اور میسج کیے تھے۔"
"کئی دن بعد آئے تھے وہ میسج۔" اس نے پھر بات کاٹ کر کہا۔
"اور پھر کئی مہینے میں جو کالز اور میسج تمہیں کرتی رہی وہ......" وہ اب ایک دوسرے سے اسی طرح بات کرنے لگے تھے جیسے ہمیشہ کرتے تھے۔ وہ دِقت، دشواری آہستہ آہستہ غائب ہونے لگی تھی۔

"وہ اگلے ماہ شادی کر رہی ہے۔" مدھم آواز میں کہے ہوئے جملے پر عکس نے اس کا چہرہ دیکھا۔ اسے اس "وہ" کے تعارف کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کس کی بات کر رہا تھا۔ وہ اسے یہ بتانے کی ہمت نہیں کر سکی کہ وہ بھی اگلے مہینے شادی کر رہی تھی۔

"کس سے؟"

"کزن ہے ایک اس کا...... داؤد۔"

"میں جانتی ہوں تمہارے لیے بہت تکلیف دہ ہے یہ۔" شیر دل نے اس کی بات کاٹ دی۔

"نہیں، میرے لیے یہ سب تکلیف دہ نہیں ہے، مجھے اس عورت میں دلچسپی نہیں ہے اب...... لیکن میرے لیے تکلیف دہ بات صرف یہ ہے کہ میں مثال سے الگ ہوں، میں اسے دیکھ نہیں پا رہا، اس سے بات نہیں کر سکتا، مجھے اس کا خیال آتا ہے تو میں سو نہیں پاتا۔" وہ بے بسی اور تکلیف سے کہہ رہا تھا۔

"وہ کب تک ایسا کر سکتی ہے...... ابھی غصے میں ہے...... تھوڑا ٹائم دو اُسے...... چند مہینے...... پھر سب کچھ نارمل ہونا شروع ہو جائے گا، پھر وہ اپنی زندگی میں بزی ہو جائے گی پھر اسے احساس ہوگا کہ وہ مثال کو ساری زندگی کے لیے تم سے دور نہیں رکھ سکتی۔" عکس نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

"تب تک مثال مجھے بھول جائے گی۔" شیر دل نے ہونٹ کاٹتے ہوئے بے بسی سے کہا۔

"تم امریکا جا کر اس سے مل آؤ۔"

"میرا ویزا کینسل کر دیا ہے امریکن ایمبیسی نے...... شہر بانو نے میرے خلاف رپورٹ کی ہے کہ میرے امریکا آنے سے اُسے اور مثال کو جان کا خطرہ ہو سکتا ہے۔" وہ تلخی سے ہنسا۔ عکس کچھ دیر بول نہیں سکی۔ وہ اب سمجھ پا رہی تھی کہ اس کا اگر نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا تو بلاوجہ نہیں ہو گیا تھا، شہر بانو کی جذباتیت نے اسے دیوار سے لگا دیا تھا۔

"شہر بانو ایسی نہیں تھی۔ میں حیران ہوں اس نے......" شیر دل نے اس کی بات کاٹ دی۔

"شہر بانو ایسی ہی تھی اور تم یہ بات اچھی طرح جانتی ہو۔ میں نے تمہیں بہت شروع میں بتا دیا تھا کہ وہ بہت جذباتی ہے۔ وہ بہت ناپختہ کار ہے، میری اور اس کی شخصیت میں بہت فرق ہے لیکن تم مجھے مجبور کرتی رہی تھیں۔ وہ کم عمر ہے اس لیے ایسی ہے، وہ ٹھیک ہو جائے گی صرف سپورٹ ملنے کی دیر ہے...... وہ تم سے پاگلوں جیسی محبت کرتی ہے تمہارے ساتھ رہے گی تو یہ چھوٹی موٹی خامیاں چلی جائیں گی۔ اس شادی میں تم نے مجھے پھنسا دیا......" وہ اس پر برسنے لگا تھا۔ وہ چپ چاپ سنتی رہی۔ وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ شہر بانو نے اس کے سارے اندازے اور توقعات غلط ثابت کر دی تھیں۔

☆☆☆

اس رات وہ بہت دیر سے واپس گھر پہنچی تھی۔ خیر دین ہمیشہ کی طرح اس کے انتظار میں جاگ رہا تھا۔

"بہت دیر ہو گئی۔"

"جی نانا۔"

"کیا کام تھا لاہور میں؟" وہ اس غیر متوقع سوال پر خیر دین کی شکل دیکھنے لگی۔ لاہور جانا اس کا معمول تھا اور خیر دین کبھی وہاں کام کی نوعیت اور اس کی مصروفیات کے بارے میں نہیں پوچھتا تھا۔

"شیر دل کی عیادت کے لیے گئی تھی، وہ بیمار ہے۔" اس نے بھی یک دم جیسے خیر دین سے جھوٹ بولنے کا

ارادہ ترک کرتے ہوئے اسے صاف صاف بتایا۔

"کیا ہوا اسے؟" خیر دین چونک گیا تھا۔

"ڈپریسڈ ہے بہت زیادہ...... بہت کمزور ہو گیا ہے۔" وہ مدھم آواز میں کہہ کر اندر چلی گئی۔ خیر دین وہیں کھڑا رہا۔

اپنے بیڈ روم میں آ کر اس نے ابھی اپنا بیگ رکھا ہی تھا کہ اس کا سیل فون بجنے لگا۔ اس نے بیگ میں سے سیل فون نکال کر اسے دیکھا، اس پر شیر دل کا نام چمک رہا تھا۔ اس نے کال ریسیو کی۔

"تم گھر پہنچ گئی ہو؟" علیک سلیک کے بعد اس نے پوچھا تھا۔

"ہاں، ابھی ابھی پہنچی ہوں۔" وہ فون پر بات کرتے ہوئے صوفے پر بیٹھ کر اپنے جوتے اتارنے لگی۔

"آج بہت دیر ہو گئی تمہیں لاہور سے نکلتے ہوئے، مجھے تمہارے جانے کے بعد وقت کا اندازہ ہوا اس لیے فون کر کے پوچھ لیا۔" وہ کہہ رہا تھا۔ وہ واقعی کافی دیر سے لاہور سے نکلی تھی۔ وہ دونوں اسی طرح بے مقصد باتیں کرتے رہے۔ وہیں پارک میں بیٹھے پھر شیر دل ایک قریبی ریسٹورنٹ میں اس کے منع کرنے کے باوجود اسے کھانا کھلانے لے گیا۔ عکس کو اندازہ تھا کہ کھانا کھاتے ہوئے مزید دیر ہو جائے گی اور ایسا ہی ہوا تھا۔

"اینڈ آئی ایم سوری۔" وہ اس کے اگلے جملے پر حیران ہو گئی تھی۔

"یہ کس لیے؟"

"ابھی بیٹھ کے سوچ رہا تھا تو مجھے احساس ہوا تم سے بہت ساری الٹی سیدھی باتیں کہہ دیں میں نے...... جو نہیں کہنی چاہیے تھیں جو کچھ ہوا اس میں تمہارا تو کوئی قصور نہیں تھا۔" وہ اب کچھ نادم سا کہہ رہا تھا۔

"لیکن آج کل بس اسی طرح کی باتیں کرتا پھر رہا ہوں کچھ سمجھ نہیں آتا کون سی بات کس سے کہنی چاہیے اور کس سے نہیں۔ صرف اس لیے میں کسی سے بھی بات نہیں کر رہا۔" وہ جیسے بڑی بے بسی کے عالم میں اس سے اپنی شرمندگی کا اظہار کر رہا تھا۔

"تم مجھ سے تو بات کر سکتے ہو اس بات کی پروا کیے بغیر کہ کوئی الٹی سیدھی بات نہ کر دو...... ساری عمر تم نے اس بات کی پروا نہیں کی تو اب تمہیں یک دم گفتگو کے آداب کیسے یاد آ گئے؟" شیر دل اس کی بات پر ہولے سے ہنس پڑا۔ وہ اس کا طنز سمجھ گیا تھا۔

"نہیں، اتنی الٹی سیدھی باتیں بھی نہیں کی ہیں تم سے...... صرف تمہیں الٹی سیدھی لگتی رہی ہیں۔"

"اسی لیے کہہ رہی ہوں مجھ سے بات کر سکتے ہو تم...... تمہاری الٹی سیدھی باتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکالنے میں مہارت ہے مجھے۔" وہ اس سے کہہ رہی تھی۔

"اچھا چلو بس میں نے یہی پوچھنا تھا پھر بات کریں گے۔" شیر دل نے یکدم بڑے abrupt انداز میں فون بند کر دیا تھا۔

وہ فون ہاتھ میں لیے بیٹھی رہی۔ وہ clinically depressed تھا اور اسے شیر دل کو اس طرح دیکھ کر بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ تقریباً پانچ گھنٹے اکٹھے بیٹھے رہے تھے اور وہ تقریباً چار گھنٹے مثال کی باتیں کرتا رہا تھا۔ اس کا ہر دوسرا جملہ اس بات پر ختم ہو رہا تھا۔ "شہر بانو میرے ساتھ اس طرح کیسے کر سکتی ہے...... "What have I done to deserve all this" (میں نے ایسا کیا برا کیا ہے جس کی سزا مجھے ملے)

اوراس ایک سوال کا جواب کوئی بھی نہیں دے سکتا تھا لیکن ہر بار اس کا یہ جملہ عکس کو عجیب سے احساسِ جرم کا شکار کردیتا تھا شیر دل کی زندگی کے اس میس کا آغاز اس کی کوششوں سے ہوا تھا جو اس نے اپنی زندگی کے میس کو صاف کرنے کے لیے کی تھیں کہیں نہ کہیں وہی اس سارے مسئلے اور خرابی کی ذمّے دار تھی اور وہ اس حقیقت سے نظریں نہیں چرا پا رہی تھی۔ شیر دل کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو وہ کندھے جھٹک کر آگے بڑھ جاتی پلٹ کر دیکھنے کی زحمت تک نہ کرتی کہ اس کے کسی اقدام سے کسی دوسرے کی زندگی پر کیا اثر پڑا تھا۔ خاص طور پر اس صورت میں جب خود وہ بھی اس طرح ایسی کسی فیملی کے ہاتھوں مسائل کا شکار ہو چکی ہوتی...... لیکن یہاں سارا فرق اس کے لیے شیر دل ڈال رہا تھا۔ ضمیر کی یہ ساری چبھن اسے اس ایک شخص کی وجہ سے ہو رہی تھی۔ جسے وہ بری طرح چاہتی تھی اور جسے وہ کبھی تکلیف میں نہ دیکھنے کی خواہش کے باوجود تکلیف میں دیکھ رہی تھی۔

شیر دل نے اس سے شہر بانو کے اس کے ساتھ افیئر کے حوالے سے کوئی الزام نہیں دُہرایا تھا وہ بھی اس کو یہ بتانے کی ہمت نہیں کر سکی تھی کہ وہ اچھی طرح جانتی تھی ان کے بریک اپ کی وجہ کون سے الزامات بنے تھے۔

اس رات عکس مراد علی سو نہیں سکی تھی۔ زندگی میں بہت سے درست سمجھے جانے والے فیصلے بہت غلط نتائج لے کر آتے ہیں اس کیس کو فائل کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے عکس نے اسے بہت درست اور ضروری سمجھا تھا لیکن اس رات بیٹھ کر اس نے پہلی بار بہت غیر جانب داری اور حقیقت پسندی سے اس کیس کو فائل کرنے کے فیصلے پر دوبارہ غور کیا تھا بہت ساری زندگیاں متاثر ہوئی تھیں اور کس حد تک متاثر ہوئی تھیں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ فائدہ کیا ہوا تھا؟...... صرف ایک...... خیر دین پر سے وہ الزام ہٹ گیا تھا جس کی اب اسے پروا تک نہیں تھی جس کو کوئی یاد تک نہیں رکھے ہوئے تھا سوائے چڑیا کے...... کیونکہ وہ اس کے بچپن کا ناقابلِ فراموش زخم تھا۔

''ان جنگوں کو لڑنا بے وقوفی ہوتی ہے چڑیا جن میں ہونے والی جیت بھی ہماری زندگی کے لیے ضروری نہ ہو۔'' اسے خیر دین کی بات یاد آئی تھی۔ اپنے ماضی کی تباہی کو ٹھیک کرنے کی کوشش میں اس نے کسی دوسرے کا مستقبل تباہ کر دیا تھا...... جو بھی کچھ ہوا تھا جان بوجھ کر نہیں ہوا تھا لیکن ہو گیا تھا۔

وہ ساری رات اپنے کمرے میں ٹہلتی رہی تھی، صبح ناشتے کی میز پر خیر دین نے اس کی سرخ سُوجی ہوئی آنکھیں دیکھی تھیں۔

''تمہاری طبیعت ٹھیک ہے چڑیا؟'' انہیں تشویش ہوئی۔

''جی ٹھیک ہے۔'' اس نے نظریں ملائے بغیر کہا۔ وہ چاہتی تھی خیر دین اس سے شیر دل کے بارے میں پوچھے...... کوئی بات کرے...... خیر دین نے جو کہا تھا اس نے عکس مراد علی کا دماغ بُھک سے اڑا دیا تھا۔

''تم سے ایک بات میں نے بھی چھپائی تھی چڑیا...... بہت بار بتانا چاہا لیکن بتانے کی ہمت نہیں کر سکا۔'' وہ خیر دین کے جملے پر حیران رہ گئی تھی۔ اسے یک دم کون سا راز شیئر کرنا یاد آیا تھا۔ اس وقت تو وہ کچھ اور بات کر رہے تھے۔

''کون سا راز ہے نانا! جو آپ نے کبھی مجھے نہیں بتایا؟'' خیر دین چند لمحے خاموش رہا پھر اس نے کہا۔

''شہر بانو کی ماں کئی سال پہلے ایک بار مجھ سے ملنے آئی تھی۔''

''میں جانتی ہوں نانا، آپ نے مجھے بتایا تھا۔'' عکس نے انہیں غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں لیکن میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ......'' وہ بات کرتے کرتے رکا اور اس کے اگلے جملے نے ڈاکٹر عکس مراد علی کو مٹی کر کے رکھ دیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ)

آئیڈیل

عقیلہ حق





''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہاری مرضی کی لڑکی کیسے ڈھونڈ دوں... غضب خدا کا خاندان کے سارے ہی لڑکے اپنے گھر بار کے ہو گئے اور تم...... تم کو کوئی لڑکی ہی پسند نہیں آتی۔ ارے میں پوچھتی ہوں کیا آسمان سے حور اترے گی تمہارے لیے......؟ تم یہ منحوس ٹی وی ہی دیکھے جا رہے ہو، میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے؟'' صغریٰ بیگم نے اپنے لاڈلے بیٹے کمال سے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا جو آرام سے بیٹھا چینل سرچنگ کر رہا تھا۔

''ارے چھوڑیں امی غصہ کیوں کرتی ہیں۔ مجھے کوئی حور پری نہیں چاہیے، نہیں ملتی لڑکی تو نہ ملے، اچھا ہے ناں...... میرے اور میری امی کے درمیان کسی دوسری عورت کا وجود ہونا ہی نہیں چاہیے...... ہم ماں بیٹا ایسے ہی ٹھیک ہیں۔'' کمال نے ماں کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے مسخرے پن سے کہا۔

''کیوں! ایسے ہی کیوں ٹھیک ہیں، تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا۔ یہ میری خوشی ہے...... تم ماں کو ایک خوشی نہیں دے سکتے......؟''

''کیوں نہیں دے سکتا، میری پیاری سی امی، آپ کے لیے تو میں اپنی جان بھی دے سکتا ہوں......'' کمال کا موڈ بدستور خوشگوار تھا وہ جانتا تھا کہ اس کی ماں کا غصہ اس کے بہلانے ہی سے ختم ہو گا۔

''تو پھر! اتنی اچھی، اچھی لڑکیاں تم کو دکھائیں تمہیں کوئی پسند ہی نہیں آتی، ارے بیٹا میں تو یہاں تک کہتی ہوں کہ اگر تم کو میری مرضی کی لڑکیاں سمجھ میں نہیں آ رہیں تو تم خود کسی کو پسند کر لو، مجھے رائی برابر اعتراض نہیں ہو گا لیکن میرے لال اب تمہارا گھر بس جانا چاہیے۔'' صغریٰ بیگم اٹھ کر کمال کے برابر میں بیٹھتے ہوئے بولیں۔

''ارے امی میری کیا پسند...... جو آپ کو پسند

ہے وہی میری بھی پسند ہوگی بس میری معمولی سی ڈیمانڈ ہے اس کا خیال رکھیے گا۔" کمال نے ماں کی طرف بڑے مان سے دیکھتے ہوئے دبی آواز میں کہا۔

"تمہاری ڈیمانڈ......!" صغریٰ بیگم نے زیرلب دُہرایا اور ان کی آنکھیں کسی نہ نظر آنے والے نقطہ پر جم سی گئیں۔

☆☆☆

کمال احمد، صغریٰ بیگم کا ایک ہی تو بیٹا تھا۔ شہر کا مشہور اور قابل سائیکاٹرسٹ، جس نے اپنی ابتدائی تعلیم کانونٹ سے اور باقی تعلیم یونیورسٹی آف پنسلوانیا، امریکا سے مکمل کی تھی۔ ہینڈسم، وجیہہ، خوش اخلاق، خوش گفتار اور حد درجہ نفیس مزاج کا حامل کمال احمد...... صغریٰ بیگم کی خواہشوں کا واحد مرکز تھا۔ ان کے شوہر رضا احمد، جب کمال صرف دس برس کا تھا ایک ٹریفک حادثے میں اللہ کو پیارے ہوگئے تھے اور پھر صغریٰ بیگم کی زندگی میں رہ گیا تھا صرف کمال...... جس پر انہوں نے اپنی ساری توجہ مرکوز کر دی...... فطرتاً صغریٰ بیگم خود بھی ایک نفیس شخصیت رکھنے والی خاتون تھیں اسی لیے مزاج کی نفاست، کمال احمد نے ماں کے دودھ کے ساتھ اپنے اندر اتاری تھی...... اور اس مزاج کی نفاست کو پختہ عادت بورڈنگ کی زندگی نے بنا دیا تھا۔ اپنے مزاج کے خلاف سمجھوتا کرنے کے لیے کمال احمد راضی نہ تھا اور یہی بات اس کی شادی میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔

☆☆☆

"ارے بہن، میں تو باز آئی آپ کے بیٹے کے رشتے سے، میرے پاس جتنے اچھے اور نفیس گھروں کی لڑکیوں کے رشتے تھے وہ سب میں نے آپ کو دکھا دیے...... لیکن معاف کرنا بہن مجھے لگتا ہے آپ کا بیٹا شادی کرنا ہی نہیں چاہتا۔"

آج جب صغریٰ بیگم نے رشتے کروانے والی بوا خیرن کو بلوایا تو انہوں نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں آپ تو برا ہی مان گئیں...... بچہ ہے بات سمجھ نہیں رہا۔ اب ایسی بھی کوئی خاص ڈیمانڈ نہیں ہے اس کی، اسے کوئی اپسرا یا حور تھوڑی چاہیے، ہمارے تمہارے جیسے انسان کی بچی ہو اور بس......" صغریٰ بیگم نے بیٹے کا کمزور سا دفاع کیا۔

"ارے کیا بات کرتی ہیں آپ، ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت اور اعلیٰ خاندانی لڑکیاں میں نے آپ کو دکھائیں لیکن آپ کے بیٹے نے ہر لڑکی میں کوئی نہ کوئی خامی ڈھونڈ نکالی......" خیرن بوا کچھ زیادہ ہی ناراض تھیں۔

"اب آپ ہی بتائیں شیخ صاحب کی نمرہ کس قدر پیاری لڑکی تھی، یاد ہے ناں آپ کو...... نیلی آنکھوں اور گلابی رنگت والی بالکل گڑیا سی لگتی تھی۔ اسے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ جب وہ ڈرائنگ روم میں آئی تو اس کا دوپٹا زمین پر گھسٹ رہا تھا۔ جس کا مطلب ہے کہ اس کی زندگی میں توازن نہیں ہے اور ایک غیر متوازن شخصیت رکھنے والی لڑکی کو وہ اپنا ہم سفر نہیں بنا سکتا۔ ارے میری بہن اس طرح نہیں ہوتا، انسان اور روبوٹ میں فرق ہوتا ہے۔" خالہ خیرن نے چائے کا کپ منہ سے لگاتے ہوئے خفگی سے کہا۔

"ارے چھوڑیں آپ تو ہمیشہ شیخ صاحب کی بیٹی کا ذکر لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔ بس اب پرانی باتیں چھوڑیں اور لڑکی دکھائیں، میں جلد از جلد اس فرض سے سبکدوش ہونا چاہتی ہوں۔" صغریٰ بیگم نے خیرن بوا کی تلخ باتوں کو مجبوراً درگزر کرتے ہوئے کہا کہ رشتہ کروانے والی عورتوں کی کمی تو نہیں ہوتی لیکن خیرن بوا کے پاس اچھے اور خاندانی گھروں کے رشتے ہوتے تھے جس سے سب واقف تھے اور اسی لیے ان کا نخرہ

بھی برداشت کرنا پڑتا۔ جن باتوں کی خیرن بوا شکایت کر رہی تھیں صغریٰ بیگم کو بھی اس کا شکوہ تھا۔ سدرہ جو کمال کے دوست عباس کی بہن تھی اور اس نے قرآن پاک بھی صغریٰ بیگم ہی سے پڑھا تھا، آج کل جناح اسپتال میں ہاؤس جاب کر رہی تھی اور جب صغریٰ بیگم کی نظرِ انتخاب سدرہ پر پڑی تو چند لمحوں کے لیے کمال بھی سوچنے پر مجبور ہوگیا کیونکہ صغریٰ بیگم کے پاس اس کا کافی آنا جانا تھا اور خود کمال بھی...... بے تکلفی سے عباس کے گھر آتا جاتا تھا۔ ماں کے اصرار پر اس نے سدرہ پر غور کرنا شروع کیا تو اس نے نوٹ کیا کہ سدرہ اپنی چپلیں چلتے چلتے اتارتی ہے اور جب بھی جوتی اتارتی ایک پیر کی جوتی آگے اور دوسرے پیر کی پیچھے، عجب انداز تھا اور پھر صغریٰ بیگم کی ناراضی کی پروا کیے بغیر اس نے صاف انکار کر دیا کہ "سدرہ کے مزاج میں جلد بازی ہے پیر سے جوتی اتارتے وقت وہ اس قدر جلد بازی کا مظاہرہ کرتی ہے تو زندگی کے اہم فیصلے کرتے وقت وہ کیا کرے گی اور بحیثیت ایک سائیکاٹرسٹ کم از کم وہ اس لڑکی کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔" اس کے دلائل سن کر صغریٰ بیگم کا دل چاہا کہ اپنا سر پیٹ لیں۔

سو وہ خیرن بوا کی باتوں کا کیا برا مانتیں اس بات پر تو وہ خود بھی ناراض تھیں اور پھر انہوں نے سوچا کہ خیرن کے اور دوسرے لوگوں کے نخرے اٹھانے سے بہتر ہے کہ اپنے خاندان میں ہی نظر دوڑائی جائے۔

☆☆☆

"کیسی ہو نتاشا؟ دل لگ گیا تمہارا ہمارے گھر میں؟" کمال جو ابھی کلینک سے آیا تھا اس نے صوفے پر بیٹھی ٹی وی دیکھتی نتاشا سے پوچھا۔

"جی...... بالکل! دل نہ لگنے والی کیا بات ہے...... میں پہلی دفعہ تھوڑی آئی ہوں، ہاں یہ ضرور

خوش نصیب

خوش نصیب وہ نہیں ہے جسے اقتدار مل گیا
بلکہ وہ ہے جس نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا
اور اپنی قوم کی تقدیر بدل دی۔ (المنصور)
مرسلہ: تسنیم رضا ذوالفقار، فیصل آباد

ہے کہ اب کافی عرصے کے بعد آئی ہوں۔" نتاشا نے شائستگی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"چلو یہ تو اچھی خبر ہے۔" کمال شوز اتار کر شوریک پر قاعدے سے رکھتے ہوئے بولا۔ "ویسے میں سوچ رہا تھا کہ ہمارے گھر میں کوئی لڑکی تو ہے نہیں شاید تم بور ہو۔"

"ارے بور کیوں ہوں گی، خالہ جان سے میری گپ شپ چلتی رہتی ہے اور ویسے بھی مسٹر کمال احمد میں کوئی نہ کوئی مصروفیت ڈھونڈ ہی لیتی ہوں، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ میری وجہ سے آپ بور ہو رہے ہوں۔" نتاشا ہنسی اور کمال احمد کو لگا جیسے اس کے چاروں طرف گھنگرو بج اٹھے ہوں اور اسے احساس ہوا کہ آج پہلی دفعہ جیسے گھر میں آ کر وہ اپنی ماں کو بھول گیا ہو۔

"امی کہاں ہیں؟" کمال نے گویا اس کی آواز کی گنگناہٹ سے بچتے ہوئے پوچھا۔

"خالہ جان! پڑوس میں قرآن خوانی میں گئی ہیں حالانکہ ان کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا، میں نے ان سے کہا بھی کہ نہیں جائیں تو وہ کہنے لگیں کہ بیٹا ہم دعوتوں اور شادیوں میں تو بہت خوش خوش جاتے ہیں اور جب قرآن خوانی یا میلاد کی دعوت آئے تو ہم منہ بنانے لگتے ہیں۔ ہمیں بوجھ لگتا ہے، کیا یہ اللہ کا شکر نہیں کہ ہم اس جگہ مدعو ہیں، جہاں اُس کا ذکر ہوگا اور ہم بھی تھوڑا ثواب کما لیں گے اور واقعی خالہ جان کی بات میرے دل کو بھی بہت پسند آئی...... خیر، آپ

فریش ہو کر آئیں، میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔'' نتاشا نے ریموٹ سے ٹی وی آف کیا۔ کھڑے ہو کر ریموٹ کو اس کی جگہ پر رکھتے ہوئے صوفے کے کشن کو درست کیا اور پیروں میں طریقے سے چپل پہنتے ہوئے کچن کی طرف چل دی اور کمال بہت خاموشی سے اس کے مزاج کی ترتیب کو نوٹ کرنے لگا۔

نتاشا صغریٰ بیگم کی بھانجی تھی جو پنجاب یونیورسٹی سے اکنامکس میں ایم اے کر رہی تھی اور آج کل صغریٰ بیگم کے اصرار پر چھٹیاں گزارنے کراچی آئی ہوئی تھی۔ نہ جانے کیوں کمال کو لگ رہا تھا کہ نتاشا میں ایسا کچھ ضرور ہے جو اسے دوسری لڑکیوں سے ممتاز کرتا ہے۔

''چائے......'' کمال نے جو صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا اس کی آواز پر آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ سفید شلوار دوپٹا اور گلابی کرتہ پہنے گریبان پر جھولتے سفید موتیوں کے بٹن، سیدھی مانگ نکال کر ایک سادی سی لمبی چوٹی، میک اپ سے بے نیاز چہرہ، سیاہ گہری آنکھوں میں ذہانت و متانت، چمکدار کلائیوں پر سجی گلابی چوڑیاں، تراشے ہوئے خوب صورت ناخن اور سفید مومی انگلیوں میں تھاما بھاپ اُڑاتا چائے کا کپ۔

''کیا دیکھ رہے ہیں؟'' نتاشا کی آواز کمال کو جیسے حال میں کھینچ لائی۔

''ارے کچھ نہیں!'' کمال نے نظریں چُراتے ہوئے چائے کا کپ تھاما۔

''سوچا جا سکتا ہے!'' کمال نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

''اب انسان ہر لڑکی تو ریجیکٹ نہیں کر سکتا!'' کمال کے اندر سے کسی نے کہا اور پھر اس نے صحن میں گملوں کو پانی دیتی نتاشا پر نظر بس جما دیں اور ایک دل آویز مسکراہٹ اس کے چہرے پر رقص کرنے لگی۔

☆☆☆

''تم کو نتاشا کیسی لگی بیٹا!'' صغریٰ بیگم جو کئی دنوں سے کمال کا جھکاؤ نتاشا کی طرف محسوس کر رہی تھیں۔ اپنی پلاننگ پر دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوتے کمال سے پوچھنے لگیں۔

''نتاشا......'' کمال نے زیرِ لب دُہرایا۔

''لڑکی تو اچھی ہے خوب صورت...... تعلیم یافتہ...... ڈسپلنڈ...... مہذب...... اور۔''

''ارے بیٹا، میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں اور تم بقراط بنے بیٹھے ہو۔'' صغریٰ بیگم نے کمال کی خاموشی پر اکتا کر کہا۔

''ارے کچھ نہیں امی، میں ہمہ تن گوش ہوں۔'' کمال نے اپنے مضبوط ہاتھوں میں صغریٰ بیگم کے ہاتھوں کو تھامتے ہوئے کہا۔

''دیکھو بیٹا! اب میں جلد از جلد تمہاری شادی کرنا چاہتی ہوں، تمہارے ساتھ کے سارے ہی لڑکے اپنے اپنے گھر بار کے ہو چکے ہیں۔ فقط ایک تم ہی کنوارے گھوم رہے ہو، میں چاہتی ہوں اب تم اپنے مزاج میں ذرا لچک پیدا کرو، خیر چھوڑو یہ بتاؤ کہ تم کو نتاشا کیسی لگی؟''

''نتاشا ایک اچھی اور مہذب لڑکی ہے امی......'' کمال نے اپنی سوچ کو الفاظ دیے۔

''وہ تو میں بھی جانتی ہوں کہ وہ نہ صرف اچھی بلکہ بہت اچھی ہے لیکن میں تم سے پوچھ رہی ہوں کہ کیا میں تمہارا پیغام لے کر نتاشا کے گھر جاؤں......؟'' وہ سمجھ رہی تھیں کہ لوہا گرم ہے اور وہ چوٹ مارنا چاہتی تھیں۔

''پروپوزل......'' کمال نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بے دھیانی سے کہا۔ گلابی کلائیوں میں کھنکتی چوڑیاں جیسے اس کے چاروں طرف بجنے

لگیں۔

”ہاں...... تمہارا رشتہ......!“ صغریٰ بیگم نے زور دیتے ہوئے کہا اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا، سامان سے لدی پھندی ہنستی مسکراتی ہوئی نتاشا چلی آئی......اور کمال جیسے کچھ کہتے کہتے رہ گیا......اور صغریٰ بیگم کو ایسا لگا کہ یہ لمحۂ اقرار تھا جو ہاتھ سے پھسل گیا لیکن اقرار......

☆☆☆

”ارے اس قدر گرمی میں آپ کچن میں کیوں چلے آئے......“ نتاشا جو اتوار کی وجہ سے ماسی کی چھٹی ہونے پر دوپہر کے کھانے کے لیے آٹا گوندھ رہی تھی۔ کمال کو کچن میں کھڑا دیکھ کر بے ساختہ بولی۔

”کیوں! جب تم اس قدر گرمی میں روٹی پکا سکتی ہو تو کیا میں پانی پینے نہیں آ سکتا......“ کمال نے نرم لہجے میں کہنیوں تک آستینیں چڑھائے آٹا گوندھتی نتاشا کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ارے میں تو عورت ہوں! یہ سب تو ہماری فطرت کا حصہ ہے......“ نتاشا پیٹھ موڑے موڑے بولی۔

”ارے، فریج میں تو ٹھنڈا پانی ہی نہیں ہے۔“ کمال نے پانی کی بوتل فریج سے نکال کر کچن کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے کہا۔

”رکیں، میں آپ کو کولر میں سے ٹھنڈا پانی دے دیتی ہوں۔“ نتاشا نے ہتھیلی کی پشت سے چہرے پر آئے بالوں کو پیچھے کرتے ہوئے کچن کاؤنٹر سے گلاس اٹھایا اور کولر کی طرف بڑھ گئی۔ آٹے سے لتھڑے ہاتھ اور ان ہاتھوں میں تھاما گلاس جس پر جگہ جگہ آٹا لگ گیا تھا اور آٹے کے چند ذرات گلاس کو تھامتے ہوئے پانی کی سطح پر گر کر تیرنے لگے تھے۔ کمال کی نظریں نتاشا کے ہاتھوں پر سے ہوتے ہوئے گلاس پر جیسے جم سی گئیں۔

”لیجیے......“

”نہیں پلیز نہیں۔“ کمال ہاتھ کے اشارے سے منع کرتا ہوا تیزی سے کچن سے باہر نکل گیا اور نتاشا حق دق کھڑی کی کھڑی رہ گئی اور کمال کا ”نہیں“ ہر فیصلے کے گرد حصار باندھ کر کھڑا ہو گیا لیکن صغریٰ بیگم کو اس کی شادی کرنا ہی تھی۔

☆☆☆

”شکر ہے یار تیری بھی شادی ہوئی ورنہ ہم سب کو یقین تھا کہ ہم نانا، دادا بن جائیں گے اور تو چھیل چھبیلا پھرتا رہے گا کیونکہ تیرا گوہر نایاب ملنا کم از کم مجھے تو ناممکن لگتا تھا......“ احسن نے دولھا بنے کمال کو چھیڑتے ہوئے کہا جو ابھی ابھی دلہن کو رخصت کروا کر لایا تھا اور اب دوستوں کے ساتھ خوشگوار موڈ میں بیٹھا ہوا تھا۔

”ارے میرے بھائی، دنیا میں کوئی بھی بات ناممکن نہیں۔ ہاں مشکل ضرور ہو سکتی ہے......اور دیکھو میں نے اپنا آئیڈیل ڈھونڈ لیا......“ کمال کے لہجے میں من پسند ساتھی پانے کا نشہ تھا۔

”وہ کہتے ہیں ناں کہ ہمتِ مرداں مددِ خدا۔“ ایک دوسرے دوست نے جملہ کسا۔

”ویسے یار یہ تو بتا کہ آخر یہ کفر ٹوٹا کیسے۔ آنٹی بتا رہی تھیں کہ بھابی سو فیصد تیری پسند کی ہیں اور تیری ہر خوشی ان کی خوشی ہے۔“ جواد نے قریب کھسکتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں فرح، بہت اچھی ہے، مجھے دیکھتے ہی اچھی لگی اور میں نے سوچا بس یہی میرا آئیڈیل ہے۔“ کمال نے محبتوں سے چُور لہجے میں کہا۔

”اللہ کا شکر ہے! ہم نے تیری بارات کی بریانی کھائی ورنہ تو ہی ہر سال ہمارے بچوں کے عقیقوں کی بریانی کھا رہا تھا۔ ویسے یہ تو بتا بھابی تجھ جیسے نالائق کو ٹکرائیں کہاں؟“ احسن نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

”فرح سے میری ملاقات......“ کمال جیسے کھو سا گیا۔

☆☆☆

”نہیں، پلیز میرے اُبٹن مت لگانا، مجھے اچھا نہیں لگتا، سارے کپڑے خراب ہو جاتے ہیں۔ ویسے بھی اس قسم کا ہلا گلا میرے مزاج کے خلاف ہے۔“ کمال جو ڈرائنگ روم کی دیوار سے پشت ٹکائے سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا لڑکوں کو بھنگڑا ڈالتے دیکھ رہا تھا۔ اس قدر سنجیدہ سے لہجے پر بے ساختہ اس کی نگاہیں لاؤنج میں ابٹن کھیلتی لڑکیوں پر سے ہوتی ہوئی سفید ساڑی میں ملبوس اس پُروقار، اور نازک اندام سی لڑکی پر ٹھہر گئیں جو دونوں ہاتھوں میں موتیا کے گجرے پہنے، بڑے مہذب انداز میں ہاتھ اٹھا کر لڑکیوں کو ابٹن لگانے سے منع کر رہی تھی۔ آج نتاشا کا مایوں تھا اور کمال، صغریٰ بیگم کے ساتھ آج ہی کراچی سے لاہور پہنچا تھا۔ صغریٰ بیگم، نتاشا سے شادی سے انکار کے باعث بیٹے سے کافی ناراض تھیں اور وہ آج کل ہر طرح سے ماں کی دلجوئی میں مصروف تھا۔ وہ نتاشا کو بہت چاہتی تھیں اور ان کی شدید خواہش تھی کہ نتاشا اور کمال کو رشتۂ ازدواج میں باندھ دیا جائے لیکن ہائے رے کمال کی نفاست پسندی اور آئیڈیل کی تلاش کا بھوت......اور نتاشا، نتاشا جیسی لڑکیاں تو ہر ایک کا خواب ہوتی ہیں اور پھر چند ہفتے بعد ہی چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کے مصداق اس کی شادی دوسری جگہ ٹھہر گئی...... اور وہ ماں کے ساتھ آج مایوں کی تقریب میں موجود تھا، کہا جاتا ہے جہاں انسان کا نصیب ہوتا ہے وہاں وہ خود ہی پہنچ جاتا ہے......تو کیا کمال کا نصیب اسے نتاشا کی شادی تک لایا تھا۔ کون جانتا تھا۔

☆☆☆

”کتنی ہی دیر اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں
میں اپنا نصیب ڈھونڈتی رہی
پر لگتا ہے!
فقط وہ ایک لکیر ہی بنا رہ گئی“

فرحت جمال

مایوں کے بعد رت جگے میں بیت بازی کا مقابلہ جاری تھا، جس میں فرح نے خوب صورت، پُرتاثر لہجے میں نظم پڑھی اور کمال جسے شعر و شاعری سے ذرّہ بھر بھی لگاؤ نہیں تھا۔ اس کے لہجے کے سحر میں جکڑ سا گیا اور نہ جانے کیوں وہ اپنا ہاتھ کھول کر لکیریں دیکھنے لگا کہ شاید کوئی لکیر وہ بھی ڈھونڈ رہا تھا اور پھر جیسے فرح اس کی نظروں کے حصار میں آ گئی۔ شادی کی تقریبات میں لباس کی چوائس منفرد اور دلکش، کبھی ڈھولک کی تھاپ پر گانے گاتی، کبھی کچن میں کام کرتی اور کبھی ہر کام چھوڑ کر بروقت نماز پڑھتی، نفیس لب و لہجے میں بات کرتے ہوئے، قاعدے قرینے سے چلتی پھرتی، کھانا کھاتی......وہ ہر جگہ پرفیکٹ تھی اور کمال کو ایسا لگتا جیسے ہر جگہ فرح ہی فرح ہے آس پاس کوئی نہیں بس فرح ہے اور فرح جو نتاشا کی بیسٹ فرینڈ ہونے کے ساتھ ساتھ تایا زاد بھی تھی، شادی کی تقریب ختم ہوتے ہی انگلی میں انگوٹھی سجائے وہ کمال احمد کی منگیتر کہلانے لگی۔

☆☆☆

”آج میں بہت خوش ہوں، لوگ کہتے تھے کہ آئیڈیل ایک سراب ہوتا ہے، آئیڈیل کسی کو نہیں ملا کرتے لیکن میں کس قدر خوش نصیب ہوں کہ میرا آئیڈیل آج میری دلہن کے روپ میں میرے کمرے میں موجود ہے۔“ کمال نے گھونگٹ اٹھا کر خوب صورت کنگن منہ دکھائی میں اسے پہناتے ہوئے خوشی سے بھرپور لہجے میں فرح کے کان میں سرگوشی کی۔

☆☆☆

”ارے دلہن، تم تو کچھ کھاتی ہی نہیں ہو، بیٹا یہ

پراٹھا تو لو۔" صغریٰ بیگم نے ناشتے کی میز پر فرح کے آگے پراٹھے کی پلیٹ کھسکاتے ہوئے کہا۔

"تھینکس امی جی! میں بس اورنج جوس لوں گی۔" فرح نے نزاکت سے نیپکن سے ہونٹ صاف کرتے ہوئے کہا۔

"لو بھئی، یہ کیا بات ہوئی، ناشتا ڈھنگ سے، نہ کھانا پیٹ بھر کر، اتنا سا کھاتی ہو چڑیا کی طرح ...... اس طرح تو بیٹا تم کمزور ہو جاؤ گی۔" ان کے لہجے میں اپنی لاڈلی بہو کے لیے پیار کے ساتھ ساتھ فکر بھی تھی۔

"ارے نہیں امی کچھ نہیں ہوگا، دراصل کمال کو موٹی لڑکیاں سخت ناپسند ہیں اسی لیے احتیاط کرتی ہوں۔" فرح نے آرام سے ساس کو سمجھایا اور وہ خاموش ہوگئیں کہ وہ بھی بیٹے کے مزاج سے بخوبی واقف تھیں۔

☆☆☆

"اور سنائیں کمال احمد صاحب خوش ہیں آپ اپنی نویلی دلہن کے ساتھ!" احسن آج کمال احمد سے ملنے اس کے کلینک آیا تو خوش و خرم کمال کو چھیڑا۔

"ہاں یار اللہ کا شکر ہے، مجھے میرا آئیڈیل مل گیا۔" وہ مسکرایا۔ "تم تو جانتے ہو مجھے کوئی حور پری چاہیے نہیں تھی بس مجھے ویل ڈسپلنڈ اور نفیس لڑکیاں پسند ہیں، تم تو جانتے ہو اماں نے مجھے بورڈنگ میں بھیج دیا تھا اور ڈسپلن بورڈنگ لائف کا پہلا سبق ہے جو ہمیں پڑھایا جاتا ہے اور پھر ہماری رگوں میں اتارا جاتا ہے۔ صبح اٹھنے کا ٹائم فکس ہے، جاگنگ، سوئمنگ، اسٹڈی، کھانے، چائے ہر چیز وقت پر، تولیا سیدھے ہاتھ پر رکھنا ہے الٹے پر رکھ دیا تو فائن، شوز دروازے کے دائیں طرف رکھنے ہیں اور بائیں طرف رکھ دیے تو فائن۔ حتیٰ کہ موسم کے کلرز تک کا خیال کہ کس موسم میں کون سا رنگ پہننا ہے ہماری تعلیم و تربیت کا حصہ ہیں اور یہ سب باتیں تعلیم کے ساتھ ساتھ ہماری زندگی میں شامل ہو جاتی ہیں...... تو میری جان، میری یہ سب عادتیں اس قدر پختہ ہوگئیں کہ میں ان پر سمجھوتا کرنا بھی چاہوں تو نہیں کرسکتا۔ میرے یار میں اور کچھ نہیں ڈھونڈ رہا تھا بس ایک ہم مزاج، ہم سفر ڈھونڈ رہا تھا اور اللہ کا شکر ہے زندگی میں ہر نعمت کے ساتھ ساتھ اللہ نے میری یہ خواہش بھی پوری کردی۔" کمال نے بہت وضاحت سے اپنا نقطۂ نظر واضح کیا۔

"چلو یہ تو بہت اچھی بات ہے، اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے تو پھر اس خوشی کے موقع پر چائے تو منگواؤ۔" احسن نے خلوص سے کہا اور کمال احمد ہنس دیا۔

☆☆☆

ہلکے آف وائٹ کلر کے سلک کے سوٹ میں جس کی قمیص پر موتیوں کے کام کا گلا اور دامن بنا ہوا تھا۔ ہلکا ہلکا میک اپ کیے اور صرف پھولوں کا زیور پہنے فرح جب کمال احمد کے دوست کے گھر ڈنر پر جانے کے لیے تیار ہوئی تو کمال اسے دیکھتا رہ گیا۔

"تم نئی نویلی دلہنوں کی طرح غرارے، شرارے اور زیورات کیوں نہیں پہنتی فرح؟" کمال احمد نے محبت سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بس مجھے اس قدر چمک دمک پسند نہیں ہے اور آپ کو بھی تو نہیں پسند ہے ناں۔" فرح اٹھلائی۔

"میری جان! میری زندگی تمہیں میرے پسندیدہ کلرز، میری پسندیدہ ڈریسنگ، ہر چیز کا اندازہ کیسے ہوگیا، میں سنتا تھا کہ خواتین تیاری میں بہت ٹائم لگاتی ہیں لیکن تم تو مجھ سے پہلے تیار ہو جاتی ہو، میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ میری زندگی کی ساتھی میری ہم مزاج ہے، مجھے کچھ بتانے کی ضرورت ہی نہیں...... آئی لو یو میری جان آئی لو یو سوچ!" وہ فرح کے ریشمی

بالوں میں منہ دیے گنگنا رہا تھا اور فرح اس کے مضبوط بازوؤں کے حصار میں کسمسا رہی تھی۔

☆☆☆

"ارے یار! میری تو ہمت جواب دے گئی ہے تمیزدار بنتے بنتے، تمہارے ساتھ تو شرط بہت ہی مہنگی پڑی، جب تم نے بتایا کہ صرف آٹا لگے ہاتھوں سے پانی دینے کی وجہ سے کمال نے تمہارے رشتے سے انکار کردیا تھا...... سو میں نے بھی کمال کو جیتنے کی شرط لگالی......" فرح نے مسہری پر بکھرے تکیوں کو سمیٹ کر کمر کے پیچھے لگاتے ہوئے درد بھری آواز میں کہا۔

"تو کیا تم کو کمال احمد اچھے نہیں لگے؟" سامنے صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھی نتاشا نے حیرت سے پوچھا۔

"ارے نہیں...... مجھے کمال تو بہت اچھے لگتے ہیں لیکن تم خود سوچو اُن کے مزاج اور پسند کے مطابق رہنا کتنا مشکل ہے، تم تو اچھی طرح جانتی ہو میں کھانے پینے کی عاشق...... دن رات اماں سے صرف اسی بات پر صلواتیں سنتی رہتی تھی اور میرا بے ڈھنگا پن اور پٹر پٹر چلنا اماں کو کس قدر ہولاتا تھا، وہ بے چاری ہمیشہ مجھے ٹوکتی رہتیں۔" فرح نے نتاشا کو یاد دلایا۔

"تم مجھے یاد نہ دلاؤ، صرف پٹر پٹر چلنا ہی نہیں تمہارا پٹر پٹر بولنا بھی خاندان بھر میں مشہور ہے۔" نتاشا ہنسی۔

"اور تم خود سوچو، دبی آواز میں مسکراتے لبوں کے ساتھ آہستہ آہستہ بولتے بولتے میرے حلق میں تکلیف رہنے لگی ہے...... ہر وقت حلق خشک سا رہتا ہے۔" فرح تقریباً رو دینے کو تھی۔

"اور تمہاری شاعری کہاں تک پہنچی کہ کمال احمد کے لیے تم نے سبق کی طرح اشعار بھی تو یاد کیے تھے۔" نتاشا نے ایک اور بھولا ہوا دکھ یاد دلایا۔

"اوہ ہاں...... ذرا سوچو میں اور شاعری...... لاحول ولا قوۃ میری تو ہمیشہ سے اردو کمزور رہی ہے اور اردو کے پیپر کی وجہ سے ہمیشہ میری پرسنٹیج خراب ہوتی تھی کہ مجھے اشعار یاد نہیں ہوتے تھے نہ کہ اب یہ حال ہے کہ میں میر اور غالب کو برمحل پڑھتی ہوں۔" فرح نے مرغی کی ران کو دانتوں سے توڑتے ہوئے زیرلب مسکراتی نتاشا سے کہا۔

"تو اب کیا ہوگا......؟" نتاشا واقعی فکرمند تھی۔

"بس ہونا کیا ہے، میں نے بھی چور راستہ نکال لیا ہے، ساس تو میری ویسے بھی اللہ میاں کی گائے ہیں اور جب سے وہ حج پر گئی ہیں میں تو جیسے آزاد ہوگئی ہوں...... کمال کے کلینک جانے کے بعد میں سارے گھر میں ننگے پیر خوب چلتی ہوں، تیز آواز میں میوزک سنتی ہوں، خوب میک اپ کرتی ہوں...... خوب بازار سے کھانے منگوا منگوا کر کھاتی ہوں...... اور جب کمال کے آنے کا وقت ہوتا ہے تو جیسا وہ چھوڑ کر صبح گئے تھے ویسی بن جاتی ہوں......" فرح نے بریانی کی پلیٹ کے بچے ہوئے تمام چاولوں کا بڑا سا نوالہ بنا کر منہ میں رکھتے ہوئے چاول بھرے منہ کے ساتھ اپنی بات بہ مشکل مکمل کی۔

اور کمال احمد جو کلینک سے یہ سوچ کر جلدی چلا آیا تھا کہ نتاشا آئی ہوئی ہے، مسہری پر چڑھی بیٹھی فرح اور مسہری پر بغیر ٹرے کے رکھی چاولوں کی پلیٹ اور رائتے کا پیالہ، چاولوں سے سنے ہاتھوں سے بریانی کھاتی فرح، پھیلا ہوا کمرا اور سامنے کرسی پر نفاست سے ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھی نتاشا کی باتیں سن کر کافی دیر تک دم بخود کھڑا رہا لیکن پھر جیسے اس کی ٹانگوں میں جان نہ رہی...... اس کے چاروں طرف ایک نظر نہ آنے والا شور گونج رہا تھا اور وہ دروازے پر پڑے پردے کو پکڑنے کی کوشش میں ہر پردہ گراتے ہوئے دھڑام سے فرش پر آرہا۔

ناولٹ

کوئی شہر ایسا بساؤں میں

نگہت سیما

آخری حصہ

سیمل نے نوشیرواں کی ڈائری اٹھا کر دیکھی تو اس میں محسن نقوی کی نظم لکھی تھی۔

کوئی شہر ایسا بساؤں میں
میرے بس میں ہو تو کبھی کہیں
کوئی شہر ایسا بساؤں میں
جہاں سچ کو سچ سے ہو واسطہ
جہاں جگنوؤں کو ہوا دکھاتی ہو راستہ
جہاں چاند ماند نہ ہو کبھی
جہاں خوشبوؤں کو بدلتی رُت سے حسد نہ ہو
جہاں خواب آنکھوں میں جگمگائیں تو
جسم و جاں کے بھی دریچوں میں تیرگی کا گزر نہ ہو
کوئی رات ایسی بسر نہ ہو
کہ بشر کو اپنی خبر نہ ہو
جہاں داغ داغ سحر نہ ہو
جہاں کشتیاں ہوں رواں دواں
تو سمندروں میں بھنور نہ ہو
جہاں برگ و بار سے اجنبی
کوئی شاخ کوئی شجر نہ ہو

میرے بس میں ہو تو کبھی کہیں
کوئی شہر ایسا بساؤں میں

اسے مروان یاد آ رہا تھا، مروان کو یہ نظم کتنی پسند تھی۔ وہ اکثر اسے سناتا تھا۔

"کیا ایسا ممکن ہے گڑیا کہ کوئی ایسا شہر ہو جہاں کوئی غم کوئی دکھ نہ ہو جہاں سب خوش اور مطمئن ہوں۔"

نوشیرواں جوس کے گلاس لیے اندر آیا اور گلاس ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ......گل کی ڈائری ہے مجھے عالم نے دی تھی۔ سیم ہمارا گل اندر سے ایک نازک دل شاعر تھا۔" وہ اپنا گلاس اٹھا کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ "اس میں اس کی اپنی نظمیں اور شاعری بھی ہے اور دوسروں کی بھی۔"

"مروان کو بھی یہ نظم بہت پسند تھی۔" اتنی دیر میں پہلی بار سیمل نے کچھ کہا تھا۔

"عالم نے مجھے بتایا تھا۔" نوشیرواں نے افسردگی سے کہا۔ "وہ ملک میں آئے دن ہونے والی دہشت گردی سے بے گناہ لوگوں کے مرنے سے، کرپشن سے، ہر چیز سے نالاں تھا، وہ کہتا تھا کہ اگر اس کے پاس کوئی جادو کی چھڑی ہوتی تو اسے گھما کر سب کچھ ٹھیک کر دیتا۔ یہ وہ آخری نظم ہے جو اس نے اس ڈائری میں نوٹ کی ہے۔ اس کے بعد صفحے خالی ہیں۔ پتا نہیں کہاں چلا گیا وہ......کون سا شہر بسانے اور کہاں......"

نوشیرواں نے سر جھکا لیا اور ہاتھ میں پکڑا گلاس سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

"سیمل تم گل کے لیے بھی دعا کیا

کرو۔ بس وہ مل جائے، ایک بار کہیں سے آجائے تو پھر میں اسے اس طرح چھپا کر رکھوں کہ کوئی اسے کچھ نہ کہہ سکے۔ اسے کچھ ہوگیا سیم تو میرے نانا کی نسل ختم ہوجائے گی۔" سیمل کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا وہ یونہی ہاتھ گود میں دھرے بیٹھی رہی۔

"ارے تمہارا جوس گرم ہوجائے گا پی لونا۔"

اس نے اچانک کہا تو سیمل نے جوس کا گلاس اٹھالیا۔ اگرچہ اس کا پینے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ جوس پی کر وہ کھڑی ہوگئی۔

"بہت دیر ہوگئی ہے، فضیلت نے گھر جانا ہوگا۔" وہ باہر نکلی تو دھوپ صحن سے ختم ہوکر اب صرف دیواروں پر تھی۔ نوشیرواں برآمدے میں کھڑا اسے سیڑھی پر چڑھتے اور پھر دیوار پر پاؤں رکھ کر دوسری طرف اترتے دیکھتا رہا۔ دل نے بڑی شدت سے خواہش کی کہ کیا ہی اچھا ہو جو سیمل اس کی زندگی میں شامل ہوجائے تو اس کی ہمراہی میں دکھ کا بوجھ اٹھانا سہل ہوجائے گا۔ اس نے مڑ کر دیکھا، کتنی خاموشی اور ویرانی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اس کے ذہن میں وہ گھر آیا تھا جہاں جب چھٹی پر وہ جاتا تو ایک دم بھگدڑ مچ جاتی تھی۔ بہنیں، کزنز، چھوٹے بھائی، چچا زاد، ماموں زاد سب اس کے گرد اکٹھے ہوجاتے تھے اور یہ صرف اس کے لیے ہی نہیں تھا جو بھی گھر آتا چھٹی گزارنے یونہی اس بڑے حویلی نما گھر میں رونقیں اتر آتی تھیں جو اَب ملبے کا ڈھیر بنا اپنے مکینوں کو روتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جلن ہونے لگی تو وہیں تخت پر بیٹھ گیا۔

"کاش میں کوئی ایسا شہر بسا سکتا گل جہاں ہم زندگی بغیر کسی خوف اور ڈر کے گزار سکتے۔" میراں اماں کمرے سے باہر آئیں تو وہ تخت پر ہاتھوں کا تکیہ بنائے لیٹا ہوا تھا۔

"ارے بچہ یہاں کیوں لیٹے ہو اتنی تپش میں؟" انہوں نے گھبرا کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"یونہی اماں جان، آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

اس نے ان کی کلائی تھام کر ان کی نبض دیکھی۔ "بخار تو نہیں ہے اب۔"

"ہاں، طبیعت ٹھیک لگ رہی ہے۔" وہ تخت پر اس کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔ دھوپ اب دیواروں پر سے بھی غائب ہوگئی تھی۔ سورج غروب ہونے کی تیاریوں میں تھا لیکن فضا میں تپش اور حبس تھا۔ ہوا کا نام ونشان تک نہیں تھا۔ نوشیرواں نے اٹھ کر برآمدے کا پنکھا آن کیا۔

"شیری بچہ......"

"جی اماں جان۔"

"شادی کرلے اب...... اپنا گھر ہوگا، بچے ہوں گے تو جینے کو جی چاہے گا۔ میں نہ رہی تو اکیلا ہوجائے گا بالکل۔"

"اللہ آپ کو بہت لمبی زندگی دے اماں جان۔"

"جو جوان تھے، بچے تھے جنہیں بہت زیادہ جینا تھا، جن کے ہاتھوں ہم نے اپنے آخری سفر پر جانا تھا وہ چلے گئے تو ہم کب تک رہیں گے، دل تیرے لیے بڑا پریشان ہوتا ہے۔ تجھے ہنستا بستا دیکھ لوں، بس یہی خواہش ہے جو بار بار دل میں چٹکیاں لیتی ہے۔ میری بات مان لے بچہ......"

"کوئی لڑکی ڈھونڈ رکھی ہے آپ نے؟" وہ مسکرایا۔

"تو مان لے تو پھر لڑکی بھی ڈھونڈ لوں گی۔ دلدار کا چاچا ہے نا اُدھر وادیِ شوال میں چھ ماہ پہلے اِدھر آیا تھا ملنے اپنی بیوی کے ساتھ، اس کی بیوی کہہ رہی تھی کہ تیرے بابا کے کوئی دوست ہیں اُدھر۔ آرمی سے ریٹائر ہوچکے ہیں۔ کرنل تھے ان کی بیٹی ہے بڑی اچھی اگر تو کہے تو......" انہوں نے بڑی تفصیل سے

بات کی تھی۔ نوشیرواں یکدم چپ ہوگیا تھا۔ اس کی نظریں سامنے دیوار کی طرف اٹھی تھیں اور میراں اماں جیسے اس کے دل کی بات جان گئی تھیں۔

"سیمل مجھے اچھی لگتی ہے، کئی دفعہ میں نے سوچا کہ سیمل کو تمہارے لیے مانگ لوں...... لیکن کس سے۔ نہ سیمل کا باپ نہ بھائی...... اور ماں کی یہ حالت...... اور اگر وہ ہوتے بھی تو شاید ہم اجنبی لوگوں کو وہ رشتہ نہ دیتے۔ یہاں تو برادری سے باہر کچھ لوگ رشتے نہیں دیتے...... اور ہم تو ہیں ہی دوسرے علاقے کے۔"

"ہمارے خاندان کے مردوں نے بھی تو پنجابیوں سے شادیاں کی تھیں اماں جان۔"

"وہ اور بات تھی بچے...... آرمی میں اکٹھے رہے، آرمی میں ہی شادیاں ہوئیں...... اب ہم۔" وہ چپ ہوگئی تھیں ان کے چہرے پر ملال تھا جیسے سیمل کو نوشیرواں کے لیے نہ مانگنے کا دکھ ہو۔ نوشیرواں کھڑا ہوگیا۔

"مجھے ابھی شادی نہیں کرنی اماں جان جب تک گل نہیں مل جاتا۔"

"گل کب ملے گا تو جانتا ہے شیری...... بوڑھا ہوجائے گا۔" نوشیرواں نے جواب نہیں دیا تھا۔ مغرب کی اذان شروع ہوگئی تھی۔

"آپ نماز پڑھ لیں تو میں آپ کے لیے چائے بنادوں گا۔" وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میراں اماں وہاں تخت پر بیٹھے اسے جاتا دیکھ رہی تھیں۔

"ماں سے بھی کبھی اولاد کے دل کا حال چُھپتا ہے بچہ۔" انہوں نے آہستگی سے کہا۔ اس سے پہلے کہ چنگاری شعلہ بنے انہوں نے نوشیرواں کو زنجیر کرنے کا سوچا تھا۔ پہلے تھوڑے زخم لگے ہیں دل پر جو...... لیکن وہ نہیں جانتی تھیں چنگاری تو کب کی شعلہ بن چکی تھی اور یہ بات خود نوشیرواں کو بھی ابھی ابھی معلوم ہوئی تھی کہ سیمل اس کے لیے کتنی اہم ہوچکی ہے اور وہ سیمل کے علاوہ کسی اور کو زندگی میں شامل نہ کرنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ وہ تھکے تھکے انداز میں بیڈ پر بیٹھ گیا۔ سیمل کو دل میں چھپا کر کسی اور کے ساتھ زندگی بسر کرنا اس کو دھوکا دینا ہے اور نوشیرواں عادل نے زندگی میں کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا۔ جانماز بچھاتے ہوئے اس نے سوچا اور اس روز جب اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو اس کی دعاؤں میں ایک اور دعا کا اضافہ ہوچکا تھا۔ عمر بھر کے لیے سیمل کی رفاقت اور ساتھ کی دعا۔

☆☆☆

سیمل نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو دعا مانگتے ہوئے وہ جھجک گئی۔ کتنے سالوں سے وہ ایک ہی دعا مانگے جارہی تھی۔ اماں کی صحت اور مروان کی واپسی کی دعا۔ کیا آخرت کے مسافر بھی کبھی پلٹ کر آسکتے ہیں۔ وہ جانتی تھی کہ نہیں...... پھر یہ دعا مانگ کر اتنے سالوں سے خود کو کیوں دھوکا دے رہی تھی۔ وہ شرمندہ سی ہاتھ بلند کیے بیٹھی تھی تب بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

"اے اللہ مروان کو مغفرت عطا فرما...... اس کے درجات بلند کر......" وہ دعا مانگ رہی تھی اور اس کے آنسو اس کی ہتھیلیوں پر گر رہے تھے۔

"یا اللہ...... ابا کا دل موم کردے، ان کے دل سے اماں کے لیے نفرت ختم کردے۔ یا اللہ انہیں میرے حق میں اور اماں کے حق میں ایسا کردے جیسا کہ باپ اور شوہر ہونے کا حق ہے۔" آج پہلی بار وہ ابا کے لیے دعا مانگ رہی تھی۔ دعا مانگ کر اس نے ہاتھ چہرے پر پھیرے اور جانماز تہ کر کے رکھی پھر اماں کی طرف دیکھا جو ایک رسالہ کھولے بیٹھی تھیں۔ جب وہ میراں اماں کے گھر سے آئی تھی تب بھی ان

کے ہاتھ میں رسالہ تھا شاید انہوں نے اس کے بیڈ سے اٹھایا تھا اور اس وقت بھی انہوں نے وہ رسالہ اٹھایا ہوا تھا۔

''اماں جی مغرب کا وقت ہے۔'' اس نے انہیں متوجہ کرنے کے لیے کہا، انہوں نے فوراً رسالہ بند کر کے رکھ دیا تو وہ مسکرا دی۔ ''اماں جی باہر چلیں اندر گھٹن اور حبس ہے بہت۔ میں چائے بناتی ہوں آپ صحن میں بیٹھیں'' فضیلت نے جانے سے پہلے چھڑکاؤ کیا تھا۔ زمین تو جیسے اور گرم ہو گئی تھی۔

اماں اٹھ کھڑی ہوئیں انہیں تخت پر بٹھا کر اس نے موتیے کی چند ادھ کھلی کلیاں توڑ کر اماں کو دیں تو وہ بالکل پہلے کی طرح انہیں کان میں ڈالنے لگیں۔ وہ چائے بنا کر لائی تو اماں کانوں میں موتیے کے پھول ڈالے بیٹھی تھیں۔ اس نے تخت کے سامنے چھوٹی سی ٹیبل رکھ کر چائے کا سامان اس پر رکھا اور برآمدے کی لائٹ جلائی پھر چائے پیتے ہوئے ہمیشہ کی طرح اُن سے باتیں کرنے لگی۔ میراں اماں کی، نوشیرواں کی، حمنہ کی اور یونیورسٹی کی' آج چائے پیتے ہوئے اماں نے بہت دلچسپی سے اس کی باتیں سنیں اور جب وہ چائے کے برتن رکھ کر واپس آئی تو وہ اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھیں۔

''باہر مچھر آ گئے ہیں۔'' انہوں نے مڑ کر اسے بتایا تھا۔

''ٹھیک ہے اماں، آپ جائیں میں کھانا بناتی ہوں۔ فضیلت نے صبح کریلے گوشت بنایا تھا لیکن میرا دل نہیں چاہ رہا اب کھانے کو، کھچڑی بنا لوں۔''

''ہاں بنا لو۔'' انہوں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

''اماں ٹھیک ہو رہی ہیں، وہ تبدیل ہو رہی ہیں۔ اس طرح کا رسپانس تو ان آٹھ سالوں میں انہوں نے ایک بار بھی نہیں دیا تھا۔ ڈاکٹر جو بھی کہیں ایک اور ہستی بھی تو ہے اوپر آسمانوں پر سب سے ماورا سب سے بلند چاہے تو مُردے کو زندہ کر دے چاہے تو آسمان الٹ دے، کیا وہ ہستی اماں کو صحیح نہیں کر سکتی بالکل پہلے جیسا...... شاید میری دعا اللہ نے سن لی۔''

کھچڑی بناتے ہوئے اس نے خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کیا تھا۔

رات وہ بہت سکون سے سوئی تھی۔ یونیورسٹی بند ہو چکی تھی۔ اس لیے وہ رات دیر سے سوئی تھی لیکن پھر بھی اس کی آنکھ فجر کے وقت کھل گئی تھی۔ اس نے دیکھا اماں جانماز پر بیٹھی تھیں اور ان کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھے ہوئے تھے۔ وہ بڑی خوشی سے آنکھیں نیم وا کیے انہیں دیکھتی رہی، جب وہ جانماز تہ کر رہی تھیں وہ اٹھ کر بیٹھ گئی وہ بیڈ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی جب اماں جانماز اپنے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی دراز میں رکھ کر اس کی طرف مڑیں اور انہوں نے بہت پہلے کی طرح اس کے قریب آ کر اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر پھونک ماری اور پھر اس کی پیشانی چوم لی۔ اس نے بے اختیار ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر چوم لیے اور پھر انہیں آنکھوں سے لگا کر چھوڑ دیا۔

''یا اللہ تیرا شکر ہے۔ لاکھ لاکھ شکر ہے تو اپنے بندوں کی دعائیں ضرور سنتا ہے۔'' وہ نم آنکھوں کے ساتھ واش روم چلی گئی۔ وہ یقیناً اپنے بندوں کی دعائیں سنتا ہے جب وہ صدقِ دل سے اسے پکاریں۔ اس نے مشیتِ ایزدی کے آگے سر جھکا دیا تھا۔ اس نے تسلیم کر لیا تھا کہ مروان اب نہیں رہا اور وہ جو دنیا میں آتا ہے اسے ایک روز جانا بھی ہوتا ہے تو اللہ نے بھی اس کے لیے درِ قبولیت کھول دیا تھا لیکن وہ نہیں جانتی تھی کل جب اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تھے تو وہ کوئی قبولیت کا لمحہ تھا اور اس کی دعائیں مستجاب ہو گئی تھیں۔ وہ سرشاری سی ناشتا بناتی رہی۔ جب اماں باہر تخت پر بیٹھی ناشتا کر رہی تھیں تو وہ بار بار انہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی

تھیں لیکن جب وہ نگاہ اٹھا کر سیمل کی طرف دیکھتی تھیں تو ان کی نگاہوں میں وہ خالی پن نہیں ہوتا تھا۔

آج فضیلت نے دیر سے آنا تھا۔ وہ گھر پر ہی تھی اس لیے اس نے خوشی خوشی اسے اجازت دے دی تھی۔

آج موسم اچھا تھا۔ آسمان پر بادل تھے اور فضا میں مٹی کی مہک تھی جیسے رات کہیں بارش ہوئی ہو۔ دھوپ ابھی ان کے صحن میں نہیں آئی تھی۔ وہ ناشتے کے خالی برتن سنک میں رکھ کر اپنی کتابیں اٹھا کر باہر ہی آ گئی۔ کتابوں کا ڈھیر اس نے تخت پر رکھا اور خود کرسی پر بیٹھ کر پڑھنے لگی۔

''اماں میں ماسٹر کر کے پھر پبلک سروس کمیشن کی تیاری کروں گی۔ اور جاب کروں گی۔'' ضروری پوائنٹس کو مارک کرتے ہوئے اس نے اماں سے کہا۔ اماں اس کی کوئی کتاب کھولے یونہی اس کی ورق گردانی کر رہی تھیں۔ پتا نہیں کتنی دیر گزر گئی وہ اپنے نوٹس بنانے میں مگن تھی کہ اماں نے اسے بلایا۔

''گڑیا......'' اس نے چونک کر اماں کی طرف دیکھا۔ کتاب ابھی بھی ان کے ہاتھ میں تھی۔

''جی اماں جی۔''

''بیٹا وہ رومی......'' وہ الجھی الجھی سی اسے دیکھ رہی تھیں۔ ''رومی کہاں ہے، وہ اتنے دنوں سے گھر کیوں نہیں آیا؟''

''اماں جی۔'' اس کی آواز اس کے حلق میں ہی پھنس گئی تھی۔ ''اماں جی وہ رومی بھائی......'' اس نے بتانے کی کوشش کی تب ہی دروازے کی بیل بجی، مسلسل جیسے کوئی بیل پر ہاتھ رکھ کر اٹھانا ہی بھول گیا ہو۔

''اوہو، یہ فضیلت بھی بس۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی، مڑ کر اماں کی طرف دیکھا اور برآمدے سے صحن میں آ گئی اور دروازہ کھولا۔

''تم بھی نا فضیلت......'' اور پھر لفظ اس کے ہونٹوں میں ہی رہ گئے۔ وہ باہر کھڑی ہستی کو حیرت اور خوف سے دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک دم پلٹ کر بھاگی۔

''سنو...... سنو گڑیا۔'' حبیب خان نے اندر قدم رکھا اور اسے پکارتے ہوئے اس کے پیچھے چلے آئے تھے۔

''نہیں......'' اس نے مڑ کر انہیں دیکھا۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔

''اماں ......وہ...... ابا......'' اماں یکدم کھڑی ہو گئی تھیں اور انہوں نے اسے اپنے پیچھے چھپا لیا تھا اور وہ ان کے پیچھے کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

''گڑیا بیٹا ڈرو نہیں، کیوں ڈر رہی ہو مجھ سے......'' وہ صحن عبور کر کے برآمدے میں قدم رکھ چکے تھے۔

اماں حیرانی سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ اپنے دونوں بازو پیچھے کیے وہ سیمل کے گرد لپیٹے ہوئے تھیں اور سیمل ان کی پشت سے چپکی ہوئی تھی۔

''یا اللہ میراں اماں اوپر سے جھانک لیں اور نوشیرواں آ کر مجھے ابا سے بچا لے۔'' اس کے دل سے دعا نکلی۔ آج اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ مروان کہیں سے آ کر اسے ابا سے بچا لے۔ آج اس نے نوشیرواں کو سوچا تھا۔ وہ خود ہی حیران ہوئی تھی۔

''کہاں چھُپ گئے تھے تم لوگ' میں کب سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا۔ کہاں، کہاں نہیں میں نے تم لوگوں کو تلاش کیا۔'' ان کی آواز میں لرزش تھی۔

''جب ان وکیل صاحب کا خیال آیا جو تم لوگوں کے معاملات کی نگرانی کرتے تھے تو وہ ملک سے باہر جا چکے تھے۔ کتنے چکر لگائے تھے ان کے دفتر کے...... ایک بار گیا تو دفتر کو تالا لگا ہوا تھا۔ پتا چلا اسلام آباد شفٹ ہو گئے ہیں۔ کہاں...... کس جگہ کوئی فون نمبر، کچھ نہ معلوم ہو سکا۔''

گڑیا نے اماں کے پیچھے سے جھانک کر دیکھا، اسے لگا تھا جیسے وہ رو رہے ہوں لیکن وہ تو اسے دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس نے سر فوراً پیچھے کرلیا۔

''کتنا تڑپا ہوں میں تمہارے لیے...... اس دن کے بعد دوبارہ تم نظر نہ آئیں۔ گویا غائب ہی ہو گئیں، میں ہفتوں اس جگہ پر جاتا رہا۔ گاڑی پارک کر کے گلیوں میں چکراتا پھرتا کہ شاید تم نظر آجاؤ۔''

یہ وہ ابا تو نہ تھے...... جنہیں سیمل جانتی تھی۔ اتنی نرمی سے، اتنی عاجزی سے بات کرنے والے...... ابا کی آواز کی گرج سے تو جیسے گھر ہل جایا کرتا تھا لیکن آج......

اماں ابھی تک حیران کھڑی تھیں اور ان کے بازو سیمل کے گرد سے ہٹ کر ان کے پہلوؤں میں آگرے تھے۔

''مینا...... مینا مجھے معاف کردو۔'' ان کی آواز بھرّا گئی تھی۔ سیمل اب اماں کے پیچھے سے نکل کر ان کے قریب کھڑی حیرت سے ابا کو دیکھ رہی تھی۔ زندگی میں پہلی بار انہوں نے اماں کو ان کے نام سے بلایا تھا۔ وہ پہلی بار ان کے لبوں سے اماں کا نام سن رہی تھی۔ اس کے کانوں میں ابا کی آواز گونج رہی تھی۔

''احمق عورت...... جاہل عورت...... یہ عورت......'' اور مروان ان کے اس طرزِ تخاطب سے کتنا چڑتا تھا۔ اگر وہ ہوتا تو اس وقت کتنا خوش ہوتا۔ کتنی حسرت تھی اسے کہ ابا کبھی احترام سے، عزت سے اماں کا نام لیں...... عزت، احترام سے نہ سہی یونہی بس نام لے کر بلالیں۔

''کاش...... اے کاش رومی ہوتا اس وقت......'' اپنی پلکوں کو جھپک کر اس نے ابا کو دیکھا۔

''میں نے تمہیں بہت ستایا مینا...... بہت گنہگار ہوں تمہارا...... اور ان شریف اور نیک لوگوں کا جنہوں نے مجھے، مجھ گندی نالی کے بے نام ونشان شخص کو اپنا نام دیا، پستی سے اٹھا کر بلندی تک پہنچایا، مجھے محبت دی، تحفظ دیا، زندگی کی ہر آسائش دی اور وہ سب کچھ دیا جس کی خواہش کوئی بھی شخص کرسکتا ہے اور میں نے سوائے اذیت کے انہیں کچھ نہیں دیا۔ ابا نے جن نظروں سے آخری بار مجھے دیکھا تھا ناں...... ان نظروں کا دکھ میرے دل میں گڑ گیا ہے مینا۔'' آنسو ان کے رخساروں پر پھسل رہے تھے۔ ابا رو رہے تھے۔ جنہوں نے ہمیشہ رُلایا تھا اسے...... اماں کو...... رومی کو۔

''میں راتوں کو سو نہیں پاتا ہوں مینا...... آنکھیں بند کرتا ہوں تو ابا میرے تصور میں چلے آتے ہیں۔ اماں کی وفات پر میں نے انہیں اکیلا وہاں چھوڑ دیا تھا...... کتنی بے دردی سے میں نے کہہ دیا تھا کہ میرا ان سے کوئی رشتہ نہیں۔'' ابا بول رہے تھے اور وہ اماں کے بازو سے لگی اب بھی حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

''مجھے معاف کردو مینا۔'' انہوں نے ہاتھ جوڑ دیے پھر یکدم ان کے پاؤں کی طرف جھکے۔ ''میں تمہارے پاؤں پکڑتا ہوں مینا......'' اماں یکدم پیچھے ہٹی تھیں۔

ابا ملتجی نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

اماں پیچھے ہٹتے ہٹتے تخت سے جالگیں۔

''بہت زیادہ ناراض ہو مجھ سے مینا۔ ایک بار مجھے معاف کردو۔'' سیمل اماں کو دیکھ رہی تھی جو ساکت سی تخت کے ساتھ کھڑی سامنے ابا کو دیکھ رہی تھیں۔

''پتا نہیں اماں، ابا کو پہچان بھی رہی ہیں۔ معلوم نہیں وہ ابا کی بات کو سمجھ بھی رہی ہیں۔'' سیمل نے اماں کو دیکھا اور پھر ابا کو یہ بتانے کے لیے منہ کھولا کہ اماں ٹھیک نہیں ہیں اور یہ کہ اماں کی یہ حالت برسوں سے ہے لیکن اماں نے اسے حیران کردیا، وہ بڑے اطمینان سے کہہ رہی تھیں۔

''میں تو کبھی آپ سے ناراض نہیں ہوئی تھی۔ بس آپ پر ترس آتا تھا، مجھے تو ڈر لگتا تھا کہ آپ کی یہ خود پرستی آپ کو نقصان نہ پہنچادے۔'' وہ آنکھیں پھاڑے اماں کو اتنا زیادہ بولتے دیکھ رہی تھی۔

''ہاں نقصان تو اتنا بڑا ہوگیا کہ کبھی اس کی تلافی نہیں ہوسکتی...... اللہ نے مجھے سبق سکھانے کے لیے میرا بیٹا مجھ سے لے لیا اور اس سچ مچ کی جاہل عورت کو مجھ پر مسلط کردیا۔''

''کون بیٹا؟'' اماں کی سوالیہ نظریں ان کی طرف اٹھیں، ان کی آنکھوں میں الجھن تیر رہی تھی۔ ابا نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

''ہمارا بیٹا...... رومی...... ہمارا مروان۔ اماں، ابا کا لاڈلا شہزادہ...... اماں، ابا کو کتنا پیار تھا اس سے اور میں نے کتنا ترسایا انہیں۔ وہ فون کرتے، میں رومی سے بات نہ کرواتا۔ وہ اسے بلاتے میں نہ بھیجتا...... اور اب میں خود اس کے لیے ترس رہا ہوں۔ پورے گھر میں اوپر نیچے پاگلوں کی طرح اسے ڈھونڈتا پکارتا ہوں لیکن وہ کہیں نہیں نظر آتا مینا...... کہیں نظر نہیں آتا۔ وہ ایک دفعہ مجھے نظر آجائے...... بھلے مجھ سے جھگڑے، ناراض ہو۔ میں ایک بار اسے سینے سے لگا کر اس کے جوان جسم کی حرارت سے خود کو مضبوط سمجھوں۔ بس ایک بار مینا...... لیکن وہ نہیں ہے، وہ کہیں نہیں ہے...... ابا نے بھی تو آخری بار فون کیا تھا۔ ایک بار...... آخری بار حبیب خان مجھے رومی سے ملوادو اور خود بھی مل جاؤ۔'' وہ دہاڑیں مار مار کر رونے لگے۔

''ابا جی......'' سیمل تڑپ کر اماں کے قریب سے ان کی طرف بڑھی تو انہوں نے اپنے بازو وا کردیے اور وہ مروان کے جانے کے آٹھ سالوں بعد ابا کے سینے سے لگی رو رہی تھی، بلک رہی تھی۔ ''ابا جی، رومی بھائی ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔'' وہ رومی کے لیے سیکڑوں بار روئی تھی اکیلے، تنہا یا حمنہ کے گلے لگ کر لیکن ابا کے گلے لگ کر وہ پہلی بار رو رہی تھی۔ ابا بھی رو رہے تھے۔ اماں بھی رو رہی تھیں لیکن ان کی آنکھوں میں وحشت تھی پھر ابا ہولے ہولے اسے تھپکنے لگے۔

''حوصلہ کرو چندا، گڑیا بیٹا بس کرو اب، اللہ کی امانت تھی...... اس نے اپنی امانت لے لی۔ اللہ نے اسے سرخرو کیا۔ ایسی موت جس کی تمنا سب کریں۔'' پہلی بار مروان کی موت کے بعد سیمل کو لگا تھا جیسے اس کے دل پر کسی نے مرہم رکھا ہو۔ ابا سے الگ ہو کر اس نے اماں کی طرف دیکھا۔ وہ سہمی سہمی سی کھڑی تھیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''اماں......'' وہ ان سے لپٹ گئی اور اب وہ دونوں ایک دوسرے کے گلے لگے رو رہی تھیں۔ جیسے آج، ابھی رومی کی شہادت کی اطلاع آئی ہو۔ بہت دیر بعد جب وہ تینوں سنبھلے تو سیمل بھاگ کر کرسی اٹھا لائی۔ اماں تخت پر بیٹھ کر اپنے ہاتھوں کو گود میں دھرے دیکھ رہی تھیں اور سیمل اماں سے جُڑی بیٹھی ابا سے ان آٹھ سالوں کی روداد سن رہی تھی۔

''میرے بیمار ذہن نے مجھے نازو سے شادی پر اس لیے اکسایا تھا کہ میں تمہیں اور رومی کو اذیت دے سکوں۔ میں کسی اعلیٰ خاندان کی لڑکی سے شادی کرتا تو شاید تمہیں اتنی اذیت نہیں ہوتی جتنی نازو سے شادی پر تمہیں اور رومی کو اذیت ہوئی تھی۔ مجھے کیا خبر تھی مینا کہ رومی مجھے تہی دامن کر کے چلا جائے گا۔ جب مجھے فون آیا کہ میں اپنے بیٹے کی ڈیڈ باڈی وصول کرلوں تو ایک لمحے کو تو مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ آخر رومی کی ڈیڈ باڈی مجھے کیوں وصول کرنے کو کہا جا رہا ہے پھر مجھے ادراک ہوا کہ میرے ساتھ کیا ہوگیا ہے۔ وہ اذیت جو میں رومی کو دینا چاہتا تھا اس سے کئی گنا زیادہ اذیت

وہ مجھے دے کر چلا گیا تھا۔ میں رومی کے لیے تڑپتا تھا تو نازو مجھے تڑپنے نہیں دیتی تھی۔ رومی میرا بیٹا تھا وہ جب پیدا ہوا تھا تو میں نے اس کی پیدائش پر فخر محسوس کیا تھا۔ جس کی کامیابیوں پر میں دل میں مسرور ہوتا اور فخر محسوس کرتا تھا گو ظاہر نہیں کرتا تھا۔ وہ اس بیٹے کی دائمی جدائی پر مجھے رونے نہیں دیتی تھی، وہ مجھے رومی کو گڑیا کو اور تمہیں یاد کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتی تھی۔ میں تمہیں اور گڑیا کو گھر لانے کی بات کرتا تو وہ فساد کھڑا کر دیتی۔ اس لیے رومی کی شہادت کے چھ ماہ بعد ہی میں نے اسے طلاق دے دی۔ بس میرا ایک ہی کام رہ گیا تھا تمہیں ڈھونڈنا...... میں آفس سے اٹھتا اور سڑکوں پر گلیوں میں چکراتا پھرتا کہ شاید کہیں کسی جگہ پر تم نظر آ جاؤ...... کل رات وکیل صاحب اچانک مجھے نظر آ گئے وہ اپنے کسی کیس کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے۔ میں نے رات کیسے گزاری، بتا نہیں سکتا...... میں تو منہ اندھیرے ہی سڑک پر آ کھڑا ہوا اور انتظار کرتا رہا کہ سورج نکلے تو دروازے پر دستک دوں۔'' وہ پھر رونے لگے تھے۔ اماں ایسے ہی بیٹھی تھیں چپ اور گود میں رکھے ہاتھوں کے ناخنوں میں جانے کیا تلاش کرتی رہیں۔ سیمل نے اماں اور ابا دونوں کو پانی پلایا۔

''تمہاری اماں میری طرف دیکھتی نہیں، سیمل گڑیا، مجھ سے بات نہیں کرتیں ان سے میری سفارش کر دو بیٹا ایک بار دل سے مجھے معاف کر دیں۔ مجھے تلافی کا موقع دے دیں۔'' تب سیمل نے روتے ہوئے انہیں اماں کے متعلق بتایا تھا اور ان کا سر جھک گیا...... وہ بے حد نادم ہو کر سیمل سے معافی مانگنے لگے۔

''اس طرح کی باتیں نہ کریں ابا جی۔'' سیمل اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میں ناشتا بناتی ہوں۔''

''نہیں، تم دونوں ابھی چلو میرے ساتھ۔'' وہ مچلے تھے۔

''ابھی؟'' سیمل پریشان ہو گئی۔

''ابھی کیسے ابا جی؟ یہاں برسوں رہے ہیں۔ ان لوگوں نے ہمارا بہت ساتھ دیا، ہمارے ہر دکھ سکھ میں شریک...... ورنہ رومی کے بعد میں اور اماں بہت اکیلے تھے، اماں بیمار، حواس سے بیگانہ اور میں اکیلی...... میں ان سب سے مل کر انہیں بتا کر ہی جا سکتی ہوں...... ایک دم سے ایسے کیسے، مجھے تو ابھی کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہا...... یہ سب کیا ہے۔ آپ کی آمد، سچ بتاؤں ابا جی مجھے یقین نہیں آ رہا کہ......''

''ٹھیک ہے جب تمہیں یقین آ جائے تو تب چلیں گے۔'' حبیب خان بہت محبت سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''لیکن میں اب ایک دن کی بھی دوری برداشت نہیں کر سکتا۔ میں بھی یہاں ہی رہوں گا۔ تمہارے پاس جب تک تم یہاں ہو۔'' وہ آہستہ سے بولے۔

''مینا مجھے نکالو گی تو نہیں......؟'' وہ لگاوٹ سے اماں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ ناشتا بنانے کے لیے کچن میں چلی گئی۔ وہ ابا کی اس طرح اچانک آمد پر ابھی تک حیران تھی۔

''اور کیا پتا ابا نازو کے کہنے پر یہاں آئے ہوں اور ہمیں لے جا کر وہ لیکن نہیں......'' اس نے خود ہی اپنے خیالات کی نفی کر دی۔ ''یہ سب ڈراما نہیں ہو سکتا اور ابا کو بھلا یہ ناٹک کرنے کی کیا ضرورت ہے، وہ چاہتے تو زبردستی بھی ساتھ لے جا سکتے تھے اور انہیں کون ایسا کرنے سے روک سکتا تھا بھلا۔'' ناشتے کے بعد وہ اماں کو کمرے میں لے آئی تھی، ایک بار پھر انہوں نے چپ کی چادر اوڑھ لی۔ ابا نے اماں کی فائل دیکھی۔

''میں ڈاکٹر عرفان سے مل کر ان کی کنڈیشن معلوم کرتا ہوں۔''

''میں تو اماں کی آواز سننے کو ترس گئی تھی ابا جی یہ جو اماں نے ذرا ذرا سا بولنا شروع کیا ہے تو صرف چند ماہ سے ورنہ تو......''

''فکر نہ کرو، میں انہیں بڑے سے بڑے ڈاکٹر کے پاس لے کر جاؤں گا بیٹا...... اگر باہر جانا پڑا تو باہر لے جاؤں گا۔'' وہ کہہ رہے تھے اور سیمل کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ اماں کو میڈیسن دے کر اس نے ابا کی طرف دیکھا۔

''ابا جی آپ اِدھر لیٹ جائیں، رات بھر کے جاگے ہوئے ہیں کچھ دیر آرام کر لیں۔'' اپنے بیڈ کی طرف اشارہ کر کے اس نے تڑے مڑے تکیے صحیح کیے تھے۔ وہ اور رومی یونہی سنبل کے تکیوں کو توڑ مروڑ کر سر کے نیچے رکھتے تھے۔

''فضیلت آتی ہو گی، میں ذرا کچن میں سمیٹ لوں۔'' جب وہ کچن سمیٹ کر آئی تو ابا بیڈ پر ٹانگیں لٹکائے گود میں تکیہ دھرے بیٹھے تھے۔ تکیے پر کہنیاں رکھے دائیں ہاتھ کے پیالے میں ٹھوڑی رکھے وہ بڑے انہماک سے اماں سے باتیں کر رہے تھے اور ان کی آنکھیں لمحے لمحے بعد لو دینے لگتی تھیں...... سیمل دروازے کے ساتھ ہی پڑی کرسی پر بیٹھ کر ابا کو دیکھنے لگی...... یہ لو دیتی خوب صورت آنکھیں رومی کی آنکھوں سے کتنی ملتی تھیں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں تھا کہ ابا بے حد خوب صورت تھے لیکن آج سے پہلے وہ اسے کبھی خوب صورت نہیں لگے تھے بلکہ جب وہ چھوٹی تھی تو سوچتی تھی کہ اگر ابا کے سر پر دو چھوٹے چھوٹے سینگ لگا دیے جائیں اور ان کے دو دانت باہر لٹک آئیں تو وہ بالکل سامری جادوگر یا زکوٹا جن لگیں...... یا پھر کوئی دیو، اس بات نے اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔ اس نے فوراً ہی ہونٹ بھینچ کر مسکراہٹ دبائی لیکن ابا کا دھیان اس کی طرف نہیں تھا۔ وہ تو جانے ماضی کے کون کون سے ورق کھولے بیٹھے تھے۔

''تمہیں یاد ہے مینا جب میں باہر جا رہا تھا تو تم بڑے کمرے کی سلاخوں والی کھڑکی سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے صحن میں کھڑے کھڑے اماں، ابا سے مل کر یونہی نظریں اٹھائی تھیں تو تم پر نظر پڑی تھی تم فوراً ہی پیچھے ہٹ گئی تھیں لیکن میں نے تمہاری آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلملاہٹ دیکھ لی تھی اور حیران ہوا تھا کہ تم رو کیوں رہی ہو...... اور اس پر بھی حیران ہوا تھا کہ تم اماں، ابا اور پھپو کے ساتھ حویلی کے گیٹ تک مجھے خدا حافظ کہنے نہ آئیں بلکہ برآمدے سے ہی واپس چلی گئی تھیں۔ شاید تم مجھ سے اپنے آنسو چھپانا چاہتی تھیں یا پھر شاید تم مجھے بہت دھیان سے سب سے چھُپ کر دیکھنا چاہتی تھیں۔ تب تم اتنی بڑی بھی تو نہیں تھیں نا...... شاید آٹھویں جماعت میں پڑھتی تھیں اور جب میں واپس آیا تھا تو ایک لمحے کو تو میں تمہیں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ ارے یہ مینو ہے...... اتنی ملاحت، اتنا حُسن، میں تو مبہوت سا تمہیں دیکھے ہی جاتا اگر ابا میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے عاصمہ خالہ سے نہ ملواتے۔''

''یہ عاصمہ ہے تمہاری اماں کی خالہ زاد بہن، تم کو تو بالکل یاد نہیں ہو گا...... جب تم چھوٹے سے تھے تو یہ کراچی چلی گئی تھیں اب ان کے میاں اپنی ملازمت سے ریٹائر ہوئے ہیں تو یہ واپس گاؤں آ گئی ہیں۔'' اس وقت مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ عاصمہ خالہ میری زندگی میں کیا زہر گھولنے والی ہیں۔ میں نے تمہیں پھر دیکھا تھا، تم چپکے چپکے مجھے دیکھتی تھیں اور جب میں تمہاری طرف دیکھتا تو تم فوراً نظریں چُرا لیتیں اور مجھے تمہاری اس چوری پر ہنسی آ جاتی جسے میں سر جھکا کر چھپا لیتا تھا۔'' اس نے اماں کی طرف دیکھا وہ سر جھکائے ہاتھ گود میں دھرے بیٹھی تھیں۔ ان کے لبوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ تھی۔ وہ ذرا سی پلکیں اٹھا کر ابا کو

بھٹکتیں اور کبھی یکدم ساکت نظروں سے ابا کو دیکھنے لگتیں۔ سیمل چپکے سے اٹھ کر باہر آ گئی۔ کچھ دیر وہ برآمدے میں کھڑی رہی پھر فضیلت کو بتا کر صحن میں آ کر دیوار پر سے دوسری طرف کود گئی۔ میراں اماں اپنے برآمدے میں تخت پر بیٹھی ابھی تک قرآن پاک پڑھ رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر مسکرائیں۔ قرآن کو جزدان میں لپیٹا۔

''آؤ، آؤ سیمل بچہ...... آج اتنی سویرے کیسے آ گئیں؟''

''اماں جان۔'' سیمل خوشی سے اُن کے گلے لگ گئی۔

''ابا آئے ہیں صبح صبح......'' وہ انہیں تفصیل بتانے لگی۔

''وہ ہمیں ساتھ لے جانا چاہتے ہیں گھر...... مگر میں......''

''نہ بچہ ضرور جاؤ اپنے ابا کے ساتھ۔ اللہ نے ان کا دل پھیرا ہے، شکر کرو سیمل بچہ اپنے رب کا۔ بغیر سائبان عورت ایسی ہی ہوتی ہے جیسے چوراہے پر پڑی چیز...... جس کا جو جی چاہے سلوک کرے، عورت تو اپنے سائبان سے ہی معتبر ہوتی ہے سیمل بچہ، باپ، بھائی، شوہر، بیٹا کوئی تو ہو۔ اکیلی عورت تو چار دیواری میں بھی غیر محفوظ ہوتی ہے۔ تمہاری اماں کی یہ حالت...... شکر اللہ کا لوگ اچھے ہیں آس پاس کے، مروت لحاظ والے، خیال رکھتے ہیں تم دونوں کا پر بیٹا نیت بدلنے میں کون سی دیر لگتی ہے۔ یہ تو حاجی صاحب تمہاری حمنہ کے ابا کا رعب داب ہے کہ کوئی آنکھ اٹھا کر تمہارے گھر کی طرف نہیں دیکھتا پر کب تک بچہ...... اکیلی عورت پر تو جھپٹنے کے لیے گدھوں کی طرح منہ کھولے بیٹھے ہوتے ہیں دنیا والے۔ اللہ کا نام لے کر ابا کے ساتھ سدھارو۔''

''جی اماں جان۔'' سیمل کے دل میں اگر کوئی الجھن تھی تو میراں اماں کی باتوں سے دور ہو گئی تھی۔

''ابا بہت بدل گئے ہیں۔ مردان کی موت نے انہیں اندر سے توڑ دیا ہے۔'' جزدان میں لپٹے قرآن شریف کو گود سے اٹھا کر میراں اماں اٹھیں۔

''بیٹھ بچہ، میں یہ قرآن رکھ آؤں تو تیرے لیے چائے بناتی ہوں۔''

''نہیں، اماں جان میں تو چائے پی کر آئی ہوں۔ آپ نے ابھی تک چائے نہیں پی؟''

''ہاں، آج شیری صبح صبح ہی چلا گیا۔''

''کہاں......؟'' سیمل کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

''یہی اسلام آباد، پنڈی تک گیا ہے۔''

''اچھا۔'' سیمل کے اندر مایوسی سی پھیل گئی۔

''کب تک واپس آئیں گے؟''

''بتا کر تو نہیں گیا...... ایک دو روز تک آ جائے گا۔'' میراں اماں نے بغور اس کے چہرے کو دیکھا تھا اور پھر قرآن لے کر کمرے میں چلی گئیں اور جب کمرے سے نکلیں تو سیمل کچن میں کھڑی تھی۔ کچن کے دروازے سے جھانک کر اس نے میراں اماں کو دیکھا۔

''اماں جان، آپ بیٹھیں میں چائے بناتی ہوں اور ناشتے میں کیا لیں گی، پراٹھا بنا دوں؟''

''نہ، نہ سیمل بچہ بس چائے کے ساتھ رس دے دینا...... اُدھر کاؤنٹر پر ہی ڈبا پڑا ہے۔'' وہ تخت پر آ کر بیٹھ گئی تھیں۔

''کاش یہ اتنی اچھی، اتنی پیاری لڑکی شیری کا مقدر بن سکتی لیکن اتنے امیر باپ کی بیٹی اور کہاں ہم خانماں برباد۔ اللہ میرے شیری کے دل سے اس کا خیال نکال دے۔ ایسا لٹا پٹا...... ایسا زخمی دل...... ایک اور زخم کھانے کی کہاں گنجائش ہے اس کے دل میں میرے مولا۔ ماں، باپ، بہن، بھائی پہلے ہی

سارے رشتے لُٹا کر بیٹھا ہے میرا بیٹا۔ اب ایک اور رشتے کا درد اسے نہ دینا مولا۔'' وہ دل ہی دل میں اللہ سے باتیں کیے گئیں، دعائیں کیں اور پھر نم آنکھوں کو پونچھا۔ جب سیمل ٹرے میں ناشتا لگائے آ گئی۔ ان کے منع کرنے کے باوجود اس نے ڈبل روٹی سینک لی تھی اور انڈا بھی فرائی کر لیا تھا۔

''منع کیا تھا سیمل بچے۔'' نم آنکھیں پونچھ کر انہوں نے ٹرے کی طرف دیکھا...... ''اور جو میری زلیخا ہوتی تو وہ بھی یہی کرتی۔ میرے منع کرنے کے باوجود وہ اپنی مرضی سے ناشتا بنا لیتی تھی کہ اماں جان ناشتا ضروری ہے۔ وہ ہنستی...... اور ہنسنے میں اس کے ڈمپل کتنے نمایاں ہو جاتے تھے۔'' ایک ٹھنڈی سانس لے کر انہوں نے سلائس اٹھا لیا تھا۔

''اپنے لیے بھی چائے بنا لینا تھی بچے۔''

''نہیں اماں جان، ابھی تو پی کر آئی ہوں۔''

میراں اماں کو ناشتا کرتے چھوڑ کر وہ دیوار پھلانگ کر گھر آ گئی۔ فضیلت صحن دھو رہی تھی۔ وہ شلوار کے پائنچوں کو بھیگنے سے بچاتے ہوئے کمرے میں آ گئی تو ابا اسی طرح تکیہ گود میں رکھے بیٹھے تھے۔ اور اماں یونہی وقفے وقفے سے مسکرا رہی تھیں۔

''پتا ہے مینا یہ عاصمہ خالہ تھیں جنہوں نے میرے دماغ میں یہ خناس بھرا تھا کہ تم میرے قابل نہیں ہو۔ میں جب بھی ان کی طرف جاتا وہ کہتی تھیں۔ تمہارے ساتھ بھائی صاحب اور آپا نے ظلم کیا...... کہاں تم اور کہاں مینا۔ وہ تو تمہارے پاؤں کی خاک بھی نہیں۔ تمہارے لیے تو کوئی بہت پڑھی لکھی اور خوب صورت ماڈرن لڑکی ہونی چاہیے تھی اور میرے اندر ان کی باتوں سے جو حس جاگ اٹھی تھی اس کا غبارہ پھولتا جا رہا تھا اور وہ اتنا پھولا کہ عاصمہ خالہ کی بیٹیاں بھی مجھے اپنے سے کمتر لگنے لگیں۔ وہ ایجوکیٹڈ تو تھیں...... لیکن خوب صورت نہیں تھیں۔''

''ابا اور اماں امینہ کو میرے ساتھ بیاہ کر اس احسان کا بدلہ لے رہے ہیں جو انہوں نے مجھے پال پوس کر کیا تھا۔ یہ مجھ سے عاصمہ خالہ نے کہا تھا۔''

''ابا جی......!'' سیمل نے انہیں چونکایا تھا۔

''دوپہر کے لیے کیا پکواؤں؟''

''میری بیٹی جو پکائے گی میں وہی کھاؤں گا۔''

''بیٹی کے ہاتھ کا پکا کھا کر تو آپ دوبارہ اس کھانے کا نام بھی نہیں لیں گے۔'' یہ اماں بولی تھیں۔ سیمل بے اختیار ہنسی تھی۔ کتنے سالوں بعد وہ اس طرح ہنسی تھی۔ وہ یکدم اپنی ہنسی سے خوفزدہ ہو گئی اور اس نے لب بھینچ لیے۔ مروان کہتا تھا۔

''ہنسا کرو گڑیا...... تم ہنستی کیوں نہیں ہو۔ خوش رہا کرو، تم خوش کیوں نہیں ہوتی ہو۔'' اور وہ اسے ہنسانے کے لیے کیسے کیسے لطیفے سناتا کہ وہ بے اختیار ہنس پڑتی تھی۔

''بھئی ہماری بیٹی جیسا بھی پکائے گی کچا پکا ہم شوق سے کھائیں گے۔'' ابا اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''دراصل ابا میں ابھی کھانا وانا نہیں بناتی۔ فضیلت ہی کرتی ہے سب...... اور اگر کبھی کوشش کروں تو وہ فضیلت سے بھی زیادہ خراب بنتا ہے۔ فضیلت بھی کوئی ماہر کک نہیں ہے لیکن گزارہ ہو جاتا ہے سو آج آپ بھی گزارہ ہی کریں۔''

''مینا کے ہاتھوں میں تو بہت ذائقہ تھا۔'' بے اختیار ہی ان کے لبوں سے نکلا تھا۔

''میں جب اماں سے سیکھ کر پکاؤں گی تو میرے ہاتھ میں بھی اماں جیسا ذائقہ ہو گا لیکن ابھی میں ذرا اپنا امتحان دے لوں۔''

''ابھی تم پڑھ رہی ہو؟'' ابا نے شاید دل ہی دل میں حساب لگایا تھا۔

"ہاں، دراصل رومی بھائی کے بعد میں نے پڑھائی چھوڑ دی تھی۔" وہ اماں کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی اور ابا کو رومی کے اس طرح اچانک چلے جانے کے بعد اپنی کیفیات بتانے لگی۔ اب ایک بار پھر وہ رو رہی تھی اور ابا اسے اپنے ساتھ لپٹائے اسے حوصلہ دے رہے تھے اور اماں ساکت بیٹھی خالی دیواروں کو تکتی جاتیں۔ کچھ دیر پہلے والی مسکراہٹ نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ آنکھیں ویران اور خالی تھیں ۔ اس نے ابا سے الگ ہو کر اماں کو لٹا دیا۔

"اماں دراصل میڈیسن کھانے کے بعد سو جاتی ہیں لیکن آج۔" اس نے ابا کی طرف دیکھا اور اماں کے پاس بیٹھ کر ہولے ہولے ان کا سر دبانے لگی۔ اماں کسی سعادت مند بچے کی طرح آنکھیں بند کیے لیٹی تھیں اور ابا حسرت سے اسے اماں کا سر دباتے دیکھ رہے تھے۔ فضیلت کے طفیل آس پاس سب کو ہی ابا کی آمد کا پتا چل گیا تھا۔ ابا ناشتے کے بعد کچھ دیر کے لیے باہر چلے گئے اور دن بھر آس پاس پڑوس کے گھروں سے آمدورفت کا سلسلہ جاری رہا۔ سب نے ہی خوشی کا اظہار کیا تھا۔ حمنہ بہت اداس تھی اور ابا کے آنے تک اس کے آس پاس ہی رہی تھی۔ وہ خود بہت اداس ہو رہی تھی۔ اتنے سارے سال اس نے یہاں گزارے تھے ان لوگوں کی محبتوں اور خلوص کے سہارے...... ابا واپس آئے تو ساتھ دو ملازم تھے۔ انہوں نے سب سامان پیک کر دیا تھا۔ اماں پھر سے چپ تھیں۔ بالکل خاموش جیسے کچھ سوچتی ہوں۔

"اماں جی، ابا ہمیں لینے آئے ہیں چلیں ان کے ساتھ۔"

"رومی...... اس سے پوچھو ناں، ناراض ہوگا؟" بہت دیر بعد اماں بولی تھیں۔

"نہیں اماں جی، رومی ناراض نہیں ہوگا۔ اس نے کہا تھا کہ اگر ابا کبھی بلائیں تو چلے جانا۔" اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھیں جل تھل ہو گئی تھیں۔

"اچھا!" اماں نے بس اتنا ہی کہا اور ان کی آنکھوں سے وہی خالی پن جھانکنے لگا۔

"کیا اماں اب کبھی ٹھیک نہیں ہوں گی۔ کیا یہ دھوپ چھاؤں کی سی کیفیت ہمیشہ رہے گی۔" وہ افسردہ سی ہو کر باہر آ گئی۔ ابا باہر صحن میں کھڑے اپنے موبائل پر کسی سے بات کر رہے تھے۔ بات کر کے انہوں نے سیمل کی طرف دیکھا۔

"تو کل صبح پھر چلیں۔"

سیمل نے سر ہلا دیا تھا۔

"تم خوش نہیں ہو سیمل...... تمہیں اچھا نہیں لگ رہا۔" وہ اس کے اداس چہرے کو دیکھ کر پتا نہیں کیا سمجھے تھے۔

"نہیں، مجھے رومی بھائی یاد آ رہے ہیں۔ انہیں یہاں صحن میں چارپائی بچھا کر لیٹنا اور آسمان پر تاروں کو دیکھنا بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ کہتے تھے وہاں دادا ابا کے گھر کے صحن سے بھی آسمان یونہی نظر آتا تھا۔"

"ہاں، ابا کے گھر میں مجھے بھی صحن میں لیٹ کر تاروں بھرا آسمان دیکھنا اچھا لگتا تھا۔" ابا یکدم ہی بہت اداس ہو گئے تھے۔

"جس صبح رومی بھائی کو جانا تھا ہم دیر تک باہر روڈ پر ٹہلتے رہے تھے اور ہم نے کافی ہاؤس میں جا کر کافی بھی پی تھی۔"

"اچھا، چلو ہم بھی چلیں سیمل آج وہاں جہاں جہاں اس نے قدم رکھے تھے۔ وہاں ہی جا کر کافی پئیں جہاں اس نے کافی پی تھی۔"

"جی ابا اگر آپ کا دل چاہتا ہے تو ضرور۔"

"ہاں میرا دل چاہتا ہے میں ان رستوں کو ان گلیوں، ان جگہوں کو دیکھوں جنہوں نے آخری بار میرے بیٹے کے قدموں کو چھوا تھا۔" پھر کھانا کھا کر وہ اماں اور ابا تینوں باہر نکلے تھے۔ آس پاس کی عورتیں

اور بچے حسب عادت پارک میں جا رہے تھے۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے روڈ کراس کر کے کافی ہاؤس میں آ پہنچے۔ سیمل کو مروان بے طرح یاد آیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ اور مروان سڑک کے کنارے کھڑے ہوں۔ ٹھنڈی یخ ہوائیں ان کے بدن کو چیرتی ہوں اور کیفے کے اندر ایک فیملی ہو اور......

"سیمل......" ابا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

"جی ابا جی۔" اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔ انہوں نے بے اختیار ہی اس کا ہاتھ تھام کر دبایا تھا۔ کافی پینے کو اس کا بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا اور شاید ابا کا بھی پھر وہ وہاں سے واپس پلٹ آئے تھے۔ جب وہ اپنی گلی کی طرف مڑے تو اسے گمان گزرا کہ جیسے نوشیرواں گلی کے کونے سے بیکری والی گلی کی طرف مڑا ہو۔ اسے انجانی سی خوشی ہوئی تھی تو نوشیرواں واپس آ گیا تھا۔ وہ اس سے ملے بغیر جانا نہیں چاہتی تھی۔ نوشیرواں نے بہت بار ان کی مدد کی تھی۔ وہ جانے سے پہلے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی یا پھر کوئی اور بات تھی لیکن وہ جو کل سے بے چین سی تھی اسے یکدم قرار آ گیا تھا۔ گھر آ کر اماں کو دوائیاں دے کر وہ بڑے سکون سے اماں کے بیڈ کے پاس میٹرس بچھا کر سو گئی تھی۔

ابا، اماں سے پرانی باتیں کر رہے تھے۔ دادا جان کی، دادی جان کی اپنی اور نانی جان کی۔ اماں ان کی باتیں سنتے سنتے سو گئی تھیں۔ صبح جلدی جلدی اس نے باقی ماندہ سامان سمیٹا تھا اور ابھی وہ سامان سمیٹ کر فارغ ہی ہوئی تھی کہ میراں اماں آ گئیں۔ ابا کمرے میں تھے وہ میراں اماں کو لے کر برآمدے میں ہی بیٹھ گئی۔

"اماں جان آپ بہت یاد آئیں گی۔"

"تم بھی مجھے بہت یاد آؤ گی سیمل بچہ...... تمہیں دیکھ کر ہمیشہ مجھے اپنی زینب یاد آ جاتی تھی لیکن اللہ تمہیں اپنے باپ کے سائے تلے سکھی رکھے اور تمہاری اماں کو صحت و زندگی دے۔"

"اماں جان آپ میری اماں کے لیے بہت دعا کرنا۔"

"میں تو اب بھی ہر نماز کے بعد اس کے لیے دعا کرتی ہوں اور جب جب گل کے لیے دعا مانگتی ہوں اس کی سلامتی واپسی کی تو تیری ماں کے لیے دعا کرنا کبھی نہیں بھولتی۔"

"اماں جان۔" اس نے میراں اماں کا ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگایا۔

"میں آتی رہوں گی کبھی کبھی ملنے، آپ بھی آئیں گی ناں، میں اپنا ایڈریس اور فون نمبر دے جاؤں گی۔" میراں اماں نے سر ہلا دیا تھا وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

"وہ نوشیرواں آ گئے واپس؟" اس نے کسی قدر جھجکتے ہوئے پوچھا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے میراں اماں نے بغور اسے دیکھا اس کی آنکھوں میں یکدم مایوسی تیرنے لگی تھی۔ بے حد افسردہ سی ہو کر انہوں نے سر جھکا لیا تھا۔

"تو آپ اکیلی ہیں گھر میں۔"

"نہ بچہ وہ حیدر کی بیوی آ جاتی ہے۔" تب ہی ابا کمرے سے باہر آئے تھے۔

"سیمل بیٹی میں گاڑی لے کر آتا ہوں تم تیاری کر لو۔"

"جی!"

ابا سر جھکائے دروازہ کھول کر باہر چلے گئے تو وہ میراں اماں کو اماں کے پاس چھوڑ کر خود باہر آ کر تخت پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں اور اس گھر میں گزرے سارے دن اس کی آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے۔

☆☆☆

نوشیرواں کو اسلام آباد سے واپس آئے آج دوسرا دن تھا وہ کل شام اسلام آباد سے واپس آیا تھا۔ اس نے گل کی بازیابی کے سلسلے میں سپریم کورٹ میں ایک درخواست دی تھی۔ اب اس کی درخواست کا کیا بنا تھا وہ معلوم کرنا چاہتا تھا لیکن کچھ پتا نہیں چل سکا عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ رات کو صحن میں ٹہلتے ہوئے اس نے کئی بار اپنی سماعتیں سیمل کے گھر کی طرف مبذول کی تھیں لیکن اُدھر خاموشی تھی۔ سیمل آج صحن میں اور برآمدے میں نہیں آئی تھی یا آئی بھی تھی تو وہ اس کے قدموں کی آہٹ نہیں سن پایا تھا۔ اس کی سسکیاں، اماں سے اس کی باتیں شاید وہ جلدی سو گئی ہو' ایک نامعلوم سی افسردگی میں گھرا وہ اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ کمرا جہاں ٹیبل پر کارگل کا نقشہ پڑا تھا اور ٹیبل پر ہی ایک کونے میں گل کی ڈائری پڑی تھی۔

وہ کچھ دیر یونہی نقشے کو دیکھتا رہا پھر ایک گہری سانس لے کر اس نے میز کے کونے پر پڑی گل کی ڈائری اٹھائی اور میز کے پاس سے ہٹ آیا۔ ڈائری پڑھتے پڑھتے وہ سخت دکھی ہو گیا۔ جب سے یہ ڈائری اسے ملی تھی وہ نہ جانے کتنی بار اسے پڑھ چکا تھا۔

گل کہاں تھا...... تھا بھی یا نہیں۔ اگر کہیں ہوتا تو کبھی تو علاقے میں جاتا، حویلی کے ملبے پر جہاں دلدار بیٹھا اس کا انتظار کرتا تھا اور کہتا تھا۔

"گل لالہ آئے گا تو یہاں سے جاؤں گا۔" وہ ایک بار پھر گل کی ڈائری پڑھ رہا تھا۔ اس کی اپنی لکھی ہوئی نظمیں اور اس کا انتخاب سب ہی خوب صورت تھا۔ پھر وہ یونہی بے مقصد ڈائری کے خالی صفحے پلٹنے لگا۔ خالی صفحے جن پر کچھ بھی نہیں لکھا تھا لیکن پھر بھی وہ صفحے پلٹ رہا تھا پھر ایک جگہ وہ ٹھٹک کر صفحہ دیکھنے لگا۔ آخری صفحات سے کچھ پہلے اس صفحے پر پنسل سے کچھ لکھا تھا اور پھر لکھ کر ربر سے مٹانے کی معمولی سی کوشش بھی کی گئی تھی لیکن صاف پڑھا جا رہا تھا۔ یہ تو...... یہ تو اس نے ایک نظر صفحے پر ڈالی۔

زمیر نہ عمر چھ سال
حکم جان عمر دو سال
شہباز سات سال
زرینہ تاج نو سال

کوئی مجھے بتائے گا کہ ان میں سے کون دہشت گرد ہے۔ مٹے مٹے سے سترہ نام پڑھتے ہوئے نوشیرواں عادل کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ایک ٹھنڈی سانس لے کر اس نے ڈائری بند کر دی۔ یہ نام تو اس کے میراں اماں اور گل کے دل پر لکھے تھے۔ وہ کچھ دیر یونہی ڈائری ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا اور پھر اٹھ کر اسے میز پر رکھا اور باہر آ گیا۔ ایک بار پھر وہ صحن میں ٹہل رہا تھا۔ دیوار کے اس طرف سے موتیے کی خوشبو میں رچی ہوا اس کے نتھنوں سے ٹکرائی تو وہ بہت لمبی سانس لے کر اس ہوا کو اپنے اندر جذب کر لیتا۔ دل بے طرح سیمل کو دیکھنے کے لیے مچل رہا تھا لیکن بھلا اس وقت وہ کہاں اِدھر آ سکتی تھی۔ مچلتے دل کو سنبھالتے ہوئے اس نے برآمدے میں قدم رکھا تو میراں اماں نے یکدم ہی اپنے کمرے کا دروازہ کھولا۔

"کیا بات ہے شیری بیٹا، کیوں اتنی رات گئے تک جاگ رہے ہو، بچہ سو جاؤ اب جا کر۔" اس نے سر جھکا لیا۔

"جی اماں جان۔"

"بچہ وہاں اسلام آباد میں کچھ خاص بات بنا چلی؟" آخر میں کسی خدشے سے ان کی آواز لرز گئی۔

"نہیں اماں جان...... کچھ بھی نہیں...... اور شاید کبھی کچھ پتا نہ چلے۔" اس نے سر اٹھا کر میراں اماں کو دیکھا۔ "آپ آرام کریں اماں جان میں ابھی آ رہا ہوں۔"

"بہت رات بیت گئی ہے شیری۔"

"اچھا!" تھکے تھکے انداز میں چلتا ہوا وہ میراں اماں کے پیچھے کمرے میں آ گیا اور دائیں طرف اپنے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اس نے جھک کر جوتوں کے تسمے کھولے اور ان کی طرف دیکھا۔ جو اپنے بیڈ پر لیٹ گئی تھیں۔

"اماں جان آپ نے دودھ پیا تھا، طبیعت ٹھیک ہے آپ کی؟"

"ہاں بچے میں ٹھیک ہوں۔" کمرے میں زرد روشنی کا بلب جل رہا تھا اور زرد روشنی میں میراں اماں کا چہرہ بھی زرد زرد لگ رہا تھا۔ جوتے اتار کر پاؤں اوپر بیڈ پر رکھتے ہوئے اس نے آہستگی سے کہا۔

"صبح مجھے جلدی جانا ہے، چھ بجے نکلوں گا گھر سے اگر میری آنکھ نہ کھلے تو جلدی جگا دیجیے گا۔"

"اچھا۔" میراں اماں نے کروٹ بدل لی۔

"کیا ہی اچھا ہوتا اماں جان اگر ہم دونوں بھی سب کے ساتھ...... ہمارا ہونا بھلا کیا ضروری تھا اور ہم نے ان سب کے بعد جی کر بھی کیا کرنا تھا۔"

"ہمارا ہونا ضروری تھا یا نہیں...... ہم دونوں کو اس نے کیوں بچا لیا، یہ تو اس کی حکمت، اس کی رضا ہے بچے۔" میراں اماں نے تڑپ کر پھر اس کی طرف کروٹ بدلی۔

وہ تکیہ درست کر رہا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے بچے، کیوں اس طرح اتنا قنوطی اور دکھی ہو رہا ہے۔"

"کیا دکھی نہیں ہونا چاہیے اماں جان، آپ دکھی نہیں ہوتیں، کیا آپ کو سب کچھ بھول گیا ہے۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"شیری بیٹا......" ان کی آنکھوں سے کرب جھلکنے لگا تھا لیکن انہوں نے کچھ کہا نہیں جیسے لفظ اندر ہی کہیں مر گئے تھے۔ وہ آہستگی سے اپنے بیڈ سے اتر کر اس کے قریب آئیں اس کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے انہوں نے اس کا سر چوم لیا۔

"بہت سی باتیں ہمارے اختیار میں نہیں ہوتیں شیری بچہ۔ ہمیں انہیں برداشت کرنا ہی ہوتا ہے۔"

"جی اماں جان۔" کچھ دیر بعد اس نے کہا تھا۔ پھر آہستگی سے انہیں الگ کیا...... ان کے ہاتھوں کو چوم کر آنکھوں سے لگایا اور پھر مسکرانے کی کوشش کی۔ کیسی زخمی دل چیر دینے والی مسکراہٹ تھی۔ میراں اماں کو لگا جیسے ان کا دل کٹ رہا ہو، وہ لمحہ بھر اسے دیکھتی رہیں۔

"آپ آرام کریں اماں جان، میں بھی سوتا ہوں۔" انہوں نے ایک بار پھر دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی چومی اور اپنے بیڈ پر آ کر لیٹ گئیں۔ نوشیرواں نے لیٹنے سے پہلے دائیں طرف دیوار پر موجود سوئچ کو آف کیا۔ کمرے میں یکدم اندھیرا پھیل گیا تھا۔ اسٹریٹ لائٹ سے آنے والی مدھم سی روشنی نے کمرے کے اندھیرے کو ذرا کم کر دیا تھا۔ نوشیرواں نے دیکھا میراں اماں لیٹ گئی تھیں اور انہوں نے اپنا دوپٹا اپنے چہرے پر ڈال لیا تھا۔

"کیا کوئی اس ماں کے دکھ کی تھاہ تک پہنچ سکتا ہے۔" نوشیرواں نے لیٹے لیٹے سوچا اور آنکھیں بند کر لیں۔ بہت سارے مناظر آنکھوں کے سامنے آتے رہے اور پھر نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

صبح اسے جلدی آفس پہنچنا تھا اس لیے میراں اماں کا ناشتا بھی اس نے جلدی بنا دیا تھا۔ انہیں ناشتا دے کر وہ باہر صحن میں آیا تو اسے دیوار کے اس طرف سے سیمل کی آواز آئی تھی۔

"آپ کے لیے ناشتا ابھی بنا دوں یا پھر کچھ دیر سے۔" شاید وہ اماں سے پوچھ رہی تھی۔ نوشیرواں کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس کا دل چاہا وہ دیوار پر سے جھانک کر اسے دیکھے۔ یکدم

اسے روبرو دیکھنے کی خواہش بہت شدت سے دل میں پیدا ہوئی تھی لیکن دل کی خواہش دل میں چھپائے وہ بے حد خوشگوار موڈ کے ساتھ میراں اماں کو خدا حافظ کہہ کر گھر سے نکل آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جلدی واپس آجائے گا لیکن پھر کچھ پرانے دوست مل گئے اور کرنل عارف زبردستی اپنے گھر لے گئے۔ اس نے وہاں سے اماں کو فون کر دیا تھا کہ وہ کچھ دیر سے آئے گا اس لیے وہ حیدر کی بیوی کو بلا لیں۔ رات کا کھانا کرنل عارف کے گھر کھا کر وہ جب اپنی گلی میں داخل ہوا تو اس کی نظریں پہلے سیمل کے گھر پر پڑی تھیں۔ وہاں بڑا سا تالا لٹک رہا تھا۔ وہ ٹھٹک کر رک گیا۔

''یہ تالا...... اور اس وقت...... اللہ خیر کرے' سیمل کی اماں ٹھیک ہوں کہیں......'' لیکن پھر خود ہی اس نے اپنے خیال کو جھٹک دیا۔'' کیا پتا سیمل اور اماں اس وقت اماں جان کے پاس بیٹھی ہوں۔'' سیمل کے تصور سے دل خوشگوار انداز میں دھڑکا۔

''لڑکی تم آہستہ آہستہ نوشیرواں عادل کے دل پر حکمران ہوتی جا رہی ہو۔'' لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔ کچھ دیر بعد ہی دروازہ کھل گیا۔ میراں اماں کو سلام کر کے وہ ان کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا برآمدے تک آیا اور کھوجتی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اس نے ان سے پوچھا۔

''آپ اکیلی تھیں حیدر کی بیوی نہیں آئی؟''

دو تین چکر لگائے ہیں اس نے ابھی کچھ دیر پہلے ہی گئی ہے۔''

''اچھا!'' اس نے غیر ارادی طور پر صحن کی مشترکہ دیوار کی طرف دیکھا تھا...... دیوار کے اس پار اندھیرا تھا۔ پیلی روشنی کا وہ بلب جو ساری رات برآمدے میں جلتا رہتا تھا آج نہیں جل رہا تھا تو ویرانی کا احساس ہو رہا تھا۔

''سیمل کی اماں جان تو ٹھیک ہیں نا؟ ان کے گھر میں تالا لگا ہوا ہے۔'' اس نے میراں اماں سے پوچھا۔

''ہاں بیٹا۔'' میراں اماں جیسے تھک سی گئی تھیں۔ وہاں ہی تخت پر ٹک گئیں اور ایک گہری نظر نوشیرواں کے چہرے پر ڈالی۔ وہ کچھ مضطرب سا لگ رہا تھا۔

''بیٹا دراصل وہ لوگ چلے گئے یہاں سے۔ سیمل کے ابا آئے تھے لے گئے انہیں۔''

''کیا......؟'' اس کا اضطراب یکدم بڑھا۔

''کسی نے منع نہیں کیا...... روکا نہیں انہیں، آپ جانتی ہیں ناں اماں جان وہ...... سیمل اپنے والد کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تھی...... مروان انہیں وہاں سے لے آیا تھا۔''

''ہاں بیٹا...... لیکن اللہ نے بڑا کرم کیا کہ صلح ہوگئی۔ بیوی اور بیٹی کا خیال آگیا انہیں۔''

''اتنے سالوں بعد......'' وہ تلخ ہوا۔

''اللہ کا کرم جب دل میں خیال ڈال دے بڑی دعائیں کرتی تھی میں۔ اکیلی بچی کب تک اور کیسے بیمار ماں کو سنبھالتی۔''

''سیمل خوش تھی؟ وہ اپنی مرضی سے گئی ہے ناں زبردستی تو نہیں کی اس کے والد نے...... وہ بہت ڈرتی تھی کہ زبردستی لے جائیں گے۔'' وہ بے یقین سا تھا۔

''نہیں، زبردستی نہیں کی کسی نے، بہت خوش تھی کہہ رہی تھی کہ ابا بہت شرمندہ ہیں۔''

''اچھا......!'' نوشیرواں کی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے، دل تھا کہ یکدم بجھ سا گیا تھا۔ وہ جسے دیکھنے کی چاہ میں وہ اسلام آباد بریگیڈیر مصطفیٰ کے اصرار کے باوجود نہیں ٹھہرا تھا وہ اس سے ملے بنا ہی جا چکی تھی۔ کم از کم اس کا انتظار ہی کر لیتی۔ اس نے دل ہی

دل میں اس سے شکوہ کیا۔

''تمہیں سلام کہہ رہی تھی۔'' میراں اماں بغور اسے دیکھ رہی تھیں۔

''کیا اس نے سیمل کو کھو دیا ہے؟'' ایک گہرے احساسِ زیاں کے ساتھ اس نے ان کی طرف دیکھا۔

''آپ نے کھانا کھا لیا اماں جان؟''

''ہاں بیٹا...... حیدر کی بیوی نے بتایا تھا تم کھانا کھا کر آؤ گے۔ تم نے کھانا کھایا؟''

''جی اماں جان۔'' ایک انجانا سا دکھ بھرا احساس ہولے ہولے دل کو چیرنے لگا تھا۔

''آپ آرام کریں اماں جان، میں ابھی کچھ دیر کام کروں گا۔'' گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے انہوں نے پھر نوشیرواں کی طرف دیکھا تھا۔ نوشیرواں کے چہرے پر پھیلی یاسیت کو دیکھ کر ان کا دل بوجھل سا ہو گیا۔

''بہت اچھی تھی سیمل...... کتنا خیال کرتی تھی ان کا...... کیسا محبت بھرا نرم دل دیا تھا اللہ نے اسے۔ بالکل زینبے کی طرح...... اللہ اسے اپنے گھر اپنے باپ کے سائے تلے سکھی رکھے۔ بہت دکھ اور تکلیف دیکھی ہے اس نے۔'' دل ہی دل میں سوچتی ہوئی وہ کھڑی ہوئیں۔ نوشیرواں نے بے اختیار ہی ان کا ہاتھ تھام لیا تھا پھر یونہی ہاتھ تھامے تھامے وہ انہیں کمرے میں لے آیا اور بہت محبت سے پوچھا۔

''اماں جان آپ کے لیے دودھ گرم کر کے لے آؤں۔'' انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''جی نہیں چاہ رہا، میں اب سو جاؤں گی، تم بھی بیٹا جلدی سو جانا۔''

''جی اماں جان۔'' انہیں لٹا کر اور ان کو چادر اوڑھا کر وہ باہر نکل آیا اور اس کے باہر جاتے ہی میراں اماں کی آنکھوں سے گرم گرم سیال بہہ نکلا تھا۔

کاش وہ اپنے اس بے حد پیارے، بے حد بہادر اور صابر بیٹے کی دل کی خوشی کا کوئی سامان کر سکتیں۔ سیمل کو دیکھ کر کئی بار ان کے دل میں بھی خیال آیا تھا کہ وہ سیمل کو نوشیرواں کے لیے مانگ لیں لیکن چاہنے کو تو دل بہت سی باتوں کو چاہتا ہے لیکن ہر چاہ پوری نہیں ہو سکتی۔ حمنہ نے انہیں بتایا تھا سیمل کا باپ ایک بے حد امیر شخص ہے اور سیمل کا گھر اتنا خوب صورت اتنا بڑا ہے کہ بندہ حیران رہ جائے۔ وہ مروان کی موت پر وہاں گئی تھی تب اس نے دیکھا تھا۔ بھلا کہاں نوشیرواں اور کہاں سیمل...... ان کی جھولی تو خالی تھی۔ وہ کیسے سیمل کے باپ کے سامنے...... پھیلاتیں۔ گھر نہ ٹھکانا بالکل تہی داماں...... گرم آنسوؤں سے تکیہ بھیگ رہا تھا اور باہر نوشیرواں تخت پر چپ بیٹھا پتا نہیں کیا سوچ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں بار بار صحن میں مشترکہ دیوار کی طرف اٹھتیں اور پھر لوٹ آتیں۔ عجیب سا احساسِ زیاں تھا جو دل کو بھینچتا تھا اور تکلیف دیتا تھا۔

''کیا اس نے جانے سے پہلے ایک بار بھی مجھے نہیں سوچا ہوگا۔ کیا اس کا دل نہیں چاہا ہوگا کہ جانے سے پہلے وہ مجھ سے مل لے۔ آخر کچھ دنوں کا ساتھ تو تھا ناں...... بہت طویل نہ سہی...... لیکن کبھی کبھی طویل رفاقتیں بھی بے معنی ہو جاتی ہیں اور لمحوں کا ساتھ عمر بھر پر محیط ہو جاتا ہے۔ کیا وہ نہیں جانتی تھی کہ میں، نوشیرواں اپنے دل کی خالی مسند پر اسے بٹھا چکا ہوں۔''

آج باہر حبس تھا اور گرمی شدید...... ہوا کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ اس کی شرٹ پسینے سے چپک رہی تھی لیکن وہ جیسے گرمی اور حبس سے بے نیاز صرف سیمل کو سوچ رہا تھا۔

''وہ ایسی تو نہیں تھی کہ یونہی پتا نشان دیے بغیر چلی گئی ہوگی۔ ضرور اماں جان کو اس نے اپنے گھر کا ایڈریس اور نمبر بتایا ہوگا۔'' ناامیدی کے بادلوں میں

سے امید کی کرن چمکی تو وہ جیسے یکدم پُرسکون ہو گیا۔
''بھلا یوں بھی کوئی کرتا ہے ظالم لڑکی۔'' اس کے لبوں کو ایک خوب صورت مسکراہٹ نے چھوا اور وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ کام کرنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا حالانکہ اسے اپنے پروجیکٹ کے متعلق رپورٹ تیار کرنا تھی۔ کچھ دیر وہ یونہی قلم ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا پھر سونے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ رات کو وہ میراں اماں کے کمرے میں ہی سوتا تھا۔ کہیں رات کو اچانک ان کی طبیعت نہ خراب ہو جائے۔ وہ آہستہ سے دروازہ دھکیل کر کمرے میں آیا، کمرے میں اندھیرا تھا۔ میراں اماں شاید سو چکی تھیں۔ وہ بھی سونے کے لیے لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کرتے ہی جیسے سیمل کا تصور چھم سے آنکھوں کی پتلیوں میں اتر آیا۔ ڈری سہمی اسٹاپ پر کھڑی۔ باپ کے ڈر سے خوف زدہ ہو کر بھاگتی ہوئی، اس کے ساتھ مروان کی باتیں کرتی ہوئی۔ سیمل کو سوچتے سوچتے وہ جانے کب سو گیا۔ صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی۔ میراں اماں ناشتا تیار کر رہی تھیں۔ اس نے جلدی جلدی فجر کی قضا ادا کی اور باہر تخت پر آ بیٹھا۔ اماں ناشتا وہیں لے آئیں۔

''وہ سیمل نے کچھ بتایا تھا وہ لوگ کہاں گئے ہیں؟ کچھ اتا پتا، فون نمبر وغیرہ......'' چائے کا سپ لیتے ہوئے اس نے جھجکتے ہوئے اماں سے پوچھا۔
''نہیں، جلدی میں تھی...... مجھے بھی خیال نہیں رہا۔'' انہوں نے نظریں چرائیں۔ اس کی چمکتی آنکھیں یکدم ماند پڑ گئیں تو بے اختیار ان کے لبوں سے نکلا تھا۔
''کہہ رہی تھی آؤں گی ملنے...... اماں کو ساتھ لے کر چکر لگایا کروں گی۔'' اس کی ماند ہوتی آنکھیں پھر چمک اٹھی تھیں۔ اماں نے امید کی ایک شمع اس کے ہاتھ میں تھما دی تھی پھر وہ بھی دلگرفتہ تھا۔ کتنی عجیب بات تھی وہاں عبداللہ کی بیوی نے اسے شادی کے لیے کہا تھا۔
''نوشیرواں بھائی اب آپ کو شادی کر لینی چاہیے۔'' عبداللہ اس کا اچھا دوست تھا انہوں نے میٹرک، ایف ایس سی اکٹھا ایک ہی کالج سے کیا تھا۔ وہ جب بھی راول پنڈی، اسلام آباد آتا اس کے پاس ہی ٹھہرتا تھا۔ اور یہی بات بریگیڈیر مصطفیٰ نے بھی کہی تھی۔
''نوشیرواں تمہیں اس وقت کسی کی رفاقت کی ضرورت ہے...... تمہارے ساتھ جو سانحہ ہوا وہ یقیناً بہت بڑا ہے۔ اس پر گل کی گمشدگی تم ہر بار مجھے پہلے سے زیادہ کمزور اور ڈسٹرب لگتے ہو۔ تمہیں شادی کر لینی چاہیے۔ دوسرا ہٹ ملے گی، کوئی دکھ بانٹنے والا تو ہوگا...... کہو تو تمہاری بھابی سے بات کروں؟''
''نہیں ابھی نہیں۔'' اسے سیمل کا خیال آیا تھا اور پھر راول پنڈی سے لاہور تک کے سفر میں وہ مسلسل سیمل کے متعلق سوچتا رہا تھا کہ وہ جا کر سیمل سے سب کچھ کہہ دے گا۔ اپنی بے چینی و بے قراری اپنے احساسات، عمر بھر کے لیے اس کی رفاقت کی چاہ اور اپنی محبت کا اعتراف...... لیکن کبھی کبھی وقت انسان کے ساتھ کیسا مذاق کر جاتا ہے۔ میراں اماں نے اس کے ہاتھ میں آس کا دیا تھما تو دیا تھا لیکن مایوسی ہر روز بڑھتی جا رہی تھی۔ کتنے سارے دن گزر گئے تھے۔ وہ پلٹ کر نہیں آئی تھی۔ آتی تو میراں اماں ضرور بتاتیں وہ جب بھی آ کر سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھتا وہ نظریں چرا لیتیں۔ وہ اتنی بے مروت تو نہیں تھی کہ اتنی جلدی سب کو بھول گئی۔ حمنہ تو اس کی بہت اچھی دوست تھی۔ دکھ درد کی ساتھی...... اس نے بتایا تھا کہ حمنہ اور اس کے گھر والوں نے ان کا بہت ساتھ دیا تھا۔ وہ یقیناً ان سے تو ملنے آتی ہوگی۔ کئی بار اس کا جی چاہا وہ حمنہ کے گھر جائے۔ حمنہ سے پوچھے

لیکن حمنہ لڑکی تھی اور پردہ کرتی تھی۔ وہ دل مسوس کر رہ جاتا۔ تب ایک روز دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے بظاہر سرسری انداز میں میراں اماں سے کہا تھا۔

''حمنہ کو سیمل کے گھر کا پتا ہوگا۔ آپ حمنہ سے پوچھ لیں تو کسی روز آپ کو ملانے لے چلوں گا۔''

''میں نے حمنہ سے پوچھا تھا۔ اسے نہیں معلوم۔''

''اچھا!'' اسے حیرت ہوئی تھی۔ ''کمال ہے۔'' وہ اماں کو جھٹلا نہیں سکتا تھا حالانکہ اس کا دل نہیں مان رہا تھا یہ بات۔ وہ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہی تھیں۔

''اس کا باپ بہت بڑا آدمی ہے...... یہ بڑی سی گاڑی تھی اس کی شیری بیٹا...... دو تین ملازم آئے تھے۔ سامان پیک کرنے اور لے جانے کو......'' میراں اماں پتا نہیں اسے کیا سمجھانا چاہ رہی تھیں۔ جو وہ سمجھنا نہیں چاہ رہا تھا۔

''کیا پتا اس کے ابا نے منع کر دیا ہو...... اسے پسند نہ ہو...... کچھ لوگ ہوتے ہیں ناں جو اپنے ہی اسٹیٹس کے لوگوں سے میل جول رکھنا پسند کرتے ہیں۔'' میراں اماں نے وضاحت کی تھی لیکن وہ وضاحت کرتے ہوئے اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھیں۔

''ہاں ہو سکتا ہے۔'' اس نے سوچا تھا۔ ''اور ممکن ہے۔ انہوں نے انہیں یہاں سے لے جانے کے لیے سب ڈراما کیا ہو۔ معافی مانگنے کا، شرمندہ ہونے کا۔'' اس کا دل سیمل کے لیے پریشان ہو گیا تھا۔ وہ ڈری سہی خوف زدہ سی سیمل اب کیسے رہتی ہو گی اس گھر میں اب جبکہ مروان بھی نہیں تھا۔ وہ کتنی تنہا ہو گی...... کتنی اکیلی...... اماں تو......

''نہیں، مجھے اس کے متعلق کچھ غلط نہیں سوچنا چاہیے...... وہ بہت خوش ہو گی اور خوشی میں اسے غم کے ساتھی بھول گئے ہوں گے۔ اللہ کرے ایسا ہی ہو۔''

ایک بار وہ سیمل سے اپنے جذبوں کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ اس سے بے حد و بے حساب محبت کرنے لگا ہے لیکن سیمل نہیں تھی۔ اور یہ اگست 2007ء کا اینڈ تھا جب مالک مکان نے گھر خالی کرنے کو کہا تھا۔ اس نے سیمل وغیرہ کے جانے کے بعد دوسرا حصہ کرائے پر نہیں چڑھایا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ یہ گھر فروخت کرنا چاہتا تھا اور اب یہ گھر فروخت ہو گیا تھا اور انہیں ایک ماہ کے اندر اندر یہ گھر خالی کرنا تھا۔ اس نے اپنے آفس کے قریب ہی ایک گھر لے لیا تھا۔ سیمل شاید کبھی اماں جان سے ملنے آئے یا حمنہ سے ایک آس تھی لیکن اب اگر وہ آئی بھی تو...... آس کا دیا ٹمٹمانے لگا تھا۔ لیکن وہ اسے بجھنے نہیں دینا چاہتا تھا۔ کئی بار وہ اسٹاپ پر گیا تھا۔

شاید کبھی وہاں وہ کھڑی نظر آ جائے۔ لیکن پھر اسے خود ہی اپنی حماقت پر ہنسی آئی۔ اب بھلا اسے اسٹاپ پر کھڑا ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ کئی بار اس نے بلاوجہ ہی سمن آباد کے چکر لگائے تھے لیکن وہ نظر نہیں آئی تھی کہیں بھی نظر نہیں آئی تھی۔ ایسی بے مروت تو نہ تھی وہ...... وہ تو بہت محبت کرنے والی تھی۔ کہیں اس کے ابا نے اس سے آگے وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا پھر بھی اس کا دل کہتا تھا کہ وہ ایسی نہیں تھی، اتنی بے مروت اتنی بدلحاظ۔

☆☆☆

اور وہ واقعی ایسی نہیں تھی۔ وہ کبھی اپنے دکھ کے ساتھیوں کو نہیں بھول سکتی تھی جنہوں نے آٹھ سال اس کا ساتھ دیا تھا جو رومی کے جانے کے بعد اس کے لیے چھاؤں بن گئے تھے۔ جنہوں نے اس کے آنسو پونچھے تھے جو اس کے ساتھ مل کر روئے تھے۔ وہ مہینے میں ایک یا دو چکر ضرور سمن آباد کے لگاتی تھی۔ کبھی اماں کے ساتھ کبھی اکیلے...... سب سے مل کر پھر وہ

بہت سارا وقت حمنہ کے ساتھ گزار کر آجاتی تھی۔ میراں اماں سے بھی دو بار ملاقات ہوئی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر اُن کے پاس بیٹھی رہی تھی لیکن دونوں بار ہی اس کی نوشیرواں سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہ گھر پر نہیں تھا۔ دونوں بار ہی اماں نے بتایا تھا وہ شہر سے باہر گیا ہوا ہے...... نہیں تو وہ اس کا انتظار کر لیتی۔ وہ نوشیرواں سے ملنا چاہتی تھی۔ وہ اسے ابا کے متعلق بتانا چاہتی تھی کہ وہ کتنا بدل گئے ہیں۔ کس طرح اس کا اور اماں کا خیال رکھ رہے ہیں اور اماں پہلے کے مقابلے میں بہت بہتر ہیں۔ ہاں کبھی کبھی وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو جاتیں ساکت اور اُلجھی اُلجھی سی لیکن اُن کی آنکھوں میں خالی پن نہیں ہوتا۔ بس وہ کہیں گم ہو جاتیں۔ کسی سوچ، کسی خیال میں گم...... وہ نوشیرواں کو بتانا چاہتی تھی کہ ابا نے بہت بڑے بڑے ڈاکٹروں سے مشورہ کیا ہے۔ سب ان کی اس بتدریج بہتری سے مطمئن ہیں، دو دفعہ اماں کے لیے ڈاکٹروں کا بورڈ بھی بیٹھ چکا تھا۔ سب کا خیال تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ مزید بہتری آئے گی۔ وہ نوشیرواں کو یہ بھی بتانا چاہتی تھی کہ وہ اسے مس کر رہی ہے۔ لیکن نوشیرواں اسے نہیں ملا تھا اور تیسری بار جب آئی تھی تو میراں اماں وہاں سے جا چکی تھیں اور حمنہ، آمنہ آپا، حیدر کی بیوی کسی کو معلوم نہیں تھا کہ انہوں نے کہاں گھر لیا ہے۔

''کم از کم میراں اماں کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' اسے بے حد دکھ ہوا تھا۔ ''یہاں سب ان سے کتنی محبت کرتے تھے، کم از کم حیدر کی بیوی کو تو پتا ہونا چاہیے تھا لیکن وہ بھی لاعلم ہے اور اب شاید میں کبھی دوبارہ نوشیرواں سے نہیں مل سکوں گی۔'' اس روز وہ سمن آباد سے واپس آئی تو بہت اداس تھی۔ اس نے لاؤنج میں ٹی وی دیکھتے، اماں کے ساتھ باتیں کرتے اور کچن میں کھانا بنواتے ہوئے نوشیرواں کے ساتھ پہلی ملاقات سے لے کر اب تک کی ہر ملاقات کو نہ جانے کتنی بار سوچا تھا۔

نوشیرواں اور میراں اماں کتنے دکھوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھے۔ اس سے ایک رومی کی جدائی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ یہاں اس گھر میں آکر تو وہ اسے بہت یاد آتا تھا۔ قدم قدم پر اس کی یادیں بکھری تھیں۔ جب وہ ابا کے ڈر سے سیڑھیوں کے نیچے چھپتی تھی اور جب وہ ریلنگ کے پیچھے چھپ کر ابا اور اماں کو لڑتے دیکھتی تھی تو رومی اسے بازوؤں میں چھپا لیتا تھا اور اسے کہانیاں سناتا تھا۔ نیلی کے ہوم سوئٹ ہوم کی، روزلی اور اس کے بھائی رچ کی اے کاش گل انہیں مل جائے اچانک اور اے کاش وہ نوشیرواں کے دکھ بانٹ سکے۔ یہ خواہش اچانک ہی دل کی زمین پر اگ آئی تھی ایک لمحے کو وہ ٹھٹک گئی۔

''نہیں...... کیا میں نوشیرواں کی رفاقت کی خواہاں ہوں...... کیا میں اس کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی ہوں...... نہیں، یہ بھلا کیسے ممکن ہے؟'' اس نے خود ہی خود کو جھٹلایا۔

''بھلا نوشیرواں مجھ سے......'' اور اس رات جب وہ بیڈ پر لیٹی تو اسے لگا جیسے وہ نوشیرواں سے محبت کرنے لگی ہے۔ اگر یہ محبت ہے تو وہ اس محبت کو پانے سے پہلے ہی کھو چکی ہے۔ اس نے خود سے اعتراف کیا اور پھر کتنے ہی آنسو آنکھوں سے نکل کر تکیے میں جذب ہوتے چلے گئے۔ کیا سیمل خان کی زندگی میں ہمیشہ ادھوری خوشیاں آتی رہیں گی۔ رومی تھا تو ابا نہیں تھے۔ اور اب ابا ہیں تو رومی نہیں ہے اور...... اور نوشیرواں بھی نہیں ہے۔

اور پھر بہت سارے دن گزر گئے۔ وہ انتظار کرتی رہی شاید کبھی میراں اماں کا فون آجائے شاید کبھی وہ ملنے آجائیں۔ ان کے پاس اس کا نمبر تھا

اسے فون تو کر سکتی تھیں پھر...... ہو سکتا ہے گل مل گیا ہو۔ وہ گل کے ساتھ اپنے علاقے میں واپس چلے گئے ہوں...... لیکن آس کی ڈور تھی کہ ٹوٹتی ہی نہ تھی...... وہ جب سمن آباد جاتی حمنہ سے میراں اماں کے متعلق ضرور پوچھتی۔

''وہ ہوتیں تو ضرور آتیں کبھی نہ کبھی۔'' حمنہ نے ایک بار کہا۔

''کیا مطلب......؟'' وہ کانپ گئی۔ وہ ایسا کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ حمنہ کے گھر سے آکر وہ کئی دن تک اپ سیٹ رہی۔

ایک روز اس نے ایک جگہ فوجی فاؤنڈیشن کا بورڈ لگا دیکھا تھا تو کتنی ہی دیر تک گاڑی ایک طرف پارک کروائے وہ اُدھر ہی دیکھتی رہی۔ کیا پتا یہاں ہی کہیں نوشیرواں کا دفتر ہو اور وہ اُدھر جاتا یا وہاں سے آتا دکھائی دے جائے پھر خود ہی اپنی بے وقوفی پر ہنسی آگئی تھی اور اس نے ڈرائیور سے گھر چلنے کو کہا۔ گھر آکر وہ بہت دیر تک رومی کے کمرے میں بیٹھی رہی۔ رومی کی کتابیں دیکھتے ہوئے اسے حامو چاچا بھی یاد آئے تھے۔ حامو چاچا جو اُن کے لیے قیمتی اور اچھی کتابیں چھانٹ کر رکھتے تھے۔ اس نے سوچا۔

''پتا نہیں وہ اب بھی وہاں کتابیں بیچتے ہوں گے یا نہیں۔ شاید ان کا پڑھا لکھا بیٹا اب کسی اچھی پوسٹ پر ہو اور انہوں نے کام چھوڑ دیا ہو لیکن ایک بار میں ضرور انارکلی جا کر دیکھوں گی کیا پتا وہ اب بھی وہاں بیٹھتے ہوں...... اور ان کا بیٹا اب بھی اچھی سی جاب ڈھونڈتا ہو..... پیپرز کے بعد وہ فارغ تھی۔ سو کتابیں پڑھتی، کچن میں نئی نئی ڈشز بناتی اور ابا اماں کو دیکھ کر خوش ہوتی۔ ابا اب بھی بہت شاندار لگتے تھے۔ ان کے سیاہ بالوں میں گرے بالوں کی آمیزش نے انہیں بہت سوبر بنا دیا تھا اور اماں تو بالکل ویسی ہی لگنے لگی تھیں بارہ تیرہ سال پہلے والی۔ وقت جیسے انہیں چھوئے بغیر گزر گیا تھا۔ ان کے گھنے سیاہ بال اب بھی اتنے ہی لمبے اور چمکیلے تھے۔ ان کا سراپا اب بھی اتنا ہی نازک تھا جب وہ نفیس کپڑے زیب تن کیے ہلکے ہلکے میک اپ کے ساتھ نفیس جیولری پہنے ابا کے ساتھ کھڑی ہوتیں تو ابا بڑے فخر سے انہیں دیکھتے رہتے۔ وہ اب بھی پہلے جیسی ہی کم گو تھیں لیکن ابا انہیں بولنے پر اکساتے تھے۔ کبھی وہ بے بسی سے انہیں دیکھتیں اور کبھی ان کی باتوں کا جواب دیے جاتیں۔

دن یونہی گزرتے جا رہے تھے ایک کے بعد ایک دن بھر کی مصروفیت کے بعد جب وہ رات کو سونے کے لیے لیٹتی تو اس کا دل بھرا ہوتا...... جی چاہتا کہ چپکے چپکے روتی رہے...... دل کو جیسے کوئی ہولے ہولے مٹھیوں میں بھینچتا رہتا...... اسے رومی کے علاوہ نوشیرواں بھی بے طرح یاد آتا تھا۔ اس رات اس نے رومی کو بڑے دنوں بعد خواب میں دیکھا تھا۔ وہ بہت خوش تھا اور نہ جانے کس بات پر ہنس رہا تھا۔ وہ دونوں انارکلی میں حامو چاچا کی دکان کے پاس کھڑے تھے۔ وہ صبح اٹھی تو اس نے سوچا وہ آج ضرور انارکلی جائے گی اور حامو چاچا سے کتابیں خریدے گی اور انہیں یہ بھی بتائے گی کہ وہ جو اس کا بھائی مروان تھا، وہ شہید ہو گیا اس لیے وہ اتنے عرصے وہاں نہیں آئی۔ دسمبر شروع ہو چکا تھا اور اس سال بھی لاہور میں ٹھیک ٹھاک ٹھنڈ تھی۔ اس کا بستر سے نکلنے کو جی ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ ناشتا اس نے کمرے میں ہی منگوا لیا تھا۔ سارا دن بیڈ پر لیٹی کتابیں پڑھتی رہی۔ اماں کی اب اسے فکر نہیں تھی۔ ابا تھے نا ان کا خیال کرنے کو اور آج تو یوں بھی اتوار تھا۔ ابا گھر پر ہی تھے۔ عصر کے بعد وہ بستر سے نکلی اور تیار ہو کر نیچے آئی۔ اماں لاؤنج میں کھڑی تھیں۔ لائٹ براؤن اور سیاہ کڑھائی کے امتزاج والے سوٹ کے ساتھ سیاہ ہی نفیس ایمبرائیڈری والی شال اوڑھے وہ بہت باوقار لگ

رہی تھیں۔ ابا بار بار انہیں مسرت سے دیکھ رہے تھے۔ وہ دونوں شاید کہیں جا رہے تھے۔ ایک خوشی بھرے احساس کے ساتھ اس نے انہیں دیکھا۔

''ہم ایک پارٹی میں جا رہے ہیں، تم چلو گی؟'' ابا نے پوچھا تھا۔

ابا، اماں کو ساتھ لے کر کسی پارٹی میں جا رہے تھے جبکہ اماں مکمل طور پر نارمل نہیں تھیں اور کبھی انہیں اماں کے ساتھ چلتے ہوئے شرمندگی ہوتی تھی۔ احساسِ تشکر سے اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''نہیں ابا جی، آپ جائیں مجھے کچھ کتابیں خریدنے اردو بازار جانا ہے۔''

''تم ہمارے ساتھ نہیں جاؤ گی گڑیا؟'' اماں پوچھ رہی تھیں۔

''نہیں۔'' وہ مسکرا دی۔

''ڈرائیور لے جانا بیٹی، اُدھر رش بہت ہوتا ہے، خود مت ڈرائیو کرنا۔''

''جی ابا جی۔'' اب ابا مسکرا کر اماں کو دیکھ رہے تھے۔

''ہم بھی چلیں۔'' انہوں نے اپنا ہاتھ اماں کی طرف بڑھایا تھا ان کا ہاتھ تھامنے کو۔ اس سب کے لیے وہ کتنا ترسی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں کی نمی کو انگلیوں کی پوروں سے پونچھا اور انہیں خدا حافظ کہہ کر باہر آ گئی۔ پورچ میں دونوں گاڑیاں کھڑی تھیں۔ جب وہ یہاں سے گئے تھے تب بھی یہاں دو گاڑیاں ہوتی تھیں۔ ایک گاڑی گھر کے لیے تھی اور دوسری ابا کے ذاتی استعمال کی۔ ڈرائیونگ اسے رومی نے سکھائی تھی لیکن رومی کے ساتھ ہونے کے باوجود وہ مین روڈ پر جاتے ہوئے خوف زدہ ہو جاتی تھی لیکن ابا کے ساتھ اس نے کئی بار پریکٹس کی تھی اور انہی کے دیے اعتماد کے سہارے وہ اب کئی بار اکیلے ہی گاڑی لے کر جمنہ سے ملنے چلی گئی تھی۔

اس نے ڈرائیور سے انارکلی چلنے کو کہا۔ بازار پہنچ کر اس نے دور سے ہی دیکھ لیا تھا کہ کپڑوں کی دکان کے سامنے تختے پر کتابیں سجائے حامو چاچا ہی بیٹھے تھے۔ ویسے ہی صاف شفاف دُھلے ہوئے سفید کپڑے اور سفید پگڑی باندھے وہ کتابیں اِدھر اُدھر کر رہے تھے۔ شاید گاہکوں نے ان کی ترتیب خراب کر دی تھی۔ آج بھی انہوں نے آنکھوں میں سرمہ لگایا ہوا تھا۔ سیمل کو وہ کچھ کمزور لگے تھے۔ ان کے بالوں میں سفیدی بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ داڑھی تو بالکل سفید تھی۔

''چاچا جی۔'' وہ ان کے سامنے زمین پر ہی دو زانو بیٹھ گئی تھی۔

''حامو چاچا نے ہاتھ میں پکڑی کتاب ایک طرف رکھ کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرائے۔ ان کی سرمہ لگی آنکھیں بے حد روشن تھیں اور پیشانی پر سجدوں کا نشان چمک رہا تھا۔ انہوں نے بنا کچھ کہے مڑ کر اپنے پیچھے رکھے کارٹن سے کچھ کتابیں نکال کر اس کے سامنے رکھی تھیں۔

''یہ میں تمہارے لیے رکھتا رہا۔''

''میرے لیے......؟'' اس کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔ آخری بار جب وہ آئی تھی تو جنوری 1999ء تھا اور اب 2007ء رخصت ہو رہا تھا۔ آٹھ سال بعد وہ اسے یوں کتابیں نکال کر دکھا رہے تھے جیسے وہ ابھی کل ہی تو آئی تھی۔

''آپ نے مجھے پہچان لیا؟ آپ کو یقین تھا کہ میں کسی دن آؤں گی اور مروان تو......''

''مجھے انتظار تھا۔'' وہ ہمیشہ ہی مختصر بات کرتے تھے۔

''لیکن مروان تو......''

''اللہ کی امانت تھی۔'' اس نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"کیا یہ کوئی بزرگ ہیں، کوئی ولی۔"

"میں نے اخبار میں پڑھا تھا اور اس کی تصویر دیکھی تھی۔"

"پھر بھی آپ کو انتظار تھا میں کسی روز آؤں گی کتابیں لینے۔" وہ مسکرا کر ایک اور کتاب نکالنے لگے۔

"آپ نے جتنی بھی کتابیں ہمارے لیے رکھی ہیں۔ ان کا بل بنا دیں۔" وہ عقیدت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ کارٹن سے کتابیں نکال کر تختے پر رکھنے لگے۔

"آپ دیکھ لیں ان میں سے کون کون سی؟"

"سب...... سب چاچا جی...... وہ سب جو آپ نے ہمارے لیے رکھی ہیں۔" وہ کھڑی ہوگئی اور اس نے کھڑے ہوتے ہوئے دیکھا۔ سامنے روڈ پر جو کوئی بھی جا رہا تھا۔ وہ چلتے ہوئے ایک پاؤں پر زور دے کر چل رہا تھا۔ اس کا دراز قد دور سے بھی اسے نمایاں کر رہا تھا آس پاس چلتے سب لوگوں میں۔ وہ یکدم روڈ کی طرف تیز تیز چلنے لگی۔ وہ کہیں لوگوں کے ہجوم میں گم نہ ہو جائے۔ وہ تقریباً بھاگنے لگی تھی۔ آس پاس کئی لوگوں نے اسے حیرت سے دیکھا لیکن وہ بھاگتی رہی۔ جب اس کے قدم نوشیرواں کے قدموں کے برابر پہنچے تھے تو اس کی سانس پھول رہی تھی۔ نوشیرواں نے یکدم پلٹ کر اسے دیکھا تھا۔

"سیمل......" وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے پھر سیمل کی نظریں جھک گئیں۔

"یوں بھی کوئی کرتا ہے سیمل ایسے......!" نوشیرواں کے لبوں پر بے اختیار شکوہ آیا تھا۔ "نہ کوئی پتا، نہ کوئی نشان، میں نے ان پانچ ماہ میں کتنا تلاش کیا ہے تمہیں۔"

"اور یہی بات میں کہوں تو...... میں تو میراں اماں سے مل کر بتا کر آئی تھی سب، فون نمبر، ایڈریس سب کچھ ہی تو دیا تھا۔ بعد میں بھی دو بار ملنے گئی، کتنا انتظار رہا کہ آپ میراں اماں کو لے کر اماں ابا سے ملنے آئیں گے۔" سیمل کے لبوں پر شکوہ آیا تو ایک لمحے کی حیرت کے بعد نوشیرواں نے جان لیا کہ میراں اماں نے اسے نارسائی کے دکھ سے بچانا چاہا تھا لیکن وہ نہیں جانتی تھیں یہ سب اپنے اختیار میں کب ہوتا ہے، ان پانچ ماہ کی ہر صبح اور ہر رات اس نے خود سے اعتراف کیا تھا وہ سیمل حبیب خان کی محبت میں بری طرح گرفتار ہو چکا ہے۔

"میں نے تمہیں بہت مس کیا سیم۔" وہ دونوں اب واپس جا رہے تھے۔

"اور میں نے بھی۔" اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے سیمل نے اعتراف کیا۔

"اور میں...... مجھے لگتا ہے کہ......" اس نے دائیں ہاتھ کی انگلی اور انگوٹھے سے اپنے کان کی لو کو مروڑا۔

"مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے سیمل، میں یعنی نوشیرواں عادل...... میرے ذہن میں یہ کبھی نہیں تھا کہ میں کبھی اس طرح بھرے بازار میں لوگوں کے ہجوم میں چلتے ہوئے تم سے اظہارِ محبت کروں گا۔ میں نے تو سوچا تھا سیمل کسی روز بڑے خوب صورت انداز میں تمہارے سامنے ایک گھٹنا موڑ کر بیٹھتے ہوئے قدیم رومن انداز میں تمہیں گلابوں کا بوکے پیش کر کے کہوں گا۔ سیمل میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں میری محبت کو قبول کرلو۔" وہ ہولے سے ہنسا۔

"لیکن......"

"میں نے اس محبت کو قبول کیا۔" چلتے چلتے رک کر سیمل نے اس کی طرف دیکھا۔ نوشیرواں بھی رک کر اسے دیکھنے لگا تھا۔ مبہوت سا ہو کر دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے پھر سیمل کی نظریں جھک گئیں۔

"کلپ، سوئیاں، بٹن۔" کسی ہاکر نے آواز لگائی تو نوشیرواں چونکا۔ اب وہ دونوں پھر ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

"محبت کا اس طرح سرِ بازار اظہار بھی اتنا برا نہیں ہے۔" وہ پھر ہنسا تھا۔

"لیکن کاش ہم کہیں تنہا ہوتے تو اس اظہارِ محبت پر......" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی وہ حامو چاچا کی تختہ نما دکان کے پاس کھڑے تھے۔ حامو چاچا نے دس بارہ کتابوں کا ایک بنڈل سا بنا دیا تھا۔

"چاچا جی یہ میجر نوشیرواں ہیں۔ مروان کے ساتھ ہی تھے کارگل کے محاذ پر۔"

حامو چاچا مسکرائے تھے۔

"میں ان پانچ ماہ میں کئی بار یہاں آیا ہوں۔"

نوشیرواں مسکرایا۔

"کہاں کہاں نہیں تلاش کیا تمہیں...... اور پتا ہے جب بھی میں نے حامو چاچا سے پوچھا۔ وہ نہیں آئی کتابیں لینے تو چاچا کہا کرتے تھے۔ وہ ضرور آئے گی لیکن سیمل مجھے بالکل یقین نہیں تھا کہ تم سے میری ملاقات یہاں ہی ہوگی۔"

"آپ کے بیٹے چاچا جی!" بل ادا کرتے ہوئے سیمل کو اچانک ہی خیال آیا تھا۔

"انہیں کوئی اچھی جاب ملی اپنے مطلب کی؟"

"جس کی امانت تھی اس نے واپس لے لی۔"

حامو چاچا جواب دے کر کتابیں ترتیب سے رکھنے لگے تھے اور نوشیرواں کے ساتھ پارکنگ کی طرف جاتے ہوئے سیمل سوچ رہی تھی۔

"حامو چاچا اشفاق احمد کے بابے نہیں لیکن ان میں اشفاق احمد کے بابوں جیسا کچھ ہے ضرور......"

☆☆☆

"میرا دل نہیں مانتا بیٹا، بلاشبہ نوشیرواں اچھا لڑکا ہے۔ اس کی والدہ بھی بہت اچھی ہیں۔ بہت محبت کرنے والی، وہ یقیناً ہماری سیمل کو بہت اچھی طرح رکھیں گے لیکن ایک تو دونوں میں عمر کا فرق بہت ہے۔ تقریباً گیارہ سال۔ نوشیرواں ہمارے رومی کا ہی تو ہم عمر ہے۔" اور کچن سے باہر لاؤنج میں آتی سیمل وہیں رک گئی۔ ابا دائیں طرف صوفے پر بیٹھے تھے اور اماں بالکل سامنے بیٹھی تپائی پر ٹوکری رکھے مٹر چھیل رہی تھیں ایک بہت پرانا منظر سیمل کی آنکھوں کے سامنے آکر گزر گیا جب اماں لاؤنج میں بیٹھ کر کوئی سبزی کاٹتیں یا ایسا ہی کوئی کام کرتی تھیں تو ابا کا عتاب اماں پر ٹوٹتا تھا۔ اس نے ایک جھرجھری سی لے کر دروازے سے جھانکا۔ ابا کچھ افسردہ اور پریشان بیٹھے تھے۔

"میں عمر کے فرق کو نظر انداز بھی کر دوں بیٹا لیکن ماحول کے فرق کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ذات، برادری، امیری غریبی سب نظر انداز کی جا سکتی ہے لیکن وہ تو ایک بالکل مختلف کلچر سے تعلق رکھتا ہے۔ رسم و رواج، ماحول ہر چیز...... پھر وہ علاقہ اس علاقے کے تو اپنے قانون اپنے رواج ہیں۔ بے شک اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ پنجاب میں گزارا ہے۔ اب بھی یہاں ہی رہ رہا ہے لیکن اپنی جڑیں، اپنی زمین تو کوئی نہیں چھوڑ سکتا...... تم بھی تو کچھ کہو نا بیٹا۔" وہ یکدم بولتے بولتے اماں کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ "کوئی رائے، کوئی مشورہ......"

"میں کیا کہوں؟" انہوں نے سر اٹھا کر بے بسی سے دیکھا۔

"ہاں تم!" انہوں نے سر جھکا لیا تھا۔

"بیٹا کیا سیمل بھی ایسا چاہتی ہے، انہوں نے جو دستِ سوال دراز کیا ہے تو کوئی جواز تو ہوگا نا ان کے پاس۔"

"پتا نہیں۔" اماں اب بھی بے بسی سے انہیں

دیکھ رہی تھیں۔
''تو بینا منع کر دو، میراں اماں کا فون آئے تو انہیں بتا دینا۔''
اور ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ پیچھے مڑ کر کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے سیمل نے کاؤنٹر سے ہی ٹیک لگائی۔

☆☆☆

اماں پہلے سے بہت بہتر تھیں۔ وہ بہت سارے کاموں میں دلچسپی لینے لگی تھیں۔ کچن کا کام، ابا کے کپڑے وغیرہ نکالنا، وہ بہت شوق سے کرتی تھیں۔ انہیں یہ بھی پتا تھا کہ رومی شہید ہو چکا ہے لیکن شاید وہ ابھی اتنی ٹھیک نہیں تھیں کہ اس کی زندگی کے متعلق کوئی رائے دے سکیں اور وہ ان سے اپنے دل کی بات کر سکے۔ انہیں بتا سکے کہ نوشیرواں کی اس کی زندگی میں کیا اہمیت ہے۔ وہ نوشیرواں کے علاوہ کسی دوسرے شخص کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی... اور، اور ابا سے بھی وہ یہ بات نہیں کر سکتی۔ ابا کیا سوچیں گے کہ...... اور ابا تو پہلے ہی رومی بھائی سے کہتے تھے...... وہ بدل گئے ہیں لیکن کیا پتا...... وہ کیا سوچیں۔
''نہیں...... میں بھی ابا سے دل کی بات نہیں کر سکتی۔'' یکا یک اس کا دل ڈوبنے لگا۔ ''تو کیا میں نوشیرواں کے علاوہ کسی اور...... اور کیا نوشیرواں اس انکار کو برداشت کر لے گا۔ وہ کتنا خوش تھا اس روز اس طرح اچانک مل جانے پر۔''
''پتا ہے کبھی کبھی میں مایوس ہونے لگتا تھا کہ شاید میرا تمہارا ساتھ بس اتنا ہی تھا۔ مجھے لگتا تھا جیسے میں نے تمہیں کھو دیا ہے۔'' پارکنگ کی طرف اس کے ساتھ ساتھ جاتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔
''اور اب اس طرح اچانک تم ملی ہو تو یہ خوشی مجھ سے سنبھالی نہیں جا رہی...... پتا ہے سیمل مجھے مدت بعد کوئی خوشی ملی ہے۔'' اور اس کی زندگی میں کوئی خوشی نہیں ہے۔ سیمل نے کاؤنٹر سے ٹیک لگائے لگائے سوچا اور آنسو اس کے اندر گرنے لگے قطرہ قطرہ کر کے۔ اس روز کتابوں کا بنڈل گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رکھتے ہوئے اس نے سیٹ پر پڑے سیمل کے موبائل کو دیکھا اور اس کی نظروں کا مفہوم سمجھتے ہوئے اس نے اپنا نمبر اسے دے دیا تھا۔
''میں آؤں گا سیمل، اماں جان کو لے کر کسی روز ملنے۔'' وہ بے حد اشتیاق سے اسے دیکھتے ہوا کہہ رہا تھا۔
''اماں بہت خوش ہوں گی وہ ہمیشہ ہی میراں اماں سے مل کر خوش ہوتی تھیں۔ آپ ضرور آنا۔''
''تم منع بھی کرو گی تب بھی آؤں گا سیمل، میرے تو سارے راستے اب تمہاری طرف ہی جاتے ہیں۔'' وہ بے حد سرشار سی گھر آئی تھی اور اس نے اماں کو نوشیرواں کے متعلق بتایا تھا اور یہ بھی کہ کسی روز میراں اماں ان سے ملنے آئیں گی اور پھر وہ سچ مچ ہی دوسرے دن میراں اماں کے ساتھ آ گیا تھا۔ ابا اس سے مل کر بہت خوش ہوئے اور بہت دیر تک اس سے رومی کی باتیں کرتے رہے۔ اس سے رومی کی باتیں کرتے ہوئے کئی بار ابا کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ وہ رومی کے آخری لمحوں میں اس کے ساتھ تھا۔ اس سے رومی کے آخر لمحوں کے متعلق جاننا ابا کو اچھا لگا تھا۔ ابا نے اس سے پھر بھی آتے رہنے کو کہا تھا اور اس کے جانے کے بعد بھی ابا بہت دیر تک اس کے متعلق باتیں کرتے رہے تھے اور اس کے خاندان کے ساتھ ہونے والی ٹریجڈی پر وہ بے حد دکھی ہوئے تھے اور اس رات جب وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے کتابیں سیٹ کر رہی تھی تو تکیے کے پاس پڑا اس کا موبائل بج اٹھا اس نے چونک کر فون اٹھایا دوسری طرف نوشیرواں تھا اور اس کی خیریت پوچھ رہا تھا۔
''ابھی چار گھنٹے پہلے تو آپ یہاں سے گئے ہیں اور میں خیریت سے تھی۔'' نچلا ہونٹ دانتوں

تلے دبا کر وہ مسکرائی تھی۔
''سیمل کبھی کبھی کوئی شخص اتنا اہم کیوں ہو جاتا ہے کہ زندگی اس کے بغیر ادھوری لگنے لگتی ہے۔ مجھے بھی تمہارے بغیر اپنی زندگی ادھوری لگنے لگی ہے۔''
سیمل خاموش رہی تھی وہ کیا کہتی اسے تو خود یونہی لگتا تھا جیسے نوشیرواں اس کی زندگی کا ہی حصہ ہو۔ پچھلے چند ماہ وہ نہیں تھا تو اسے اپنی زندگی نامکمل لگتی تھی۔ ادھوری خالی اور ویران سی۔
''سنو سیمل، کیا میں تمہیں پروپوز کر سکتا ہوں؟ دیکھو یہ ہے تو آکورڈ سا، تمہیں اس طرح یوں رات کے اس پہر پروپوز کرنا...... لیکن سیمل۔'' وہ ہنسا تھا۔
''انارکلی کے ہجوم میں تم سے اظہارِ محبت کرنا اور اب اس وقت پروپوز کرنا ہے تو کچھ عجیب سا لیکن یار کیا کروں۔ ابھی اسی وقت چند لمحے پہلے مجھے خیال آیا ہے کہ مجھے تمہیں پروپوز کر دینا چاہیے کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی اور...... اور میں خالی ہاتھ تہی داماں رہ جاؤں۔ میں اتنے رشتے کھو چکا ہوں کہ اب مجھ میں کوئی اور رشتہ کھونے کی سکت نہیں ہے۔ بتاؤ نا، سیمل میں صبح اماں جان کو بھیج دوں؟''
''لیکن اتنی جلدی......'' وہ اپ سیٹ ہو گئی تھی۔
''میں نے تو ابھی ابا کی محبتوں کو صحیح طرح سے محسوس بھی نہیں کیا۔ میں ابھی انہیں انجوائے کرنا چاہتی ہوں۔ میں ابھی اماں اور ابا کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں...... میں...... مجھے لگتا ہے جیسے میں نے پہلی بار جانا ہے کہ باپ کیا ہوتا ہے۔ اس سے پہلے بھی میں ابا کے ساتھ رہی ہوں۔ اتنے بہت سے سال لیکن تب وہ اجنبی لگتے تھے۔ اب پہلی بار مجھے لگا ہے وہ میرے ابا ہیں پھر ابھی اماں، ابا دونوں کو ہی میری ضرورت ہے۔''
وہ یکدم ریلیکس ہو گیا تھا۔
''میں کب کہہ رہا ہوں سیمل کہ تم آج ہی رخصت ہو کر میرے ساتھ آ جاؤ، میں تو بس اپنے اس سہمے ہوئے خوف زدہ دل کے یقین کا کوئی سامان کرنا چاہتا ہوں جو ہر وقت ڈرتا رہتا ہے کہ کہیں بے خبری میں تمہیں میں کھو نہ دوں۔ بس ایک بار مجھے یقین ہو جائے کہ تم میری ہو تو پھر جب تم نے چاہا جب جو تم نے کہا...... وہی ہوگا...... اس دوران میں علاقے میں اپنی زمین، جائداد وغیرہ فروخت کر کے یہاں اچھا سا گھر لے لوں گا تمہارے لائق...... کیا پتا تب تک گل بھی آ جائے...... تو پھر میں اماں کو بھیج دوں نا......'' اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا اور پھر اگلے ہی روز میراں اماں نے آ کر ابا کے سامنے اپنا مدعا بیان کر کے انہیں سوچ کر جواب دینے کو کہا تھا اور ابا نے فیصلہ سنا دیا تھا۔ وہ سیدھی ہو کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ اس نے کاؤنٹر پر پڑے چائے کے کپ کو دیکھا۔ چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی اس نے اپنی جلتی ہوئی آنکھوں کو ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے رگڑ ڈالا۔ یہ صرف نوشیرواں کی خواہش تو نہیں تھی، وہ خود بھی تو نوشیرواں کے سنگ ہی زندگی گزارنا چاہتی تھی لیکن یہ بات وہ ابا سے نہیں کہہ سکتی تھی کبھی نہیں۔
وہ ابا کو یہ موقع نہیں دینا چاہتی تھی کہ وہ کہیں کہ ان سے الگ ہو کر رومی اور اماں نے اس کی صحیح تربیت نہیں کی اور پھر رومی کی وجہ سے ابا کتنے بکھر گئے ہیں۔ وہ اپنی طرف سے انہیں دکھی نہیں کر سکتی تھی...... وہ نوشیرواں کے لیے اور اپنے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی...... یکدم اندر گرتے آنسو باہر آنے کو بے تاب ہونے لگے تو وہ کچن کا دروازہ کھول کر باہر نکلی...... ابا کہیں جا چکے تھے اور اماں مٹر کی ٹوکری سامنے رکھے کسی گہری سوچ میں گم تھیں۔ آہٹ پر انہوں نے سیمل کی طرف دیکھا تو سیمل ان سے نظریں چرائے تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

☆☆☆

نوشیرواں میراں اماں کی گود میں سر رکھے آنکھیں موندے لیٹا تھا اور وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھیں۔

''میں تمہیں اس دکھ سے بچانا چاہتی تھی اس لیے میں نے۔''

''میں جانتا ہوں اماں جان۔''

''یہ بہت مشکل تھا شیری...... میرا بھی جی چاہا تھا کہ سیمل میری بہو بنے...... میرے شیری کی دلہن۔ وہ مجھے بالکل اپنی زینب کی طرح لگتی تھی لیکن میں نے اپنے دل کو سمجھا لیا۔''

''لیکن میں اپنے دل کو کیسے سمجھاؤں اماں جان؟'' بند آنکھوں کے پیچھے مچلتے آنسوؤں کو روکتے ہوئے نوشیرواں نے سوچا۔

''بہت سی چیزیں ہمیں اچھی لگتی ہیں شیری بچہ لیکن ہم انہیں خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ ہمیں دل مارنا پڑتا ہے۔''

''لیکن سیمل چیز تو نہیں ہے اماں جان......'' نوشیرواں نے تڑپ کر آنکھیں کھولی تھیں۔ ''وہ تو میرے دل کی آرزو ہے۔''

''سب آرزوئیں بھی پوری نہیں ہوتیں بیٹا۔'' انہوں نے اس کی بے حد سرخ آنکھوں کو دکھ سے دیکھا۔ ''دل تو اکثر لاحاصل چیزوں کی آرزو بھی کرنے لگتا ہے بچے۔''

''کیوں......؟ بھلا کیوں ایسی آرزوئیں پیدا ہوتی ہیں دل میں جنہیں پورا نہیں ہونا ہوتا۔'' نوشیرواں نے یہ سوچتے ہوئے پھر آنکھیں موند لی تھیں۔ میراں اماں اسی طرح اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہی تھیں اور ان کی آنکھیں نم ہوتی جا رہی تھیں۔ اگر سیمل اپنے ابا سے کہتی، انہیں اپنی مرضی بتاتی تو کیا وہ اس کے اور نوشیرواں کے متعلق نہیں سوچتے لیکن اس نے تو لڑے بغیر ہی ہتھیار ڈال دیے۔

''نہیں، میں ابا سے یہ سب کچھ نہیں کہہ سکتی۔''

''کیوں نہیں کہہ سکتیں سیمل؟'' نوشیرواں بے حد مضطرب اور بے چین تھا۔

''میں ابا کو دکھ نہیں دینا چاہتی۔'' اس کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئی تھیں۔

''اور کیا خود کو دکھ دے لوگی؟'' نوشیرواں تلخ ہوا تھا۔ وہ صبح صبح ہی ملنے چلی آئی تھی۔ میراں اماں کچن میں تھیں اور وہ ٹیبل سے ٹیک لگائے نوشیرواں کے کمرے میں کھڑی تھی۔

''بیٹھ جاؤ سیمل۔'' نوشیرواں کو احساس ہوا تھا کہ وہ جب سے آئی ہے کھڑی ہے لیکن سیمل اسی طرح میز سے ٹیک لگائے ٹکی کھڑی رہی۔ میراں اماں ملک ہاؤس آئی تھیں تو ابا نے مختلف کلچر اور ماحول کی بات کر کے معذرت کر لی تھی اور میراں اماں کے جانے کے بعد نوشیرواں نے اسے کتنے ہی فون کیے تھے لیکن وہ انہیں اٹینڈ نہیں کر رہی تھی۔ اس میں نوشیرواں سے بات کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ اسے سنبھلنے کے لیے تھوڑا وقت چاہیے تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اگر اس نے نوشیرواں سے بات کر لی تو وہ خود بکھر جائے گی اسے اپنے آنسوؤں پر اختیار نہیں رہے گا۔

''پلیز نوشیرواں، میں بات نہیں کر سکتی کل آؤں گی۔'' اس نے نوشیرواں کو میسیج کیا تھا۔ سو اب وہ اس کے سامنے تھی۔

''میں جانتا ہوں تم خوش نہیں رہ سکو گی۔ ایک بار صرف ایک بار ان سے بات کر کے تو دیکھو۔''

''نہیں۔'' سیمل کے لہجے میں مضبوطی تھی۔

''میں اپنا بھرم نہیں کھو سکتی...... میں مروان کے لیے ایک بھی منفی بات نہیں سن سکتی، میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ ابا کے دل میں یہ خیال تک بھی آئے کہ مروان نے مجھے بہت آزادی دے رکھی تھی۔ پلیز نوشیرواں مجھے معاف کر دیں۔ میری ذات آپ کے

لیے دکھ کا باعث بنی حالانکہ میں نے تو ہمیشہ آپ کو سکھ دینے کا ہی سوچا تھا۔ میں تو آپ کے غم بانٹنا چاہتی تھی میں تو آپ کے آنسو پونچھنا اور آپ کے ساتھ مل کر رونا چاہتی تھی لیکن انجانے میں دکھ دے بیٹھی۔''

''دکھ......؟'' نوشیرواں کے لبوں پر زخمی سی مسکراہٹ ابھری۔ ''دکھ تو بہت معمولی لفظ ہے لڑکی...... میرا تو دل ہی خالی ہو گیا ہے۔'' اور سیمل جو اب تک ضبط کیے بیٹھی تھی یکدم رو پڑی۔ نوشیرواں بے بسی سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ پھر وہ چلی گئی۔ وہ کتنی ہی دیر تک خالی دروازے کو تکتا رہا۔ کمرے میں اس کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ وہ تھکا تھکا سا بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔ پھر میراں اماں آ گئیں انہوں نے اس کا سر سینے سے لگا کر اس کا سر ہمیشہ کی طرح چوما تھا پھر دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا تھا۔

''میں اسی دن سے ڈرتی تھی شیری...... اور مجھے اسی بات کا خوف تھا۔'' نوشیرواں کا دل چاہا تھا وہ میراں اماں کے گلے لگ کر بہت سا رو لے۔ وہ قبائلی بہادر مرد بہ مشکل اپنے آنسو روک پا رہا تھا۔ دل تو خالی تھا تب سے جب سب نے اکھٹا دوسری دنیا کی راہ لی تھی اور اس خالی دل میں بس ایک آس کا دیا جلتا تھا۔ گل کے ملنے کی آس...... پھر نہ جانے کہاں سے اس خالی دل میں بہاروں کی خوشبو بھر گئی۔ وہ سہمی سہمی خوف زدہ سی لڑکی دل کے خالی آنگن میں آزادی سے گھومنے لگی اور بار بار اسے بہار کا پیام دینے لگی۔ میراں اماں بیڈ پر بیٹھ گئی تھیں اور وہ ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں کہ کھلی آنکھوں کے پیچھے آنسو مچلتے تھے اور باہر آنے کو بے تاب ہوتے تھے۔

''شیری تو تو میرا بہت بہادر بچہ ہے...... میرا نوجی جوان۔'' ان کی انگلیاں اب بھی اس کے بالوں میں تھیں اور ممتا بھرا لمس اسے سکون دے رہا تھا۔

"اکثر حقیقتیں بہت تلخ ہوتی ہیں لیکن انہیں قبول کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے قبول نہ کرنے سے حقیقت بدل تو نہیں جاتی...... سیمل بہت پریشان تھی...... بہت رو رہی تھی۔ تمہیں تو اسے حوصلہ دینا چاہیے تھا الٹا خود حوصلہ ہار بیٹھے۔ بچیاں تو ایسے ہی ہوتی ہیں کمزور، نازک دل مگر تو بہادر فوجی ہے ناں۔"

"ہاں بہادر فوجی۔" اس نے آنکھیں موندے موندے دل میں اعتراف کیا...... "اور ہمیں سکھایا گیا ہے کہ ہمیں اپنی آخری سانس تک جنگ لڑنی ہے۔ سیمل نے ہتھیار پھینک دیے ہیں لیکن میں ہتھیار نہیں پھینکوں گا...... میں اپنی جنگ خود لڑوں گا۔ آخری سانس اور آخری امید تک۔" اس نے اپنے ہاتھ میراں اماں کے ہاتھوں پر رکھ دیے اور آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا۔

"اماں جان میں ٹھیک ہوں۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "آپ پلیز جا کر آرام کریں۔" انہوں نے بغور اسے دیکھا اور پھر بولیں۔

"میری جھولی میں صرف تم ہو شیری اور ایک آس ہے گل کے ملنے کی آس۔ مجھے تہی دامن مت کرنا شیری بچے۔"

"میں ایسا کچھ نہیں کرنے والا اماں جان۔ آپ وہم نہ کریں، بس کچھ دیر آرام کروں گا۔" وہ ہولے سے ہنسا اور ان کا ہاتھ دبایا۔

"آئی ایم اوکے اماں جان۔" اس کی آنکھوں میں پھیلے کرب کے پیچھے کسی عزم کی جھلک تھی یا پھر میراں اماں کو محسوس ہوئی تھی اور وہ دل ہی دل میں اس کی خوشیوں اور سکون کی دعا کرتے ہوئے کمرے سے باہر چلی آئیں اور بیڈ پر لیٹ کر تکیے پر سر رکھتے ہوئے نوشیرواں نے زیر لب کہا۔

"میں ایک سپاہی ہوں اور میں زندگی کی آخری سانس تک جنگ لڑوں گا اپنی بقا کے لیے۔" اس نے آنکھیں موند لیں۔ باہر میراں اماں بے وقت ہی نفل پر نفل پڑھے جاتی تھیں اور دعا کرتی تھیں کہ شاید کہیں کوئی درِ قبولیت کھل جائے اور ان کے شیری کا خالی دل بھر جائے۔

☆☆☆

سیمل نے حسان کو تھپکتے ہوئے نوشیرواں کی طرف دیکھا جس کی نظریں ٹی وی پر تھیں لیکن وہ ٹی وی نہیں دیکھ رہا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

"کچھ نہیں۔" ایک افسردہ سی مسکراہٹ نوشیرواں کے لبوں پر نمودار ہوئی اور اس نے تکیے کے پاس رکھا ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آف کر دیا اور بیڈ کراؤن سے ٹیک لگاتے ہوئے سیمل کی طرف دیکھا۔

"حسان سو گیا کیا؟" سیمل نے سر ہلایا اور گود میں لیٹے حسان کو اٹھا کر کاٹ میں لٹا دیا اور نوشیرواں کے قریب بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔

"ٹی وی کیوں بند کر دیا۔ کیا کوئی خاص پروگرام نہیں آ رہا۔" نوشیرواں نے نفی میں سر ہلایا اور سیمل کی طرف دیکھا۔ "ایک اور سال بیت گیا سیم۔ کل نئے سال کی پہلی صبح ہوگی جنوری 2012ء کی صبح لیکن ان بیتے سالوں میں کیا ہوا سیمل کچھ بھی تو نہیں بلکہ لگتا ہے ہمارے لیے ہم پاکستانیوں کے لیے زندگی اور مشکل ہوگئی ہے۔ ڈرونز، دہشت گردی، خودکش حملے، ٹارگٹ کلنگ، مہنگائی، کرپشن، لوڈشیڈنگ، ناانصافی، ظلم...... کیا ہوگا اس ملک کا سیم......" ان بیتے سالوں میں اجتماعی سطح پر کوئی خوشی کی خبر نہ تھی۔ ہاں انفرادی خوشیاں تھیں، اس کی زندگی میں سیمل شامل ہوئی تھی۔ وہ اپنی جنگ جیت گیا تھا۔ سوائے اپنی آبائی حویلی کے کھنڈرات کے اس نے علاقے میں اپنی ساری زمین بیچ دی تھی اور یہاں اقبال ٹاؤن میں ایک کنال کا گھر خرید لیا تھا۔ وہ اکثر حبیب خان سے ملنے چلا جاتا تھا

اس کے بعد راہیں ہموار ہوتی گئیں ایک روز وہ حبیب خان کے سامنے بیٹھا کہہ رہا تھا۔

"میں مروان نہیں ہوں لیکن آپ مجھے اپنا مروان ہی سمجھیں...... سیمل کے لیے آپ جو بھی فیصلہ کریں گے مجھے اور سیمل کو قبول ہوگا۔ سیمل آپ کی بیٹی ہے اور آپ اس کے لیے فیصلہ کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ وہ آپ کے کسی بھی فیصلے سے انحراف نہیں کرے گی لیکن فیصلہ کرنے سے پہلے ایک بار پھر سوچیے گا ضرور۔ میں نے ہمیشہ کے لیے یہاں ہی رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے پھر بھی آپ مجھے سیمل کے قابل نہیں سمجھتے تو آپ کو حق ہے مجھے ریجیکٹ کر دیں۔" حبیب خان خاموش رہے تھے۔ اس ایک سال میں وہ ان کے بہت قریب آ گیا تھا، وہ اس سے بہت ساری باتیں شیئر کرنے لگے تھے اس سے بہت سارے معاملات میں مشورہ کرتے تھے وہ اس پر رومی کی طرح ہی اعتبار کرنے لگے تھے۔ کبھی کئی دن وہ نہ آتا تو وہ اس سے ملنے کو بے چین ہو جاتے۔ سو انہوں نے نوشیرواں کے حق میں فیصلہ دے دیا اور یوں سیمل اس کی زندگی میں آ گئی۔ ان خوشیوں کو پائیدار کرنے کے لیے حسان بھی آ گیا۔ اماں اب کافی بہتر بلکہ بالکل ٹھیک تھیں۔ اماں، ابا حج بھی کر آئے تھے۔ یہ چھوٹی چھوٹی انفرادی خوشیاں تھیں لیکن باقی سب کچھ ویسا ہی تھا، وہ بہت دلگرفتہ ہو رہا تھا۔ 2011ء گزر گیا تھا۔ وہ اب بھی ایک دوسرے کو محسن نقوی کی نظم سناتے تھے۔

میرے بس میں ہو تو کبھی کہیں
کوئی شہر ایسا بساؤں میں
جہاں چاند ماند نہ ہو کبھی

اب بھی ان کے دل میں ایسا شہر بسانے کی خواہش چٹکیاں لیتی تھی جہاں یہ سب کچھ نہ ہو۔ یہ نفرتیں، یہ ہلاکتیں، خودکش حملے ایسا شہر، ایسا ملک، جہاں سکون ہو، امن ہو، خوشحالی ہو، انصاف ہو

اور جہاں لوگ مطمئن اور خوش ہوں۔ آج چار سال بعد بھی وہ گل کے پلٹ آنے کا انتظار کرتے تھے اور اس کے سلامت لوٹ آنے کی دعائیں کرتے تھے۔ آج بھی گل سے متعلق کہیں کوئی خبر نہیں ملتی تھی۔ میراں اماں دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتیں تو پھر کتنی ہی دیر اٹھائے رکھتیں اور آنسو ان کے ہاتھوں کے پیالے میں گرتے رہتے۔ سیمل اور نوشیرواں اب بھی کسی نہ کسی اتوار کو انارکلی جاتے اور حامو چاچا نے ان کے لیے اچھی اچھی کتابیں الگ کر کے رکھی ہوتیں اور وہاں سے واپس آکر آج بھی سیمل سوچتی تھی۔

''حامو چاچا اشفاق احمد کا بابا نہیں ہیں لیکن لگتا ہے۔'' کہیں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ کوئی اچھی اور خوش کُن تبدیلی لیکن وہ خواب تو دیکھ سکتے تھے اچھے دنوں کے خواب سو وہ دیکھتے تھے۔

''سیمل صبح میں اسلام آباد جارہا ہوں۔'' بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے نوشیرواں نے باہر جاتی سیمل سے کہا۔

''کیوں؟''

''سنا ہے لاپتا افراد کے لواحقین کوئی ریلی نکال رہے ہیں۔''

''آپ جانا چاہتے ہیں تو چلے جائیں۔''

''پتا نہیں جانا چاہتا ہوں یا نہیں۔'' وہ بے حد تھکا تھکا لگ رہا تھا۔ ''لیکن سیم تم جانتی ہو ناں گل میرے نانا کی نسل کا امین ہے۔ بچ جانے والا میرا واحد رشتے دار...... ہمارے علاقے کے بہت کم افراد لاپتا ہوئے ہیں۔ دو تین یا شاید چار...... لیکن وہاں اسلام آباد میں جب جب گیا مجھے لگا میرا دل یہاں ہی پھٹ جائے گا۔ وہاں ان لاپتا افراد کے بے شمار لواحقین چھوٹے چھوٹے بچے ہاتھوں میں بینرز اٹھائے جھکے کندھوں اور ٹوٹی کمروں والے بوڑھے والدین، میں انہیں دیکھنے کی ہمت خود میں نہیں پاتا...... ان کے مایوس چہرے، ویران آنکھیں لیکن میں کیا کروں سیمل۔ میں ایسا کوئی موقع ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتا... وہ ملے نہ ملے میں آس کی ڈور ٹوٹنے نہیں دینا چاہتا اپنی آخری سانسوں تک......اور جب میں نہیں رہوں گا تو اپنی یہ آس اپنے بچوں کے دل میں چھوڑ جاؤں گا کہ شاید......شاید کبھی میرے نانا کی نسل کا امین لوٹ آئے۔'' اس نے آہستگی سے کہا اور سیمل کی طرف دیکھا۔

''سیم......! مجھے وہ نظم سناؤ اپنی نرم دلکش اور خوب صورت آواز میں۔ جو مروان کو پسند تھی جو گل کو پسند تھی اور جو شاید ہر پاکستانی کے دل کی آواز ہے۔ میں کچھ دیر کے لیے خواب دیکھنا چاہتا ہوں سیمل۔''

سیمل بیٹھ گئی وہ جانتی تھی کہ جب کبھی گل کے آنے کی امید دم توڑنے لگتی تھی تو وہ یونہی نڈھال ہوجاتا تھا۔

''ہاں سیم بولو ناں۔'' اس نے تکیے پر سر رکھتے ہوئے آنکھیں موند لی تھیں۔ سیمل نے آہستگی سے نظم سنانا شروع کی۔

''میرے بس میں ہو تو کبھی کہیں
کوئی شہر ایسا بساؤں میں
جہاں سچ کو سچ سے ہو واسطہ
جہاں جگنوؤں کو ہوا دکھاتی ہو راستہ
جہاں......''

سیمل نظم سنا رہی تھی اور اس کی بند آنکھوں کے پیچھے آنسوؤں کا دریا موجزن تھا۔ خمدار پلکیں بھیگتی جارہی تھیں اور لاؤنج میں جا نماز پر بیٹھی دعا مانگتی میراں اماں کے آنسو دعا کے لیے اٹھے ہاتھوں کے کٹورے میں گرتے جاتے تھے اور نگاہیں دور آسمان پر بھٹکتی تھیں جانے کب درِ قبولیت کھلنا تھا...... جانے کب......

(ختم شد)



وفاؤں کے رنگ

اصفا فیصل

مزمل کی فیملی نے اقصیٰ کو اس کی چچا زاد کزن حبیبہ کی شادی میں دیکھا تھا۔ مزمل کے پاپا اور اقصیٰ کے چچا آپس میں دیرینہ دوست تھے سو اس رشتے پر کسی کو بھی اعتراض نہ ہوا۔ حتیٰ کہ اقصیٰ کو بھی نہیں۔

حبیبہ کی شادی کے بعد حبیبہ کا یوں بات بے بات بلش ہوجانا اور حبیبہ کے شوہر نجیب کا ہر بات پر فدا ہوجانا اقصیٰ کو بہت فیسی نیٹ کرر ہا تھا۔ شادی کے بعد سانولی سی حبیبہ پر اس قدر روپ چڑھا تھا کہ آنکھیں اس کے

چہرے سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں...... ایسے میں ویل ایجوکیٹڈ فیملی سے اقصیٰ کے لیے رشتہ آنا خود اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ شوخ و چنچل قسم کی لڑکی تھی پوری شادی میں آگے آگے رہی یوں وہ مزمل کی فیملی کی نظر میں آگئی۔ سوچٹ منگنی پٹ بیاہ...... اور دو مہینے یعنی عیدالفطر کے فوراً بعد شادی...... یوں اقصیٰ بیاہ کر مزمل کی زندگی میں آگئی۔

☆☆☆

''اقصیٰ اب اٹھ بھی جاؤ میں آفس سے لیٹ ہو رہا ہوں۔'' مزمل نے ٹائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے کہا۔

''کیا ہے بھئی ابھی تو سونے دو۔'' اقصیٰ کسمسائی۔

''اٹھو بہت انجوائے منٹ ہوگئی۔'' پرسوں ہی دونوں شمالی علاقہ جات کی سیر سے واپس لوٹے تھے۔

''مزمل آپ آفس نہ جائیں ناں۔'' اقصیٰ نے بڑے مان سے کہا۔

''کیا مطلب! پہلے ہی بہت چھٹیاں ہوگئیں، پندرہ دن کی چھٹیاں تھیں اور میں بیس دن کے بعد جارہا ہوں، کیا آفس سے نکلوانے کا ارادہ ہے!''

''اچھا ٹھیک ہے شام کو جلدی آجایئے گا۔''

''پہلے آپ بھیجیں تو سہی پھر ہی واپس آؤں گا ناں۔'' اس نے اقصیٰ سے پھر کہا۔

''اٹھیں اچھا چلیں۔''

''جو حکم جناب کا!'' دونوں ہنستے ہوئے کمرے سے باہر نکلے تو مزمل کی امی نہال ہوگئیں۔

مزمل کی امی کا شمار ان ساسوں میں تھا جو بہو اور بیٹے کی خوشی میں خوش ہوتی ہیں اور کیوں نہ ہوتیں ایک بیٹی تھی جو شادی ہو کر اپنے گھر میں تھی اور ایک چھوٹا بیٹا تھا جو ابھی کنوارا تھا۔ شوہر سرکاری نوکری سے ریٹائر ہو چکے تھے سو وہ اپنے دوستوں کے جھرمٹ میں خوش تھے اور پیچھے اکیلی وہ خود رہ جاتی تھیں اسی لیے وہ اب بہو کی ہنسی سے گھر میں چھائی اکیلے پن کی فضا کو دور کرتیں۔

کچھ ہی دنوں میں انہیں بہو کی طرف سے خوشخبری بھی مل گئی اب تو جہاں آرا بیگم اسے زمین پر پاؤں بھی اتارنے نہیں دیتی تھیں۔ مزمل الگ سے قربان جاتا تھا اتنی محبت پا کر اقصیٰ پھولے نہیں سماتی تھی۔ یہاں تک کے اقصیٰ کا دل اپنے میکے میں بھی نہیں لگتا تھا۔ جو وی آئی پی پروٹوکول اسے سسرال میں میسر تھا وہ ہر شادی شدہ لڑکی کا خواب ہوتا ہے۔

آج بہت دن بعد اقصیٰ اپنے میکے آئی تھی۔ آئی کیا تھی بلکہ بلائی گئی تھی وہ بھی حبیبہ کے پُرزور اصرار پر کیونکہ شادی کے بعد ملنا ملانا صرف تقریبات تک محدود ہو گیا تھا اور اس کنڈیشن میں اقصیٰ خود تقریبات اٹینڈ کرنے سے گھبراتی تھی۔

''شکر ہے آپ حُجرے سے تو نکلیں۔'' حبیبہ نے پیار سے گلے لگاتے ہوئے اقصیٰ سے شکوہ کیا۔

''چلو میں تو نکل بھی آئی مگر تمہیں تو توفیق نہ ہوئی۔''

''اچھا جی، یہ میں نے ہی فون کر کے بُلالیا ہے آپ کو اور خود بھی مابدولت آپ ہی کی خاطر یہاں آئی ہیں۔''

''تم سناؤ کوئی گڈ نیوز......!''

''کہاں یار...... اب تو تنگ آگئی ہوں جو ملتا ہے یہی سوال کرتا ہے۔''

''چلو خیر ہے ابھی تو شادی ہوئی ہے، مجھے دیکھو فوراً ہی سلسلہ شروع۔ کہیں آسکتی ہوں نہ جاسکتی ہوں۔''

''ہش پاگل! شکر ادا کرو رب کا ایسے کفرانِ نعمت نہ کرو۔''

''نہیں خیر! کفرانِ نعمت نہیں کررہی شکر ہے خدا کا مگر پھر بھی......''

''ہم کسی اور موضوع پر بات کرسکتے ہیں؟'' حبیبہ نے اُکتاتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔

''ہاں کیوں نہیں نجیب بھائی کی سناؤ وہ کیسے ہیں؟'' اقصیٰ نے گفتگو کا رخ موڑا۔

☆☆☆

جہاں آرا بیگم اقصیٰ کے پاس بیٹھی اسے سمجھا رہی تھیں۔ کل ہی الٹرا ساؤنڈ کی رپورٹ میں جڑواں بچوں کی نوید سنائی تھی اور اقصیٰ از حد گھبرا رہی تھی جہاں آرا بیگم اسے سمجھا رہی تھیں۔

''اقصیٰ بیٹا ابھی تم کسی سے ذکر نہ کرنا۔''

''کیوں امی؟''

''سمجھا کرو بیٹا! نظر لگ جاتی ہے۔''

''مگر امی اس میں نظر کیوں لگے گی۔''

''بیٹا یہ وہ خوش خبری ہے جو رب نے پوشیدہ رکھی ہے بس خدا رحم کرے ان لوگوں پر جو جدید مشینوں کے ذریعے پوشیدہ احوال بیان کرتے ہیں۔ ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے اور ہر چیز اپنے مقررہ وقت پر ہی اچھی لگتی ہے۔ اب تم اپنی دوستوں اور رشتے داروں سے اس بات کا ذکر نہیں کروگی اور نہ اب مجھ سے مزید کوئی سوال......'' جہاں آرا بیگم نے مصنوعی ناراضی سے کہا۔

''اچھا میری پیاری امی جیسا آپ کہیں گی ویسا ہی کروں گی لیکن ایک شرط ہے۔'' اقصیٰ نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔

''ہیں، ساس سے شرطیں رکھتی ہے شرم کرلڑکی۔''

''پہلے سن تو لیں۔''

''اچھا بتاؤ۔''

''پہلے آپ صبح اور رات دودھ پلاتی تھیں، ایک گلاس میرے لیے اور ایک بے بی کے لیے خدارا میں اب تین گلاس دودھ نہیں پیوں گی کہ آپ اب شام کو بھی دودھ پلائیں کہ یہ دوسرے بے بی کے لیے۔'' اقصیٰ کی بات پر جہاں آرا ایک لمحے تو دیکھتی رہیں پھر دونوں قہقہے مار کر ہنسنے لگیں۔

''ارے واہ جی واہ کس بات پر اتنا کھلکھلایا جارہا ہے۔'' مزمل نے اندر آتے ہوئے حیرت سے دریافت کیا۔

''ارے جائیں منہ دھو رکھیے یہ ہم ماں بیٹی کی بات ہے۔''

''حیرت ہے بھئی ساس اور بہو میں اتنا پیار۔''

''جی نہیں یہ میری مما ہیں کوئی ساس واس نہیں۔'' وہ جہاں آرا بیگم کو پیار سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''دیکھ لیں امی یہ آپ کو ساس واس کہہ رہی ہے۔''

''کوئی فائدہ نہیں آگ لگانے کا یہاں سے دھواں نہیں نکلے گا۔'' اقصیٰ نے چڑایا۔

''بیٹا تم ہاتھ منہ دھو کر فریش ہو جاؤ میں کوثر سے چائے کا کہہ دوں ایک تو جب تک ان نوکروں کے سر پر کھڑے نہ ہو یہ کام نہیں کرتے، دیکھوں ذرا رات کے کھانے کا کیا کرنا ہے۔'' جہاں آرا بیگم کہتے ہوئے کمرے سے باہر چلی گئیں۔

☆☆☆

اسی طرح ہنستے کھیلتے یہ دن بھی گزر گئے اور اقصیٰ ایک بیٹا اور ایک بیٹی کی ماں بن گئی۔ صدقہ خیرات کیا گیا، مٹھائیاں بٹیں عقیقے نمٹائے گئے۔

''شکر ہے خدا کا کہ اس نے دونوں بچے صحت مند دیے کوئی جسمانی عیب نہیں۔ بس بہن اٹھتے بیٹھتے لب پر یہی دعا ہوتی تھی کہ وہ ربِّ کریم ساتھ خیریت سے میری اقصیٰ کو فارغ کرے۔'' اقصیٰ کی امی جہاں آرا بیگم سے مخاطب تھیں۔

''ہاں، بہن لاکھ لاکھ شکر ہے پروردگار کا۔''

دونوں کے نام صلاح ومشورے سے زین

العابدین اور دُرِّ نجف رکھے گئے۔

اقصیٰ کی زندگی صحیح معنوں میں بہت ٹف ہوگئی ایک کو چُپ کراتی تو دوسرا رونے لگتا، دوسرے کو فیڈ کراتی تو پہلا رونے لگتا۔ انہی دنوں جہاں آرا بیگم حج پر چلی گئیں۔ وہ اقصیٰ کو چھوڑ کر جانا تو نہیں چاہتی تھیں مگر اللہ کے گھر کا بُلاوا تھا سو جانا لازمی تھا۔ وہ اقصیٰ مزمل اور نوکرانی کوثر کو بہت سمجھا بجھا کر گئیں۔ دردانہ جو اقصیٰ کی نند تھی دوسرے شہر میں رہتی تھی تو اس کا آنا جانا بھی مشکل تھا۔ یوں حماد چھوٹے بیٹے اور شوہر کے ہمراہ سب کو ڈھیروں نصیحتیں کرتے ہوئے وہ روانہ ہوگئیں۔

کچھ دن اقصیٰ کی امی اس کے ساتھ رہیں مگر کب تک......! انہیں اپنا گھر بار بھی دیکھنا تھا سو وہ چلی گئیں۔

☆☆☆

''اقصیٰ اپنا حلیہ دیکھا ہے تم نے؟'' مزمل نے غصے سے اقصیٰ سے کہا۔ مزمل اقصیٰ کو دو تین دن سے نوٹ کر رہا تھا۔ کہاں اقصیٰ دن میں دو دفعہ لباس تبدیل کرتی تھی۔ آج تین دن سے ایک ہی سوٹ پہنے گھوم رہی تھی۔ میک اپ تو کجا بال بنانے تک کی زحمت گوارہ نہیں کی تھی۔

''مزمل میں کیا کروں؟'' اقصیٰ روہانسی ہونے لگی۔

''کیا کروں مطلب ......اور بھی تو عورتیں ہوتی ہیں جو بچے بھی سنبھالتی ہیں گھر اور سسرال بھی، تمہیں تو ایسا کوئی جھنجٹ بھی نہیں، دو بچے ہیں وہ ہی نہیں سنبھل رہے۔'' مزمل کا یہ انداز دیکھ کر اقصیٰ رونے لگی۔

''ارے، ارے اب رووٴ تو مت، کیا کروں عادت جو نہیں تمہیں اس طرح دیکھنے کی اسی لیے......'' مزمل گھبرا گیا۔

''ہاں تو میں جان بوجھ کر ایسا کرتی ہوں خود تو آپ مزے سے رات کو سوجاتے ہیں وہ دونوں مجھے جگائے رکھتے ہیں اس پر سے آپ مجھے ہی ڈانٹ رہے ہیں، آنے دیں امی کو آپ کی شکایت کروں گی۔''

''بھئی یہ غضب نہ کرنا، اچھا دیکھو سوری غلطی ہوگئی...... دیکھو کان پکڑتا ہوں۔'' مزمل کو کان پکڑتا دیکھ کر اقصیٰ کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''شکر ہے تم ہنسیں تو سہی۔'' مزمل بولا۔

☆☆☆

اگلے دن امی سے فون پر بات ہوئی تو اقصیٰ نے امی سے مزمل کی خوب شکایتیں کیں۔ جہاں آرا بیگم ہنس کر سنتی رہی آخر میں انہوں نے کہا ان کی ایک دُور کی عزیزہ ہیں ان کی بیٹی فرحت بہت سمجھدار ہے آج کل کوئی مصروفیت بھی نہیں ہے اس کے پاس وہ ان کو فون کردیں گی مزمل جا کر اسے لے آئے گا اس کے آنے سے بچوں کو سنبھالنے کا مسئلہ کچھ تو حل ہوجائے گا۔

''اللہ امی آپ کتنی اچھی ہیں سچ میں، میں تو گھن چکر بن گئی ہوں سمجھ ہی نہیں آتا کس کو پہلے دودھ پلاؤں کس کو بعد میں، دونوں ایک ساتھ ہی روتے ہیں اور سب سے مشکل کام تو ان کو نہلانا ہے، اتنا ڈر لگتا ہے اور وہ کوثر اس کو تو کچھ پتا ہی نہیں اس کو تو بس کھانا بنانے اور صفائی کرنے سے فرصت ہی نہیں ملتی اور اسے تو بچہ پکڑانے کو دل بھی نہیں چاہتا۔'' امی نے کچھ کہا ہوگا تو اقصیٰ بولی۔ ''جی امی میں کہہ دوں گی۔ جی......جی خدا حافظ ابو کو سلام کہیے گا۔''

اقصیٰ کے ذہن میں فرحت کا خاکہ نارمل سا تھا مگر وہ تو اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ جدید تراش خراش کے خوب صورت کالے سوٹ میں اس کا گورا رنگ دمک رہا تھا۔ فرحت اس سے بہت پیار سے ملی۔

''سوری اقصیٰ میں تمہاری شادی پر نہ آسکی

دراصل ان دنوں آپی پریگنینٹ تھیں میں ان کے پاس تھی۔'' فرحت نے بتایا۔

''سنا ہے بہت ایکسپرٹ ہیں آپ بچے سنبھالنے میں۔'' اقصیٰ کی زبان پھسلی۔

''ایکسپرٹ کیا ڈیر! بس بچے ہوتے ہی اتنے پیارے ہیں۔ ارے تم بتاؤ تمہارے بچے کہاں ہیں مجھے ٹوئنز دیکھنے کا بہت شوق ہے۔'' فرحت بہت ایکسائٹڈ ہو رہی تھی۔

فرحت کے آنے سے اقصیٰ کو بہت سکون ملا پہلے تو اقصیٰ نے جی بھر کر اپنی نیندیں پوری کیں۔ نہ جانے فرحت کے پاس کیسا جادو تھا وہ پلک جھپکتے ہی سارے کام کردیتی تھی۔

''دیکھیں مزمل یہ میری انگلی پکڑ رہا ہے دیکھیں ناں۔'' اس دن اچانک وہ سو کر اٹھی تو لاؤنج سے آتی ہوئی آوازوں نے اس کو متوجہ کیا۔ لاؤنج میں زین العابدین بے بی کاٹ میں لیٹا ہوا تھا اور اس کے دونوں اطراف مزمل اور فرحت کاٹ پر جھکے ہوئے تھے۔ فرحت کی انگلی زین العابدین کی چھوٹی سی مٹھی میں اور مزمل کی نگاہیں فرحت پر...... اقصیٰ کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا ''یہ نگاہیں تو صرف میری جانب ہی اس طرح اٹھتی تھیں۔''

''آؤ اقصیٰ دیکھو ناں۔'' فرحت نے اقصیٰ کی جانب دیکھتے ہوئے اسے پکارا۔ ''ہوسکتا ہے میرا وہم ہو۔'' اقصیٰ نے سر جھٹکا اور آگے بڑھ گئی۔ اقصیٰ نے زین العابدین کو جیسے ہی گود میں اٹھایا وہ رونے لگا۔

''ارے میرے زین کو بھوک لگی ہے۔'' اقصیٰ نے بہلایا۔

''نہیں اقصیٰ، اسے نیند آرہی ہے یہ اس کے سونے کا ٹائم ہے۔'' فرحت نے بڑے یقین سے کہا۔

''دیکھ لو اقصیٰ تم سے زیادہ فرحت کو پتا ہے اس کے بارے میں۔'' مزمل نے فرحت کی طرف فخریہ

لبنیٰ عروج کے نام

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اِک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

لبنیٰ عروج کا تعلق ہمارے شاہینوں کے شہر سرگودھا سے تھا۔ لبنیٰ عروج کیا جدا ہوئیں ایسا لگ رہا ہے پورا سرگودھا اداس ہے۔ ہر شے روتی ہوئی نظر آرہی ہے۔ یہ اس لیے کہ ہم رو رہے ہیں۔ ایک ایسی ہستی ہم سے جدا ہوگئی جو پاکیزہ کی جان تھی اور جس میں پاکیزہ سے وابستہ ہر فرد کی جان تھی۔ نیک خیالات کی مالک اچھی رائٹر بہترین رہنما ہم سے بچھڑ گئی۔ دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میری موسٹ فیورٹ رائٹر اتنی جلدی ہم سے جدا ہوجائیں گی۔ ان کی ڈریسنگ، ان کے بات کرنے کا اسٹائل، ان کا مسکرا کے بات کرنا ان کی ہر ادا دل میں اتر جاتی تھی۔ ان کے افسانے حقیقت سے قریب تر ہوتے تھے۔ ہماری دل سے دعا ہے کہ اللہ رب العزت ان کو جنت الفردوس میں سب سے اعلیٰ مقام دے، آمین

جبیں ہاشمی بھیرہ، سرگودھا

انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''اقصیٰ تم ایسا کرو تم زین کو سلا دو دُرِّ نجف تو ابھی ابھی سوئی ہے۔ فرحت کو ایک دو چیزیں لینی ہے گھر سے ہم بس ابھی آتے ہیں۔'' مزمل اور فرحت، اقصیٰ کے دیکھتے ہی دیکھتے یہ جا وہ جا۔

اب تو یہ روز کا معمول بن گیا تھا اقصیٰ کو ایسا لگتا جیسے فرحت بچوں کے ساتھ ساتھ بچوں کے ابا کو بھی سنبھالنے آئی ہے۔ ناشتے میں فرحت، مزمل کی پسند کا چیز آملیٹ بنا رہی ہے، کبھی فش فرائی ہو رہی ہے، کبھی آؤٹنگ کا پروگرام بن رہا ہے، آخر ایک دن وہ مزمل

کے سامنے بول پڑی۔

''مزمل میرا خیال ہے بہت دن ہو گئے، اب فرحت کو اپنے گھر چلے جانا چاہیے۔''

''کیا؟ اپنے گھر چلے جانا چاہیے! حد ہوتی ہے احسان فراموشی کی ایک تو وہ تمہارا اتنا ہاتھ بٹا رہی ہے بجائے شکر گزار ہونے کے تم کہہ رہی ہو اسے گھر چلے جانا چاہیے۔''

''تو آپ کیوں اتنا بھڑک رہے ہیں ایک نہ ایک دن تو اسے جانا ہی ہے ناں۔'' اقصیٰ تنک کر بولی۔

'جانا ہے نہیں جانا مجھے نہیں پتا...... پر اس کے آنے سے مجھے بہت سکون ہے، اور تم بھی تو کتنے آرام سے ہو۔'' مزمل کہنے لگا۔

''میرے آرام کی فکر چھوڑ دیں آپ بس اپنی بات کریں یہ کہیں کہ آپ کا دل لگا ہوا ہے۔''

''بکواس بند کرو، تمہیں ایسا لگتا ہے تو ایسا ہی صحیح ...... تم نے کب میرا اتنا خیال کیا......؟ تم نے کبھی یہ جاننے کی کوشش کی کہ مجھے کیا پسند ہے کیا نہیں......؟ یہ تو امی ہی ہیں جو شادی کے بعد میرے ناشتے سے لے کر ہر چیز کا خیال رکھتی رہیں تمہیں تو بس نخرے اٹھوانے آتے ہیں۔''

''مزمل آپ......؟'' اقصیٰ رونے لگی۔

''بند کرو یہ رونے دھونے کا ڈراما...... شادی کے بعد ہر لڑکی میچور ہو جاتی ہے اور یہ بس ہر وقت ننھی بنی رہتی ہو۔جب کچھ نہیں آتا تو رونا شروع، شکایتیں شروع، شکر کرو ایسا سسرال اور شوہر ملا کوئی اور ہوتا نہ تو اب تک......'' مزمل اس کو روتا چھوڑ کر باہر چلا گیا۔

اگلے دن اس نے پہلی فرصت میں امی کو فون کیا نہ جانے کیا بات تھی کال مل کر ہی نہ دی اقصیٰ نے حبیبہ کو کال کی اور اس کو ساری بات بتائی۔

''یہ سب تمہارا ہی قصور ہے۔''

''ہاں تم بھی مجھے ہی کہو گی میں پہلے ہی اتنی پریشان ہوں مزمل نے آج تک مجھ سے ایسے بات نہیں کی تھی جیسے اب کی ہے۔''

''اسی لیے تو کہہ رہی ہوں تمہارا قصور ہے۔'' حبیبہ نے پھر اپنا جملہ دھرایا۔

''اب بتاؤ میں کیا کروں میں تو سوچ رہی ہوں ابھی فرحت کو نکال باہر کروں۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''پاگل پنے کی بات نہیں کرو، اس طرح مسئلے حل نہیں ہوتے آج سے تم مزمل کے کھانے پینے لباس اور آرام کا خصوصی خیال کرو۔'' حبیبہ نے سمجھایا۔

''میں خیال کروں؟ وہ بھی اتنی باتیں سننے کے بعد، انہوں نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔''

''پھر بے وقوفی کی باتیں کر رہی ہو اگر فرحت کو گھر سے نکال دو گی تو باہر مل لیں گے بتاؤ پھر کیا کرو گی؟'' حبیبہ نے اس سے کہا۔

''ہائے اللہ حبیبہ تمہی بتاؤ میں کیا کروں۔امی سے بھی بات نہیں ہو پا رہی۔''

''دیکھو تم کچھ بھی کہو، ہیں تو وہ بھی تمہاری ساس ناں اپنے بیٹے کی غلطی نہیں مانیں گی۔تم ایسا کرو پیار سے، محبت سے مزمل کا اور زیادہ خیال رکھو، اپنی نیند کی قربانی دو صبح خود اٹھ کر ناشتا بنا کر دو، کپڑے ریڈی کرو ان کے، خود تیار رہو ان کی پسند کے کھانے بناؤ۔'' اس نے پیار سے سمجھایا۔

''حبیبہ بچے ساری رات جگاتے ہیں میں کیسے اٹھوں صبح صبح؟ کیسے بناؤں ناشتا؟ میں نے تو عرصے سے کچن میں نہیں جھانکا۔''

''ہاں تو مانو یہ سب تمہاری ہی غلطیاں ہیں جس سے فرحت فائدہ اٹھا رہی ہے، دیکھ لو میرا کام صرف سمجھانا تھا، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری ساس آئیں اور فرحت ان کا بھی دل جیت لے، آگے تم خود سمجھدار ہو۔'' حبیبہ نے ہر پہلو اقصیٰ کو دکھا دیا۔

''اُف ایک تو حبیبہ کی بچی نے اور ڈرا دیا۔ابھی تک یہ ڈھارس تھی کہ امی کے آتے ہی فرحت کا بستر گول...... یہاں تو حبیبہ نے کچھ اور ہی کہانی سنا دی ویسے کچھ غلط بھی نہیں کہہ رہی ہے وہ۔''

چند ہی دنوں میں اقصیٰ نے اپنے آپ کو بدل لیا، گو کہ یہ مشکل تھا مگر ناممکن نہیں تھا، کچھ بچے بھی تھوڑا روٹین میں آ رہے تھے۔رات کے لیے ان کا فیڈر لگایا تا کہ ڈبے کے دودھ سے ان کا پیٹ بھر لے اب بچے ساری رات نہیں جگاتے تھے۔اپنے ہاتھ سے ناشتا بنا کر اور اس کے ساتھ ناشتا کر کے مزمل کو آفس بھیجتی، ان کی ضرورت کا خیال رکھتی، چند ہی دنوں میں مزمل پھر پہلے جیسا ہو گیا، فرحت کو جب نو لفٹ کا بورڈ ملا تو وہ خود ہی چلی گئی سب کچھ نارمل اور اقصیٰ کی مرضی کے مطابق ہونے میں ٹائم لگا مگر ہو ہی گیا لیکن اقصیٰ کا دل ٹوٹ گیا...... وہ سوچتی تھی کہ مزمل کی وفاؤں کا رنگ اتنا کچا تھا کہ حالات کی بارشیں اسے دھندلا دیں۔ چند دنوں بعد اقصیٰ کی ساس بھی آ گئیں اور یوں امی کے آنے سے اقصیٰ کو بھی ڈھارس ملی۔ جہاں آرا بیگم بہو کا یہ بدلا ہوا انداز دیکھ کر اور نہال ہو گئیں۔

زین العابدین اور دُرِ نجف دونوں بچوں کی پہلی سالگرہ بھی خوب اہتمام کیا گیا تھا۔ ہر طرف سے اقصیٰ ہی کی پکار تھی۔ اقصیٰ کو اتنی ذمے داری سے کام کرتا دیکھ کر پورا خاندان حیران تھا۔ ہر طرف بس اقصیٰ کی واہ واہ تھی سب انتظام شاندار تھا مہمان خوب تعریفیں کر کے گئے تھے۔ساس سسر الگ نہال تھے کہ اتنے چھوٹے چھوٹے جڑواں بچوں کے ساتھ یہ وہی اقصیٰ ہے جو چھوٹی چھوٹی باتوں پر رو پڑتی تھی۔اتنی تعریفیں سن کر بھی اقصیٰ کے دل کو ایک نامعلوم سی اداسی نے گھیرا تھا۔وہ شاید مزمل سے اب بھی بدگمان رہتی جو اس نے اپنی ساس اور مزمل کی باتیں نہ سن لی ہوتیں۔

''مزمل! اقصیٰ کچھ بجھی بجھی سی ہے۔''

''ہاں امی آپ صحیح کہہ رہی ہیں، میں ترس گیا ہوں اس کی بے ساختہ ہنسی سننے کے لیے۔''

''مزمل تم اسے بتا کیوں نہیں دیتے، اس واقعے کو وہ اب تک نہیں بھولی۔''

''نہیں امی وہ مجھ سے بڑھ کر آپ پر بھروسا کرتی ہے۔ اگر میں نے اسے بتا دیا کہ اس کی غیر ذمے داری اور بچپنے کو ختم کرنے کے لیے آپ نے ہی فرحت کے ساتھ مل کر وہ ڈراما رچایا تھا تو اس کا اعتبار آپ پر سے اٹھ جائے گا۔'' وہ فکر مندی سے بولا۔

''اٹھتا ہے تو اٹھ جائے کم از کم اپنے شوہر پر اس کا مان تو قائم رہے گا ناں بیٹا اور یہ سب تو اس کی بھلائی ہی کے لیے کیا تھا اور ساسیں تو نہ جانے کیسے کیسے ظلم کرتی ہیں ہم نے تو بس چھوٹا سا ڈراما کیا تھا۔''

''نہیں امی اسے آپ پر بہت مان ہے۔ پہلی بات ہے وہ مانے گی نہیں دوسرا میں خود بتانا نہیں چاہتا۔ اپنا اعتبار میں پیار سے جیت لوں گا کچھ وقت لگے گا مگر بہر حال میں پرامید ہوں۔''

''چلو جو تم بہتر سمجھو اب سو جاؤ جا کر کافی رات ہو گئی۔'' انہوں نے بڑے پیار سے کہا۔

''شب بخیر امی!''

''شب بخیر بیٹا! اللہ تمہیں سدا خوش رکھے۔''

اقصیٰ دروازے سے ہٹ گئی آج حقیقت میں وہ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ یہ سچ ہے کہ مزمل کی بے وفائی نے اسے توڑ دیا تھا۔ اسے مزمل کا پیار و محبت اب مکر و فریب لگتا تھا مگر آج ساس کی باتیں سن کر اسے یک گونہ اطمینان حاصل ہوا تھا۔

''ساس، ساس ہوتی ہے مگر میری ساس تو گریٹ ہیں اور شوہر اس سے بھی زیادہ گریٹ، اتنے پُرخلوص ہیں اور میں ایویں بدگمان ہوتی رہی۔'' اب اقصیٰ تو جا رہی تھی دو نفل شکرانے کے پڑھنے۔ رب نے اسے کس قدر سچی اور پُرخلوص چاہتوں سے نوازا تھا۔

ناولٹ

دلہن بنتی ہیں

لبنیٰ عروج



قارئین کرام! جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ہماری بہت پیاری اور نامور مصنفہ لبنیٰ عروج اب ہمارے درمیان نہیں مگر ان کی دلکش یادیں ان کی تحریروں کی صورت ہمارے دلوں میں سدا آباد رہیں گی، زیرِ نظر افسانہ لبنیٰ عروج کی یاد میں آپ کے لیے شائع کیا جارہا ہے۔ یاد رہے یہ افسانہ مئی 2006ء کے پاکیزہ کی زینت بن چکا ہے۔

''نہیں، نہیں، میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔''

آمنہ بیگم نے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر دھر لیے۔

''ایک دم یوں جواب دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا، آپ کچھ دنوں کی مہلت لے لیجیے اور خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کیجیے۔'' ان کے چھوٹے داماد نے انہیں سمجھایا۔

''اشفاق میاں وہ لوگ پنجاب کے کسی دور دراز گاؤں سے تعلق رکھتے ہیں جہاں نہ بجلی ہے، نہ

سڑکیں، مین روڈ سے اندر گاؤں تک جانے کے لیے اونٹوں کا استعمال ہوتا ہے اب تک۔ ہم ٹھہرے شہری لوگ، شہری سہولیات کے مطابق زندگی گزارنے والے۔“

”لیکن یہ بھی تو سوچیں وہ لوگ اب وہاں تو نہیں رہتے۔ لڑکا پڑھا لکھا ہے گریجویٹ ہے، لاہور میں جاب کرتا ہے بیوی کو لے کر گاؤں جانے سے تو رہا۔ ایسی صورت میں جبکہ نائلہ کی گورنمنٹ جاب بھی اسی شہر میں ہے۔“

”وہ سب تو ٹھیک ہے اشفاق میاں لیکن دل نہیں مانتا۔“

”یہ بھی تو دیکھیے نا امی جان وہ دو ہی بھائی ہیں، چھوٹا تو ابھی صرف چھٹی ساتویں میں پڑھتا ہے اور ان کی والدہ تو اس قدر خاموش طبع اور کم گو ہیں کہ لگتا ہے منہ میں زبان ہی نہیں۔“

راضیہ، آمنہ بیگم کی دوسرے نمبر کی بیٹی تھی، سادہ مزاج، شوہر کی فرمانبردار، وہ ماں کا احتراز سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی۔ دونوں میاں بیوی بس بغیر سوچے سمجھے اس اجنبی انجان رشتے کی وکالت کیے جا رہے تھے جبکہ آمنہ بیگم کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات صاف دیکھے جا سکتے تھے۔ کچھ دنوں کے لیے معاملہ ٹل گیا۔ چند دن بعد پھر محلے کی وہ عورت جو یہ رشتہ لائی تھی اور کروانے میں پیش پیش تھی آدھمکی۔

”آپا جی وہ لوگ جلدی جواب چاہ رہے ہیں، آپ لوگ فیصلہ کرنے میں اتنی دیر لگائیں گے تو وہ کہیں اور بھی دیکھ رہے ہیں۔“ آمنہ بیگم نے بڑے تحمل سے اس خاتون کی بات سنی پھر بولیں۔

”دیکھو رشیدہ! بیٹیوں کے رشتے کوئی یونہی بے سوچے سمجھے تو نہیں کر دیے جاتے، ہتھیلی پر سرسوں تو جمائی نہیں جا سکتی ناں‘ ہمیں فیصلہ کرنے میں کچھ وقت لگے گا انہیں جلدی ہے تو وہ کہیں اور دیکھ لیں۔“

”ٹھیک ہے جی، میں انہیں بتا دوں گی۔“ رشیدہ نے چائے کا کپ میز پر رکھتے ہوئے برقع سنبھالا۔

آمنہ بیگم ایک گورنمنٹ اسکول سے ریٹائرڈ ہیڈ مسٹریس تھیں، شوہر بھی کئی سال سے ریٹائرڈ زندگی گزار رہے تھے اور گھر کے معاملات سے تقریباً بے نیاز ہو چکے تھے۔ تین بڑے بچے شادی شدہ اپنے گھربار والے تھے۔ ایک بیٹا حکومت کی طرف سے ملک سے باہر تھا۔ چھوٹے دو اپنے اپنے طور پر رزق کی تلاش میں سات سمندر پار تھے۔ اب ان کے پاس دو چھوٹی بیٹیاں ہی تھیں جن میں سے نائلہ ایم۔ اے۔ بی۔ ایڈ کر کے ایک سرکاری اسکول میں پڑھا رہی تھی اور آج کل آمنہ بیگم اسی کے رشتے کے لیے پریشان تھیں اور بھانت بھانت کے لوگ رشتہ لے کر چلے آتے تھے۔ کئی بار تو ایسے لوگ آ جاتے جن کے آنے پر وہ چیں بہ جبیں ہو کر رہ جاتیں۔ ان کی بڑی دو بیٹیاں اچھے اور شریف لوگوں میں بیاہی گئی تھیں۔ داماد ماشاء اللہ خوب صورت تھے برسرِ روزگار تھے‘ کسی سے کوئی شکایت نہیں تھی لیکن اب زمانہ بدل چکا تھا بہت کچھ دیکھنا پڑتا تھا‘ سوچنا پڑتا تھا۔ آمنہ بیگم کو تقریباً تنہا ہی سارے فیصلے کرنے پڑتے۔ ساری ذمے داریاں نبھانی پڑتیں۔ شوہر کی طرف سے کوئی مدد کوئی سہارا نہ تھا وہ زیادہ تر بیٹھے رہتے، سگریٹ پھونکتے رہتے۔ کس کا رشتہ آ رہا ہے، کون لوگ ہیں، کیسے ہیں وہ ان معاملات میں کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کرتے تھے۔

اپنے آپ میں مگن رہتے، ان کی سماعت ویسے بھی کمزور ہو چکی تھی۔ انہوں نے اپنی ایک خیالی، تصوراتی دنیا بسا لی تھی جہاں وہ اپنے کمرے میں لیٹے ماضی کے دوستوں سے باتیں کیا کرتے، نہ کسی کے اچھے میں نہ برے میں۔ وہ اپنی ذمے داریاں نہ پہلے نبھاتے تھے نہ اب کہ اب تو بڑھاپا اور سماعت

سے معذوری نے انہیں بالکل ہی ہر ذمے داری سے مستثنیٰ کر دیا تھا۔

آمنہ بیگم ہمیشہ سے تنہا تھیں، وہ صرف سوا سال کی تھیں کہ ان کے والد گزر گئے۔ ان کی والدہ نے بیوگی کی چادر اوڑھ لی مگر بیٹی کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گئیں تو ماں نے اپنے کسی دور پار کے رشتے دار سے بیاہ دیا۔ جو جوانی میں خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ سخت متلون مزاج بھی تھے۔

آمنہ بیگم نے اپنی ماں کی مدد سے اپنے بچوں کو پالا پوسا، پڑھایا لکھایا۔ ان کی شادیاں کیں اور آج پھر ایک بیٹی کے رشتے ہی کا معاملہ تھا جس نے انہیں بے چین کر رکھا تھا۔ بظاہر لڑکا اچھی شکل صورت کا مالک تھا۔ برسرِ روزگار تھا، فیملی بھی لمبی چوڑی نہیں تھی لیکن پھر بھی آمنہ بیگم متذبذب تھیں فیصلہ نہیں کر پا رہی تھیں۔

ان کے رہن سہن، رسم و رواج اور زبان میں بھی فرق تھا۔ لڑکے کی حد تک تو ٹھیک تھا وہ تو پڑھا لکھا تھا، لڑکے کے باپ بھی ریٹائرڈ اسکول ٹیچر تھے۔ ان سے بھی بہتری کی توقع کی جا سکتی تھی۔ لڑکے کی ماں تو بولتی ہی بہت کم تھیں، جب بھی آتیں خاموش بیٹھی رہتیں۔ تب آمنہ بیگم نے بڑی بیٹی کو بلوایا اور مشورہ مانگا، وہ کہنے لگی۔

”مجھے تو لگتا ہے بہت ہی شریف لڑکا ہے، آپ اللہ کا نام لے کر کر دیں باقی نائلہ کے نصیب۔“ آمنہ بیگم یا تو دامادوں سے مشورہ کرتیں یا پھر بیٹیوں سے، اور کوئی تھا نہیں، تینوں بیٹے ملک سے باہر تھے۔ جو تھوڑے بہت رشتے دار تھے وہ کوئی حتمی بات نہیں کہتے تھے۔ ساری بات سن کر ”جیسا آپ مناسب سمجھیں فیصلہ کر دیں۔“ کہہ کر رخصت ہو جاتے۔

آمنہ بیگم بیٹوں کو خط لکھ لکھ کر ساری صورتِ حال سے مطلع کرتی رہتیں۔ وہ لوگ وہاں بیٹھ کر یہاں کی صورتِ حال کا صحیح طور پر اندازہ نہیں کر پاتے تھے، یہی لکھ دیتے ”جیسا آپ مناسب سمجھیں۔“ اِدھر آمنہ بیگم سخت پریشان تھیں، یہ لوگ ان کو اچھے نہیں لگے تھے۔ لڑکے کی ماں ابھی تک تہ بند باندھتی تھیں اور اکثر اسی حلیے میں آمنہ بیگم کے گھر آ جاتی تھیں۔ وہ لوگ کئی برسوں سے شہر میں نہیں تو شہر کے نزدیک ترین قصبے میں رہتے تھے لیکن ان کے طور اطوار ذرا نہ بدلے تھے، نہ پہننے اوڑھنے میں کوئی فرق پڑا تھا، نہ زبان بہتر ہوئی تھی۔ ان کے مقابلے میں آمنہ بیگم کا گھر، ان کے طور طریقے، زبان، رہن سہن بہت ہی اعلیٰ درجے کا تھا۔ مالی حالات بھی بہت اچھے تھے اور سب سے بڑھ کر تعلیم نے ان لوگوں کو نکھار دیا تھا۔ شہر میں ان کا ایک اچھا پڑھا لکھا حلقۂ احباب تھا۔ ان کا خاندان شریف اور پڑھا لکھا تھا، لوگ عزت کرتے تھے۔ ایسے میں دیہاتی بیک گراؤنڈ کے لوگوں سے رشتہ جوڑنا آمنہ بیگم کو انتہائی مشکل لگ رہا تھا۔ اِدھر وہ لوگ اکثر ہی جواب کے لیے چلے آتے تھے اور اصرار کرتے تھے کہ انہیں ہاں ہی میں جواب دیا جائے۔

☆☆☆

لڑکے کے والد صاحب اپنے اور آمنہ بیگم کے گھر کے درمیان طبقاتی فرق کو شدت سے محسوس کر رہے تھے اور گھر جا کر اکثر اس بات کا ذکر کرتے تھے کہ وہ لوگ ہمیں شاید ہی رشتہ دیں، ان کے اور ہمارے درمیان بہت واضح فرق ہے۔ ایسے میں ان کی زوجہ محترمہ کی پیشانی کے بل اور بھی گہرے ہو جاتے، وہ نخوت سے ہونٹ سکوڑتیں۔

”کیوں، ہمارے بیٹے میں کیا کمی ہے اور ان لوگوں میں ایسا کیا خاص ہے؟“ وہ اپنی زبان میں شوہر کو خوب لتاڑتیں۔ بیٹا دونوں کے بیچ بیٹھا ماں کا

لیکچر سنا کرتا۔ اِدھر آمنہ بیگم کے گھر میں بھی کچھ عرصے سے بڑی خاموشی تھی، وہ فیصلے کی صلیب پر لٹکی ہوئی تھیں۔ اب تک جتنے رشتے آئے تھے ان میں کئی لحاظ سے یہی رشتہ بہتر تھا اور پھر ان کے نادان مشیر بھی اسی رشتے کے لیے اصرار کرتے۔

''شادی کے بعد نائلہ نوکری چھوڑ کر شوہر کے پاس لاہور چلی جائے گی وہاں نہ کوئی ساس ہوگی نہ سسر عیش کرے گی عیش۔'' راضیہ باجی کو تو سب اچھا اچھا ہی نظر آتا تھا۔ اِدھر وہ رشتہ کروانے والی بھی ہر دوسرے تیسرے روز تعریفوں کے پل باندھنے آموجود ہوتی۔ ایسے ہی کسی کمزور لمحے میں آمنہ بیگم ہاں کر بیٹھیں۔

''دیکھیے گا امی جان نائلہ کے اسکول میں CO-STAFF ہے نا، یہ گاؤں والے بڑے غیرت مند ہوتے ہیں فوراً نوکری چھڑوا دیں گے نائلہ کی۔''

''اللہ کرے ساری عمر نوکری کرنے کی جو سزا میں نے بھگتی ہے وہ نائلہ کو نہ بھگتنی پڑے۔'' انہوں نے محبت سے اپنی کم گو بیٹی کو دیکھا۔

ہاشم کے والدین ہاں ہوجانے کے بعد اب اکثر ہی آنے لگے تھے۔ اکثر اوقات وہ دوپہر کے کھانے کے وقت پر آدھمکتے تھے۔ وہ لوگ جلدی سے کھانے کا اہتمام کرتے۔ ہاشم کے والد احمد علی تو رغبت سے کھانا کھاتے لیکن ان کی بیوی منہ باندھے بیٹھی رہتیں۔

''آپ لیجیے نا، کیا بات ہے کھانا پسند نہیں آیا؟'' آمنہ بیگم پوچھتیں۔

''ہاشم کی ماں دیسی گھی کا بنا سالن کھاتی ہے، آج کل کے ڈالڈا وغیرہ کے کھانے سے یہ بیمار ہوجاتی ہے۔'' ہاشم کے والد نے حقیقتِ حال بتائی جو کہ خاصی تشویشناک تھی۔ وہ لوگ تو گھی کا بنا کھانا کھاتے تھے، اب ایک بندے کے لیے خاص طور پر دیسی گھی کے کھانے کا اہتمام کرنا بڑی عجیب سی بات تھی۔ تب انہوں نے رشیدہ کے سامنے یہ مسئلہ رکھا، وہ کھلکھلا کے ہنس دی۔

''ارے آپا جی آپ سے کس نے کہا ہے کہ سچ مچ ہی دیسی گھی کا کھانا پکانے بیٹھ جایا کریں۔ آپ بس دودھ میں ڈبل روٹی ڈال کر عیشاں بہن کو دے دیا کریں، اللہ اللہ خیر سلا۔''

''دودھ میں ڈبل روٹی؟'' آمنہ بیگم مزید حیران ہوئیں۔

''ہاں جی، شہر میں جوان کے اکّا دکّا ملنے والے ہیں نا وہ یہی کرتے ہیں۔ اب اس زمانے میں اول تو دیسی گھی ملتا نہیں مل بھی جائے تو اتنے بکھیڑے کون کرے۔'' رشیدہ ہنستی جارہی تھی۔

اگلی بار جب ہاشم کی اماں آئیں تو آمنہ بیگم نے رشیدہ کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل کر ڈالا۔ دودھ میں ڈبل روٹی دیکھتے ہی عیشاں بہن کا موڈ آف ہوگیا، وہ سُوج پھول کر بیٹھ گئیں۔ دودھ ڈبل روٹی کا ملغوبا واپس کردیا۔ آمنہ بیگم بہت پریشان ہوئیں مجرم سی بن گئیں۔ اگلی بار رشیدہ نے مشورہ دیا کہ مکھن کی ٹکیا بیکری سے منگوا کر ان کا سالن الگ سے بنا دیا کریں، یوں یہ مسئلہ کسی حد تک حل ہوگیا لیکن یہ علیحدہ سے اہتمام کرنے والی بات سب کو بے حد بری لگتی۔

اب ہاں ہوچکی تھی اور منگنی کی بھی چھوٹی سی رسم ادا کردی گئی تھی۔ ہاشم کی والدہ اپنے زیورات میں سے ایک بڑی سی کشتی نما انگوٹھی لے کر آئی تھیں جسے دیکھنے کے بعد ہر کوئی ہنس دیا تھا اور نائلہ کی سنجیدگی اور خاموشی اور بھی گہری ہوگئی تھی۔

''ہمارے لیے شہر کے لوگ اور ہم شہر والوں کے لیے اجنبی ہیں، آپ بری کی تیاری کے لیے ہماری مدد کیجیے تاکہ زیورات اور کپڑوں کی تیاری آسانی

سے ہوسکے۔'' آمنہ بیگم خود بھی جہیز کی تیاری میں بے حد مصروف تھیں لیکن سمدھی کی بات ٹال نہ سکیں جھٹ مدد کے لیے تیار ہوگئیں۔ وہ تینوں یعنی عیشاں بہن، احمد علی اور آمنہ بیگم جب ٹیکسی کر کے بازار جاتے تو آمنہ بیگم اس وقت سخت حیران ہوجاتیں جب احمد علی ٹیکسی سے اتر کر الگ سے کھڑے ہوجاتے اور کرائے کی ادائیگی ہمیشہ آمنہ بیگم کے حصے میں آجاتی۔ وہ گھر آکر اکثر ذکر کرتیں۔

''شاید ان لوگوں کو یہ مینرز پتا ہی نہیں ہیں۔'' وہ کُڑھ کر رہ جاتیں۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ دو عورتوں کے ساتھ ایک مرد ہو وہ بھی پڑھا لکھا مرد لیکن وہ ٹیکسی کا کرایہ تک ادا نہ کرے سائڈ پر کھڑا ہوجائے۔'' راضیہ اور اشفاق حیران ہوتے۔

منگنی کے بعد محمد ہاشم کو ایک دن کھانے پر مدعو کیا گیا اور خوب خوب اہتمام کیا گیا۔ محمد ہاشم کے ساتھ چھوٹا بھائی مزمل بھی تھا۔ دونوں سارا دن رہے، شام گئے واپسی کا ارادہ ظاہر کیا اور محمد ہاشم نے ہونے والی ساس سے کہا۔

''امی جی جہیز کے سامان میں کوانٹٹی کا نہیں کوالٹی کا خیال رکھیے گا۔'' محمد ہاشم کی ایسی سوچ اور ذہنیت سے بلاشبہ آمنہ بیگم اور باقی لوگوں کو سخت مایوسی ہوئی لیکن پتا نہیں کیوں وہ لوگ یہ ساری چھوٹی بڑی باتیں نظر انداز ہی کرتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ شادی کا دن آپہنچا۔ آمنہ بیگم کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ بارات میں شامل خواتین شلوار قمیص میں آئیں گی جس پر تھوڑا بہت عمل کیا گیا لیکن پوری طرح نہیں۔ جب حسبِ روایت باہر مردوں کو پہلے کھانا سرو کیا گیا تو احمد علی صاحب نے کھانا کھانے کے اگلے پچھلے ریکارڈ توڑ ڈالے۔ وہ ڈونگے پر ڈونگے خالی کرتے گئے، لڑکوں بالوں کے ہاتھ ایک دلچسپ مشغلہ آگیا۔ وہ مذاق ہی مذاق میں ان کو بار بار ڈونگے سرو کرتے رہے اور باقی لوگ مذاق ہی مذاق میں تصویریں بناتے رہے کہ مووی کا تو وہ زمانہ ہی نہ تھا۔

آمنہ بیگم کا چھوٹا بیٹا انگلینڈ سے آیا ہوا تھا بہن کی شادی کرنے اور باہر ملنے جلنے والے اس سے ڈھکے چھپے لفظوں میں بار بار پوچھ رہے تھے کہ اتنی پڑھی لکھی لڑکی تم لوگوں نے کن لوگوں میں بیاہ دی ہے۔ کیا شہر میں کوئی رشتہ نہیں ملا جو اجڈ گنوار لوگوں کو رشتہ دے دیا۔ وہ سخت بیزار ہورہا تھا۔

''یہ آپ لوگوں نے کیسا فیصلہ کیا ہے؟'' وہ بار بار ماں سے، بہنوں سے اور بہنوئی سے پوچھ رہا تھا اور ہر بار سب لوگ چپ ہو کے رہ جاتے۔ جانے کیوں ان سب نے سب کچھ دیکھتے ہوئے سمجھتے ہوئے آنکھوں دیکھی مکھی نگل لی تھی یا پھر یہ سب تقدیر کا لکھا تھا۔ جوڑے آسمان پر بن چکے تھے، نصیب میں یہی لکھا تھا شاید۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ رسم ورواج کا تضاد الگ تھا۔

محمد ہاشم کی پھوپیوں، خالاؤں اور تمام مردوں کو جوڑے دیے گئے جو گھر جا کر عیشاں بی بی نے کسی بہن یا نند کو نہیں دیے، سب کچھ صندوق میں بند کر کے اپنی تحویل میں لے لیا۔ شادی والے دن عیشاں بہن نے دیسی گھی کا کھانا کھایا تھا اس کے باوجود گھر پہنچتے ہی ...... ناسازیِ طبع کا اعلان کردیا۔ اگلے دن ولیمہ تھا، نائلہ کی ساری فیملی مدعو تھی، کھانے میں فقط چاول تھے۔ آمنہ بیگم کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ولیمے کا کھانا اس قدر غریبانہ ہوگا، نہ کوئی سالن نہ روٹی نہ رائتہ نہ سلاد۔ سوکھے چاول کسی کے حلق سے نیچے نہیں اتر رہے تھے۔ نائلہ خاموش تھی، اس کے میکے والے چپ تھے۔ اِدھر ہاشم کے رشتے دار اس غلط فہمی کا شکار کہ یہ تو بڑے لوگ ہیں شاید شادی کی تصویریں اخباروں میں

آئیں گی اور یہ ہم ہرگز نہ ہونے دیں گے۔ وہ بیکار کی بحث میں الجھے تھے۔

آمنہ بیگم کا پورا گھرانا ایک تاسف کی کیفیت میں تھا۔ دل دکھ سے بھرے تھے اور آنکھیں چھلک رہی تھیں۔ ایک غلط فیصلہ، ایک غلط قدم وہ اٹھا چکے تھے جسے اب ساری زندگی نائلہ نے بھگتنا تھا، سہنا تھا، برداشت کرنا تھا۔ شاید آمنہ بیگم کے گھرانے میں سے قدرت نے اس کڑے امتحان کے لیے نائلہ کو چن لیا تھا۔

☆☆☆

شادی کے بعد محمد ہاشم واپس اپنی نوکری پر لاہور سدھار گیا اور نائلہ واپس آمنہ بیگم کے پاس رہ کر نوکری کرنے لگی۔ ہر ویک اینڈ پر نائلہ کو شوہر کے حکم اور اصرار کے مطابق اس کے گاؤں پہنچنا ہوتا تھا، جہاں ہاشم بھی آجاتا۔ نائلہ کا شوہر سے ایک ہی مطالبہ تھا کہ اسے ساتھ لاہور لے جائے لیکن اس نئی نویلی دلہن کا یہ خواب کبھی پورا نہ ہوسکا۔ عیشاں بی بی اب کھل کر سامنے آچکی تھیں۔ جب تک نائلہ دلہن بن کر اس کے آنگن میں نہیں اتری انہوں نے چپ کا لبادہ اوڑھے رکھا اور آہستہ آہستہ اب اصل روپ سامنے آنے لگا، چھوٹے مزمل نے بھابی کو بتایا۔

"ہم سب اس قصبے سے نکل کر شہر میں آباد ہونے کے خواب برسوں سے دیکھ رہے ہیں، اب ہم بھی شہر جاکر آپ کے ساتھ رہیں گے۔" عیشاں بہن اور احمد علی کے ارادے ان پر ظاہر ہوچکے تھے۔

ایک اور مایوسی ایک اور دکھ۔ ان پڑھے لکھے، شہروں میں پلنے بڑھنے والوں کو گاؤں کے سیدھے سادے لوگوں نے لوٹ لیا تھا۔ سرعام سینڈھ لگائی تھی انہوں نے۔ وہ لوگ نائلہ کو سیڑھی بنا کر شہر میں آباد ہونے کے منصوبے پر عمل پیرا تھے۔ انہیں ٹی وی چاہیے تھا، ٹیپ ریکارڈر چاہیے تھا۔ شہر میں کرائے کا مکان چاہیے تھا جہاں وہ سب مل جل کر رہتے۔ نائلہ اتنی بڑی ذمے داریاں اٹھانے سے گریزاں تھی۔ تین بندوں کو لاکر شہر میں رکھنا اور ان کی ہر ذمے داری کو پورا کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ نائلہ سے شادی کے موقع پر ایسا کوئی معاہدہ نہیں کیا گیا تھا پھر یہ سب کیا تھا؟ تبھی نائلہ ماں بننے کے خوش کن مرحلے میں داخل ہوگئی۔ اس موقع پر ایک بار پھر ایک مسئلہ سامنے آیا۔ نائلہ بچے کو شہر میں جنم دینا چاہتی تھی لیکن عیشاں بہن کا اصرار تھا کہ وہ اسی قصبے میں چل کر رہے اور وہیں بچے کو جنم دے۔

عیشاں کو کامیابی ہوئی اور اٹھارہ دن کی زچہ کو وہ لوگ شہر اور ڈاکٹر کی سہولیات سے بہت دور اسی قصبے میں لے گئے۔ آمنہ بیگم نے دل پر پتھر رکھ لیا تھا۔ وہ خود کو مجرم سمجھتی تھیں، بیٹی کے لیے وہ کوئی اچھا فیصلہ نہیں کرسکی تھیں، وہ سچ مچ کفِ افسوس ملتی تھیں، پریشان رہتی تھیں۔ ایک مستقل پچھتاوے نے ان کا گھیراؤ کرلیا تھا۔ نائلہ اپنی صابر و شاکر فطرت کے باعث کچھ نہیں کہتی تھی، کبھی شکایت زبان پر نہیں لاتی تھی لیکن ماں کا دل جانتا تھا کہ وہ خوش نہیں تھی۔ محمد ہاشم کانوں کا کچا ثابت ہوا تھا۔ وہ ماں کی کہی گئی ہر بات کو حرفِ آخر سمجھتا تھا۔ ہفتے بھر کے انتظار کے بعد وہ آتا۔ چند گھڑی ماں کے پاس بیٹھتا، باہر نکلتا تو چہرہ سرخ ہوتا، گردن تنی ہوتی۔ جانے وہ بیٹے کے کیا کان بھرتی تھیں کہ وہ فوراً ہی بیوی سے بگڑ جاتا۔

محمد ہاشم کا پل پل بدلتا موڈ نائلہ کو عدم تحفظ کا شکار بنا رہا تھا۔ ادھر بیٹی کی پیدائش کے بعد کسی ایسے بندوبست کی ضرورت تھی کہ بچی کی دیکھ بھال بھی ہو جاتی اور نائلہ کی نوکری بھی برقرار رہتی۔ بچی نانی اور خالہ کی گود میں پل کر سال ڈیڑھ سال کی ہوچکی تھی اور عیشاں بی بی کے خوابوں کو تعبیر ملنے والی تھی۔ نائلہ محمد ہاشم سے ایک ہی مطالبہ کرتی تھی نوکری

چھڑوانے کا اور اپنے ساتھ لاہور لے جانے کا۔

"نوکری چھوڑنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" محمد ہاشم کا لب ولہجہ یکسر تبدیل ہوجاتا۔

"تم کبھی محمد ہاشم کے ساتھ جاکر اکیلی رہنے کا خواب بھی مت دیکھنا۔" عیشاں بی بی اپنی زبان میں کہتیں۔ نائلہ کو اب ان کی زبان قدرے سمجھ آنے لگی تھی۔

دھیرے دھیرے وقت نے کروٹ لی اور طے پایا کہ نائلہ اپنی ماں کے شہر میں جہاں اس کی نوکری تھی ایک گھر کرائے پر لے اور عیشاں بی بی، احمد علی اور مزمل کو اپنے ساتھ رکھے۔ بچی دادی کے پاس رہا کرے گی اور نائلہ حسبِ معمول نوکری کرتی رہے گی۔ جب کبھی نائلہ ملازمت کی سختیوں اور پابندیوں سے اوب جاتی تو نوکری چھوڑنے پر اصرار کرتی، اس کا یہ مطالبہ سختی سے رد کردیا جاتا۔

"ہرگز نہیں، کبھی نہیں، ہو ہی نہیں سکتا۔" مختلف آوازیں اس کا گھیراؤ کرلیتیں۔

احمد علی، ہاشم، عیشاں بی بی سب..... آمنہ بیگم کے ساتھ ایک ایسا کھیل کھیل گئے جس میں گیم کا ہر رول ہر اصول ہر ضابطہ نائلہ کے خلاف ہی جاتا تھا۔ وہ لوگ شہر اٹھ آئے تھے۔ ایک خواب پورا ہوگیا تھا۔ نئے لوگ، نیا محلہ نئی دنیا سب کچھ تو نیا تھا۔ پڑھی لکھی بہو جو اپنے اسٹوڈنٹس کے لیے لائقِ احترام تھی۔ نائلہ کا نام لے کر باقاعدہ اس کا فائدہ اٹھایا جاتا۔ انہیں کوئی نہیں جانتا تھا، کوئی نہیں مانتا تھا، ان کی بہو ان کا تعارف تھی، ان کی پہچان تھی۔ عیشاں بی بی اب شلوار قمیص پہنتی تھیں۔

"نائلہ کی ماں عینک لگاتی ہے، مجھے بھی عینک لگوانی ہے۔" وہ شوہر سے مطالبہ کرتیں اور احمد علی ہنس پڑتے۔

"ارے بھلی لوک اس نے ساری زندگی پڑھایا ہے، اس کی تو نظر کمزور ہے، تمہیں کیا ضرورت ہے؟"

"بس مجھے بھی عینک لگوانی ہے۔" اور آخر عیشاں بی بی کو نظر کی عینک لگ گئی۔

"نائلہ کی ماں جب اس سے ملنے آتی ہیں تو ان کے پاس پرس ہوتا ہے، مجھے بھی پرس چاہیے۔"

"واہ بھئی یہ بھی خوب رہی۔" احمد علی ہنس پڑے اور چند ہی دنوں بعد عیشاں بی بی کی بغل میں ایک پرس بھی آگیا جو کہ ان کی شخصیت سے ہرگز لگا نہیں کھاتا تھا۔ جلد ہی عیشاں بی بی نے اپنا کھانا الگ کرلیا، دیسی گھی میں وہ سب کا کھانا پکانا افورڈ نہیں کرسکتی تھیں۔ نائلہ کی بچی کے لیے دودھ آتا تھا، دودھ کی بھری ہوئی دیگچی پر عیشاں بی بی کا قبضہ ہوتا، وہ دودھ ہلکی آنچ پر پکا پکا کر ملائی اتارتیں پھر مکھن بناتیں، مکھن کو گرم کرکے دیسی گھی بناتیں۔ بھرے پُرے گھر کی راجدھانی میں کسی ملکۂ عالیہ کی طرح گھومتیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بگڑ جاتیں۔ بہو سے ہفتوں بول چال بند رہتی۔ ذرا ذرا سی بات پر دونوں ہاتھ کمر پر رکھے نائلہ کے کمرے کے دروازے کے بیچوں بیچ آن کھڑی ہوتی تھیں۔ جب چیخنا شروع ہوتیں تو نائلہ کا دل خوف کے مارے دھک دھک کرنا شروع کردیتا۔ وہ بہت پریشان رہنے لگی تھی۔

☆☆☆

مزمل شہر آکر بری صحبت کا شکار ہوگیا تھا۔ شہر میں اتنا کچھ نیا تھا، اتنا حیران کردینے والا تھا کہ اس بچے کا پڑھائی میں دل ہی نہیں لگتا تھا۔ احمد علی نے کہیں ملازمت شروع کردی تھی۔ وہ جب بھی گھر آتے مزمل سے مارپیٹ شروع کردیتے۔ اسے پڑھانے کی کوشش کرتے لیکن ان کی ہزار کوششوں کے باوجود مزمل میٹرک نہ کرسکا۔

محمد ہاشم نے لاہور سے اپنی ملازمت ختم کردی تھی۔ تب نائلہ کے منجھلے بھائی نے اپنے تعلقات کے بل بوتے پر فیصل آباد کی کسی فرم میں شاندار نوکری دلا دی، وہیں پر محمد ہاشم کی ملاقات رانا صاحب سے ہوئی۔ وہ برسوں سے اس فرم میں اکاؤنٹس کا کام دیکھتے تھے اور فرم کے بہت سے رازوں سے باخبر تھے۔ اب بلڈ کینسر میں مبتلا تھے۔ انتہائی زردرنگت، سفید بال، دبلا پتلا جسم، کوتاہ قد۔ وہ محمد ہاشم کو کمپنی کے تمام اکاؤنٹس سمجھا رہے تھے ساتھ ساتھ بہت سے رازوں سے بھی آگاہ کررہے تھے۔

چند ہی دنوں میں رانا صاحب اور ہاشم میں گاڑھی چھننے لگی۔ دونوں دفتری اوقات کے بعد بھی اکٹھے نظر آتے۔ اس شام رانا صاحب نے بڑی ہوشیاری سے محمد ہاشم کو سارا پلان سمجھایا جس پر عمل کر کے کمپنی کو دیوالیا کیا جاسکتا تھا۔ اعلیٰ حکام کو سارے معاملات سے مع ثبوت آگاہ کر کے ایک موٹی رقم حاصل کی جاسکتی تھی۔ اس اثنا میں نائلہ ایک اور بیٹی کو جنم دے چکی تھی۔

محمد ہاشم آج کل خواب وخیال کی دنیا بسائے شاندار گھر اور شاندار گاڑی کے خواب دیکھ رہا تھا، کئی بار بیوی سے کہتا، گاڑی کا رنگ پسند کرلو تمہیں کون سی گاڑی چاہیے؟ تب نائلہ حیران ہوتی۔

''آخر یہ اچانک اتنا پیسہ کہاں سے آگیا؟''

''آیا نہیں آنے والا ہے۔ میرے پیرومرشد کا کہنا ہے بہت جلد تقدیر کی دیوی مجھ پر مہربان ہونے والی ہے بس مالک کا کرم چاہیے۔'' اس اثنا میں رانا صاحب وفات پاگئے۔ اب فرم کے تمام حسابات اور اکاؤنٹس محمد ہاشم کے ہاتھ میں تھے۔ فرم والے اسے بہت اچھی تنخواہ دے رہے تھے۔ گھر کے حالات بہت بہتر ہوگئے تھے کہ ایک رات وہ کاغذوں، فائلوں اور رجسٹروں کی گٹھڑی باندھ کے گھر لے آیا۔

''یہ سب کیا ہے؟''

''یہی تو ہے وہ لکشمی دیوی۔'' وہ مسرور سا نوکری چھوڑ کر گھر بیٹھ گیا، کچھ ہی دنوں میں فرم والوں کو خبر ہوگئی۔ سارا ریکارڈ غائب تھا۔ ہاشم کی اس مذموم حرکت کی خبر سب کو ہوچکی تھی۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ لوگ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کررہے تھے کہ فرم والوں نے کوئی مقدمہ بنا کر ہاشم کے نام کی ایف آئی آر درج کرادی۔ معاملہ پولیس تک پہنچا، نائلہ کے بھائیوں نے بڑی مشکل سے اپنے تعلقات اور کوششوں سے محمد ہاشم کو بچالیا۔

اس سارے واقعے کے بعد نائلہ نے اپنا ٹرانسفر دوسرے شہر کروالیا، پھر اِک نئی منزل کا سامنا تھا، اِک کڑا امتحان پھر منتظر تھا۔ چار چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ تھا۔ محمد ہاشم حسبِ سابق بیکار تھا، دن بھر گھر میں پڑا رہتا یا پھر سودا سلف لادیتا۔ نائلہ چپ تھی، بچے ہراساں، چھوٹی چھوٹی خواہشات کی تکمیل کے لیے ترستے ہوئے۔ وقت کا پنچھی کبھی سست روی سے کبھی تیزی سے اُڑتا جارہا تھا۔

نائلہ اور محمد ہاشم کے اختلافات آہستہ آہستہ بڑھ رہے تھے۔ نائلہ شام کے وقت بچوں کو ٹیوشنز دے کر حالات کا مقابلہ بڑی پامردی سے کررہی تھی۔ محمد ہاشم نے نمازِ پنجگانہ مسجد میں جا کر ادا کرنی شروع کردی تھی۔ چاروں بچے لائق اور فرمانبردار تھے مگر اب بڑے ہورہے تھے' دھیرے دھیرے حالات کی ستم ظریفی اور باپ کی بیکاری پر کُڑھنے لگے تھے۔

''باجی، بھائی جان دفتر نہیں جاتے؟'' کام کے لیے آنے والی مہترانی بھی جتانے سے باز نہ رہتی کہ ''صاحب'' بیکار تھے اور باجی دن رات محنت میں جُتی تھی۔ انہی دنوں قدرت پھر مہربان ہوئی۔ محمد ہاشم کو کسی دوسرے شہر میں ملازمت مل گئی۔ وہ صبح کا نکلا شام ڈھلے گھر لوٹ آتا۔ بچے پھر سے جی اُٹھے، نائلہ کو بھی لگا جیسے کندھوں پر رکھا بوجھ کسی حد تک ہلکا ہوگیا ہو۔ نائلہ اور بچے مسکرا اٹھے۔

نائلہ کی اچھی عادتوں، خوش اخلاقی اور ملنساری کے باعث یہاں بھی ان کا ایک اچھا حلقۂ احباب بن گیا تھا۔ نائلہ کی بیٹیاں بڑی تھیں بیٹے چھوٹے تھے۔ وہ دن رات ان کی تعلیم وتربیت میں مگن تھی۔ گھر میں صفائی ستھرائی باوجود ایک ملازمت پیشہ عورت ہونے کے ہمیشہ قائم رہتی۔ آئے گئے کی آؤ بھگت، خاطر مدارت اور خوش خلقی کے باعث لوگ انہیں پسند کرتے تھے۔ سرکاری گھر کے عقب میں باغیچے میں سبزیاں' پھل اور پھول لگائے گئے تھے۔ گھر کے اندر گملوں کی بہتات تھی کہ نائلہ کو پودوں سے ہمیشہ سے رغبت رہی تھی۔ وہ ہر لحاظ سے سیٹ ہوچکے تھے، کبھی کبھی نائلہ میکے چلی آتی تو اسے اور اس کے بچوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔

نائلہ کے بھائی اب پردیس سے لوٹ آئے تھے، شادیاں ہوچکی تھیں۔ ان کے بچے نائلہ کے بچوں کے ہم عمر تھے اور ان سب کی آپس میں گاڑھی چھنتی تھی۔ نائلہ کے بھتیجے ہمیشہ پھپو سے ایک ہی فرمائش کرتے۔

''پھپو آپ واپس آجائیں نا۔'' اِدھر نائلہ کے بچوں کو بھی اکثر ہی ماموں کے بچوں کے یاد ستاتی۔

''امی جان ہم کب واپس جائیں گے۔ وہاں تو سب لوگ ایک ہی شہر میں رہتے ہیں، خوب مزے کرتے ہیں ایک ہم ہی دور ہیں۔''

''بیٹا رشتے داریوں میں فاصلے اور دوریاں محبتوں کو بڑھاتے ہیں۔ ہر روز کا آنا جانا دلوں سے محبتوں کو نکال کر گلے شکوے بھر دیتا ہے اور ایک دوسرے کی قدر نہیں رہتی۔'' وہ بچوں کو سمجھاتی۔ عیشاں بی بی سال میں ایک دو بار ان کے پاس چکر لگاتیں، نائلہ کی دن رات کی محنتوں اور مشقتوں کو

دیکھ کر کبھی بھی ان کا دل نہ پسیجتا، وہ ہمیشہ شاکی رہتیں۔ گلے شکوے کرنا' طعنے دینا، نائلہ کے میکے والوں کے خلاف بولنا۔ عیشاں بی بی ذرا بھی نہ بدلی تھیں۔ ایک دن بھی انہوں نے انصاف سے کام نہیں لیا۔ ایک دن یہ نہیں کہا کہ میرا بیٹا تو اکثر بیکار ہی رہتا ہے، نائلہ محنت سے کما کر میرے بیٹے اور چار پوتے پوتیوں کو پال رہی ہے، وہ قابلِ تحسین ہے، قابلِ ستائش ہے۔ الٹا وہ جب تک رہتیں گھر کے ماحول میں کھنچاؤ اور تناؤ کی کیفیت رہتی۔ محمد ہاشم سب کچھ دیکھتا تھا، سنتا تھا، سمجھتا تھا لیکن کوئی بھی انصاف سے کام نہ لیتا تھا۔ نائلہ کو ہمیشہ پیسہ کمانے والی ایک مشین سمجھا گیا۔

☆☆☆

وقت نے ایک کروٹ لی اور نائلہ کو بہت جلد شوگر کے مرض نے آن گھیرا۔ نائلہ نے ہمت و استقلال کی حد کردی تھی، وہ بہت اچھی طرح جان چکی تھی کہ اس کی ملازمت اس کے بچوں کے لیے آکسیجن کی حیثیت رکھتی ہے اور اس ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتی۔ وقت گزر رہا تھا سب کچھ ویسا ہی تھا بس بچے بڑے ہوگئے تھے۔ محمد ہاشم کے خاندان میں ادلے بدلے کی شادیوں کا رواج تھا۔ بیٹی لینے کے لیے بیٹی دینی بھی پڑتی تھی۔ ہاشم کا چھوٹا بھائی اب شادی کے قابل تھا، پڑھا لکھا نہ تھا معمولی ملازمت کرتا تھا لہٰذا اس کے لیے خاندان ہی سے کوئی لڑکی ڈھونڈ کر لائی جانی تھی۔

عیشاں بی بی کی نگۂ انتخاب اب کی بار اپنے بھائی کی بیٹی پر پڑی۔ سکینہ بن ماں کی بچی تھی۔ عیشاں بی بی کا بھائی عیشاں بی بی کے اصرار پر بیٹی دینے کو تیار تو ہوگیا لیکن عیشاں بی بی کے پاس اس کے بیٹے کو دینے کے لیے کوئی بیٹی نہ تھی لہٰذا معاملہ یوں طے پایا

کہ بیٹی تو محمد اکرم دے گا اور اس کا سارا جہیز عیشاں بی بی تیار کریں گی۔
کیسا اندھیر تھا یہ ایک طرف جہیز کی ڈیمانڈ منہ پھاڑ کر، دوسری طرف خود بہو کا جہیز تیار کیا جا رہا تھا۔ عیشاں بی بی نے برتن، فرنیچر، زیور، کپڑا سب کچھ میاں کی پینشن کے پیسے سے خود بنایا بلکہ ایک دس مرلے کا پلاٹ خرید کر پانچ مرلے کے پلاٹ پر گھر بھی تعمیر کیا اور یوں سکینہ کو بیاہ کر لایا گیا، بقیہ پانچ مرلے محمد ہاشم کو بخش دیے گئے۔
''ہمیں تعمیر شدہ مکان کیوں نہیں دیا گیا۔'' نائلہ نے پھر انصاف مانگا۔
''تم دو جنے کماتے ہو، اپنا مکان خود تعمیر کرو، ہم نے پلاٹ دے دیا ہے یہی بہت ہے۔'' اس کے سسر نے ٹکا سا جواب دے کر بات ختم کر دی۔
مزمل نے نہ پڑھائی میں دماغ کھپایا نہ کمائی کی صعوبت اٹھائی، بیٹھے بٹھائے شادی شدہ گھر بار والا ہو گیا۔ اب سکینہ سارا وقت نائلہ بھابی کے اٹھنے بیٹھنے، اوڑھنے پہننے کے اطوار دیکھتی اور سوچوں کے سمندر میں ڈوب جاتی۔ نائلہ کے بچے اردو بولتے تھے، اچھے اسکولوں میں پڑھتے تھے، تمیز دار اور تہذیب والے تھے، پڑھی لکھی ماں کے پڑھے لکھے بچے تھے۔ سکینہ کے لیے ہر لمحہ پریشانی کا تھا، دکھ کا تھا۔ وہ حیران تھی، پریشان تھی اس کے باوجود اسے ساس سسر کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ مزمل کی وہی رفتار بے ڈھنگی تھی، کبھی کبھار کچھ کما لاتا ورنہ ماں باپ کی محتاجی میں زندگی بسر ہو رہی تھی۔ نائلہ کی زندگی بظاہر پُرسکون تھی لیکن اس خاموشی کے پیچھے بھی کوئی طوفان ہی چھپا تھا۔ اچانک ہی محمد ہاشم کے دل میں واپسی کی سما گئی۔
''واپس ٹرانسفر کی کوشش کرو بہت پردیس دیکھ لیا۔'' محمد ہاشم کا وہی رعونت بھرا لہجہ تھا۔ بچوں نے سنا تو وہ بھی کھل اٹھے۔
''واپس چلیں امی جان، ہم اس شہر میں بالکل اکیلے ہیں کوئی بھی تو اپنا نہیں۔'' نائلہ نے بہت سمجھانا چاہا، بہت سی حقیقتیں ان پر آشکار کرنا چاہیں۔
''دیکھو، ہم لوٹ گئے تو ابو کی جاب کا کیا ہوگا؟''
''وہیں کہیں کر لیں گے۔ ویسے بھی ابو کون سا چھ مہینے سے زیادہ جاب کرتے ہیں۔'' بڑا بیٹا باپ کی سختی کا اکثر ہی نشانہ بنتا تھا اسی لیے باپ سے نالاں رہتا تھا۔ محمد ہاشم نے ایک مدت سے سختی اور زبان درازی کا رویہ اپنا کر بیوی اور بچوں کو ڈرا اور سہا رکھا تھا۔ کسی کو سچ بولنے یا حق بات کہنے کی قطعاً اجازت نہ تھی۔ یہاں تک کہ ٹرانسفر کے لیے درخواست دے دی گئی۔
وہ ایک طویل عرصے سے اس شہر میں مقیم تھے لہٰذا محکمے والوں نے بھی فوراً ہی کارروائی کر کے انہیں واپسی کے آرڈرز تھما دیے۔ محمد ہاشم نے انہیں واپس اسی شہر میں پہنچا دیا تھا خود ابھی ملازمت کی وجہ سے وہیں رک گیا تھا وہ لوگ واپس اسی پرانے شہر میں آ کر بے حد خوش تھے لیکن نائلہ کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں بہت گہری ہو گئی تھیں۔ جس شہر سے وہ واپس آئے تھے وہاں سرکاری رہائش تھی میڈیکل فری تھا اب پھر مکان کا کرایہ بھی تھا اور دوائیوں کا خرچ الگ۔ ساس سسر مزمل اور اس کی بیوی بچوں کے ساتھ ذاتی مکان میں رہائش پذیر تھے۔ عیشاں بی بی نے جتنے خواب دیکھے تھے انہیں ان کی تعبیر مل گئی تھی جبکہ نائلہ کی آنکھوں کے خواب ہنوز ادھورے تھے، نامکمل تھے۔ اسے اس پانچ مرلے کے پلاٹ پر ایک گھر تعمیر کرنے کے لیے مزید جدوجہد کرنا تھی۔
تبھی محمد ہاشم ایک بار پھر اس موجودہ ملازمت والی کمپنی کے کچھ رازوں کی گٹھڑی اٹھائے واپس چلا آیا اور اپنے سالے یعنی نائلہ کے بھائیوں کی مدد کا

طلبگار رہوا۔ وہ لوگ سخت سٹپٹائے، جھنجلائے۔

"یہ کیا حرکت ہے محمد ہاشم! ہر بار شارٹ کٹ کیوں ڈھونڈتے ہو، محنت سے پیسہ کیوں نہیں کماتے؟ ہر بار غیر قانونی ذرائع سے دولت مند بننے کے خواب کیوں دیکھتے ہو؟" وہ چیخ پڑے۔

"مجھ سے غلطی ہوگئی ہے، بچا سکتے ہو تو بچالو ورنہ شہر بھر میں ذلیل ہو جاؤ گے اگر پولیس مجھے پکڑ کرلے گئی تو......" وہ ان شریف لوگوں کو دھمکا رہا تھا۔ بھائیوں نے نائلہ کا چہرہ دیکھا، اس کے بچوں کی طرف دیکھا اور پھر سے سرگرمِ عمل ہو گئے۔ وہ ایک بار پھر بچ گیا اور بیکاری کی چادر اوڑھ کر ہر فکر سے آزاد ہوگیا۔

ایک غلط فیصلہ نائلہ کی ماں اور بھائیوں کو بھگتنا تھا سو وہ قدم قدم پر بھگت رہے تھے۔ اِک عمر کے پچھتاوے تھے جن سے وہ نبرد آزما تھے۔ نائلہ اور اس کے بچوں کا اندازِ گفتگو اور لباس ہرگز محمد ہاشم سے لگا نہ کھاتے تھے۔ وہ اکٹھے رہتے تھے ایک چھت کے تلے لیکن جب وہ اکٹھے باہر نکلتے تو الگ الگ معلوم ہوتے۔ کئی بار لوگ نائلہ سے پوچھ لیتے ہنسی ہنسی میں۔

"کیا آپ لوگوں کی لو میرج ہے ورنہ اور تو کوئی چیز مشترک دکھائی نہیں دیتی آپ کے بیچ۔" تب نائلہ صرف مسکرا دیتی، کس کس کو بتاتی کہ یہ سب تقدیر کے فیصلے تھے۔ ظالم اور کڑے اور اس لمبی مسافت پر نائلہ کو تنہا چلنا تھا، صبر وضبط اور ہمت کی پتوار تھام کے کہ منزل ابھی بہت دور تھی۔

محمد ہاشم کے خاندان میں کبھی کسی لڑکی نے اسکول کی راہ نہ دیکھی تھی، آج اس کی بیٹیاں ایک پڑھی لکھی ماں کی گود میں پرورش پا کر تعلیم کے اعلیٰ مدارج طے کررہی تھیں، نائلہ نے انہیں اوڑھنے، پہننے، پکانے اور گھر کی آرائش وسجاوٹ کرنے میں طاق کر دیا تھا۔ وہ نمازِ پنجگانہ پابندی سے ادا کرتی تھیں۔ مہذب اور سلیقہ شعار تھیں۔

نائلہ نے بینک سے لون لے کر اور کمیٹیاں ڈال کر اپنے لیے ایک چھت ڈال ہی لی تھی۔ محمد ہاشم کی وہی رفتار بے ڈھنگی تھی۔ وہ کبھی بھی اپنی ذمے داریاں پوری نہ کرسکا۔ بس اسے صرف ایک سبق یاد تھا کہ ماں جو کہہ دے وہ حرفِ آخر ہے اور ماں کی اطاعت اس پر لازم ہے۔ انہی دنوں نائلہ کے سسر گزر گئے۔ عیشاں بی بی ٹوٹ کر رہ گئیں۔ محمد ہاشم ماں کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا۔

"یہ مکان بیچ دینا چاہیے، اس پیسے سے میں چاہتا ہوں بزنس کروں اور مزمل کو کاروبار میں شریک کرلوں۔"

"کیا......؟" نائلہ کی آنکھیں حیرت کی شدت سے پھٹ گئیں۔

"ایسا ہرگز نہیں ہوگا، یہ مکان میرے بچوں کی امانت ہے، ان کا حق ہے میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔" نائلہ کا صبر اور ضبط جواب دے گیا تھا۔ انتہا ہوگئی تھی، وہ کہاں تک برداشت کرتی کب تک صبر وضبط کا دامن تھام کے رکھتی۔ پہلی بار نائلہ نے زبان کھولی تو محمد ہاشم برداشت نہیں کرسکا حکم عدولی، اس نے تھپڑوں اور مکوں سے نائلہ کا حشر کردیا، اتنا سب کچھ ہوجانے کے باوجود وہ مکان بک کے رہا۔ اس اثنا میں مزمل نے گاؤں واپسی کی ٹھان لی۔

"اماں اس مکان کو کرائے پر دے کر گاؤں واپس چلو، بہت رہ لیے شہر میں، ہم لوگ شہر کے خرچے نہیں برداشت کرسکتے۔"

"نہیں، ہرگز نہیں۔" مزمل تو عیشاں اور سکینہ کے سارے سپنے چُور چُور کرنے پر تل گیا تھا۔

"گاؤں جا کر بھینس خرید لیں گے، گھی، دودھ کا خرچ نہیں ہوگا۔" مزمل کسی صورت نہیں مان رہا تھا

اور وہ دونوں عورتیں دہائیاں دے رہی تھیں۔ آخر کار لاڈلا اور بگڑا ہوا مزمل انہیں واپس گاؤں لے گیا۔

اِدھر نائلہ نے مکان سے حاصل ہونے والی رقم بہت سنبھال کر بینک میں ڈال دی اور ایک اچھی اور نئی رہائشی کالونی میں بارہ مرلے کا پلاٹ خرید لیا۔ پلاٹ دونوں میاں بیوی کے نام کچھ ایسی شرائط کے ساتھ تھا کہ نہ نائلہ اسے اکیلی بیچنے کی مجاز تھی نہ ہاشم۔

وقت گزرتا رہا، نائلہ کی زندگی پھر سے کرائے کے مکانوں میں بسر ہونے لگی تھی۔ بیٹیاں ماں کے ساتھ ٹیوشنز میں ہاتھ بٹاتی تھیں۔ چھوٹے بیٹے پڑھ رہے تھے۔ زندگی کی گاڑی پھر سے رینگنا شروع ہوگئی تھی۔ نائلہ نمازِ پنجگانہ پابندی سے ادا کرتی تھی، کبھی کبھار شکوہ لبوں پر آجاتا تو وہ کہتی۔ ”الٰہی! ایسی آزمائش کیا میرے نصیب میں ہی لکھی تھی؟ یا پھر میں یہ سب سہہ سکتی تھی اس لیے تونے مجھ پر اتنا بوجھ ڈالا۔“

وقت گزر رہا تھا۔ محمد ہاشم کی بے کاری، بدمزاجی اور غصہ عروج پر تھا۔ وہ ڈٹ کر کھاتا، جی بھر کر سوتا، منڈی سے جاکر سستے سے سستا پھل اور سبزی خرید لاتا پھر گھر آکر فخر سے بتاتا۔ ”فلاں چیز دکاندار نے اتنے کی بتائی تھی میں نے اتنے کی کروالی۔“

نائلہ کے بہن بھائی ملنے جلنے کے لیے آجاتے، اس کی مکمل خبر گیری کرتے۔ نائلہ کے ماں باپ وفات پاچکے تھے، بہن بھائی اپنے اپنے گھر بار والے تھے اس کے باوجود سب کو یہ احساس شدت سے رہتا تھا کہ نائلہ نے ایک غلط فیصلے کو بڑی دلجمعی سے نبھایا تھا۔ نائلہ کی ساس زندہ تھیں کبھی آجاتیں تو دو تین ماہ تک رہتیں۔ محمد ہاشم ان کو حد سے زیادہ پروٹوکول دیتا۔ ڈبل بیڈ پر ٹی وی کے سامنے بٹھا دیتا' بیوی اور بچے اس کی ناراضی کے خوف سے عیشاں بی بی کی خدمت بجالاتے۔ جس میں سب سے بڑی اور تھکا دینے والی ایکسرسائز دیسی گھی میں الگ کھانا بنانا تھا۔ نائلہ خود ایک ملازمت کرنے والی خاتون تھی۔ اسکول، گھر کا کام، ٹیوشنز اور ساتھ ساتھ ساس کی خدمت۔ ساس بھی ایسی کہ بات بات پر ناراض ہو جاتیں۔ وہ ناراض ہوتیں تو محمد ہاشم کا مزاج بگڑ جاتا اور پھر پورے گھر کا ماحول بگڑ جاتا۔ بچے کڑھتے رہتے، نائلہ سلگتی رہتی اور عیشاں بی بی ان کے سر پر سوار رہتیں۔

عیشاں بی بی جب تک رہتیں مزمل کے بچوں کو یاد کرتی رہتیں۔ ہر وقت محمد ہاشم اور مزمل کے بچوں کا موازنہ کرتیں۔ محمد ہاشم کے بچوں کی تعلیمی قابلیت دیکھتیں، ان کے لباس اٹھنے بیٹھنے' بولنے چالنے کے طریقے دیکھتیں تو مزمل کے بچوں کے لیے آہیں بھرتیں۔ نائلہ نے ان کی ایک پوری نسل کو سنوار دیا تھا۔ پیچھے گاؤں میں آج بھی وہی غربت، وہی جہالت تھی، نا آسودگی تھی۔ نائلہ کو شوگر کے ساتھ بلڈ پریشر نے بھی آن گھیرا تھا۔ بچے ماں کے ہمدرد تھے اس کی ذرا سی ہائے پر چاروں ماں کے اردگرد بیٹھ جاتے، ماں کی دوا اور غذا کا خیال رکھتے۔ نائلہ ان کے لیے ماں بھی تھی اور باپ بھی۔ باپ کے ذمے اولاد کو مالی تحفظ ہی تو دینا ہوتا ہے اور نائلہ کئی سالوں سے اپنے چار بچوں اور بیکار شوہر کو یہ تحفظ فراہم کررہی تھی۔ وہ وہی کام کررہی تھی جو ایک مرد کے ذمے ہوتا ہے۔

تقدیر نے اپنے ترکش سے ایک اور تیر نکالا۔ عیشاں بی بی کی بہن صغراں نے جس کے صرف چار بیٹے تھے، چاروں ہی بڑے لائق تھے، نائلہ کی بڑی بیٹی دعا کا رشتہ اپنے تیسرے بیٹے کے لیے مانگ لیا۔ لڑکا اچھے سرکاری عہدے پر فائز تھا۔ محمد ہاشم اور عیشاں رشتے پر راضی تھے نائلہ نے سنا تو کانپ کر رہ گئی۔ وہی ماحول' وہی بولی، وہی رہن سہن، وہی تضاد، وہی پرانی کہانی پھر سے دُہرائی جائے گی۔

اب کی بار وہ نہیں اس کی بیٹی نشانہ بنے گی انہی رسم و رواج کا، انہی روایات کا، صرف چہرے بدل جائیں گے، کردار وہی رہیں گے، وہی غلطی بیس برس بعد پھر دُہرائی جائے گی، تبدیلی صرف اتنی ہوگی کہ محمد ہاشم کی پرائیویٹ جاب تھی جسے وہ جب چاہتا لات ماردیتا تھا اور یہاں صغراں بی بی کا بیٹا پکی سرکاری ملازمت سے لگا تھا۔ باقی سب کچھ وہی تھا ویسا ہی تھا جسے نائلہ آج تک بھگت رہی تھی۔

”نہیں، نہیں میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔“

وہ راتوں کو کروٹیں بدلتی، امن، سکون غارت ہوکر رہ گیا تھا۔ بہن بھائیوں سے مشورہ کرتی، کسی پل چین نہیں تھا تب اس نے بابر حمید کو گھر بلوایا۔ بابر حمید کی مشابہت محمد ہاشم سے بہت زیادہ تھی، وہ اس کے دل کو نہیں لگا، وہ تو صبر شکر سے تقدیر کا لکھا بھگت رہی تھی، دعا کو کیوں سزا ملے، کس جرم کی سزا ملے۔ سو اس نے جی کڑا کر کے صغراں بی بی کو جواب دے دیا۔ تب محمد ہاشم اور عیشاں بی بی غصے کی شدت سے پاگل ہوگئے۔

”نائلہ نے میرے بھانجے کو جواب دے کر ہمارے خاندان کی ہتک کی ہے۔“ عیشاں بی بی، محمد ہاشم کو پل پل بھڑکاتیں، چاروں بچے ماں کے ساتھ تھے، ماں کی ڈھال تھے۔ انہوں نے آج تک اپنی ماں کو زندگی کے محاذ پر اکیلے ہی لڑتے دیکھا تھا مگر اب وہ ماں کے بازو بن کر اس کے ساتھ کھڑے تھے۔ محمد ہاشم نے بھی خلافِ توقع، خلافِ معمول ہتھیار پھینک دیے۔ یوں یہ معاملہ دب گیا اور بات آئی گئی ہوگئی۔

☆☆☆

نائلہ کی بیٹیاں شریف تھیں، باکباز تھیں، نمازِ پنجگانہ پابندی سے ادا کرتی تھیں، گھریلو کام کاج میں طاق تھیں ایسے میں لوگ میڈم نائلہ کی بچیوں کا رشتہ پوچھنے چلے آتے تھے۔ کئی بار کئی اچھے رشتوں نے بچیوں کے باپ کے بارے میں سوال کیا، اس کی ملازمت کے بارے میں پوچھا، ذاتی مکان کے بارے میں سوال کیا، تب نائلہ کو ادراک ہوا کہ اچھے رشتوں کے حصول کے لیے باپ کا اچھی جگہ برسرِروزگار ہونا اور ذاتی مکان کا ہونا کس قدر ضروری ہے۔

”ہاشم ہم اس پلاٹ کو بیچ کر بنا بنایا گھر خرید لیتے ہیں۔ ذاتی گھر ایک اہم ضرورت ہے، اس کا ہونا ہماری بچیوں کے حق میں بہت بہتر ثابت ہوگا۔“

”ہرگز نہیں، اچھے رشتے کے لیے ذاتی مکان ہونا کوئی شرط نہیں۔ جو لوگ ایسا مطالبہ کرتے ہیں، ہم وہاں بیٹی نہیں دیں گے۔“ محمد ہاشم کا ایک ہی جواب تھا۔

”آخر ہم کب تک کرائے کے مکانوں میں رہیں گے؟“ بچے ماں سے سوال کرتے۔

آج کل محمد ہاشم کو پھر لاہور میں کوئی جاب مل گئی تھی۔ وہ گھر سے چلا گیا تھا مگر ہر ویک اینڈ پر آجاتا تھا۔ گھر کا تمام سودا سلف لانا اسی کے ذمے تھا۔ نائلہ بچیوں کے رشتوں کے لیے پریشان رہتی تھی۔ کئی لوگ آئے گئے کسی کو یہ لوگ پسند نہیں آئے اور کسی کو انہوں نے پسند نہیں کیا۔

وقت گزر رہا تھا۔ دونوں بیٹیوں نے پرائیوٹ اسکولز میں جاب کرلی تھی، آج کل کے پرائیوٹ اسکولز بھی ٹیچرز کا آخری قطرہ تک نچوڑ کر تنخواہ دیتے ہیں۔ پہلے سال گرمی کی چھٹیوں کی تنخواہ ندارد۔ جس دن چھٹی کی اس دن کی تنخواہ کاٹ لی' کلاس روم سے ٹیچر چیئر ندارد، کھڑے رہ رہ کر ٹیچرز کی کمریں ٹوٹ جاتی ہیں، اوپر سے بے شمار کاپیوں کی چیکنگ، پرنسپل اور اساتذہ کی میٹنگ ہمیشہ اسکول کی چھٹی کے بعد رکھی جاتی پھر ٹیچرز پیرنٹس میٹنگ کا سلسلہ الگ۔ پیرنٹس چونکہ بھاری فیس بھرتے ہیں اس لیے آکر

ذرا ذرا سی بات پر چیختے ہیں، ایسے سخت اور ٹینس ماحول میں نوکری کرنا اور اسٹاف روم کی سیاستوں سے نبرد آزما ہونا کچھ ٹیچرز ہی کا حوصلہ ہوتا ہے۔

نائلہ کی بیٹیاں دعا اور عشا بہت زیادہ تھک جاتی تھیں نائلہ کو ان کی تھکان کا شدت سے احساس تھا لیکن وہ مجبور تھی جب تک اچھے رشتے نہ ملتے وہ بچیوں کو گھر پر بیکار بٹھا کر کیا کرتی، وہ سمجھتی تھی کہ فارغ رہنے سے بہتر ہے کہ وہ کہیں مصروف رہیں، بہت سے لوگوں کے رشتے آئے مگر کہیں بات بنتی نہیں تھی۔

تب اچانک ہی نائلہ کی فرسٹ کزن اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر آئیں، لڑکا گریجویٹ تھا، خوب صورت تھا، برسرِ روزگار تھا لیکن محمد ہاشم کا غصہ دیدنی تھا۔

''اماں نے کہا نائلہ نے ہمارے خاندان کی ہتک کی ہے تو کیا وہ اپنے رشتے داروں میں شادی کر کے یہ ظاہر کرنا چاہتی ہے کہ اس کا خاندان میرے خاندان سے اعلیٰ ہے، برتر ہے، میں یہ ہرگز نہ ہونے دوں گا۔'' وہ ہتھے سے اُکھڑ گیا۔ نائلہ خاموش ہوگئی۔ لڑکے والوں کا اصرار بڑھ رہا تھا۔ نائلہ دم بخود تھی۔

''ہاشم ہمیں اپنی بچی کی بہتری کے لیے فیصلہ کرنا ہے۔ یہ ہمارے خاندانوں کی عزت بے عزتی کا سوال نہیں ہے، ہماری بچی کے مستقبل کا سوال ہے، یہ ضد اور بدلے لینے کا مقام نہیں ہے۔''

''تم مجھے اور میرے خاندان کو نیچا دکھانا چاہتی ہو۔'' وہ ایک ہی بات پر اڑا ہوا تھا۔ ''کیا کمی تھی میرے خاندان میں، کیوں انکار کیا تھا تم نے میرے خاندان والوں کو؟''

نائلہ اور محمد ہاشم کی ساری زندگی نا اتفاقی میں گزری تھی۔ آج اولاد شادی کے قابل تھی اور میاں بیوی میں برسوں سے چلا آرہا نفاق آج بھی زوروں پر تھا۔ گھر کے ماحول میں تلخیاں گھل گئی تھیں۔ جانے کیا فیصلہ ہوگا، کون جیتے گا' کون ہارے گا۔ نائلہ کی رشتے کی بہنیں جانتی تھیں نائلہ نے ایک مشکل زندگی گزاری ہے۔ انہیں احساس تھا کہ محمد ہاشم ایک مشکل مرد ہے، انہیں نائلہ کی مشکلات کا اندازہ تھا اس کے باوجود وہ دعا کو بہو بنانا چاہتی تھیں کہ ان بچیوں کے اطوار اس قدر نیک تھے کہ ان سے رشتہ جوڑنا عین سعادت تھا۔ محمد ہاشم کے تیور بدلے ہوئے تھے' چہرہ سرخ تھا۔ گھر میں سب کے ساتھ بول چال بند تھی۔ ایسے میں نائلہ اپنے رشتے داروں سے گریزاں سی تھی وہ جانتی تھی اس رشتے کے معاملے میں سوائے خفّت کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ معاملہ بگڑے گا' اچھلے گا، سارے خاندان میں ان دونوں میاں بیوی کے آپس کے نفاق کی خبر اُڑے گی۔ وہ تو کب سے اس گھر کو گھر بنا کے بیٹھی تھی اپنی ہڈیوں کا سرمہ بنا ڈالا تھا اس نے محنتِ شاقہ کر کر کے۔ محمد ہاشم کے بچوں کو پڑھا لکھا دیا تھا، دنیا والے ان کی عزت کرتے تھے، ان کا ایک بھرم تھا وقار تھا مگر اب جانے کیا ہونے جارہا تھا کیا ہونے والا تھا۔ بچیاں اس خوف سے نڈھال تھیں کہ اب ہمارے گھر کے نفاق کا پردہ چاک ہوجائے گا، سارا ننھیال جان جائے گا، امی جان اور ابو کی شادی کا بھرم ٹوٹ جائے گا۔

دنیا والے تماشا دیکھیں گے کیا سوچیں گے، کیا کہیں گے۔ تب نائلہ ہار گئی اسے لگا وہ اب زیادہ دیر محمد ہاشم کی ضد اور انتقام کے آگے نہ ٹھہر سکے گی۔ اسے پھر خاموشی اختیار کرنا ہوگی۔ لہٰذا ہر طرف ایک اذیت ناک خاموشی چھا گئی۔

تب محمد ہاشم نے چھوٹے بیٹے سے نائلہ کی چھوٹی بہن کے میاں کو فون کروایا کہ تم آجاؤ کسی معاملے میں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ جواد احمد دل سے نائلہ کی عزت کرتا تھا، وہ فوراً ہی بیوی بچے لے کر پہنچ گیا۔ تب محمد ہاشم کے چھوٹے بیٹے نے حیرت سے خالو کو دیکھا۔

''آپ ابو کے بُلاوے پر سچ مچ آگئے ہیں خالو جان اور وہ تو گاؤں سدھار گئے ہیں۔ آج صبح ہی کہہ رہے تھے جلد واپس آجاؤں گا۔'' جواد احمد چپ کا چپ رہ گیا۔ اسے ہرگز یہ توقع نہ تھی کہ محمد ہاشم ایسے بھی کرسکتا ہے، وہ چپ چاپ انتظار کرنا چاہتا تھا اور نائلہ کے بچے جن کی جواد خالو سے بہت دوستی تھی ہنستے چلے جارہے تھے۔

''آپ ابو کی باتوں میں آگئے خالو جان۔''

''دیکھو کیا ہوتا ہے بچو' دنیا امید پر قائم ہے۔'' جواد بھی ہنس دیا۔

اگلے دن محمد ہاشم کی واپسی ہوگئی، پوری رات وہ جواد احمد کو گزرنے والے گزشتہ بیس بائیس سالوں کی کہانی سناتا رہا جس میں ساری شکایتیں ساری حکایتیں نائلہ سے متعلق تھیں، ہر الزام نائلہ کے سر تھا، نائلہ کے بہن بھائیوں کے سر تھا۔ جواد احمد نہایت تحمل سے صبر سے ساری کہانی سنتا رہا۔

باقی سب گھر والے مذاکرات کے نتیجے کا انتظار کرتے کرتے سو گئے تھے۔ صبح اٹھے تو پتا چلا مذاکرات ناکام ہوگئے ہیں، محمد ہاشم کو اس رشتے سے انکار ہے۔

''پھر ہمیں کیوں اتنی دور سے بلایا تھا۔'' نائلہ کی چھوٹی بہن کو بھی غصہ آگیا۔ ''اٹھیں ابھی واپس چلیں۔''

تب محمد ہاشم نے پھر پینترا بدلا اور جواد احمد کو الگ لے جاکر اپنے تحفظات سے آگاہ کیا، کچھ شرائط سامنے رکھیں اور پھر پتا چلا کہ محمد ہاشم راضی ہے۔ تب جواد احمد اور اس کی بیوی پھر لڑکے والوں کی طرف گئے۔ وہ جھٹ رسم کی ادائیگی کے لیے آنے کو تیار ہوگئے۔

''شام کو وہ لوگ آئیں گے۔'' جواد احمد نے واپس آکر بتایا۔

''صرف تین لوگ آسکتے ہیں ایک بندہ بھی اس سے زائد نہیں ہوگا۔ لفظ منگنی استعمال نہیں کیا جائے گا، انگوٹھی نہیں پہنائی جائے گی۔'' محمد ہاشم نے اعلان کردیا۔

''جب کچھ ہونا ہی نہیں ہے تو وہ لوگ کیوں آئیں بھلا؟'' نائلہ کی چھوٹی بہن الجھی۔

''صرف تین بندے، ہم بندوں کی پابندی نہیں لگا سکتے۔'' جواد احمد نے کہا۔ تب محمد ہاشم نے تین بندوں والی شرط میں نرمی کردی۔

''مہمانوں کو صرف چائے دی جائے گی ساتھ میں کچھ نمکو رکھ دی جائے۔'' محمد ہاشم نے پھر نیا حکم جاری کیا۔

''نہ بندے کم ہوں گے نہ خالی چائے دی جائے گی، لڑکی والوں کی ایک عزت ایک بھرم ہوتا ہے' چائے کے تمام لوازمات میرے ذمّے۔'' جواد احمد نے ساری بازی اپنے سر لے لی اور چائے کے لوازمات مع مٹھائی جاکر بازار سے خود لے آیا۔ لڑکے والے مٹھائی کی ٹوکری' پھولوں کا زیور اور چوڑیاں لائے تھے باقی سب احباب نے بچی کے ہاتھ پر پیسے رکھے تھے۔ یوں چھوٹی سی رسم ادا ہوگئی۔

اگلے دن لڑکے کے ہاتھ پر پیسے رکھنے جانا تھا۔ لڑکے والوں نے بے تحاشا اہتمام کر رکھا تھا۔ وہ لوگ بہت خوش تھے مگر محمد ہاشم کے چہرے کی سنجیدگی اور ناگواری کسی سے چھپی نہ تھی۔ اس رسم کے بعد لڑکے کی ماں اور خالائیں کبھی آجاتیں تو محمد ہاشم کے تیور بگڑ جاتے، کسی سے سلام دعا نہ کی جاتی۔ آنے والوں کے ساتھ تحقیر آمیز سلوک کیا جاتا۔ نائلہ اور بچے سہم جاتے، گھر کے ماحول میں سراسیمگی پھیل جاتی، آنے والے شرمندہ ہوجاتے۔ نائلہ ایسے میں پریشان سی ہوجاتی۔ آنے والے چہرے پڑھ لیتے تھے۔ ناگواری بھانپ لیتے تھے۔ ایسے ہی ایک دن

نائلہ کی ایک بڑی عمر کی کزن کا فون آ گیا۔ دعا کی رسم کے دن ان کی کسی دوست نے نائلہ کی چھوٹی بیٹی عشا کو اپنے بھانجے کے لیے پسند کر لیا تھا۔ لڑکا کمپیوٹر انجینئر تھا۔ عرب امارات میں رہائش پذیر تھا۔ وہ رشتہ لے کر آنا چاہتی تھیں۔ فون اتفاق سے محمد ہاشم نے اٹھایا اور انہیں بے بھاؤ کی سنائیں۔ وہ لوگ محمد ہاشم کے اس رویے سے دم بخود تھے۔ محمد ہاشم کا یہ سلوک یہ رویہ شاید اس کی کوئی چال تھی۔ بیٹی کا رشتہ دے کر وہ شاید پھر سے کوئی گیم کھیلنا چاہتا تھا۔ لڑکے والوں کو بے عزت کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ کچھ وقت گزرا، محمد ہاشم اپنی روش بدلنے کو تیار نہیں تھا، آخر کار ایک دن اچانک ہی لڑکے والوں کا فون آ گیا، انہیں اس رشتے سے انکار تھا۔

رشتے داریوں میں دراڑ آ گئی۔ ایک دوسرے کی طرف آنا جانا ملنا جلنا ختم ہو گیا، الٹا نائلہ کے لیے ایک طعنہ بن گیا کہ تمہارے رشتے داروں نے رشتہ توڑ دیا۔ وقت گزرتا رہا، تب نائلہ کی چھوٹی بھابی کی معرفت پھر ایک رشتہ آ گیا۔ لڑکے کی عمر بہت زیادہ تھی، کسی حد تک فارغ البال بھی تھا۔ کافی پڑھا لکھا تھا، گورنمنٹ جاب کے ساتھ ساتھ کسی دوست کے ساتھ بزنس بھی کرتا تھا۔ اس رشتے میں سوائے دولت کے اور کوئی خوبی نہ تھی۔ محمد ہاشم کو صرف پیسے والی خوبی نے متاثر کیا تھا۔ لڑکے کے گھر والے بہت اچھے تھے، بہنیں بہت اچھی تھیں، سب لوگ اچھے تھے مگر ماں بہت بدمزاج دِکھتی تھیں۔ نائلہ اس رشتے پر دل سے راضی نہ تھی۔ لڑکے کی شکل صورت اور پرسنالٹی کچھ بھی نہیں تھی۔ جانے کیا ہوا، کیسے ہوا وہ لوگ ہاں کر بیٹھے۔

بہت جلدی میں آنا فانا اس بار منگنی کے بجائے نکاح کا فیصلہ کر لیا گیا۔ گیارہ بجے لڑکے والوں نے آنا تھا مگر محمد ہاشم کا ایک ہی فیصلہ تھا۔ ”کھانا نہیں دیا جائے گا صرف چائے ہو گی۔“ حالانکہ خرچہ اتنا نہیں ہو جاتا ہے صرف سمجھ کی بات ہے، نکاح کے لیے لڑکے والوں کی طرف سے کافی لوگ آئے تھے۔ جواد احمد کا مشورہ تھا کہ ٹینٹ لگا دیا جائے اور کرسیاں منگوالی جائیں لیکن محمد ہاشم کو انکار تھا۔ ”خرچہ بہت زیادہ ہو گا۔“

”بھائی صاحب بڑے بڑے کاموں پر خرچے بھی بڑے ہوتے ہیں اور عزت کی خاطر تو انسان قرض بھی لیتا ہے، آپ سٹنگ ارینجمنٹ تو ڈھنگ کا کریں۔“

نکاح ہوا، تصویریں بنیں، چائے ہوئی اور لوگ رخصت ہو گئے۔ نکاح ہو گیا تھا مگر نائلہ کے چہرے پر خوشی کی رمق نہ تھی دل بجھا ہوا تھا۔

”بہن کو سمجھاؤ، لڑکا مالدار ہے وہ کیوں پریشان ہے۔“ محمد ہاشم نے نائلہ کی چھوٹی بہن سے کہا۔

”دولت ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی۔“ چھوٹی بہن نے زبان سے تو نہیں کہا تھا مگر دل میں ضرور سوچا تھا۔

نکاح کو ایک ہفتہ ہو چکا تھا لیکن لڑکے والوں نے دوبارہ رابطہ نہیں کیا تھا۔ نائلہ سخت پریشان تھی۔ لوگ پلٹے نہیں ایک فون کال تک نہیں کی، خدا خیر کرے۔ ایک دن بیٹے کو ساتھ لے کر وہ خود وہاں چلی گئی۔ ان لوگوں کے موڈ بگڑے ہوئے تھے۔ استفسار پہ پتا چلا کہ وہ لوگ ناراض تھے۔ بقول لڑکے کی ماں کے ”ہم اتنے رشتے دار لے کر آئے اور آپ نے صرف چائے پر ٹرخا دیا، یہ عزت ہماری۔“ بڑی بی کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔

”لڑکے کو چائے میں ڈالنے کے لیے چینی نہیں ملی۔“ انہوں نے گلے شکوؤں کا طومار باندھ دیا۔ نائلہ دم بخود بیٹھی تھی۔ لڑکے کی ماں جیسے کسی ریکارڈ پر سوئی رکھ دی تھی۔ وہ بولتی گئیں۔ نائلہ نے حسبِ توفیق جواب دینے کی وضاحت کرنے کی کوشش کی لیکن لڑکے کی ماں نے نائلہ کی ایک نہ سنی۔

گھر آ کر اس نے سب کچھ ہاشم کے گوش گزار کر دیا۔ وہ سن کر متفکر تو ہوا لیکن مطمئن تھا۔

”یہ سب باتیں ہیں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، لڑکا پیسے والا ہے۔“ اس کا یہی ایک موقف تھا مگر نائلہ کی نیندیں اُڑ چکی تھیں۔ ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا، شکر ہے رخصتی سے پہلے ہی وہ لوگ ظاہر ہو گئے۔ نائلہ چوبیس پچیس سال سے ساس کے مظالم برداشت کر رہی تھی کیا ضروری تھا آگے جا کر بیٹی بھی یہی سب کچھ بُھگتے۔ وہ پوری رات جاگتی رہی اور صبح اٹھ کر دل کی بات اس کی زبان پر آ ہی گئی۔

”ہمیں فیصلہ لے لینا چاہیے، بچی کو جہنم میں دھکیلنے سے پہلے ہی یہ قصہ ختم کر دینا چاہیے۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں امی جان!“ سارے بچے دم بخود تھے۔

”یہ رشتہ پہلے دن سے میرے دل کو نہیں لگا، ہمیں بچی کو بچا لینا چاہیے۔ لڑکے کی ماں بہت بدمزاج، زبان دراز عورت ہے، وہ دعا کی زندگی اجیرن کر دے گی۔“ نائلہ کی ایک ہی رٹ تھی۔ سب لوگ پریشان حال خاموش بیٹھے تھے۔

”یاالٰہی یہ کیا ہو رہا ہے کیا ہونے جا رہا ہے؟“ بچے چپ چاپ تھے۔

”ایک غلط فیصلہ ساری زندگی میں نے بُھگتا، کیا ضروری ہے کہ میری بیٹی بھی ایک غلط فیصلے کو بھگتے۔ میں یہ نہیں چاہتی، میں یہ نہیں ہونے دوں گی۔“ نائلہ نے رو رو کے دریا بہا دیے۔ دعا ماں ہی کی دوسری کاپی تھی، چپ چاپ صابرہ شاکرہ بن کے ہر کسی کا منہ دیکھ رہی تھی، نہ کوئی سوال نہ کوئی استفسار۔ الٹا روتی ہوئی ماں کو تسلیاں دیتی۔

”شکر کریں وہ لوگ ہم پر کُھل گئے، ہمیں اللہ نے بچا لیا۔“ وہ ہر کسی کو یہی دلاسا دے رہی تھی۔ آخر کار فیصلہ ہو کے رہا۔ اتنی پاکباز، نیک سیرت بچی کے ساتھ ایسا ہو گا کسی نے سوچا بھی نہ تھا۔ خالائیں روئیں، ماموں روئے یہاں تک کہ محمد ہاشم بھی پھوٹ پھوٹ کر رو دیا مگر ہونی ہو کے رہی۔ نائلہ کے بھائیوں نے تمام معاملات کو سنبھالا۔ بہت جلد اس آنا فانا کیے گئے نکاح سے خلاصی ہو گئی۔ زندگی پہلے ہی کون سی خوشگوار تھی اب سب کو ایک چُپ لگ گئی تھی، گھر کا ماحول انتہائی افسردہ تھا۔ خوشی اس گھر کا راستہ بھول گئی تھی۔ نائلہ کے خاندان میں آج تک ایسا نہیں ہوا تھا جانے یہ کس کے گناہوں کی سزا تھی جو بچی کو بھگتنا پڑی۔

نائلہ دوبارہ زندگی کی طرف لوٹ آئی کہ اس کے سوا کوئی چارا ہی نہ تھا۔ زندگی کی پھر وہی روٹین شروع ہو گئی تھی اس کے دونوں بیٹے مٹھیاں بھینچ کر رہ جاتے تھے، دانت پیستے تھے لیکن کچھ کرنے پر قادر نہ تھے۔ صبر و ضبط اور جبر کی کڑی منزلوں سے گزر رہے تھے وہ۔ ان کی اتنی پیاری اتنی نیک سیرت بہن کے ساتھ یہ کیا ہو گیا تھا۔ ہر وقت لبوں پر آہیں تھیں، آنکھوں میں اشکوں کا طوفان تھا۔ نائلہ کے لیے یہ صدمہ برداشت کرنا بہت مشکل تھا لیکن وہ سہہ گئی شاید اس لیے کہ مالکِ دو جہاں جتنا بوجھ اس پر ڈالتا تھا وہ اسے سہہ سکتی تھی برداشت کر سکتی تھی۔ اُدھر ان کی رشتے کی بہن نے اپنے بیٹے کی شادی بڑی دھوم دھام سے غیروں میں کر دی تھی لیکن شادی کے صرف آٹھ ماہ بعد ان کی حاملہ بہو بلڈ پریشر کی زیادتی سے اچانک وفات پا گئی، تقدیر کے اس ستم پر وہ لوگ دم بخود تھے۔ بیٹے کا گھر بسنے سے پہلے ہی اُجڑ گیا تھا۔ تب ان لوگوں کو نائلہ کی بیٹی سے کی گئی زیادتی کا احساس ہوا۔ شاید یہ سب اس بے گناہ بچی

کے ساتھ زیادتی کی پاداش میں ہوا۔ وہ دن رات سوچتیں۔ اِدھر دعا کے ساتھ بھی انہونی ہی ہوئی تھی۔ آٹھ دنوں کے اندر اس کا نکاح ختم ہوگیا تھا۔ دل رنجیدہ تھے، چہرے سنجیدہ تھے اور حالات شاید انتہائی پیچیدہ تھے۔ کبھی کبھی زندگی میں ایسے مقام بھی آجاتے ہیں جب سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ختم ہوجاتی ہیں، عقل سلب ہوجاتی ہے۔ یہی سب کچھ نائلہ کے ساتھ ہورہا تھا۔ اسے یاد آیا جب پہلی بار دعا کی بات پکی کی تھی وہ مٹھائی لے کر بیٹے کے ساتھ خود ساس کو مٹھائی اور مبارکباد دینے پہنچی تھی۔ اور دادی نے مٹھائی وصول کر کے ایک لفظ مبارک کا نہ کہا تھا البتہ یہ کہا تھا کہ تم اپنے رشتے داروں میں دعا کا رشتہ نہ کرتیں۔

تب نائلہ کو بہت دکھ ہوا تھا اور آج وہ سوچ رہی تھی دادی نے پوتی کی بات پکی ہونے پر کیسی بدشگونی کی تھی کہ وہ رشتہ بھی ٹوٹ گیا پھر غیروں سے ہاتھ جوڑے تو وہاں بھی سب کچھ ختم ہوگیا۔ نائلہ کا پورا اسٹاف نائلہ کی بچیوں کو جانتا تھا۔ وہ ان کی اسٹوڈنٹ رہی تھیں۔ وہ سب ان کے کردار کی معترف تھیں اور نائلہ کے دکھ میں برابر کی شریک تھیں، تب نائلہ نے دل سے بچیوں کی شادی کا خیال نکال ہی دیا۔ بچے باپ سے ذاتی گھر کی ضد کرنے لگے تب باپ نے بیٹوں کو یہ اختیار دیا کہ وہ پلاٹ کسی پراپرٹی ڈیلر کے تھرو بیچیں اور اسی پیسے سے مکان خریدیں۔ بچے خوش ہوگئے۔ جب معاملہ طے ہونے لگتا تو محمد ہاشم یکسر انکاری ہوجاتا۔ بچے حیران پریشان باپ کا منہ دیکھتے، کچھ عرصے بعد محمد ہاشم پھر خود ہی ذکر چھیڑتا۔

''ہاں بھئی وہ پلاٹ کا کیا ہوا؟''

''آپ نے انکار کردیا تھا خود ہی۔'' بچے شاکی نظروں سے باپ کو دیکھتے۔

''ارے بھئی یہ جائداد خریدنے بیچنے کے معاملات یونہی تو طے نہیں ہوجاتے، وقت تو لگتا ہی ہے۔'' بچے پھر سے تازہ دم ہو کے کوششوں میں لگ جاتے۔ جب معاملہ طے ہونے لگتا تو محمد ہاشم اچانک انکار کردیتا۔

''آپ بہت ظالم ہیں ابو، آپ کو ہماری عزت کا کوئی خیال نہیں۔ ہم زبان دے کر زبان سے پھر جاتے ہیں، اب لوگ ہمارا مذاق اُڑانے لگے ہیں۔'' چھوٹا بیٹا آنسوؤں سے رو دیا۔ اس کے ساتھ ماں اور بہنوں نے بھی اشک بہائے اور بات ختم ہوگئی لیکن چھوٹا بیٹا جس سے باپ کا سلوک کسی حد تک مشفقانہ تھا اب باپ سے انتہائی ضرورت کے تحت بات کرتا تھا، اکثر خاموش رہتا، دکھ اس کے چہرے سے ہویدا تھا۔ وہ چپ چاپ اپنی پڑھائی میں جُت گیا تھا۔ وقت سرکتا رہا۔

ایک دن محمد ہاشم نے دونوں بیٹوں سے پوچھا۔

''شناختی کارڈ بن گئے ہیں تم لوگوں کے؟''

''جی ابو۔''

''کوئی مکان وغیرہ ڈھونڈو بھئی تم لوگ۔''

''ہمارے پاس ٹائم نہیں ہے ابو، یونیورسٹی سے آتے آتے دیر ہوجاتی ہے۔''

''میں تو یہاں ہوتا نہیں ہوں تم لوگ ہی کوشش کرو۔'' بچے دل ہی دل میں خوش ہوگئے۔ اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر وہ پھر سے اس مہم پر جُت گئے۔ پلاٹ بِک گیا ماں باپ دونوں کے دستخط ہونے کے بعد۔ اب مکان کی تلاش تھی۔

''مکان میں تمہاری ماں کے نام پر خریدوں گا۔''

''کیا مطلب؟'' بچے چونکے۔ ''تو اپنے نام خرید لیں۔'' سب نے آسان اور سادہ سا حل پیش کیا۔

''نہیں، مکان دونوں بیٹوں کے نام پر ہوگا۔''

''یہ عجیب سی بات نہیں ہے کہ ماں باپ اپنی زندگی ہی میں مکان بیٹوں کے نام کردیں۔'' جس نے سنا حیرت کا اظہار کیا۔

''اصولاً تو مکان امی جان کے نام خریدنا چاہیے جن کی دن رات کی محنتوں اور مشقتوں کے باعث ہم یہاں تک پہنچے ہیں، انہیں ان کی خدمات کا کوئی تو ایوارڈ ملنا چاہیے۔ ابو نے کتنی عجیب بات کی ہے نا۔'' نائلہ اس دوران خاموش تھی مکمل طور پر۔

''ذاتی گھر ہونا چاہیے۔'' اس کا یہی موقف تھا بعد میں بھی تو یہ سب اولاد کے کام ہی آتا ہے۔ محمد ہاشم خوش تھا کہ اس کی ماں کی رضا اسی میں تھی کہ مکان نائلہ کے نام نہیں ہونا چاہیے۔ نائلہ نے ساری زندگی شوہر کی بیکاری برداشت کی۔ اولاد کو پڑھایا لکھایا، بیماریوں سے جنگ لڑی، عیشاں بی بی کی ایک نسل کو سنوار دیا لیکن وہ آج بھی غیر تھی، تنہا تھی۔ دکھ نے اسے اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا بظاہر سالم نظر آتی تھی۔

مکان خرید لیا گیا، سب بہل سے گئے۔ گھر کی مرمتیں ہورہی تھیں۔ بڑے عرصے بعد قدرت نے انہیں ذاتی گھر کی صورت میں خوشی دی تھی۔

اس دوران رشتے بھی آتے رہے دعا کے لیے لیکن وہ لوگ بہت زیادہ ڈر گئے تھے، حد سے زیادہ محتاط تھے۔ وقت کا ساگر بہہ رہا تھا، کبھی دھیمے سُروں میں کبھی تیز رفتاری سے۔ نائلہ کے بچے تعلیمی منازل طے کر رہے تھے۔ وہ اس بات پر بے حد خوش تھی۔ اللہ کا شکر بجالاتی تھی، تب وقت نے پھر اک انگڑائی لی۔ کوئی ملنے والا پھر دعا کے لیے ایک رشتہ لے کر آ گیا۔ لڑکا اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔ بہت اچھی پوسٹ پر تھا۔ نائلہ کو ساری باتیں پسند آئیں لیکن اس نے رشتہ لانے والے کو صاف صاف بتا دیا کہ بچی کا ایک بار نکاح ہوکر ختم ہوگیا تھا رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ لڑکے والوں کو اس بات پر کوئی اعتراض نہ تھا، وہ خود بھی بیٹیوں والے تھے، دل میں خوفِ خدا رکھتے تھے۔

دعا کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ وہ آج اپنے گھر میں ماشاءاللہ خوش باش ہے لیکن نائلہ اکثر سوچتی ہے کہ رشتہ ہمیشہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم کے مطابق ہم پلّہ لوگوں میں کرنا چاہیے۔ جہاں زبان، رسم ورواج، روایات کا بہت زیادہ فرق ہو وہاں بیٹی کو ایک بوجھ سمجھ کر سر سے نہیں اتار دینا چاہیے۔ ایسی عمارت جس کی پہلی اینٹ ہی غلط رکھی گئی ہو وہ ہمیشہ ٹیڑھی ہی رہتی ہے۔

نائلہ اور محمد ہاشم کے درمیان کبھی انڈر اسٹینڈنگ نہ ہوسکی۔ وہ دونوں ایک چھت کے نیچے رہے مگر دریا کے دو کناروں کی طرح جُدا رہے۔ ان کے درمیان پائی جانے والی نااتفاقی اور تفاوت نے ان کے بچوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ ماں باپ کی نااتفاقی کا خمیازہ ان کی اولاد نے بھگتا۔ جن گھروں میں ماں باپ کی آپس میں نہیں بنتی ان بچیوں کو چاہیے وہ جہاں کہیں جس کسی سے بیاہی جائیں اپنے شوہر، اپنی سسرال کو اپنا بنالیں، ماں باپ کی زندگی سے سبق سیکھیں۔

ایک غلط فیصلہ کئی زندگیوں پر محیط ہوتا ہے، کئی زندگیوں کو متاثر کرتا ہے۔ بچیوں کے فیصلے بہت سوچ سمجھ کر کیجیے، انہیں بوجھ نہ سمجھیں۔ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں یہ درست ہے، تقدیر کا لکھا کون ٹال سکتا ہے بجا، لیکن جو چیزیں صاف صاف سامنے نظر آرہی ہوں انہیں نظر انداز نہ کیجیے۔ بچیوں کے معاملات بہت سوچ سمجھ کر طے کیجیے۔ اگر میاں بیوی کے درمیان نااتفاقی ہے تو کوشش کیجیے اس نفاق کو مٹانے کی ورنہ یہ بہت دُور تک ساتھ جائے گا۔

سمجھوتا

سعدیہ قریشی

"کہاں گئی تھیں؟" وہ جونہی اندر آئی، دانیال پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ وہ خاموش رہی۔

"پتا ہے میں کتنی دیر سے پریشان ہو رہا تھا۔ کم از کم بتا کر تو جانا چاہیے تھا۔"

"کیوں؟" اپنے لانگ بوٹ اتارتے ہوئے اس نے یکدم نظر اوپر اٹھائی۔

"کھانا کھایا؟" تھوڑی دیر وہ خاموش رہا پھر دوبارہ گویا ہوا۔

"کھانا ہوگا تو کھالوں گی، مہمان نہیں ہوں یہاں۔" اس نے اپنی چیزیں سمیٹیں اور دانیال پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر قریب سے گزر گئی۔ وہ ڈھیلے سے انداز میں صوفے پر گر گیا۔ ایسی صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی کہ سنبل کو بھی کوئی راہِ فرار نہ سوجھ رہی تھی... جبھی وہ اس کا سامنا کرنے کے بجائے دوستوں کے ہاں پناہ ڈھونڈتی۔

☆☆☆

دانیال سنبل کا خالہ زاد تھا۔ عائشہ بیگم اور یوسف احمد کے ہاں جب شادی کے آٹھ سال تک کوئی اولاد نہیں ہوئی تو انہوں نے اپنی بہن سے اپنے گھر کی تنہائی دور کرنے کے لیے دانیال کو مانگ لیا۔ اس وقت دانیال میٹرک کا اسٹوڈنٹ تھا۔ اسلام آباد آ کر اس نے اپنی پڑھائی جاری رکھی۔ جس دن اس کا رزلٹ نکلا۔ اسی دن سنبل پیدا ہوئی۔ عائشہ اور یوسف صاحب خوشی سے دیوانے ہی ہو گئے۔ وہ کہتے تھے دانیال کے مبارک قدم نے انہیں صاحبِ اولاد کر دیا۔

☆☆☆

"تم نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا؟" اس دن دانیال نے آفس سے آ کر اسے کھانے کی ٹیبل پر بیٹھے دیکھا تو حیرت سے پوچھا۔

"نہیں۔" سنبل نے اپنی پونی ٹیل کو معصومیت سے ہلایا۔

"جیا!" ان سے کچھ بولا نہیں گیا۔

"امی...... آپ جیا سے کہا کریں کہ کھانا کھالیا کرے۔ دیکھیں صبح اسے اسکول بھی جانا ہوتا ہے۔ اب ایک بجنے والا ہے۔" امی اسے کھانا دینے آئیں تو دانیال نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"ارے بیٹا...... میں تو اس لڑکی سے کہہ کہہ کر تھک گئی ہوں لیکن اس کی وہی ایک رٹ۔ تمہارا انتظار کرے گی۔" انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔

"تمہارے بغیر تو اس کے حلق سے نوالہ نہیں اترتا۔" وہ محبت سے بولیں تو دانیال بھی مسکرا دیا۔

وہ ایسی ہی تھی۔ پاگل سی...... دانیال سے محبت کرتی تھی، دیوانگی کی حد تک۔

"اس بے وقوف کی آدھی جان تو دانیال میں ہے۔" امی جی اکثر کہا کرتیں۔ اس بات پر وہ فخر سے سر بلند کر لیتی۔

"کل سے کھانا تم نو بجے تک کھالیا کرو گی۔



میں آؤں یا نہ آؤں۔ سمجھ آ رہی ہے بات؟"

"نہیں۔" وہ ہنس دی۔ بہت معصومیت سے پلکیں جھکا جھکا کر وہ اپنی بات اسی طرح دانیال سے منواتی تو وہ قربان ہو جاتا۔

"جیا!" انہوں نے ہلکے سے اس کے سر پر چپت لگائی۔ "میرے خیال میں اب سونے کی تیاری کرنا چاہیے بہت دیر ہو گئی ہے۔ صبح تمہیں اسکول بھی جانا ہے۔ میٹرک کے امتحانات سے فارغ ہو جاؤ پھر بے شک رات بھر جاگنا۔" وہ اٹھا تو ناچار اسے بھی اٹھنا پڑا۔ ورنہ تو آج کتنی ساری باتیں جمع ہو گئی تھیں اسے بتانے کی......

☆☆☆

اس دن دانیال گوجرانوالہ سے واپس آیا تو وہ سخت ناراض تھی۔

"جیا!" وہ بہت پیار سے اسے شاید تیسری مرتبہ آواز دے رہا تھا۔ "مان جاؤ ناں چندا۔ ادھر دیکھو میری طرف۔" اس نے بازوؤں سے پکڑ کر اسے اپنے روبرو کر لیا۔ وہ کچھ نہ بولی۔

"دیکھا بی آپا...... صرف تین دن کے لیے گیا ہوں گھر...... اور اس لڑکی کا موڈ دیکھیں۔" وہ اپنی بڑی بہن سے بولے جو ابھی دانیال کے ساتھ ہی گوجرانوالہ سے آئی تھیں۔

"ارے بیٹا رہنے دو...... خود ہی ٹھیک ہوجائے گی۔ باؤلی ہوئی ہے، اب بچہ دو تین دن کے لیے اپنے ماں باپ سے ملنے بھی نہیں جائے۔" امی کو غصہ آگیا۔

"تو میں نے کب کہا ہے کہ مجھے منائیں...... اور نہ میں ان سے ناراض ہوں، مجھے کیا پروا...... تین دن بعد آئیں یا تین ہفتوں بعد۔" وہ منہ پھلائے اسی انداز میں بولی۔

"نالائق لڑکی۔" وہ کُھل کر مسکرایا۔ سنبل ناراض سی اپنے کمرے میں چلی آئی اور چادر تان کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

"بھئی یہاں میری ایک چھوٹی سی منی سی گڑیا رہتی ہے۔ کہاں ہے وہ؟" وہ گھٹنے کے بل اس کے بیڈ کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔ سنبل نے اس کی طرف دیکھا۔ دو آنسو آنکھوں سے ٹپکے اور بالوں میں روپوش ہوگئے۔

"پلیز جیا اس طرح تو مت کرو۔" اس نے آنسو پونچھے۔

"بس ابھی آپ جائیں...... مجھے سونا ہے۔"

"بس اتنی سی بات پر خفا ہوگئیں اپنے دانیال بھائی سے۔"

"کیا؟" وہ چیخی۔

"یہ اتنی سی بات ہے۔ ایک تو بغیر بتائے گئے...... اور وہ بھی تین دن کے لیے پھر کہہ رہے ہیں ذرا سی بات۔" وہ جوش میں سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"اچھا بابا...... آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ اب تو بخش دو۔" وہ اس لڑکی کے دیوانے پن پر ہنس دیا تو اسے بھی عام معافی کا اعلان کرتے ہوئے مسکرانا پڑا۔

☆☆☆

ٹی وی پر کوئی زبردست مووی آرہی تھی۔ امی پڑوس تک گئی تھیں۔ ابا عشا کی نماز ادا کر رہے تھے۔ دانیال ابھی ابھی آفس سے آیا تھا۔ ذرا کمر سیدھی کرنے کے لیے صوفے پر نیم دراز ہوگیا۔ وہ آلتی پالتی مارے صوفے پر بیٹھی تھی۔ دانیال کے پیر اس کے پیروں پر تھے۔ مونگ پھلی کھاتے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ ایک دانہ خود کھاتی اور ایک دانیال کو کھلاتی۔ کبھی ہاتھ رکتے...تو دانیال کے پیر دبانا شروع ہوجاتی۔

"دانیال! اِدھر آؤ۔" بی آپا نے آواز دی تو وہ اٹھ کر ان کے کمرے میں چلا گیا۔

"تم نے زیادہ سر پر نہیں بٹھا رکھا اس لڑکی کو۔" وہ تیزی سے بولیں۔

"سر پر بٹھانے کی کیا بات ہے بی آپا۔ جیا جیسا تو میرے لیے کوئی بھی نہیں ہے۔ she is very special"

"کتنی اسپیشل ہے؟ کیا شادی کرو گے اس سے؟" وہ تنک گئیں وہ یکدم پلٹا۔

"آپ کا دماغ تو صحیح ہے......!" وہ سُن سا ہو کر رہ گیا۔

"مجھے تو تم ہوش میں نہیں لگ رہے ہو دانیال......"

"اگر آپ کے علاوہ یہ بات کسی اور نے کہی ہوتی تو......" اس نے زور سے مکے کو ہتھیلی پر مارا۔

"تو کیا کر لیتے؟ زبان کھینچ لیتے اس کی؟"

"جی...... شاید میں ایسا ہی کرتا۔" وہ دانت بھینچ کر بولا۔

"اس وقت تو چلو میں تھی۔ کل کو کسی اور نے دیکھ لیا ناں تو محترمہ اسی گھر میں بیٹھی رہیں گی۔ یہ کرتوت رکھ کر۔"

"خدا کے لیے بی آپا...... خاموش ہو جائیں۔ مت کریں اتنی غلیظ...... اور چھوٹی بات۔" وہ چیخ ہی تو اٹھا۔ "سنبل کو میں بالکل اپنی بہنوں کی طرح سمجھتا ہوں۔ پلیز میرے اور اس کے معاملے میں دخل اندازی کا آپ کو کوئی حق نہیں...... سمجھ گئیں؟" وہ غصے میں کمرے سے باہر نکل گیا۔ دل کی عجیب سی حالت ہوگئی تھی۔ اندر گھٹن کا احساس بڑھا تو وہ باہر کھلی فضا میں آگیا۔

"حد کرتی ہیں یہ بی آپا بھی۔ کم از کم میری اور سنبل کی عمر کے فرق کا لحاظ کیا ہوتا۔ شرم آتی ہے مجھے ایسا سوچتے ہوئے بھی اور انہوں نے کتنے آرام سے اپنے اندر کے شک کو باہر کی راہ دکھائی۔"

لوگ ظالم ہیں ہر اک بات کا طعنہ دیں گے
باتوں باتوں میں مراد کر بھی لے آئیں گے

ان کی طنزیہ باتیں کافی دیر تک اس کے کانوں میں زہر گھولتی رہیں۔ حقیقت یہی تھی کہ لوگوں کی سوچ اب محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ نہ صرف یہ کہ محدود ہوگئی ہے بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی سوچیں انتہائی گھناؤنی بن کر رہ گئی ہیں۔ پتا نہیں لوگوں کو کیا ہوگیا ہے۔ وہ کافی دیر تک ٹینس رہا۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ سب سے نفرت سی محسوس ہونے لگی۔ آہستہ آہستہ خود ہی اپنے دل و دماغ کو ٹھنڈا کیا اور بے دلی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔

☆☆☆

تیسرے دن بی آپا واپس گوجرانوالہ چلی گئیں۔ وہ دانیال سے سخت ناراض ہو کر گئی تھیں۔ اس نے ان کی ناراضی کی کوئی پروا نہیں کی۔ جیا کے سیکنڈ ائیر کے امتحان ہونے والے تھے۔ وہ اپنی پڑھائی میں بے حد مصروف تھی۔ کبھی کبھار تو وہ پڑھائی سے اکتا جاتی تو دل چاہتا ساری کتابیں کسی بکس میں بند کر دے۔

وقت اپنی رفتار سے گزرتا رہا۔ پلک جھپکتے ہی دو سال کا طویل عرصہ گزر گیا۔ اس دوران ابا کا انتقال ہوگیا۔ ان کے بعد اماں کی طبیعت بہت خراب رہنے لگی۔ دو بار بائی پاس ہو چکا تھا۔ نہ جانے اماں نے کون سا غم پال لیا تھا۔ وہ اندر ہی اندر کڑھتی رہتیں۔ کم از کم دانیال بھائی کو تو بتانا چاہیے لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ابا کے جانے کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو بالکل تنہا سمجھ لیا ہو۔ وہ اماں کی وجہ سے کافی اپ سیٹ رہنے لگی تھی۔

اس دن وہ کالج سے گھر لوٹی تو گھر میں ایک پُراسرار سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ سیدھی امی کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اپنا نام کانوں میں پڑا تو قدم آپ ہی آپ دروازے پر ہی جم گئے۔

"میں جیا سے شادی کروں گا۔" دانیال کہہ رہے تھے۔ وہ توازن قائم نہیں رکھ سکی۔

"اوہ...... نہیں۔ نہیں۔" دروازے کی چوکھٹ کو اس نے مضبوطی سے تھام لیا۔

"آپ جیا کی فکر بالکل نہ کریں...... میں آج ہی قاضی کا انتظام کرتا ہوں۔" وہ کمرے سے باہر آنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ سنبل تیزی سے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ دل میں اچانک ایک اذیت ناک درد پیدا ہوا۔ دانیال کی بات نے اسے اندر تک زخمی کر دیا۔ اسے فوری کسی سہارے کی ضرورت تھی لیکن سہارا دینے والا کوئی نہیں تھا۔

"میں آپ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔" دانیال جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئے وہ پیلے زرد چہرے کے ساتھ بولی۔

"جیا...... وہ...... میں......"

"پلیز...... کچھ اور مت کہیے گا۔" دکھ کی شدت سے اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے چباڈالا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

شام کو اس کا نکاح دانیال سے ہوگیا اور اسی

شام امی ان سے منہ موڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلی گئیں جہاں سے کبھی کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ وہ تڑپ تڑپ کر روئی تھی۔

گردشِ ایام ٹھہرنے کے لیے کہاں؟ وقت بہت بڑا مرہم ہے۔ اس نے دوبارہ یونیورسٹی جانا شروع کر دیا تو کچھ بہل گئی۔ دانیال سے اس نے بات کرنا ہی چھوڑ دی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ دونوں کے تمام واسطے کسی گہری سیاہ رات کا روپ دھار کر ان کی زندگی کی خوشیوں کو ڈھانپ چکے ہوں۔ اس دوران اسے بڑے عجیب اور اُلجھا دینے والے خوابوں نے بھی پریشان کیا۔ کبھی چاند کے بغیر رات دیکھی اور کبھی سورج کے بغیر دن...... کبھی ایسی چکا چوند روشنیاں دیکھیں کہ ان کی شدت سے آنکھوں میں زخم ہوتے ہوئے محسوس ہوئے اور کبھی تو یوں دیکھا کہ بہت زوروں کی بارش ہو رہی ہے اور وہ اس بارش میں اکیلی بھیگ رہی ہے۔ دانیال نے گھر میں کام کاج کے لیے ایک بوا کو رکھ لیا تھا۔ اس خیال سے بھی کہ بعض اوقات اگر وہ دیر سے گھر آئے تو جیا گھبرا نہ جائے۔

☆☆☆

جمعہ کا دن تھا۔ وہ لاؤنج میں رکھے صوفے پر آلتی پالتی مارے کشن گود میں رکھے ٹھوڑی کو ہتھیلی پر ٹکائے نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ دانیال اسی طرف چلا آیا۔

''رات کو کھانے پر میرے کچھ دوست آ رہے ہیں تم گھر پر رہنا۔'' ان کے لہجے میں سدا کی نرمی اور محبت تھی۔ وہ خاموش رہی۔

''بوا ایک کپ چائے ذرا میرے کمرے میں لے آئیں، میں پڑھنے جا رہی ہوں۔'' اس نے پیروں میں سلیپر ڈالے اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ جیسے اس سے ایسے کسی رویے کی امید نہ ہو۔ کتنا اُلجھ گیا تھا وہ اپنی اس زندگی سے...... یہ زندگی بھی بڑی عجیب اور مضحکہ خیز شے ہے۔ وہ سوچنے لگا۔ جو زندہ رہنا نہیں چاہتا انہیں نہ صرف زندہ رکھتی ہے بلکہ دنیا کے وہ تمام دل سوز مناظر دیکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ جسے دیکھنے کی تاب کوئی نہیں لا سکتا مگر یہی زندگی ہے......

سنبل نے کمرے میں آ کر دروازہ زور سے بند کیا۔ جیسے سارا قصور اس میں دروازے کا ہی ہو۔ کتنا دل چاہ رہا تھا۔ آج دانیال سے بات کرنے کا...... کئی بار جی چاہا کہ اس ساری خاموشی کو توڑ دے۔ کم از کم چھوٹی سی کوئی بات ہی کر لے۔ دل و دماغ میں ایک عجیب سی سرد جنگ جاری تھی اور اتفاق دونوں میں کسی صورت میں ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔

☆☆☆

آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ بادل کی...... اوٹ سے سورج پوری آب و تاب سے زمین پر جلوہ فگن تھا۔ دھوپ کی تیز کرنیں جب کھڑکی کی جانب بڑھنے لگیں تو وہ کسلمندی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دل پتا نہیں آج بے پناہ اداس تھا۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ کام بھی روزانہ کی طرح اپنے معمول کے مطابق ہو رہے تھے۔ بڑی بے چینی اور اضطراب کا عالم تھا۔ شاید اس کی اداسی کا سبب یہ تھا کہ گزشتہ رات اس نے بہت بے چینی کے عالم میں گزاری۔ نیند کی آغوش میں پناہ بڑی مشکل سے ملی تھی۔

''پریشان ہو؟'' دانیال کافی دیر سے اس کی بے چینی نوٹ کر رہا تھا۔ پہلے تو بہت دیر تک بڑے تحمل سے اسے دیکھتا رہا پھر بالآخر اس کے قریب چلا آیا اور دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈالتے ہوئے دھیمے سے انداز میں پوچھا۔



کرن سہیل، کراچی

کام کی باتیں

☆ خوب صورت ہونا اہم نہیں، اہم ہونا خوب صورت ہے۔ جس طرح کئی خوب صورت بادلوں میں پانی نہیں ہوتا، اسی طرح کئی خوب صورت لوگوں میں خوب صورتی نہیں ہوتی۔

☆ یہ نہ دیکھو کہ کون بول رہا ہے بلکہ یہ دیکھو کہ کیا بول رہا ہے۔

☆ غصہ پی جانے کی عادت اچھی ہے، اگر تمہارے اندر آگ لگتی ہے تو بہتر ہے کہ دھواں باہر نہ نکلے۔

☆ رشتے داری وہ گاڑی ہے جو پٹرول کے بجائے خون مانگتی ہے۔

مرسلہ: نوشین اقبال، نوشی، گاؤں بدر مرجان

''نن...... نہیں۔'' وہ گھبرا سی گئی۔ دانیال مسکرایا...... کتنی مختلف لگ رہی تھی آج وہ...... اتنے دنوں بعد......

''اچھا! ہو سکتا ہے میں نے ہی محسوس کیا ہو اور تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' وہ کافی دیر تک اس کے چہرے میں جانے کیا تلاش کرتا رہا۔ سنبل نروس ہو گئی۔ صاف محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا جھوٹ پکڑا گیا ہو۔

''آپ کو کیسے پتا چلا؟'' وہ معصومیت سے پوچھ بیٹھی۔

دانیال کو ایسا محسوس ہوا جیسے خلوص اور محبت کی وہ چاشنی جو تلخ ہو کر اس کے سامنے چند روز پہلے آ کھڑی ہوئی تھی۔ دوبارہ اپنی جُون میں واپس آ گئی ہو۔

''یہ پوچھنے کی بات نہیں عقل کی اندھی...... دانیال کی جان ہو تم......'' وہ بے چینی سے ایک دم کھڑی ہو گئی۔ عجیب سی تشنگی تھی۔ جانے وہ کیا چاہ رہی تھی۔ اپنا آپ بے بس محسوس ہو رہا تھا۔ دل چاہا دانیال کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دے ساری بے چینی دور ہو جائے۔ دل سارے جذبات کو پس پشت ڈال کر ناراضی کو بیچ میں لا بیٹھا۔ وہ یکدم کٹھور بن گئی۔

وہ جانے لگی تو دانیال نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کا دل سینے کی دیواریں توڑنے لگا۔ کچھ شفاف شفاف قطرے ستاروں کی طرح اس کی گھنیری پلکوں کی جھالر میں اٹک کر رہ گئے۔

''کیوں اتنی سخت اور کٹھور بن رہی ہو جیا؟'' اس نے نرمی سے پوچھا۔

''میرا ہاتھ چھوڑیں۔'' اس نے سنبل کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

''مجھے طلاق چاہیے دانیال......'' اس نے سنگدلی کی حد ہی تو کر دی۔ الفاظ تھے کہ ہتھوڑے برسا گئے۔ وہ ششدر رہ گیا۔

''تم...... تم ہوش میں تو ہو......'' باقی الفاظ حلق میں ہی اٹک گئے...... یہ، یہ وہ کیا کہہ گئی۔

''آپ کی خواہش کا احترام میں اس سے زیادہ دنوں تک نہیں کر سکتی...... بس میں کچھ اور نہیں کہنا چاہتی۔''

''اور اگر میں ایسا نہیں کروں؟'' وہ غرائے۔

''تو میں کورٹ چلی جاؤں گی اور خلع کا مطالبہ

کروں گی۔"

تڑاخ...... دانیال کا ہاتھ اٹھا......وقت تھم گیا۔ وہ کوئی تلخ جملہ کہتے کہتے رک گیا۔ بہرکیف وہ ان کی محبت تھی۔

"بے وقوف لڑکی۔" وہ غصے میں کہتا کمرے سے باہر کی جانب بڑھا۔ سنبل تیزی سے اس کی جانب بڑھی۔

"آپ آج کوئی حتمی فیصلہ کر کے جائیں گے۔" اس نے دونوں شانوں سے دانیال کو پکڑلیا۔ کچھ دیر وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر اس کے ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹاتے ہوئے بولا۔

"فیصلہ تو ہو چکا ہے سنبل بی بی...... اور میں بار بار پٹریاں بدلنے کا عادی نہیں ہوں۔"

"میری ماں کو آپ کی اسی خواہش نے مارا۔ ذرا سا بھی احساس نہیں ہے آپ کو۔ نہ جانے وہ کون منحوس گھڑی تھی جب امی، ابا نے خالہ سے آپ کو گود لیا۔ میں نے آپ کو ہمیشہ اپنا بڑا بھائی سمجھا۔ کتنا مان تھا مجھے آپ پر...... کتنا اعتماد کرتی تھی میں آپ کے اوپر...... سارا مان، سارا اعتماد خود ختم کردیا آپ نے...... میں...... میں کیا کروں...... نہیں برداشت کرسکتی... میں اس سے زیادہ لوگوں کے طنز سے بھرپور قہقہے اور ان کے کہے جملے، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرا خون خشک ہو رہا ہو آپ کی وجہ سے...... صرف آپ کی وجہ سے میرا محبت پر سے اعتبار اٹھ گیا ہے اور نفرت پر یقین ہوگیا ہے۔ حالانکہ نفرت کرنا نہیں سیکھی میں نے مگر آج محسوس ہوتا ہے کہ اللہ نے میرے دل میں محبت کے علاوہ ایک اور جذبہ بھی شدت سے رکھا ہے...... نفرت کا۔ اتنی شدید نفرت...... کہ آپ بھی میری نفرت سے پناہ مانگیں گے۔ نہ صرف آپ سے بلکہ اپنے آپ سے بھی......" وہ پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی۔

"خاموش رہو۔" انہوں نے اس کو بری طرح جھنجوڑ دیا۔ وہ زور زور سے رونے لگی۔

"جیا! چپ ہو جاؤ...... تم نہ جانے کیا سمجھ رہی ہو۔ بخدا میری یہ خواہش کبھی نہیں رہی۔"

"کتنا جھوٹ اور بولیں گے دانیال؟ میں نے خود سنا ہے۔"

"تم کیوں اتنا بدل گئی ہو کہ میری ہی بات پر اعتبار کرنا چھوڑ دیا ہے۔" وہ اس کے قریب آکر بیٹھ گئے۔

"آئی ایم سوری، امی جان کو صرف تمہاری فکر نے دل کا مریض بنا دیا تھا۔ وہ سمجھتی تھیں... ان کے بعد تم اکیلی رہ جاؤ گی۔ میرے ساتھ رہنے میں انہیں کوئی اعتراض تھا اور نہ مجھے لیکن خاندان والوں نے...... خود میرے گھر والوں نے...... میرے اور تمہارے متعلق اتنی گھٹیا باتیں کیں کہ انہیں فوری یہ فیصلہ کرنا پڑا۔ اب لوگوں کو کون سمجھاتا اور کہاں تک سمجھاتا...... ہمارے تعلق، دوستی، محبت کو بڑی گہری اور چبھتی ہوئی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے ہو رہے ہوں۔ خالہ جان یہ سب برداشت نہیں کرسکیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ اپنی زندگی میں تمہیں پُرسکون دیکھیں اور تمہاری طرف سے بے فکر ہو جائیں۔ میں نے بھی اس رشتے کی تمہاری طرح سب سے بہت مخالفت کی تھی لیکن آخری وقت جس طرح انہوں نے میرے سامنے ہاتھ جوڑے تو میں انکار نہیں کر پایا۔" بولتے بولتے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ گھٹنوں میں سر دے کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

☆☆☆

اس رات وہ پل بھر کے لیے بھی نہیں سو سکی۔ بوا نے بتایا کہ دانیال صبح کی فلائٹ سے کراچی جا رہا

ہے۔ تو اس کی حالت غیر ہونے لگی۔

"نہیں دانیال...... آپ ایسا نہیں کرسکتے۔ آپ مجھے اکیلے چھوڑ جائیں گے؟ کیسے رہیں گے آپ میرے بغیر؟ میں آپ کو نہیں جانے دوں گی۔ مجھ سے قریب ہوتے ہوئے بھی آپ اتنے دور ہوگئے کہ مجھے اکیلا کردیا۔ اے خدا مجھے جدائی کے صدمے سے بچالے۔" اس کے دل سے بے اختیار دعا نکلی۔

☆☆☆

ناشتے پر دانیال نے سنبل سے کوئی بات نہیں کی۔ بوا نے اس کی اُڑی اُڑی رنگت دیکھی تو گھبرا گئیں۔ دانیال کی بے چینی کئی گنا بڑھ گئی۔ اس نے سنبل کی طرف دیکھا۔ سنبل کی نظر اٹھی اور دانیال کے چہرے سے ٹکرائی۔ دونوں کی آنکھوں میں بچھڑ جانے کا دکھ تھا۔ ان کے چہرے پر آزردہ سی مسکراہٹ تھی۔ کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ وہ شاید کسی کمزوری کا مظاہرہ کرنا نہیں چاہتے تھے اور اپنی بے چینیوں اور بے قراریوں پر قابو پانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ دونوں تیزی سے رخ موڑ کر کھڑے ہوگئے۔

"میں جا رہا ہوں۔" اس نے اپنا گلا صاف کیا ایسے جیسے حلق میں کوئی چیز پھنس گئی ہو پھر بولا۔

"کوئی فیصلہ اس لیے کر کے نہیں جا رہا کہ بعد میں ہمیں پچھتانا نہیں پڑے۔ تم تھوڑے دن اور سوچ لو۔ میں تمہیں زبردستی اپنا پابند نہیں کروں گا...... لیکن" وہ پلٹا۔ "اب مجھے اس کا اعتراف کر لینے دو کہ اس رشتے کے اعتبار سے مجھے واقعی تم سے محبت ہوگئی ہے۔" دانیال نے سنبل کی طرف دیکھا۔ وہ چہرہ نیچے کیے دونوں ہتھیلیوں کو کھولے نہ جانے ان میں کیا تلاش کر رہی تھی۔

"یہ محبت بھی کیا چیز ہے!" وہ ہلکے سے ہنسا۔

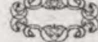
"تمام تر جذبوں پر حاوی...... اس میں دوری کا احساس بڑا جان لیوا اور کرب انگیز ہوتا ہے اور خاص طور پر اپنوں سے دوری بڑا دکھ دیتی ہے۔" وہ تھوڑا اس کی جانب جھکا۔

"اچھا میں چلتا ہوں۔ اس احساس اور دکھ کے ساتھ کہ جیا جی...... آپ مجھے پہچان نہ پائیں۔ بس اتنا ضرور کہوں گا کہ روزانہ مجھے یاد ضرور کرلیا کرنا۔ اچھے یا برے کسی بھی الفاظ میں...... صرف اس لیے کہ میرے بغیر رہنے کی تمہیں عادت ہی نہ پڑ جائے۔" وہ جانے کے لیے مڑا۔

"دانیال......" وہ اس کی چوڑی پشت پر سر ٹکا کر رو دی۔ "محبت کر رہے ہیں اور دور ہو رہے ہیں۔ مجھے کیوں نئی آزمائش میں ڈال رہے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔" ایک جھٹکا تھا جو اسے لگا اس نے سنبل کو بے یقینی سے دیکھا۔ اس نے اپنی انگلیوں کی پوروں سے اپنے آنسو صاف کیے اور کمرے میں آگئی۔

یہ حقیقت تھی کہ وہ دانیال کے بغیر رہنے کا تصور ہی نہیں کرسکتی تھی۔ وہ ہی تو اس کا سب کچھ تھا دوست، ساتھی، ہمنوا، ہمدرد اور...... اور اب شوہر...... یہی وہ رشتہ تھا جہاں آکر وہ بے بس ہو جاتی۔ اس نے اپنی آنکھوں کو موند لیا اور اپنے آپ کو اس بات پر آمادہ کرنے لگی کہ جس شخص کو ہمیشہ بھائی ہی جانا۔ اُسے شوہر کا درجہ کیسے دے گی۔

"شاید مستقبل میں میری زندگی لفظ "سمجھوتا" پر ہی محیط ہو۔" اس نے سوچا۔ کس قدر مختصر لفظ ہے یہ سمجھوتا مگر اسی قدر مشکل بھی...... جب سمجھوتا ہی کرنا ہے تو...... آنکھوں کو آنسوؤں کا عادی بنانے کا کیا فائدہ... اس نے بے دردی سے آنکھوں کو مسل ڈالا۔



زندگی

ناہید سلطانہ اختر

نوک شمشیر پہ یوں ہم نے گزارے لمحے
کانچ کی آنکھوں سے خوابوں کا گزر ہو جیسے

قسط 10

زندگی میں جہاں رشتے ناتے اور روابط بہت اہم ہوا کرتے ہیں ...وہیں ایک دوسرے کے مثبت رویے بھی کسی خاندان کے لیے مضبوط ستون کا درجہ رکھتے ہیں... مگر ہمیں بہت سے لوگ، بہت سے مواقع ایسے ضرور ملتے ہیں... جب محبت دستک دیتی ہے ...اور اس کی خوشبو میں روشنی کی تابناکی بھی ہوا کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ... مکروفریب ... سفاکی اور تنگ نظری کے سائے ...ازل سے محبت کرنے والوں کے دشمن رہے ہیں اور زندگی بھی یہی ہے کہ کبھی کبھی ترپ کی دگی بھی حکم کے اکے کو کاٹ دیا کرتی ہے ...

ہماری مایہ ناز مصنفہ ناہید سلطانہ اختر کے قلم سے ایک شاہکار ناول

جس کی سطر سطر میں زندگی سفر کرتی نظر آئے گی



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

دولت خان آفریدی تھے اور ماہتاب شنواری...... دولت خان کی پہلی منکوحہ بی بی جان تھیں۔ بی بی جان کی پہلی شادی دولت خان کے بڑے بھائی رحمت خان آفریدی سے ہوئی۔ دولت خان کو اس نئے رشتے سے ایسی شرم آئی کہ وہ بغیر بتائے کراچی آگئے اور آٹھ نو سال ایک پلمبرنگ کے استاد کے پاس رہے۔ پھر ایک ریکروٹنگ ایجنسی کے توسط سے کویت جانے کا موقع مل گیا۔ حجاب نے ایم اے بی ایڈ کیا اور وہ ایک محکمہ تعلیم میں سولہ گریڈ کی آفیسر تھی پھر پبلک سروس کمیشن کے توسط سے خود کو ہیڈ مسٹریس کی اسامی کا اہل ثابت کیا۔ ایک ثانوی تعلیمی ادارے میں حجاب کا تقرر کیا گیا۔ رباب انجینئر بننے جارہی تھی۔ تقدیم، تسنیم کے موبائل پر مدثر کے میسج پڑھ لیتی ہے اور سب کچھ ابا کو بتادیتی ہے، تسنیم یونیورسٹی کے بہانے مدثر کے ساتھ جاکر کورٹ میرج کرلیتی ہے۔ تقدیم ابا کو بتاتی ہے کہ تسنیم نے کورٹ میرج کرلی ہے۔ مدثر یونیورسٹی جانے سے پہلے تسنیم سے مل کر جاتا ہے تو یونیورسٹی میں تقدیم کو اپنا منتظر پاتا ہے۔ حجاب کے نکاح کی تقریب گھر کے بجائے الطاف کے کہنے پر فائیو اسٹار ہوٹل میں ہوتی ہے۔ تقدیم کے گھر میں مدثر کی کال کا انتظار ہوتا ہے۔ مدثر، تسنیم کو بھیجنے کی حامی بھرلیتا ہے اور پھر اپنی والدہ کو اپنی کورٹ میرج کے بارے میں بتاتا ہے۔ زیتون نے تقدیم کے لیے عباد کا رشتہ بتایا تو اماں رضامند ہوگئیں کہ وہ لوگ لڑکی کو دیکھنے آجائیں۔ حجاب سیمہ سے کہتی ہے کہ وہ الطاف سے اپنا رشتہ ختم کردے گی، گھر والے حجاب کو سمجھاتے ہیں لیکن وہ اپنی بات پر قائم رہتی ہے۔ تسنیم گھر واپس آکر اپنے کمرے میں رہ رہی ہے لیکن کوئی اس سے بات چیت نہیں کرتا بس اس کو کھانا دے دیتے ہیں، رات میں اسے پیاس لگتی ہے تو وہ دروازہ کھولنا چاہتی ہے لیکن دروازہ باہر سے بند تھا۔ حجاب کا فون بند ہونے پر الطاف امی کے فون پر کال کرتا ہے لیکن حجاب بات نہیں کرتی۔ تسنیم مدثر سے کہتی ہے کہ وہ اپنی امی کو بھیجے۔ حجاب کی امی الطاف کی بہن سے بات کرتی ہیں تو وہ سب لوگ ان کے گھر آجاتے ہیں اور بسمہ کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ اکیڈمی میں پاسنگ آؤٹ کی تیاریاں ہورہی تھیں۔ مونس کو آؤٹ پاس نہیں ملتا تو صبور احمد پوری فیملی کے ساتھ کاکول آگئے۔ زیتون ان کو عباد کے لیے جو لڑکی دکھاتی ہے وہ انہیں بہت پسند آتی ہے لیکن عباد کو ان کی غربت پر اعتراض ہوتا ہے۔ امی اسے منع کرنے سے انکار کرتی ہیں تو عباد جہیز کی لسٹ لکھ کر بھیج دیتا ہے۔ الطاف، حجاب کو راستے میں روک کر اپنے ساتھ چلنے کا کہتا ہے مگر حجاب رکشے میں اسکول چلی جاتی ہے۔ زیتون بیگم عباد کی امی کو آکر بتاتی ہیں کہ عباد نے جہیز کی لسٹ بنا کر بھیجی تو ان لوگوں نے رشتے سے انکار کردیا۔ ابا پریشان ہوتے ہیں کہ مدثر نے ابھی تک کوئی پیش رفت کیوں نہیں کی۔ مدثر پریشان تھا کہ ڈیڈی نے وہاں جانے سے منع کردیا تھا۔ تسنیم، مدثر سے بات کرتی ہے تو مدثر کا رویہ اکھڑا اکھڑا سا ہوتا ہے۔ الطاف، حجاب کے اسکول پہنچ جاتا ہے اور اسے ڈراتا ہے کہ اسٹاف کے لوگوں کو بلا کر وہ سب کو بتادے گا۔ تقدیم اور ابا مونس کی پاسنگ آؤٹ کی تقریب میں جاتے ہیں تو صبور احمد اور ان کی فیملی کا بہت اچھی طرح خیال رکھتے ہیں اور واپسی پر ان کو تحائف کے ساتھ رخصت کرتے ہیں۔ مونس گھر آتا ہے تو اماں چاہتی ہیں کہ خوش بخت سے اس کا رشتہ طے کردیں لیکن مونس انہیں ٹال دیتا ہے۔ تقدیم سمجھ جاتی ہے کہ وہ لڑکی عائزہ ہے جس کی وجہ سے مونس انکار کررہا ہے۔ وہ مونس سے بات کرتی ہے تو مونس کو یہ ڈھارس ہوجاتی ہے کہ اس معاملے کو اب تقدیم سنبھال لے گی۔ تقدیم اماں کو بتادیتی ہے کہ مونس، عائزہ میں انٹرسٹڈ ہے اس لیے وہ خوش بخت کا خیال دل سے نکال دیں۔ عباد اچھی جگہ شادی کرنے کے لیے شادی دفتر میں اپنا اندراج کراتا ہے لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوپاتا۔ مدثر، تسنیم کو طلاق بھجواتا ہے بذریعہ رجسٹری تو مونس کو تمام باتوں کا علم ہوتا ہے، تسنیم، مدثر کو فون کرتی ہے تو وہ فون ریسیو نہیں کرتا اور میسج کے ذریعے بتاتا ہے کہ ڈیڈی راضی نہیں ہوئے اس لیے طلاق دینی پڑی۔ مونس، مدثر کا ایڈریس پوچھتا ہے تاکہ اس سے طلاق کی وجہ پوچھ سکے لیکن تسنیم اس کی رہائش سے لاعلمی کا اظہار کردیتی ہے۔ الطاف امی کو دھمکی دیتا ہے اب وہ کورٹ میں مقدمہ دائر کردے گا۔ حجاب کو امی کی سپورٹ ملی تو اس نے خلع کا مقدمہ دائر کردیا۔ عائزہ اور اس کے گھر والے خوش تھے کہ انہیں کسی مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ تسنیم کے پریگننٹ ہونے پر ابا نے مدثر کے والد سے بات کی کہ ایک دن کے لیے اسے رخصت کراکے اپنے گھر لے جائیں۔ بہت مشکل سے وہ اس بات کے لیے راضی ہوجاتے ہیں۔ عباد کو ابھی تک وہ گوہر نایاب نہیں ملا تھا جس کی اسے تلاش تھی۔ الطاف نے وکیل کو فون کیا اور اس بات پر آمادہ کرنا چاہا کہ وہ یہ کیس نہ لڑے اور حجاب کو کیس واپس لینے پر آمادہ کرلے تو الطاف اسے منہ مانگا معاوضہ دے گا۔

اب آگے پڑھیں

کہنے کو تو اماں اور ابا نے مدثر کے والدین سے یہ کہہ دیا کہ ان کی عزت رکھنے کو خواہ ایک دن کے لیے ہی سہی تسنیم کو رخصت کر کے اپنے گھر لے جائیں مگر اب سب کی جان پر بنی تھی کہ رخصتی کے اگلے ہی دن جب تسنیم گھر آکر بیٹھے گی تو لوگوں سے کیا کہا جائے گا۔ مشکل پہلے بھی ہوتی مشکل اب بھی تھی۔ تسنیم کی ایک غلطی نے زندگی کو جگ ساپزل بنادیا تھا...... ٹکڑوں میں بٹی ہوئی...... منتشر...... صورت گری کے لیے دماغ سوزی کی طلبگار...... ہجوم افکار ماں اور ابا ہی نہیں خود تسنیم اور باقی بہنوں کے اعصاب شل کردینے کو کافی تھا...... شہر میں دو ہی تو رشتے دار گھرانے تھے ان کو بھی نکاح میں شریک نہ کرنے کے لیے کوئی بہانہ گھڑ بھی لیا گیا تو دونوں گھرانے اور ان سے خبریں پا کر دوسرے شہروں میں بسے رشتے دار کیسی کیسی باتیں نہ بنائیں گے...... گلے، شکوے، اعتراضات، طعن و تشنیع، ناراضی...... ابا کے کزن کو نکاح میں شریک نہ کرنا قابلِ رعایت ہوسکتا تھا مگر اماں کی بہن تو سگی تھی انہیں اور ان کے اہلِ خانہ کو گلہ ہونا لازم تھا۔ دین سے دنیا تھامنی مشکل...... خالہ کہتیں اتنی غیریت برتی...... تسنیم عدت میں تھی اور عدت کے اپنے کچھ شرعی تقاضے تھے۔ حنابندی، زیب و آرائش کی ممانعت...... کتنی سادگی روا رکھی جاتی...... دولھا والوں کی مادہ پرستی سے بیزاری کی کیسی کیسی تاویلیں ہی کیوں نہ پیش کردی جاتیں تسنیم کا تھوڑا بہت تو ہار سنگار کرنا ہی تھا۔ اماں اس دغدغہ میں کہ ایسا کرنے سے کہیں کسی بڑی پکڑ میں نہ آجائیں...... گھر میں موت کا سناٹا تھا۔ خالہ کو بُلا وا ملا تو وہ لپکی ہوئی آئیں۔

”اے آپا پرسوں ہی تو میں تمہارے پاس سے ہو کر گئی ہوں، تم نے جھوٹوں بھی ذکر نہیں کیا۔“

”بس جمیلہ تمہارے جاتے ہی میری ایک جاننے والی لڑکے کی ماں کو لے کر آئیں۔ انہوں نے بچیاں دیکھیں تو تسنیم پر ان کی نظر ٹھہر گئی۔ لڑکا باہر جارہا ہے۔ کل ماں، باپ، بھائی بھاوج سب آگئے اور میرے پلنگ کی پٹی پکڑ کر بیٹھ گئے کہ ہمیں رشتہ چاہیے...... بس آپ ہاں کردیں۔“

”دو بڑی بہنوں سے پہلے آپا!“ خالہ بولیں۔

”کیا کریں جمیلہ...... میری اور تمہارے بہنوئی کی بھی یہی خواہش تھی کہ پہلے بڑیوں کی ہوتی مگر وہ لوگ تو جان کو آگئے۔ کہتے تھے اٹھیں گے نہیں جب تک آپ لوگ ہاں نہیں کردیں گے۔“

”تو تم نے ہاں کردی؟“

”میں نے کیا تمہارے بہنوئی نے۔“

”چلو اللہ مبارک کرے...... مگر اتنے کم وقت میں کیسے ہوگا سارا بندوبست!“

”جمیلہ شرط رکھ دی انہوں نے ایک تنکا نہیں لے جائیں گے لڑکی کے ساتھ اور اسے بھی گھر کے تین کپڑوں میں...... بالکل سادگی سے...... کہتے ہیں ہمیں جو پہنانا اوڑھانا ہوگا ہم اپنے ارمان اپنے گھر لے جاکر پورے کرلیں گے۔“

”ارے بھئی ہمارے بھی تو کچھ ارمان ہیں...... ہم اپنی بچی کو بے ہار سنگار تو نہیں بھیجیں گے۔“

”ہاں تھوڑا بہت......“ اماں نے پہلو بدلا۔ ”باقی ان کی چیز۔“

”سستے میں چھوٹ رہی ہو آپا، ورنہ آج کل تو لوگ منہ سے فرمائشیں کر کر کے مانگتے ہیں اور لے بھی جاتے ہیں۔“

”بس جمیلہ تمہارے بہنوئی کی کوئی نیکی کام آگئی۔“ اماں نظریں چُرا کر بولیں۔

”اللہ نصیبہ اچھا کرے...... ویسے پوچھ گچھ تو کرالی ناں تم نے؟ میں اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ اللہ نہ کرے آج کل دھوکے بھی بہت ہوتے ہیں۔“

''جنہوں نے رشتہ بتایا ہے وہ میری بہت اچھی پرانی جاننے والی ہیں...... پوری ذمّے داری لے رہی ہیں وہ۔''

''چلو اللہ اچھا ہی کرے...... ولیمہ کب ہے؟''

''ولیمہ لڑکے کے واپس آنے پر کریں گے۔''

''تو کیا تسنیم بھی اس کے ساتھ جائے گی؟''

''ابھی تو نہیں...... مگر وہاں جا کر لڑکا اسے بلالے گا۔''

خالہ سے باتیں کرتے ہوئے باتوں ہی باتوں میں اماں کو لوگوں کی جانب سے متوقع سوالات کے جوابات مل گئے تھے۔ مثلاً یہ کہ لڑکا شادی کے بعد ایک آدھ روز میں ہی باہر روانہ ہو جائے گا...... تسنیم گھر آ کر بیٹھی بھی تو جواز یہ ہوگا کہ لڑکا باہر چلا گیا ہے بعد میں بہانہ کر دیں گے کہ اس نے تو بلانے کے بجائے طلاق بھجوادی۔

☆☆☆

ان دنوں دفتر میں تقدیم کا ذہن بار بار بھٹک کر کہیں اور نکل جاتا تھا۔ دفتر میں اپنے فرائضِ منصبی کی انجام دہی کے دوران گھر کا خیال آنا یا کسی نجی مسئلے کی طرف ذہن کا بھٹک جانا کوئی خلافِ امر بات نہیں تھی ایسا اکثر ہوتا رہتا تھا مگر اس کی توجہ اپنے فرائضِ منصبی پر مرکوز رہتی۔ بیماری، آزاری میں بھی دفتر آ کر وہ اپنی تکلیف بھول جایا کرتی تھی۔ شام کو دفتر سے اٹھتی تو احساس ہوتا کہ صبح جب دفتر آنے کے لیے گھر سے نکلی تو طبیعت خراب تھی یا فلاں مسئلہ تھا۔ دفتری امور بروقت اور پورے انہماک سے انجام دینے کی چاہ میں اکثر نجی معاملات اِلتوا میں جا پڑتے تھے مگر اب کی بار یہ کیسی تکلیف تھی کہ گزشتہ تین چار دن سے وہ اپنی تمام تر کوشش کے باوجود دفتری امور پر اپنی توجہ کو ہر تھوڑی دیر بعد بھٹکتے پانے لگتی...... اماں اور ابا کے ساتھ مدثر کے باپ کا اہانت آمیز رویّہ، اماں اور ابا کے چہروں پر بکھری بے بسی اور شرمندگی اور تسنیم کی آنکھوں میں لرزاں احساسِ ندامت...... وہ اپنے دل سے محو ہی نہیں کر پا رہی تھی۔ کیسی رعونت اور اہانت تھی مدثر کے باپ کے لہجے اور آنکھوں میں اور کس درجہ بے بسی اور درد ابا کے لہجے اور اماں کے رونے میں، پچھلی رات جب وہ اگلی صبح دفتر کے لیے اپنے کپڑے استری کر رہی تھی۔ تسنیم اتنی آہستگی سے اپنے کمرے سے نکل کر برآمدے میں سوئچ بورڈ کے نزدیک پڑے آئرن اسٹینڈ کے پاس آ کھڑی ہوئی کہ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ وہ کب وہاں آ کھڑی ہوئی۔

''تقدیم آپی!'' وہ اس کے مخاطب کرنے پر چونکی تھی۔

''ہاں۔'' اس نے گردن موڑ کر تسنیم کی طرف دیکھا۔

''وہ......'' اس نے فقط اتنا ہی کہا اور مزید کچھ کہنے میں انتہائی متامّل سی دکھائی دینے لگی۔

''ہاں بولو۔'' اس نے استری کو عموداً کھڑا کر کے ہاتھ روک لیا اور ہمہ تن اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ تسنیم نے سر جھکا لیا۔

''کیا بات ہے؟'' تقدیم نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھتے ہوئے دلسوزی سے پوچھا۔ تسنیم دلسوزی کی مستحق تھی یا نہیں...... اس سے اسے کوئی بحث نہیں تھی۔ وہ اس کی ماں جائی تھی۔ لغزیدہ تھی اور لغزش کھانے والے کو معتوب قرار دے کر اسے ذلّت سے دیکھنا یا اس سے قطع تعلق کر لینا اس کی لغزش سے بھی بڑی نادانی ہوتی۔

''وہاں...... وہاں......'' وہ پھر رک گئی۔

''ہاں، ہاں بولو...... رُک کیوں گئیں۔''

''وہاں کوئی جائے گا میرے ساتھ؟'' اس نے کچھ اس طرح کہا جیسے کوئی بیمار صحتیابی کے لیے دی جانے والی گولی کا کڑوا مزہ اپنی زبان پر محسوس کرتے ہی اسے اُگل دینے کی کوشش کرے۔

''کہاں؟'' وہ انجان بن گئی۔

تسنیم نے نظر اٹھا کر ایک لمحے کو اس کی طرف دیکھا اور تقدیم کو اس ایک لمحے میں ہی اس کی آنکھیں گہرے پانیوں میں ڈوبتی دکھائی دیں۔ ''وہیں...... جہاں اماں، ابا مجھے ایک دن کے لیے بھیج رہے ہیں۔'' اس کی آواز میں نمناکی تھی۔

''مدثر کے گھر؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''پتا نہیں...... یہ تو اماں کو معلوم ہوگا...... ویسے...... جاتی تو ہے لڑکی کے ساتھ ایک ساتھ والی...... مگر میرا خیال ہے ہماری طرف سے کوئی نہ جائے شاید...... مسائل پیدا ہو سکتے ہیں...... میرا نہیں خیال کہ اماں کسی کو بھیجیں گی۔''

''پلیز!'' تسنیم نے اس کے دونوں ہاتھ یکبارگی اپنے ہاتھوں میں دبوچ لیے اور گڑگڑائی۔ ''اماں سے کہیں مجھے اکیلے وہاں نہ بھیجیں۔'' اس کا سر تقدیم کے شانے سے آ لگا اور وہ گھٹ گھٹ کر رونے لگی۔ تقدیم کو بیک وقت دو متضاد احساسات اپنے دل میں پاؤں پسارتے محسوس ہوئے۔ تسنیم پر غصہ اور اس سے ہمدردی...... غصہ اس خیال سے کہ اگر اس نے ایک غلط قدم نہ اٹھایا ہوتا تو کیوں اسے اور باقی گھر والوں کو یہ دن دیکھنا پڑتا اور ہمدردی، بہن ہونے کے ناتے اس کے آنسوؤں سے پسیج کر۔

دفعتاً تسنیم نے اپنا سر اس کے شانے پر سے اٹھایا اور اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اسے اپنی بھیگی ملتجی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے انتہائی گڑگڑا کر بولی۔ ''پلیز! پلیز مجھے اکیلے مت بھیجیے گا آپ لوگ وہاں۔''

''میں اماں سے بات کروں گی۔'' تقدیم جانتی تھی کہ وہ محض اس کا دل رکھنے کو ایسا کہہ رہی تھی...... ساتھ جانے کو تو خالہ تھیں۔ ابا کے کزن کی بیوی تھیں، ان کی بہو تھی مگر اماں کسی کو اس کے ساتھ بھیج کر راز افشائی کا خطرہ مول کیوں لینے لگی تھیں بھلا۔

''آپ چلی چلیے گا۔'' تسنیم نے گویا ٹیلی پیتھی سے اس کا ذہن پڑھ لیا تھا۔

''میں!'' تقدیم ہڑبڑائی۔

اس نے ملتجی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

''میں...... میں کیسے جا سکتی ہوں؟'' تقدیم جس نے شادیوں میں صرف شادی شدہ خواتین کو ہی دلہن کی ساتھ والی بن کر جاتے دیکھنے کی روایت سنی اور کہیں کہیں دیکھی بھی تھی بولی۔

''پلیز آپی!''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اماں اس کی اجازت نہیں دیں گی۔'' اس نے پورے یقین سے کہا۔ ''میں جانتی ہوں...... کسی بھی قیمت پر نہیں۔''

''آپ اماں سے بات تو کر کے دیکھیں۔''

''فرض کرو...... بفرضِ محال...... اماں مان بھی جائیں تو میں نہیں جا سکتی تمہارے ساتھ۔''

”کیوں؟“ وہ چونکی۔

اس نے تسنیم کو کڑی نگاہوں سے دیکھا۔ ”اچھا لگے گا؟“

”میری خاطر آپی!“ اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے کر دیے۔

”بس ایک رات ہی تو......مل کر گزار لیں گے......پلیز آپی۔“

”نہیں......“ تقدیم نے برا منہ بناتے ہوئے دوٹوک لہجے میں کہا۔ ”اگر اماں اجازت دے بھی دیں تو میں ایسے بدتمیز لوگوں کے گھر ایک رات کیا، ایک گھنٹا بھی نہیں گزار سکتی۔“

تسنیم کی التجائیہ نگاہوں میں مایوسی پھیل گئی۔

”اس روز اماں ابا کی اتنی بے عزتی کی تمہارے مدثر کے باپ نے کہ میرا تو جی چاہ رہا تھا کہ دو ہاتھ جڑ دوں اس شخص کے منہ پر......!“ تقدیم لحظہ بھر کو رکی اور اس نے اپنی نگاہیں تسنیم کے چہرے پر مرکوز کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں پتا ہے کیا کہتا ہے وہ شخص......“ تسنیم اس طور اس کی جانب دیکھنے لگی۔ جیسے جاننا چاہتی ہو کہ کیا کہتا تھا وہ شخص۔ ”وہ کہتا ہے ہمیں کیا پتا کس کا بچہ ہے؟“

تسنیم چند لمحوں کو سکتے میں رہ گئی......پھر جیسے وہ کسی ڈراؤنے خواب سے بیدار ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ ”او مائی گاڈ!“ اس نے صدمے کی کیفیت میں کہا۔ ”انہوں نے اتنی بڑی گالی دی۔“ وہ درد میں ڈوبی آواز سے بولی۔ ”آپ لوگوں کو گریبان پکڑ لینا تھا ان کا۔“

”گریبان پکڑا جا سکتا ہے مگر زبان نہیں۔“ تقدیم بولی۔ تسنیم شدید ہیجان سے دوچار نظر آنے لگی۔ تقدیم نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھا۔ اس کے جبڑوں پر غیر معمولی دباؤ کے باعث باہر کو نکلی ہڈیوں کے ابھار اس ہیجان کے غمّاز تھے۔ تقدیم کو اپنی طرف دیکھتے پا کر اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور ایک مرتبہ پھر رونے لگی۔ تقدیم نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر دھر دیا۔ ”ابھی تو پتا نہیں اور کیا کچھ سننا پڑے گا۔“

”سب کچھ سن لوں گی آپی......یہ نہیں......ہرگز بھی نہیں......خون پی جاؤں گی ایسا کہنے والے کا۔“ اس نے اپنے چہرے پر سے ہاتھ ہٹائے اور بھرّائی ہوئی آواز میں بولی۔

صبح دفتر آنے کے بعد سے اب تک نہ جانے کتنی مرتبہ اسے تسنیم کا خیال آ چکا تھا۔ پہلی بار ماں بننے کے تجربے کے ابتدائی مراحل سے گزرتی تسنیم اپنی کوکھ میں نمو پاتی زندگی کے لیے کیسی مضبوط دفاعی لائن نظر آئی تھی گزشتہ شب کہ وہ دیکھتی رہ گئی تھی۔

فجر کی نماز کے بعد بلاناغہ قرآن مجید کی تلاوت تقدیم ہی نہیں گھر کے تمام افراد کا معمول تھا۔ وہ عربی کے ساتھ اکثر اردو ترجمہ اور تفسیر بھی پڑھتی۔ اس روز وہ معمول کی تلاوت کے بعد کافی دیر اس بے مثل صحیفۂ حیات کے اوراق اُلٹتی پلٹتی رہی اور اسے اس کے ایمان وایقان کے بموجب مناسب رہنمائی مل گئی۔

سورۂ طلاق کی پہلی آیت نبی ﷺ کو اپنا مخاطب بنا کر ساری امتِ مسلمہ سے خطاب کرتے ہوئے مطلقہ عورتوں کے بارے میں بارِالٰہا کا یہ فرمان جاری کر رہی تھی۔ ”مت نکالو ان کو ان کے گھروں سے اور وہ بھی نہ نکلیں مگر جو کریں صریح بے حیائی۔“ مفسّر نے اس فرمان کی تفسیر میں لکھا تھا۔ طلاق دینے والے مرد مطلقہ عورتوں کو دورانِ عدت اپنے گھروں سے نہ نکالیں اور عورتیں خود بھی نہ نکلیں یعنی مطلقہ اپنی عدت طلاق دینے والے مرد کے گھر میں گزارنے کی پابند ہے اور یہ سکنہ یعنی رہنے کے لیے مکان دینا محض حق العبد نہیں کہ مرد یا عورت میں

سے کسی ایک کی رضا سے ساقط ہو جائے بلکہ حق الشرع ہے یعنی دین کا حکم، ہاں البتہ اگر کوئی مطلقہ عورت طلاق کے بعد کوئی کھلی بے حیائی کرے یا بقول بعض علما زبان درازی کرے یا ہر وقت کا رنج وتکرار رکھتی ہو تو اسے اپنے گھر سے نکالنا مرد کو جائز ہے لیکن اگر مطلقہ بے وجہ خود اس گھر سے نکلے گی تو یہ خود صریح بے حیائی ہوگی۔

اسی سورہ کی چوتھی آیت تسنیم کی طرح کی حاملہ خواتین کی مدتِ عدّت کی وضاحت یوں کر رہی تھی کہ حاملہ عورتوں کی عدّت وضع حمل تک ہے خواہ ایک منٹ کے بعد ہو جائے یا کتنی ہی طویل مدت ہو۔

مذکورہ سورہ کی آیت نمبر چھ حاملہ مطلقہ عورتوں کے لیے ایک واضح فرمانِ خداوندی جاری کرتی ہے۔ ”ان کو گھر دو رہنے کے واسطے جہاں تم آپ رہو اپنے مقدور کے موافق اور ایذا دینا نہ چاہو ان کو تاکہ ستاؤ ان کو۔ اور اگر رکھتی ہوں پیٹ میں بچہ تو ان پر خرچ کرو جب تک جنیں پیٹ کا بچہ پھر اگر وہ دودھ پلائیں تمہاری خاطر تو دو ان کو ان کا بدلہ اور سکھاؤ آپس میں نیکی، یعنی طلاق دینے والے مرد کے لیے ضروری ہے کہ وہ مطلقہ عورت کو سکنہ فراہم کرے یعنی رہنے کے لیے مکان دے اور سکنہ کے ساتھ نفقہ بھی مرد کے ذمّے ہے کیونکہ دورانِ عدّت عورت اسی وجہ سے مکان میں قید ومحبوس رہے گی۔ مرد کو لازم ہے کہ اپنی حیثیت کے موافق اس کے کھانے کپڑے کا بھی مناسب بندوبست کرے۔ مرد اسے ستائے نہیں کہ وہ تنگ آ کر نکلنے پر مجبور ہو جائے۔ ایسی مطلقہ عورت جو حاملہ بھی ہو اس کی عدّت وضع حمل تک ہے جب تک وہ بچے کی ولادت سے فارغ نہیں ہو جاتی، طلاق دینے والے مرد کو ایسی عورت کو وضع حمل تک سکنہ اور نفقہ یعنی رہنے کے لیے مکان اور اس کا خرچ دینا ہوگا۔ وضع حمل کے بعد اگر عورت مرد کی خاطر بچے کو دودھ پلائے تو مرد کو لازم ہے کہ بچے کو دودھ پلانے کی اُجرت عورت کو دے۔ اس سلسلے میں مرد اور مطلقہ عورت معقول طریقے سے دستور کے مطابق باہم مشورہ کر کے قرارداد کر لیں۔ دونوں کو چاہیے کہ خوامخواہ ضد اور کج روی اختیار نہ کریں بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ نیکی کا برتاؤ رکھیں۔

سورۂ بقرہ کی آیت نمبر دو سو تینتیس بچے کی پرورش کے سلسلے میں یہ فرمانِ الٰہی جاری کرتی ہے۔ ”اور بچے والی عورتیں دودھ پلاویں اپنے بچوں کو دو برس پورے جو کوئی چاہے کہ پوری کرے دودھ کی مدت اور باپ پر ہے کھانا اور کپڑا ان عورتوں کا موافق دستور کے تکلیف نہیں دی جاتی کسی کو مگر اس کی گنجائش کے موافق نہ نقصان دیا جائے۔ ماں کو اس کے بچے کی وجہ سے اور نہ اس کو جس کا وہ بچہ ہے یعنی باپ کو اس کے بچے کی وجہ سے۔“ اس آیت کی رو سے ماں بننے والی مطلقہ عورت کو حکم ہے کہ اپنے بچے کو دو برس تک دودھ پلائے۔ اس مدت میں کمی بھی جائز ہے یعنی اگر کسی مصلحت کی وجہ سے مثلاً ماں کا دودھ بچے کو موافق نہ ہو تو مرد اور عورت باہمی صلاح مشورہ کر کے دو سال سے پہلے بھی بچے کا دودھ چھُڑوا سکتے ہیں۔ عورت جب تک بچے کو دودھ پلائے گی جس کی انتہائی مدت دو برس کامل ہیں اس دوران باپ کو بچے کی ماں کو دودھ پلانے کی اجرت دینی ہوگی اور بچے کے ماں باپ بچے کی وجہ سے ایک دوسرے کو تکلیف نہ دیں۔ مثلاً ماں بلاوجہ دودھ پلانے سے انکار کرے یا باپ بلاسبب ماں سے بچے کو جُدا کر کے کسی اور سے دودھ پلوائے یا اس کے کھانے کپڑے میں تنگی کرے۔

سورۂ طلاق کی آیت نمبر سات عورت کو طلاق دینے والے مرد کو پابند کرتی ہے کہ ”چاہیے خرچ کرے وسعت والا اپنی وسعت کے موافق اور جس کو نپی تلی ملتی ہے اس کی روزی تو خرچ کرے جیسا کہ دیا ہے اس کو اللہ نے اللہ کسی پر تکلیف نہیں رکھتا مگر اسی قدر جو اس کو دیا اب کر دے گا اللہ سختی کے پیچھے کچھ آسانی۔“ یعنی بچے کی پرورش کا خرچ باپ پر ہے وسعت والے کو اپنی وسعت کے موافق اور کم حیثیت اپنی حیثیت کے مطابق خرچ

کرے۔ اگر کسی شخص کو زیادہ فراخی نصیب نہ ہو محض نپی تلی روزی اللہ نے دی ہو وہ اسی میں سے اپنی گنجائش کے موافق خرچ کرے۔ اللہ ربّ العزت کا قانون ہے کہ وہ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ جب تنگی کی حالت میں اس کے حکم کے موافق خرچ کیا جائے گا تو وہ تنگی اور سختی کو فراخی اور آسانی سے بدل دے گا۔

قرآن مجید کے ان احکامات سے آگہی نے تقدیم کے دل کو جیسے اپنی شفا بخش مٹھی میں لے لیا تھا۔ گزشتہ تین دن کی طرح اس روز بھی دفتر میں اس کا ذہن دفتری امور سے بار بار بھٹک کر گھر اور تسنیم کی طرف جارہا تھا مگر آج دل گرفتگی، جھلاہٹ، بے بسی اور بے قراری کے بجائے دل کو جیسے کسی نے مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ یہ کہ تسنیم اخلاقی طور پر لغزش کی مرتکب ہونے کے سبب نا قابلِ بیان شرمندگی اور اذیت بُھگت رہی تھی مگر مدثر محض مرد ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نپی تلی گلی سے نہیں نکل سکتا تھا۔ احکامِ شریعت اسے اس کی مطلقہ تسنیم اور اس کے ہونے والے بچے کے سلسلے میں متعدد ذمے داریوں کا پابند کررہے تھے...... آخر کہیں تو پکڑ تھی اس کی بھی...... اور یہ خیال تقدیم کو انوکھی تقویت دے رہا تھا کہ تسنیم اتنی بے بس اور کمزور ہرگز نہیں تھی جتنا کہ مدثر اور اس کے گھر والے باور کر بیٹھے تھے...... بات اپنے جائز حقوق کے لیے لڑنے کی تھی اور اس کے لیے ہمت لازم تھی...... تسنیم کو بھی...... اور اس کے ساتھ باقی گھر والوں کو بھی۔

اویس انصاری ایک نوجوان وکیل تھا۔ تقدیم کا اس سے اکثر رابطہ رہتا۔ جس این جی او سے وہ وابستہ تھی اویس انصاری اس این جی او کا قانونی مشیر بھی تھا۔ اپنی نجی زندگی کو اوروں پر ظاہر کرنا تقدیم کو کبھی روا نہیں رہا تھا مگر زندگی میں کبھی کبھی ایسے مواقع بھی آتے ہیں جو تقدیم جیسے محتاط رووں کو بھی اپنی راہ سے انحراف پر مجبور کردیتے ہیں۔ تسنیم کا معاملہ گھر کی عزت کا معاملہ ہی سہی مگر مدثر کا گریبان پکڑنے اور تسنیم کی مشکل کو کچھ آسان کرنے کے لیے کسی نہ کسی کو تو اس معاملے میں اعتماد میں لے کر اس پر حقیقت آشکار کرنا ہی تھی...... اویس انصاری دفتر کے معاملات کے سلسلے میں اپنے اب تک کے رابطوں میں تقدیم کو خاصا سُلجھا ہوا سا آدمی لگا تھا۔ تسنیم کے معاملے میں قانونی مشاورت کے لیے تقدیم کو وہ بہترین محسوس ہوا۔

☆☆☆

قبل ازیں اویس انصاری سے تقدیم کی ملاقاتیں اپنے ادارے میں ہی رہی تھیں مگر آج وہ سٹی کورٹ میں اس کے چھوٹے سے چیمبر میں اس کے روبرو تھی۔ کیس کی مرکزی کردار سے اپنا تعلق ظاہر کیے بغیر وہ اویس انصاری سے تفصیلی بات چیت کرچکی تھی۔

''مس تقدیم مطلقہ کی عدت، دورانِ عدت سکنہ ونفقہ اور بچے کی ولادت کے بعد اس کی پرورش کے سلسلے میں ہمارے عدالتی قوانین کم وبیش انہی احکامات کے پابند ہیں جن کا آپ الحمدللہ قرآن مجید کے مطالعے سے اِدراک رکھتی ہیں۔'' اویس انصاری نے کہا۔

''اوکے۔'' اس نے ایک اطمینان بھری سانس لی۔

''ویسے ہے خاصا دلچسپ کیس۔'' اویس انصاری نے کہا۔

''دلچسپ اوروں کے لیے ہوسکتا ہے اویس صاحب مگر لڑکی اور اس کے گھر والوں کے لیے انتہائی تکلیف دہ۔''

''یقیناً...... یقیناً'' اویس انصاری کچھ شرمندہ سا ہوگیا۔ ''دلچسپ میں نے اس اعتبار سے کہا کہ مرد اور

عورت میں طلاق کے بعد دوبارہ ملاپ کی کوششوں کے کیسز تو بہت دیکھے ہیں ہم نے لیکن طلاق کے بعد صرف دنیا کو دکھانے کے لیے اسی شخص سے مطلقہ کی شادی کا سین میرے علم میں آنے والا اپنی نوعیت کا پہلا کیس ہے غالباً۔''

''عزت کی خاطر لوگوں کو نہ جانے کیا کچھ کرنا پڑجاتا ہے اویس صاحب۔'' تقدیم کے لہجے میں موہوم سا دکھ تھا۔

''درست۔'' اویس انصاری نے تائید کی۔

''اب آپ ایک بات بتائیں بلکہ...... مشورہ دیجیے۔''

''جی...... ارشاد۔'' اویس ہمہ تن متوجہ ہو بیٹھا۔

''لڑکے اور لڑکی کے والدین کے درمیان یہ طے ہوا ہے کہ لڑکی رخصت ہوکر صرف ایک رات کے لیے لڑکے کے گھر جائے گی اور اگلے دن اپنے ماں باپ کے گھر آجائے گی...... اگر لڑکی ان لوگوں سے اپنے شرعی اور قانونی حقوق حاصل کرنا چاہے؟''

''شریعت اور قانون کو فرد کے چاہنے یا نہ چاہنے سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ تو بس اٹل ہیں...... ان کی پاسداری لازم...... میرا مشورہ یہ ہے کہ لڑکی کو اپنے حقوق ضرور حاصل کرنے چاہئیں۔''

''اور اگر مرد، عورت کو اس کے حقوق دینے سے انکار کرے؟''

''اگر عورت اس سے قانون کی زبان میں بات کرے گی تو کیسے انکار کرسکتا ہے وہ!''

''یعنی؟''

''یعنی یہ کہ گھریلو لڑائی جھگڑے اور دنگا فساد کے بجائے عورت قانون کا سہارا لے اور عدالت کے ذریعے مرد سے اپنے حقوق طلب کرے...... بلکہ اس سے قانونی جنگ لڑے...... زیرِ بحث کیس میں مرد مطلقہ کو اس کی عدت کے دوران سکنہ فراہم کرنے، اسے نان ونفقہ ادا کرنے، بچے کی ولادت کے اخراجات اٹھانے اور بعد ولادت بچے کی پرورش کا خرچ عورت کو ادا کرنے کا پابند ہے۔''

''بچے کی پرورش کا خرچ کتنے عرصے تک؟''

''دو سال تک مرد بچے کو دودھ پلانے کا حق اس کی ماں کو ادا کرے گا بشرطیکہ عورت بچے کی پرورش پر آمادہ ہو...... اس کے بعد اگر بچہ ماں کے پاس ہی رہتا ہے تو عورت عدالت کے ذریعے بچے کی ضروریات اور تربیت کا خرچ مرد سے طلب کرسکتی ہے لیکن اگر عورت اور مرد میں عدالت سے رجوع کیے بغیر ہی کوئی قرارداد طے پاجاتی ہے تو بہت اچھا۔''

''ہوں!'' تقدیم کے چہرے پر ایک جوت سی تھی۔ ''اب آخری سوال۔''

''آپ بلا تکلف جتنے چاہیں، سوال کریں۔'' اویس انصاری مسکرایا۔

''اگر......'' وہ کچھ ہچکچاہٹ کے ساتھ بولی۔ ''مرد یا اس کے گھر والے عورت کی پریگنینسی کو اَون کرنے سے انکار کردیں؟''

''آپ کا مطلب ہے عورت کے شکم میں موجود بچے کو اپنی اولاد ماننے سے انکار کردیں؟'' اویس انصاری چونکا۔

''جی۔''

''اوہ......! مس تقدیم کوئی بے حس، بے ضمیر اور ننگِ انسانیت آدمی ہی اپنی اولاد کو اپنی اولاد تسلیم کرنے سے انکار کرسکتا ہے...... جس شخص میں ذرا سی بھی انسانیت ہو وہ تو اپنی اولاد کو اپنی نسبت دینے سے انکار نہیں کرے گا...... لوگ تو اولاد کی آرزو کیا کرتے ہیں مس تقدیم...... وہ کون بدبخت ہوگا جو اولاد جیسی نعمت خداوندی کو ٹھکرائے۔''

''ہوتے ہیں اویس صاحب...... کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں۔''

''تو پھر وہ انسان نہیں ہوتے ہوں گے۔''

''بظاہر انسان ہی ہوتے ہیں...... ہماری، آپ کی طرح ان کے بھی ہاتھ، پاؤں، آنکھیں، ناک، کان اور دل ہوتے ہیں۔'' وہ گھائل لہجے میں بولی۔

''تو پھر ایسے لوگوں کے دل گوشت پوست کے نہیں پتھر کے ہوتے ہوں گے۔'' اویس انصاری کی نگاہیں اس کے چہرے پر تھیں۔

''شاید!'' اس نے دھیرے سے کہا۔

''کہیں اس خاتون کو بھی جس کا کیس آپ ڈسکس کررہی ہیں خدانخواستہ ایسی ہی کسی صورتِ حال کا سامنا تو نہیں؟''

''جی اویس صاحب۔'' اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''اوہ، سو سیڈ!''

تقدیم نے گھٹی گھٹی ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ''یہ زندگی ہے اویس صاحب یہاں بہت کچھ ہوتا ہے۔''

اویس انصاری نے میز پر اپنے سامنے دھرا شیشے کا پیپر ویٹ اپنے ہاتھ میں اٹھایا اور اسے اپنی ہتھیلی کی آغوش میں دھیرے دھیرے ہلکورے دیتے ہوئے بولا۔ ''زندگی کا قصہ یہ ہے مس تقدیم کہ اسے ہر شخص اپنے حسابوں دیکھتا ہے۔ میں ایک قانون داں ہوں میرا زاویہ نظر یہ ہے کہ زندگی کا سارا حُسن توازن میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک میزان عدل رکھی ہوئی ہے۔ انسان اگر اللہ کے احکامات کی پابندی کرتے ہوئے زندگی گزارے تو یہ میزانِ عدل کہیں بے توازن نہیں ہوتی۔ دونوں پلڑے ایک برابر رہتے ہیں۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ کبھی فرائض کی ادائیگی میں انسان کی کوتاہی اور کبھی اپنے حقوق کی وصولی میں ہماری کمزوری زندگی کو بے توازن کردیتی ہے۔ یہ دنیا جو ہمیں کبھی کبھی بہت بے رونق اور زندگی جو کبھی کبھی بہت دکھی محسوس ہونے لگتی ہے اس کا سبب غالباً یہی ہے کہ ہم اپنے حقوق کو جانے دیتے ہیں اور غاصب بڑی دیدہ دلیری سے ہمارے حقوق غصب کیے رکھتے ہیں۔''

''اویس صاحب میرا خیال ہے ہمیں اکثر اپنے حقوق سے آگہی ہی نہیں ہوتی۔''

''ہاں یہ بھی ہے...... اور یہ عدم آگہی حقدار کی کمزوری اور غاصب کی طاقت کا سبب بنتی ہے۔''

''علم ضروری ہے۔''

''بے شک...... بلکہ تعلیم ضروری ہے۔''

''آپ کا بہت وقت لے لیا میں نے۔''

''مجھے خوشی ہوئی...... اس کیس کو ڈسکس کرنے کے بہانے ہی سہی آپ نے یہاں آکر مجھے عزت بخشی......

ان خاتون کے کیس کے سلسلے میں اگر میری خدمات درکار ہوں تو حاضر ہوں...... بنا کسی فیس کے۔'' اویس انصاری نے اپنے سینے پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔

''تھینک یو۔''

''اجازت ہو اور آپ برا نہ منائیں تو ایک سوال کرنا چاہوں گا آپ سے۔''

''جی...... ضرور۔''

''یہ خاتون ہیں کون، کیا آپ کی کوئی کولیگ؟''

''جی نہیں۔'' اس نے کہا۔ وقت کم تھا۔ تسنیم کا مسئلہ ایک قانون دان سے ڈسکس کرنے کے بعد اس دکھ کو کسی کے ساتھ شیئر کرنے کا لمحہ آگیا تھا۔

''میری چھوٹی بہن اویس صاحب۔'' تقدیم کو اپنی آواز کہیں بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔

اویس انصاری بے ساختہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

☆☆☆

فون پر رانگ کال آنا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ جہاں فون تھا کبھی نہ کبھی رانگ کال بھی تھی۔ سیانوں کی زبان میں جہاں بیری ہو وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں مگر اس تواتر سے! حجاب اپنے سیل فون پر آنے والی رانگ کالز سے پریشان ہوگئی۔ کسی ناشناسا نمبر سے پہلے بھی آجایا کرتی تھی کال مگر کبھی کبھار...... اور انہی میں سے کوئی چھچھورا، لفنگا حالِ فون جان کو بھی آجاتا مگر حجاب اسے جلد ہی اس کی اوقات پر لے جا بٹھاتی لیکن اس بار تو انتہا ہوگئی...... ایک ہی آواز اور متعدد انجانے نمبروں سے کالز...... وہ ایک نمبر بلاک کرتی تو دوسرے سے کال آجاتی...... دوسرے کو بلاک کرتی تو تیسرے سے...... جیسے فون کرنے والا انواع بنوع سمز کی دکان ہی تو کھولے بیٹھا تھا...... کون کون سے نمبر پر پہرہ لگاتی وہ...... انجانے نمبروں سے آنے والی کالز ریسیو کرنا اس کی پیشہ ورانہ مجبوری تھی...... کوئی کام پڑنے پر اس کی اسٹاف ممبرز بھی فون کرلیتی تھیں...... کسی ایمرجنسی میں اسکول کے چوکیدار کو بھی رابطہ کرنا پڑجاتا...... گرلز اسکول تھا...... مسائل ہوتے رہتے تھے...... بعض لڑکیوں کے والدین بچیوں کو اسکول سے واپس لے جانے کے معاملے میں اتنی غیر ذمے داری کا مظاہرہ کرتے کہ ڈیڑھ بجے اسکول کی چھٹی ہوتی اور چار ساڑھے چار بجے چوکیدار کا فون آجاتا کہ فلاں بچی ابھی تک اسکول میں بیٹھی ہوئی ہے کوئی اس کے گھر سے اسے لینے نہیں آیا...... ایسے مواقع پر وہ عموماً اپنی ایک سینئر ٹیچر کو جن کا گھر اسکول کے نزدیک ہی واقع تھا فون کرکے ان سے اسکول جانے اور بچی کے والدین سے رابطہ کرنے کو کہتی...... غیر معمولی حالات میں اسے بعض اوقات خود بھی اسکول جانا پڑجاتا جیسے ایک روز رات کو نو بجے اسے چوکیدار کی طرف سے کال آئی کہ نویں جماعت کی ایک لڑکی چھٹی کے بعد گھر واپس نہیں پہنچی تھی اور اس کے گھر والے اس کی ہر ممکن تلاش کے بعد اسکول ریکارڈ سے اس کی ایک ایسی سہیلی کا فون نمبر لینے آئے تھے۔ جس کا نمبر انہیں اس کی کسی اور سہیلی سے نہیں مل سکا تھا۔ رات نو بجے چوکیدار کی اس فون کال نے اس کے اوسان خطا کردیے تھے۔

''نصر اللہ دوپہر ڈیڑھ بجے اسکول کی چھٹی ہوئی اور یہ لوگ اب آرہے ہیں؟'' اس نے فون پر چوکیدار سے کہا۔

''میڈم جی دوپہر کو آئے تھے۔ تین سوا تین بجے کے وقت' انہیں بتادیا تھا کہ اسکول میں اب کوئی بچی نہیں سب جاچکی ہیں۔'' وہ فون پر ہی چوکیدار پر برس پڑی۔

"بے وقوف آدمی تم نے یہ بات مجھے کیوں نہیں بتائی۔" چوکیدار کے جواب نے اسے لاجواب کردیا تھا۔

"میڈم جی، کس کس کا بتاؤں آپ کو، یہاں تو ایسے بھی لوگ آتے ہیں کہ بچی گھر بیٹھی ہوئی ہوتی ہے اور باپ، بھائی اپنے آفس یا دکان سے اٹھ کر اسے لینے کے لیے اسکول آجاتے ہیں اور پھر ہم سے لڑتے ہیں...... گھر فون کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے بچی تو گھر پہنچی ہوئی ہے۔" حجاب کو اسکول کے ساتھیوں ہی نہیں ایمرجنسی میں بچیوں کے والدین، ہم عصر اداروں کے ہم رتبہ ساتھیوں اور بعض اوقات دفتری اوقاتِ کار کے بعد نظامت تعلیمات کے کسی افسر کی طرف سے بھی فون آجاتا تھا۔ لہٰذا کسی ناشناسا نمبر سے آنے والی فون کال ریسیو کرنا بھی اس کی مجبوری ٹھہرتی۔

ایک ہی آواز میں تابڑ توڑ رانگ کالز نے اسے مشکل میں ڈال دیا۔ آواز سے وہ نوجوان لگتا اور عجیب بے ہودہ باتیں کرتا جو وہ اپنی زبان سے امی تک کو نہ بتا پاتی۔ کسی اور کو تو بتانے کا سوال ہی نہیں تھا حالانکہ اس کی ایک ٹیچر کے شوہر ایک سیلولر فون کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے ان کی مدد لی جاسکتی تھی مگر وہ اس خدشے کے تحت ان کی مدد لینے سے گریزاں تھی کہ لوگ رائی کا پہاڑ بنا لیتے ہیں...... عورت کے پیٹ میں آئی بات رہتی ہے بھلا مذکورہ ساتھی اوروں سے ذکر کرتی...... اسی کو شک کی نظر سے دیکھا جانے لگتا یا کم از کم باتیں تو ضرور بنائی جاتیں...... جس معاشرے کا وہ حصہ تھی وہاں اس پر انگشت نمائی کے لیے اس کا عورت ہونا ہی کافی تھا...... عورت پر انگلیاں اٹھاتے وقت لوگ اس کی عمر، اس کا خاندانی پس منظر، پیشہ، مرتبہ، میچورٹی سب طاق پر اُٹھا دھرتے ہیں...... ملک کے اعلیٰ ترین عہدے پر بھی ہو تو اس کی کردار کُشی کے لیے اس کا عورت ہونا ہی بہت...... سو حجاب اپنے ساتھیوں سے اپنی نجی زندگی کے درمیان مناسب فاصلہ رکھتی تھی...... بر سبیلِ تذکرہ کوئی بات منہ سے نکل جانا اور بات تھی مگر ویسے وہ احتیاط رکھتی تھی...... اسکول میں کسی کو اس نے کانوں کان بھی اپنی زبان سے یہ بھنک نہیں ملنے دی تھی کہ جس شخص سے اس کا نکاح ہوا تھا اس سے اس کا کوئی قضیہ چل رہا تھا...... عدالت میں مقدمے بازی کا ذکر تو بہت دور کی بات تھی۔

"میڈم! رخصتی میں دیر کیوں ہورہی ہے؟" بعض بے تکلف ساتھیوں کی طرف سے آئے دن یہ سوال آتا۔

"جلدی کیا ہے؟" وہ مسکرانے کی کوشش کرتی۔

"دیر بھی کیوں؟"

"دیر آید درست آید......" سوال کرنے والے کو وہ محض اپنے رُتبے کے زور پر ترکی بہ ترکی جواب دے کر لاجواب کردیتی یا پھر خفیف جیسے ایک روز مسز وجاہت کے ایسے ہی استفسار پر اس نے اپنی مخصوص مسکان کے ساتھ کہا تھا۔ "مجھ سے بیزار ہوگئی ہیں کیا؟"

"اوہ نو...... نو میڈم......" مسز وجاہت کا چہرہ شرمندگی سے تمتمانے لگا تھا۔ طرفہ تماشا یہ تھا کہ وہ اس خوش فہمی میں تھی کہ اس نے اپنی نجی زندگی کو ساتھیوں سے راز رکھا ہوا تھا اور وہ آشنائے راز ہوتے ہوئے بھی بظاہر انجان بنی ہوئی تھیں۔ اس کی ایک ساتھی کی نند جو نظامت کے تحت چلنے والے ایک پرائمری اسکول کی سربراہ تھی، الطاف کی ایک بہن سے ان کی سسرالی رشتے داری تھی۔ انہی کے توسط سے الطاف سے اس کے قضیے حتیٰ کہ مقدمے بازی تک کی خبر نہ صرف اس کے اپنے اسکول کے ساتھیوں بلکہ بعض دوسرے اسکولوں میں بھی پہنچی ہوئی تھی۔

تلخ سہی مگر حقیقت تو یہی ہے ناں کہ جب ہم اپنی زندگی کے معاملات کو دوسروں سے راز رکھتے ہوئے اس

خوش فہمی کا شکار ہوتے ہیں کہ لوگوں کو کچھ معلوم نہیں تو درحقیقت انہیں وہ سب کچھ معلوم ہوتا ہے جو اکثر ہمیں خود بھی معلوم نہیں ہوتا۔

جب سے اس کے موبائل فون پر رانگ کالز کا سلسلہ شروع ہوا تھا اس کا دل چغلی کھاتا کہ ہو نہ ہو یہ الطاف ہی کی کارستانی تھی جو اپنے کسی بندے کو اعتماد میں لے کر اسے رانگ کالز کے ذریعے ذہنی آزار میں مبتلا کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ تنگ آکر اسے امی کو بھی بتانا پڑا...... مگر وہ ساری بکواس نہیں جو فون کرنے والا کرتا تھا...... بس اتنا ہی کہ اس کے فون پر رانگ کالز آرہی تھیں۔ امی پر اس نے الطاف کے بارے میں اپنا شبہ ظاہر کیا تو وہ بولیں۔ "نہیں، نہیں...... وہ میچورڈ آدمی ہے، وہ ایسی حرکت نہیں کرے گا۔"

"امی! مجھے تو اسی پر شبہ ہے کیونکہ اس سے پہلے میرے موبائل پر مہینوں میں ایک آدھ رانگ کال آگئی ہو تو اور بات، اتنے تسلسل کے ساتھ کبھی نہیں آئیں رانگ کالز...... اور وہ بھی ایک ہی آواز میں۔"

"بیٹا! جب تک عدالت کوئی فیصلہ نہیں دے دیتی تم اس کے نکاح میں ہو، اٹھارہ بیس سال کا چھوکرا نہیں ہے وہ بُردباری کی عمر ہے اس کی...... وہ بھلا ایسی چھچھوری حرکت کیوں کروائے گا کسی سے۔"

"بُردباری کی عمر!" اس نے جی ہی جی میں سوچا۔ اسی عمر میں تو لوگ زیادہ بہکتے ہیں...... مے نوش کو پیتے ہی نشہ تھوڑی چڑھتا ہے...... کچھ وقت لگتا ہے نشہ چڑھنے میں...... گندگی اور غلاظت بھی درمیانی عمر میں زیادہ ہوتی ہے...... اس کے اپنے اسکول کی ساتویں جماعت کی ایک بارہ سالہ بھولی بھالی بچی کو پانچ بچوں کا ایک پینتالیس سالہ ترکھان باپ بھگا لے گیا تھا کہ نہیں۔

"امی آپ مانیں یا نہ مانیں ان رانگ کالز کے پیچھے وہی ہے۔" اس نے امی سے کہا۔

"ان رانگ کالز کے پیچھے وہ ہو یا نہیں ہو مجھے ڈر رہتا ہے کہ کسی دن وہ خود تمہارے پیچھے نہ آجائے۔"

"پہلے بھی تو آیا ہے امی...... اپنے منہ کی کھا کر گیا ہے کہ نہیں۔" حجاب نے کہا۔

"پہلے کی بات اور تھی...... اب مقدمے بازی ہے...... جب انسان کی اپنی عزت پر بنی ہوئی ہو تو وہ دوسرے کی بھی عزت خاک میں ملانے سے گریز نہیں کرتا...... اپنا خیال رکھا کرو...... اسکول چلی جاتی ہو تو جب تک واپس نہیں آجاتیں مجھے فکر لگی رہتی ہے۔" امی بولیں۔

"فکر نہ کیا کریں۔" اس نے امی کے گلے میں اپنی بانہیں حمائل کرتے ہوئے کہا۔ "بس دعا کیا کریں میرے لیے۔" اس کی آواز بھرّا گئی اور آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

امی نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کے لیے اپنے آنسو ان سے پنہاں رکھنا مشکل ہوگیا۔

"بہت دعا کرتی ہوں بیٹا۔" امی نے اپنے دوپٹے کا پلو مٹھی میں لے کر اس کی آنکھیں دھیرے دھیرے پونچھتے ہوئے کہا۔ "میں تو ہمیشہ سے اپنے تمام بچوں کے لیے نام بنام دعا کرتی ہوں...... پھر بھی پتا نہیں کیوں یہ تکلیف تیرے حصے میں آگئی۔" امی کی اپنی آواز بھرا گئی اور آنکھیں آنسوؤں سے لبریز دکھائی دینے لگیں۔

اب اس کی باری تھی۔ امی کے گال کو بصد احترام چوم کر اس نے انتہائی خشوع سے کہا۔ "جس کے ساتھ ماں کی دعائیں ہوں اس کی کوئی تکلیف، تکلیف نہیں رہتی امی۔"

"اپنا نمبر تبدیل کرلو۔" امی کا مشورہ ہمیشہ نہایت صائب ہوتا تھا۔

"جی امی...... میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔" اس نے اپنا نمبر تبدیل کرلیا...... نئے نمبر سے صرف ان کو

آگاہ کیا جنہیں آگاہ رکھنا ضروری سمجھا۔ وہ جانتی تھی نیا نمبر کوئی سربستہ راز تو نہیں رہے گا مگر فی الحال تو اسے بے ہودہ رانگ کالز سے نجات مل گئی تھی۔

''نمبر کیوں تبدیل کرلیا میڈم؟'' پوچھنے والے پوچھ رہے تھے۔

''نئی سم کے پیکجز کافی اچھے ہیں۔'' اس کا ہر ایک کو یہی جواب تھا اور اس ایک جواب نے اس کے خیال میں اسے بہت سی وضاحتوں سے بچالیا تھا لیکن یہ اس کی خوش فہمی تھی...... لوگ تو وضاحتوں کے بِنا ہی بہت کچھ جانے ہوئے تھے...... وہ اور بات تھی کہ جانتے ہوئے بھی انجان بنے ہوئے تھے۔

☆☆☆

''پاگل مت بنو......'' اماں نے تقدیم کو گھورا۔ ''اور اب اس کے بعد یہ بات مجھ سے پھر مت کہنا...... تسنیم کی تو مجبوری ہے ورنہ دل تو میرا اسے بھی وہاں بھیجنے کو نہیں چاہتا...... غیر لوگ ہیں ان کی نیتوں کا کیا اعتبار......''

''تسنیم کو وہاں بھیجنا مجبوری ہے تو میرا تسنیم کے ساتھ جانا بھی ضروری سمجھ لیں۔'' تقدیم نے کہا۔

''پھر تم نے وہی بات کی۔'' اماں کے لہجے میں ناگواری تھی۔

''وہ اکیلی وہاں جاتے گھبرا رہی ہے اماں...... بہت پریشان ہے...... لڑکی کے ساتھ کوئی ساتھ والی جاتی نہیں ہے کیا؟''

''کوئی پکی عمر کی...... بیاہی اور تجربہ کار عورت...... تمہیں کیسے بھیج دوں میں ایک انجان گھر میں...... لوگ باتیں بنانے بیٹھ جائیں گے۔''

''خدایا! آپ کو اپنے مسائل سے زیادہ لوگوں کی فکر کیوں رہتی ہے اماں!''

''کیونکہ مجھے لوگوں کو منہ دکھانا ہوتا ہے۔''

''کسی کو کچھ بتانے...... کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی نہیں۔''

''اچھا! تو کیا اسے رخصت ہو کر جاتے نہیں دیکھیں گے لوگ...... کیا اعلان کرادوں کہ جب تسنیم رخصت ہو کر جانے لگے تو کوئی یہ دیکھنے کی کوشش مت کرنا کہ تسنیم کے ساتھ اس کی بِن بیاہی بہن اس کی ساتھ والی بن کر جارہی ہے۔''

''اماں...... پلیز!'' وہ پھر انتہائی لجاجت سے بولی۔ ''تسنیم بہت گھبرا رہی ہے۔''

''گھبرانے دو...... یہ اسی کا تو بویا کاٹنا پڑ رہا ہے...... ایسی کانٹوں بھری فصل ہے کہ انگلیاں تو چھوڑو دل تک میں کانٹے کھُب گئے ہیں۔ جیتے جی مار دیا ہے اس نے ہمیں۔'' اماں کی آواز بھرّا گئی۔

''آہستہ اماں...... وہ سنے گی تو اسے رنج ہوگا۔''

''مجھے تو جیسے کوئی رنج ہی نہیں۔''

''اماں دیکھیں ناں...... جب میں اس کے ساتھ ہوں گی تبھی اس گھر میں اس کا کیس لڑسکیں گے ہم اور خود تسنیم بھی۔''

''کوئی کیس ویس نہیں لڑا جارہا...... بس جائے وہاں اور اپنے گھر واپس آجائے۔''

''یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی اماں۔''

''بس یہی بات ہے۔'' وہ دوٹوک لہجے میں بولیں۔

"یہ کمزوری ہے اماں...... سراسر کمزوری...... تسنیم اتنا کچھ سہہ رہی ہے...... ہم سب سہہ رہے ہیں...... مدثر
تنگ گلی سے کیوں نکل جائے...... اسے راستہ کیوں دیا جائے۔"

"وہ مرد ہے...... اس کا نہ کچھ بگڑا ہے نہ بگڑے گا۔" اماں نے اسے خشونت سے دیکھا۔

"یہی تو ناانصافی ہے...... غلطی اس کی بھی ہے اسے بھی کچھ تو دباؤ میں آنا چاہیے...... پتا چلنا چاہیے کہ اسلام نے مرد اور عورت کے حقوق و فرائض میں توازن رکھا ہے...... مرد کو عورت کا حاکم بنایا ہے تو عورت کے کچھ حقوق بھی مرد کے ذمّے رکھے ہیں...... مردوں کو عورتوں کے ان حقوق کی ادائیگی لازم ہے...... احکامِ شریعت کی پابندی نہ کرنے والے کو آخر کار سزا بھگتنا پڑتی ہے۔"

"بس، بس رہنے دو اپنا لیکچر...... یہاں کون کرتا ہے احکامِ شریعت کی پابندی...... کون دیتا ہے کسی کو اس کا حق۔"

"لینے کی ہمت ہونی چاہیے اماں...... دینے والا اگر نہ دے تو لینے والے کو چاہیے کہ لڑ کر اپنا حق لے...... اپنے حق کے لیے نہ لڑنا بھی جرم ہے۔"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو...... جو مسئلہ خاموشی اور عزت سے حل ہو رہا ہے اسے اُچھالنے اور بے عزتی مول لینے سے فائدہ...... سیانے کہتے ہیں بندھی مٹھی لاکھ کی...... کھل گئی تو خاک کی۔" اماں بولیں۔

تقدیم مطلقہ عورت کے بارے میں قرآنی احکام اور اویس انصاری سے اپنی بات چیت سے اماں اور ابا کو بالتفصیل آگاہ کر چکی تھی۔ اماں اور ابا، مدثر اور اس کے گھر والوں سے کسی بحث و تمحیص یا معرکہ آرائی کے حق میں نہ تھے مگر تقدیم کا کہنا تھا تسنیم کے شرعی حقوق کے لیے لڑنے میں اگر تسنیم اور مدثر کی کورٹ میرج کا قصہ بھی لوگوں پر کھل جائے تو کوئی حرج نہیں۔

"ہنسی اُڑانا چاہتی ہو اس گھر کی۔" اماں نے اسے خشونت سے گھورتے ہوئے کہا تھا۔

"کیا آپ کے خیال میں...... میں ایسا کر سکتی ہوں؟" اس نے اماں کو شاکی نگاہوں سے دیکھا۔

"بیٹا یہ کیسے ممکن ہے بھلا کہ آپ کیچڑ میں پتھر پھینکیں اور آپ کا دامن آلودہ نہیں ہو۔" ابا نے کہا۔

"ابا...... تسنیم نفسیاتی طور پر بہت ٹوٹ پھوٹ گئی ہے...... اس کا اعتماد بحال کرنے کے لیے اسے یہ احساس ملنا ضروری ہے کہ وہ اتنی کمزور نہیں جتنا مدثر اور اس کے گھر والے اسے سمجھ رہے ہیں۔" اس نے توقف کیا پھر اپنے لہجے میں مزید زور پیدا کر کے بولی۔ "مدثر اور اس کے ماں باپ اور ان جیسے ان تمام بے رحم لوگوں کو جو طلاق کے بعد عورت کو یوں نکال پھینکتے ہیں جیسے دودھ میں سے مکھی یہ پتا چلنا ضروری ہے کہ عورت اتنی کمزور اور بے وقر نہیں جتنا کہ وہ اسے سمجھتے ہیں۔"

"ایسے لوگوں کو کوئی کچھ نہیں سمجھا سکتا۔" اماں نے مایوسی سے کہا۔

"ایسے لوگوں کو ڈنڈا اور قانون سمجھاتا ہے اماں...... ذرا سوچیں تو...... ہماری تسنیم کا مسئلہ تو یہی ہے نا کہ وہ نفسیاتی طور پر ڈسٹرب ہوئی ہے...... خدانخواستہ اسے یہ مسئلہ نہیں کہ رہے گی کہاں...... خرچ کون اٹھائے گا...... ان لڑکیوں اور ان عورتوں کا کیا ہوتا ہوگا جنہیں ان کے شوہر طلاق دے کر ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر سے نکال دیتے ہیں...... نہ انہیں کوئی پناہ دینے والا ہوتا ہے نہ ان کے سر پر ہاتھ دھرنے اور تسلی دینے والا...... تسنیم کے حق کے لیے لڑنے سے اگر ایسی دو چار عورتوں کو بھی آگہی مل جاتی ہے...... ان میں اپنے حق کے لیے لڑنے کا حوصلہ آجاتا ہے تو پھر آپ لوگوں پر بات کھل جانے کی فکر نہ کریں۔" تقدیم کے مسلسل اصرار اور دلیل پر دلیل نے اماں اور ابا

کو بالآخر اس کے موقف سے اتفاق کر لینے پر مجبور کر دیا مگر تسنیم کے ساتھ اسے بھی مدثر کے گھر رات گزارنے کی اماں نے کسی قیمت پر اجازت نہیں دی۔

''تو پھر کون جائے گا اس کے ساتھ...... وہ بہت پریشان ہو رہی ہے اماں؟''

''کون جا سکتا ہے...... جسے بھیجو، بھید کھلے گا۔'' اماں کے لہجے سے دلی گرفتگی جھلک رہی تھی۔ ''ہاں!'' دفعتاً اماں کا لہجہ ایک نئی جوت، ایک امید کا ترجمان بنا۔ ''ایک ہے جسے بلا کھٹکے تسنیم کے ساتھ والی بنا کر بھیجا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ راضی ہو جائے۔''

''کون اماں؟''

''مدثر کے دوست کی بیوی...... ثریا۔'' تقدیم کو اماں کے ذہن کی رسائی پر اچنبھا بھی ہوا خوشی بھی......

''کہہ تو رہی ہیں آپ ٹھیک...... اگر وہ ساتھ چلی جائیں تو ہمیں بات کھلنے کا ڈر ہوگا نہ کوئی اور پرابلم...... وہ تو سب کچھ جانتی ہیں۔''

''اپنی باتوں سے تسنیم کی ہمدرد بھی لگتی ہے وہ۔''

''تسنیم سے زیادہ آپ کی اور ابا کی...... بس ذرا زبان کی کڑوی ہیں۔'' تقدیم نے کہا۔

''یہ جو زبان کے کڑوے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے دل میں کوئی میل نہیں ہوتا۔''

''یہ تو ہے...... اچھا اماں...... ثریا سے تو فوراً بات کرنی ہوگی...... وقت کم ہے۔''

''مجھے نمبر ملا کر دو...... ثریا کے ساتھ جانے میں فائدہ یہ ہے کہ وہ ہمیں بھی جانتی ہے اور اُن سے بھی پرانے تعلقات ہیں دونوں میاں بیوی کے۔''

ثریا سے اماں نے بات کی تو اس نے کہا۔ ''آنٹی کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ آپ لوگوں سے تو اب ہمارا گھر کا سا تعلق ہو گیا ہے۔ آپ بے فکر رہیں، میں تسنیم کے ساتھ چلی جاؤں گی۔''

ثریا کے جواب نے اماں اور تقدیم کو مطمئن کر دیا۔

''اماں! ہم ثریا کو بھی اعتماد میں لے کر اپنا پروگرام نہ بتا دیں۔'' تقدیم نے کہا۔

اماں سوچ میں پڑ گئیں پھر کچھ دیر بعد بولیں۔ ''کوئی حرج بھی نہیں لیکن...... ہم سے ثریا کی جان پہچان کو جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے...... ان لوگوں سے دونوں میاں بیوی کا تعلق برسوں پرانا ہے...... میں اللہ نہ کرے بدگمانی نہیں کر رہی...... انسان تو انسان ہی ہے...... خطا کا پتلا...... چمڑے کی زبان کو پھسلتے دیر ہی کتنی لگتی ہے...... کہیں ثریا نے ان لوگوں کو بتا دیا تو ایسا نہ ہو کہ تسنیم کا اس گھر جانا ہی دھرا رہ جائے۔ کتنی مشکل سے تو وہ لوگ مانے ہیں۔''

اماں کی دور اندیشی تقدیم کے دل کو لگی۔

''شکوہ ضرور ہوگا ان کو کہ میں کام آئی اور مجھی سے چھپایا۔''

''لوگوں کو اپنی مجبوری بتاؤ تو اچھے لوگ سمجھ جاتے ہیں...... ثریا بھی سمجھ جائے گی۔'' گھر کے معاملات میں ہمیشہ اماں اور تقدیم سر جوڑ کر بیٹھتی تھیں اور جو کچھ طے پاتا اس سے ابا کو یوں آگاہ کر دیا جاتا جیسے کوئی حکم نامہ خاصی دماغ سوزی سے مرتب کرنے کے بعد.... حتمی منظوری کے لیے فائنل اتھارٹی کے حضور پیش کر دیا جاتا ہے۔ ابا نے منظوری دے دی۔

☆☆☆

پاسنگ آؤٹ کے بعد عائزہ اور اس کے گھر والوں سے یہ مونس کی پہلی ملاقات تھی۔ صبور احمد اپنی اہلیہ اور تینوں بچوں کے ہمراہ ے ڈے پر اس سے ملنے کے لیے خود منگلا آ گئے تھے۔ انہیں ریسیو کرنے کے لیے مونس اپنے کمانڈنگ افسر کی مہربانی سے یونٹ کی مستعار شدہ فوجی جیپ میں خود چیک پوسٹ تک گیا۔ صبور احمد انتہائی گرمجوشی سے اس سے گلے ملے۔ ان کی بیگم نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بلائیں لیں۔ منصور اور طہور اسے دیکھ کر اپنوں کی طرح خوش ہوئے۔ عائزہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا۔ ''آئی ایم سو ہیپی۔''

''سیم ہیر!'' مونس کی آنکھوں نے اس کے دل کی ترجمانی کی۔ وہ لوگ اس کے لیے بہت ساری چیزیں اپنے ساتھ لائے تھے...... کھانے پینے کی بھی...... اور اس کے ذاتی استعمال کی بھی...... ہاٹ پاٹس میں گرم کھانا اور بڑے سے تھرماس میں دودھ پتی بھی تھی۔ مونس کو ان کی آمد کی اطلاع تھی اس نے بھی میس سے ان لوگوں کے لیے خاصا پُرتکلف کھانا تیار کروا رکھا تھا...... کھانا اس نے اپنے کمرے میں ہی منگوا لیا...... سرو کرنے کے لیے دو بیٹ مین تھے۔ ایک اس کا اپنا، دوسرا اس کے ایک ہم منصب ساتھی کا...... مہمانوں کا لایا ہوا کھانا مونس کی چکھا چکھی کے بعد کچھ دیر ہوا میں رکھ کر فریج میں رکھوا دیا گیا کہ بقول بیگم صبور وہ صرف مونس کے لیے بنایا تھا۔

''مونس بیٹے! خوبانی کا میٹھا عائزہ نے خود بنایا ہے...... تمہارے لیے۔'' بیگم صبور احمد نے بطورِ خاص بتایا۔

''اور کبابوں کی ٹکیاں میں نے بنائی تھیں۔'' طہور چہکا۔

''جی ہاں...... صرف ٹکیاں انہوں نے بنائی تھیں باقی سب کچھ ماما نے کیا تھا۔'' عائزہ مسکرائی۔

''آپ نے کیا کیا بڑے صاحب؟'' مونس نے اپنا بازو منصور کے شانوں پر دراز کرتے ہوئے دوستانہ انداز میں پوچھا۔

''کوالٹی کنٹرول!'' منصور نے بے حد سنجیدگی سے مختصر سا جواب دیا۔

''کیا مطلب؟''

''یہ ہر چیز چکھ چکھ کر بتاتے رہے کیسی بنی ہے۔'' مسز صبور احمد بولیں۔

''اور چکھنے چکھنے میں یہ اپنا کام کر گئے۔'' صبور احمد مسکرائے۔

کھانے کے بعد سبز قہوے کا دور چلا پھر عائزہ اور بیگم صبور کو قیلولہ کرنے کے لیے اپنے کمرے میں چھوڑ کر مونس، صبور احمد اور ان کے دونوں بیٹوں کو برابر والے کمرے میں لے گیا جو اس کے ایک ساتھی کے چھٹی پر گھر جانے کے باعث خالی تھا اور مونس نے اپنے مہمانوں کی سہولت کی خاطر اس سے کمرا استعمال کرنے کی فون پر اجازت لے کر اس کے بیٹ مین سے کمرا کھلوا لیا تھا۔

''بیٹا تم بھی کچھ دیر آرام کر لیتے۔'' صبور احمد نے مونس سے کہا۔

''مجھے دوپہر میں سونے کی بالکل عادت نہیں انکل...... میں یونٹ کا چکر لگا کر آتا ہوں تب تک آپ لوگ آرام کر لیں...... پھر ڈیم پر چلتے ہیں...... چائے وہیں پئیں گے۔''

''اوکے......'' صبور احمد نے پیار سے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

''مونس بھائی! ڈیم کتنی دور ہے؟'' طہور نے اشتیاق سے پوچھا۔

''زیادہ دور نہیں کامریڈ۔'' مونس نے خوش دلی سے کہا۔ سہ پہر کو وہ انہیں ڈیم پر لے گیا۔ صبور احمد پھڑک اٹھے۔

''مونس بیٹے برسوں ہو گئے اسلام آباد میں رہتے کبھی اس طرف آنا ہی نہیں ہوا حالانکہ ذکر بہت سنا تھا..... آج تمہارے طفیل منگلا ڈیم بھی دیکھ لیا...... کیا خوب صورت جگہ ہے! ہم انسان اپنی زندگی میں دنیا تو دنیا اپنے ملک کا عشرِ عشیر بھی نہیں دیکھ پاتے اکثر...... کیوں بیگم؟''

''ہاں......لیکن جن کے پاس وسائل ہوتے ہیں وہ تو دنیا بھی بار بار دیکھتے ہیں۔'' بیگم نے کہا۔

مونس نے مہمانوں کی ہائی ٹی سے تواضع کی۔ سوئے اتفاق صبور احمد صاحب کی ملاقات اپنے ایک سابق ساتھی سے ہو گئی جو ریٹائرمنٹ کے بعد جہلم میں سکونت پذیر ہو گئے تھے اور اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ ڈیم کی سیر کو آئے ہوئے تھے۔ صبور احمد اور ان کی بیگم ان کے اصرار پر اپنی میز سے اٹھ کر ان کے ساتھ جا بیٹھے۔ منصور اور طہور نے سیر کے لیے آئی ہوئی ایک اور فیملی کے بچوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنا شروع کر دی۔ مونس اور عائزہ چہل قدمی کرنے لگے۔

''آج تمہیں کتنے دنوں کے بعد دیکھا ہے مونس!'' عائزہ نے اس کے پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ ''جی چاہتا ہے ساری زندگی اسی طرح تمہارے ساتھ چلتی رہوں۔''

''یہاں بھی یہی معاملہ ہے۔'' وہ جھک کر ایک چھوٹا سا کنکر اٹھاتے ہوئے بولا۔ دفعتاً وہ رک گئی اور اس کے روبرو ہو کر بولی۔

''تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی میں۔''

''میں پھر وہی بات دہراؤں گا...... سیم ہیئر...... اِدھر بھی یہی معاملہ ہے۔'' وہ مسکرایا۔

''مجھ سے شادی کر لو پلیز۔''

اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ ''اپنی تعلیم تو مکمل کر لو۔'' اس نے کنکر پانی کے رخ پر اچھال دیا۔

''ہوتی رہے گی...... تقریباً ہو ہی گئی ہے۔''

''شادی تمہی سے کروں گا مگر ابھی نہیں۔'' مونس نے اسے محبوبیت سے دیکھا۔

''ابھی کیوں نہیں؟'' وہ یک لخت اداس دکھائی دینے لگی۔

''کم از کم دو بڑی بہنوں کی شادی ہو جائے...... پھر۔''

''میں انتظار نہیں کر سکتی مونس۔'' اس کے لہجے میں بے تابی تھی۔

''کیوں؟'' وہ چونکا۔

''تم دور ہوتے ہو تو کسی کام میں دل ہی نہیں لگتا میرا...... میں تمہارے نزدیک رہنا چاہتی ہوں مونس ہر وقت...... ہر لمحہ......'' اس نے مونس کا بازو تھام لیا۔

''نوکری کرنے دو گی یا نہیں۔'' وہ مسکرایا۔

''تم سے دور رہوں گی تو بِن پانی کی مچھلی کی طرح مر جاؤں گی مونس۔''

''ارے رے... رے انجینئر صاحبہ آپ یہ شاعرانہ باتیں کیسے کرنے لگیں۔'' وہ پھر مسکرایا۔

''مجھے خود نہیں معلوم۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''کہیں یہ اس منظر کا اثر تو نہیں......!'' وہ گرد و پیش پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے بولا۔

''نہیں...... میرا گھر میں بھی یہی حال رہنے لگا ہے...... یونیورسٹی میں بھی تمہارا خیال میرے ساتھ ساتھ رہتا

ہے۔ مونس پلیز...... اب تو تم کمیشنڈ آفیسر ہو...... مستقبل کی کوئی فکر نہیں...... شادی کر سکتے ہو...... دیکھو میں میں خود بھی کمیشن کے لیے ٹرائی کروں گی...... ورنہ کوئی سول جاب تو کرنی ہی ہے...... ہم دونوں مل کر تمہاری بہنوں کی شاید زیادہ بہتر طور پر شادیاں کر سکیں گے...... میں تمہاری پرابلمز شیئر کروں گی مونس...... بس تم...''

مونس نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ وہ سرتاسر اِک عاجزانہ سی کیفیت میں ڈوبی نظر آئی...... جیسے اس کے قدموں میں ہی تو بیٹھ جائے گی...... اسے گھر میں بیٹھی پانچ جوان بہنوں کا خیال آیا...... ان میں سے ایک بازی میں آگے نکلنے کے چکر میں ٹھوکر کھائی گھر بیٹھی تھی۔ پانچ بہنوں کے گھر میں ہوتے وہ پہلے خود شادی کیسے کر سکتا تھا۔ کم از کم تمہید باجی اور تقدیم آپی کی تو ہو جاتی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔

☆☆☆

اسکول سے واپس آنے کے بعد حجاب بہت اداس سی اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ وہ صبح اسکول جارہی تھی تو بڑا عجیب واقعہ ہوا تھا۔ کالے شیشوں والی ایک کار غلط جانب سے آکر اس کے اتنے نزدیک رکی کہ وہ گھبرا گئی۔ ڈرائیور نے سُرعت سے دروازہ کھولا اور اس کے چہرے پر پانی پھینکا۔ واردات اتنی غیر متوقع تھی کہ اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکلی۔ گاڑی چلانے والا شخص کوئی اور نہیں الطاف تھا۔ صبح صبح کا وقت تھا۔ راستہ سنسان تھا اور لوگوں کی آمد و رفت بے حد کم...... تاہم ایک دو راہ گیر ٹھٹک گئے۔

''جائیں جائیں اپنا کام کریں...... یہ ہمارا گھریلو مسئلہ ہے۔'' الطاف نے ٹھٹک جانے والے راہ گیروں کو پھٹکارا اور ان کے مزید اطمینان کے لیے حجاب کو ایک نظر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''بیوی ہے میری۔'' راہ گیر اپنی راہ ہو لیے۔ الطاف گاڑی سے اتر کر اس کے روبرو کھڑا ہو گیا اور اسے زہر خند نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ صرف سمجھانے کی کوشش کی ہے...... یہ تو پانی تھا تیزاب پھینکنا بھی کچھ مشکل نہیں...... شکل بگڑ جائے گی...... کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہو گی۔''

''اور تم بچ جاؤ گے؟'' حجاب کے دل کی دھڑکنیں تب تک بے قابو تھیں۔ وہ یوں ہنسا جیسے اس نے کوئی احمقانہ بات کر دی ہو۔

''لوگ قتل کر کے بچ جاتے ہیں...... حیثیت ہونی چاہیے بچنے کی۔''

حجاب نے اپنا سر جھٹکا الطاف نے اچانک اس کی ٹھوڑی پکڑ لی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ''زیادہ ایکشن مارنے کی ضرورت نہیں...... ریوالور پڑا ہے گاڑی میں......'' اس کی ٹھوڑی ایک جھٹکے سے چھوڑ کر اس نے اپنی دو انگلیوں کے سرے اس کی پیشانی سے مَس کرتے ہوئے کہا۔ ''اِدھر گولی ماروں تو بھیجا نکل کر باہر جا پڑے گا مگر نہیں...... ماروں گا نہیں میں تمہیں...... اب بھی وقت ہے سیدھے راستے پر آجاؤ...... میں سب کچھ معاف کر دوں گا۔''

حجاب کیسی ہی پُراعتماد سہی، تھی تو عورت...... دل بری طرح دھڑک رہا تھا ٹانگیں لرز رہی تھیں۔

الطاف نے ایک جھٹکے سے اپنی انگلیاں اس کی پیشانی سے ہٹائیں اور اسے گھورتے ہوئے واپس مڑا گاڑی میں بیٹھا زور سے دروازہ بند کیا اور گاڑی جو اسٹارٹ ہی کھڑی تھی گیئر میں ڈال کر یہ جا وہ جا۔

اسکول میں دن بھر وہ اس واقعے کو بار بار یاد کرتی رہی۔ گھر واپس لوٹی تو دل اداس اور ذہن پر دباؤ سا تھا۔ کتنی پُرسکون گزر رہی تھی زندگی...... الطاف نے اس سکون کو درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا...... کیا تھا اگر شادی نہ

ہوتی...... زندگی اتنی بے سکون تو نہ ہوتی...... زندگی اکیلے بھی گزر ہی جاتی...... اس دوئی سے کیا فائدہ جس نے اس کی پہچان چھین لی تھی...... اس کا رنگ روپ بھی وہ نہ رہنے دیا تھا جو الطاف سے رشتہ ہونے تک تھا۔ اب تو لوگ پوچھنے لگے تھے۔ ''آپ کو ہوا کیا ہے پہلے جیسی رنگت رہی نہ وہ تازگی۔'' وہ کام کی زیادتی کو اپنے چہرے کی تازگی اور شادابی متاثر ہونے کا بہانہ قرار دیتی مگر درحقیقت ایسا کب تھا۔

الطاف کے رشتہ دینے پر جب اس نے امی کو جلدی جلدی معاملات نمٹاتے دیکھ کر نایاب باجی سے کہا تھا۔ ''امی کو اتنی جلدی کیا ہے؟'' تو امی نے جو سوئے اتفاق اسی وقت کسی کام سے اس کے کمرے میں آئی تھیں اس کی یہ بات سن کر تیوری پر بل ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

''اس عمر میں تو میں چار بچوں کی ماں بھی بن چکی تھی...... اچھے رشتے مقدر سے ملتے ہیں...... میں بھی پرنسپل نہ سہی ٹیچر تو تھی ہی...... خوب صورت بھی تھی...... مگر دیکھ لو قسمت کہاں بندھی تھی...... کیا تھا تمہارے باپ کے پاس...... تعلیم نہ دولت...... باہر چلے بھی گئے تو کیا بے چارے رہے تو مزدور ہی...... ساری زندگی مجھے اکیلے ہی زندگی کے معاملات سے نمٹنا پڑا...... مرد سر پر نہ ہونے کے باعث گھر کے اندر باہر سارے کام اکیلے ہی کرنا پڑتے...... کیسی کیسی باتیں نہیں بناتے تھے لوگ...... مرد مضبوط ہو تو اس کی عورت کی طرف لوگ دیکھنے کی بھی جرأت نہیں کر پاتے اور مرد مضبوط ہوتا ہے اپنے معاش سے...... پیسے سے۔'' امی کے لہجے میں کرب تھا۔

''امی ٹھیک کہتی ہیں حجاب۔'' نایاب باجی نے تائید کی۔

''اس سے پوچھو جلدی کیوں نہ کروں...... دیر کس لیے کرنا چاہتی ہے یہ؟'' امی کا روئے سخن نایاب باجی کی جانب تھا لیکن درحقیقت خطاب اسی سے تھا۔ ''ہم جیسے لوگوں کی بیٹیوں کی تو جوانی بھی مختصر ہوتی ہے خوب صورتی بھی مہمان...... نوکری جس کا زعم ہوتا ہے لڑکیوں کو قید محسوس ہونے لگتی ہے...... اللہ نہ کرے چار چھ سال اور باہر دھکے کھانے پڑے تو آئینہ بھی پہچاننے سے انکار کر دے گا اور آنے والے بھی اس گھر کا راستہ بھول جائیں گے۔'' زمانے کی سختیاں دیکھی ہوئی امی کے لہجے میں تلخی بھی تھی، کرب بھی۔

''امی غلط نہیں کہہ رہی ہیں۔'' نایاب باجی نے امی کی پھر تائید کی۔

''غلط میں بھی نہیں کہہ رہی ہوں باجی۔'' اس نے کہا۔

''انکار کی وجہ؟'' نایاب باجی نے اسے بڑی عجیب سی نگاہوں سے دیکھا تھا۔ توہینِ ذات کے احساس سے اس کا رُواں رُواں سلگنے لگا...... وہ لوگ جن کے سامنے وہ کھلی کتاب کی طرح رہی تھی اس کی مشکل سمجھنے کے بجائے اسے شک سے دیکھ رہے تھے۔

''میں نے انکار تو نہیں کیا۔'' اس نے پورے شدومد سے کہا۔

''تو پھر؟'' وہ خود کو ہیجان سے دوچار پانے لگی۔

''بولو۔'' نایاب باجی نے تقاضا کیا۔

''کیا بولوں؟''

''انکار کی وجہ بتاؤ۔'' امی نے کہا۔

''اوہو، امی میں انکار نہیں کر رہی ہوں۔'' اس نے اپنا سر ہاتھوں سے تھامتے ہوئے کہا۔

''الجھی ہوئی تو ہو۔'' نایاب باجی بولیں۔

''ہاں۔'' اس نے اقرار کیا۔ ''پتا نہیں کیوں...... میرے دل پر وحشت سی ہے...... جب سے یہ سلسلہ چھڑا ہے میرا دل پریشان ہے...... ڈر سا لگ رہا ہے مجھے۔''

''کوئی سولہ سال کی لڑکی نہیں ہو تم...... نایاب کی ہوئی، اس نے تو کسی ڈرور کا ڈراما نہیں کیا۔''

اسے امی بڑی بے رحم سی لگیں۔

''میں بھی کوئی ڈراما نہیں کر رہی ہوں۔'' اس نے ناگواری سے کہا۔

''یہ ڈراما نہیں تو اور کیا ہے...... ہوتی کوئی اور لڑکی تو اتنا اچھا رشتہ آنے پر شکرانے کے نفل پڑھتی۔''

اپنے اور امی کے درمیان رابطے کا فقدان محسوس کرتے ہوئے اس نے پھر نایاب باجی کو اپنی مشکل سمجھانے کی کوشش کی۔ ''جب گھر میں ان لوگوں کا ذکر ہوتا ہے تو میرا جی چاہتا ہے...کہیں بھاگ جاؤں۔''

''کہاں جاؤ گی بھاگ کر؟'' امی کا لہجہ زہر میں بُجھا تھا۔

اسے سخت کوفت ہوئی۔ وہ کیا کہنے کی کوشش کر رہی تھی اور امی کیا سمجھ رہی تھیں۔

''آپ میری بات کیوں نہیں سمجھ رہیں امی!'' وہ گڑگڑا کر بولی۔

''میں سب سمجھتی ہوں۔'' امی نے اسے زہر خند نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اپنے ہاتھ سے سر کے بالوں کو چھُوا۔ ''یہ بال میں نے دھوپ میں سفید نہیں کیے ہیں...... تمہارے بعد ایک اور ذمے داری بھی بیٹھی ہے میرے سر پر...... تم سے فارغ ہولوں تو اس کی بھی سوچوں......'' امی کی مُراد رباب سے تھی۔ ''ساٹھ سال کی عمر ہوچکی میری...... کتنا اور جی لوں گی۔''

''پلیز امی ایسی باتیں نہ کیا کریں۔'' نایاب باجی بھی ہول گئیں۔

حجاب کا دل بھی بھر آیا...... امی کو تو وہ اپنی متاعِ حیات سمجھتی تھی۔

''میں غلط کہہ رہی ہوں تو کہو۔'' امی نے کہا۔

''آپ فکر نہ کریں سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' نایاب باجی نے امی کو تسلی دی اور اپنا ہاتھ حجاب کے شانے پر رکھتے ہوئے بولیں۔ ''مان جائے گی یہ بھی۔''

''مناؤ......'' امی نے طنز سے کہا اور کمرے سے چلی گئیں۔

''مسئلہ کیا ہے؟'' امی کے جانے کے بعد نایاب باجی نے قدرے تشویش سے پوچھا۔

''پتا نہیں۔'' وہ خود تذبذب میں تھی۔ ''میری چھٹی حس جیسے کہتی ہے کہیں کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔''

''اللہ پر بھروسا رکھو...... امی اور ہم سب لوگ تمہارا بُرا تو نہیں چاہیں گے ناں...... کیوں؟''

''میں جانتی ہوں۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔

''بس تو اپنے دل سے ہر وہم کو نکال پھینکو۔'' مگر وقت نے ثابت کیا کہ کبھی کبھی دل کی آواز پر کان دھرنا بھی بہت سی مصیبتوں سے بچالیتا ہے۔

کاش امی نے جلدی نہ کی ہوتی۔ الطاف کے بارے میں خاطر خواہ چھان بین کرالیتیں...... شاید کسی ذریعے سے اس کا شادی شدہ ہونا کھُل جاتا...... اس کے جھوٹ کا پتا چل جاتا...... جو آدمی جھوٹا ہو اس میں اور بھی کئی عیب ہوتے ہیں۔ الطاف کے عیوب بھی دھیرے دھیرے کھل رہے تھے...... کوئی شریف آدمی تو اس قسم کی حرکت نہیں کرتا جیسی اس نے صبح اس کے اسکول جاتے وقت راستے میں کی تھی...... چہرے پر تیزاب پھینکنے کی

دھمکی اور گولی مار کر بھیجا باہر نکال دینے کا ڈراوا۔ حجاب کو یقین تھا کہ اس کے موبائل فون پر رانگ کالز بھی اسی نے کروائی تھیں۔ صبح والے واقعے کا امی سے تذکرہ کر کے وہ انہیں مزید پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی مگر اس کا دل ڈر رہا تھا کہ الطاف کا اگلا قدم خدا جانے کیا ہوگا۔

☆☆☆

تسنیم نے خائف نظروں سے چہار اور دیکھا...... اس گھر کی مکین بنانے کے خواب دکھاتے دکھاتے مدثر اسے کتنی دور لے گیا تھا...... کمرے میں موت کا سا سناٹا تھا...... باہر سے بھی کوئی آواز نہیں تھی...... جیسے سانپ سونگھ گیا ہو...... خدا جانے یہ اہلِ خانہ میں سے کس کا کمرا تھا جس میں لا بٹھایا گیا تھا...... بیڈ پر بچھی چادر شکن آلود تھی اور اس کے دل میں لحظہ بہ لحظہ گہری پڑتی شام کی تیرگی کا سا احساسِ درماندگی درد انگیز...... ثریا اس کے ساتھ آئی تھی...... شاید گرمی زیادہ تھی یا اندر گھٹن...... بہت حلق خشک ہونے پر اس نے ثریا سے آہستگی سے کہا۔ ''بھابی ایک گلاس پانی مل سکتا ہے؟'' ثریا پانی لینے کے لیے کمرے سے باہر چلی گئی تھی...... اسے تنہائی سے خوف آرہا تھا...... کمرے کے در و دیوار سے عجب وحشت برس رہی تھی...... اس گھر میں اسے یوں لایا گیا تھا جیسے کسی میت کو دفنانے کے لیے قبرستان لایا جاتا ہے...... جس کار میں وہ اپنے گھر سے رخصت ہو کر یہاں آئی تھی اس میں اگلی نشست پر مدثر بھی بیٹھا تھا...... سلک کا کرتہ شلوار پہنے، سر پر عنابی زرتار کلاہ باندھے اور گلے میں سرخ گلابوں کا ہار ڈالے۔

ایک ہی گاڑی میں سفر کرتے ہوئے مگر ریل کی پٹڑیوں کی طرح کبھی مل نہ سکنے کے خیال سے اس کا دل رو دیا...... کیا، کیا تھا گاڑی کی اگلی نشست پر بیٹھے اس شخص نے اس کے ساتھ۔ زندگی ملیامیٹ کر کے رکھ دی تھی...... اب اس کے لیے تو چہار سو اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

گاڑی میں عقبی نشست پر وہ درمیان میں بیٹھی ہوئی تھی۔ مدثر کی ممی اس کے دائیں جانب اور ثریا بائیں جانب...... پہلی مرتبہ اسے احساس ہوا کہ انسانوں کے جسم زبان کی طرح قوتِ گویائی تو نہیں رکھتے مگر اپنے محسوسات کا اظہار کرتے ہیں۔ مدثر کی ممی کا بایاں پہلو اس کے دائیں پہلو سے مَس ہو کر راستے بھر عجیب سا احساس دیتا رہا...... ناگواری...... ناپسندیدگی...... اور ناقبولیت کا احساس! راستے بھر وہ اس احساس سے بچنے کے لیے اپنے دائیں پہلو کو بار بار سکیڑتی، سمیٹتی رہی۔

گاڑی پورچ میں رکی تو کسی نے اس کا سواگت نہیں کیا۔ گاڑی سے اترتے ہوئے ثریا نے اسے اپنا ہاتھ دیا۔ ثریا کا ہاتھ تھامے وہ گھر کے اندر داخل ہوئی تو اس نے مدثر کی ممی کو ثریا سے بس اتنا کہتے سنا۔ ''اُدھر...... اس کمرے میں۔'' ثریا اسے ایک کمرے میں لے آئی...... اسے پیاس لگ رہی تھی...... مجبوراً ثریا سے پانی مانگنا پڑا۔

اس کے دل میں نہ جانے کیوں اب تک یہ خوش فہمی اٹکی ہوئی تھی کہ مدثر آکر اس سے اپنے کیے پر ندامت کا اظہار کرے گا۔ ثریا کی آہٹ پر اس کا دل بری طرح دھک دھک کرنے لگا...... شاید وہی آیا ہو...... مگر ثریا کو دیکھ کر اس کی ساری خوش فہمی کافور ہوگئی۔

''توبہ، توبہ ایسے خسیس لوگ ہیں، پانی تک نہیں رکھا کمرے میں۔'' ثریا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

بات خست کی نہیں عدم قبولیت کی تھی...... جب آپ کسی شخص کو کسی بھی حوالے سے قبول ہی نہیں کرنا چاہیں تو

اس کے لیے کسی سہولت، کسی اہتمام کی حاجت کب رہتی ہے۔

ثریا نے اسے جگ سے گلاس میں پانی انڈیل کر دیا اور کمرے میں پڑی ایک بیڈ روم چیئر پر بیٹھ کر کمرے کا ناقدانہ نگاہوں سے جائزہ لینے لگی۔ ''اتنی توفیق بھی نہ ہوئی کہ بستر پر نئی چادر ہی بچھا دیتے۔'' ثریا نے کہا۔

پانی کا گلاس منہ سے لگائے تسنیم کی نگاہیں ثریا کی نظروں سے ملیں۔ وہ اسی کو دیکھ رہی تھی۔

''دیکھا تم نے ...... یہ ہوتا ہے ایسی باتوں کا انجام۔'' ثریا نے کہا۔ تسنیم نے نظریں چرا لیں ...... مگر نظریں چرانے سے خلاصی کب ہونا تھی ...... ثریا ان لوگوں میں سے تھی جو لگی لپٹی نہیں رکھتے ...... کھری اور دوٹوک!

وہ بیڈ روم چیئر سے اٹھ کر اس کے پاس آ بیٹھی۔ ''اس گھر میں تم اپنے اور اس گھر کے بڑوں کی مرضی سے عزت سے رخصت ہو کر آئی ہوتیں تو اس کمرے میں رنگ و روغن بھی نیا ہوتا ...... فرنیچر بھی نیا ...... پردے بھی نئے پڑے ہوتے اور بستر پر چادر بھی نئی بچھی ہوتی ...... گھر والے کمرے کو سجاتے بھی اور چھت گیری بھی لگواتے۔ تم دلہن بنی پھولوں کی سیج پر بیٹھی ہوتیں اس وقت اور وہ مدثر ...... جو کمبخت گاڑی سے اترتے ہی نہ جانے کہاں اُڑنچھو ہو گیا اس وقت تمہارے اردگرد چکر کاٹ رہا ہوتا ...... منتظر ہوتا کہ کب دلہن کو اکیلا چھوڑا جاتا ہے ...... خبیث مردود ...... شیطان کہیں کا ...... اسی لیے کہتے ہیں لڑکیوں کو بہت سنبھل کر چلنا چاہیے ...... اس کا کیا بگڑا ...... نہادھو کر پوتر پاک ...... ماری تو تم گئیں ناں ...... یا پھر تمہارے گھر والے ...... تمہارا بچہ بھی جب بڑا ہوگا تو کہے گا ...... اماں تم نے ایسا کیوں کیا تھا ......؟'' تسنیم نے بے ساختہ گھائل نگاہوں سے ثریا کو دیکھا۔

''ہاں ...... غلط تھوڑی کہہ رہی ہوں میں ...... ارے بھئی بچے کو تو ماں اور باپ دونوں ہی کی ضرورت ہوتی ہے ناں ...... باپ مر جائے تو اور بات ہے لیکن جب وہ اسے زندہ دیکھے گا تو تمہارا ہی گریبان پکڑے گا ...... تم دیکھ لو ابھی سے کیا حشر ہو رہا ہے تمہارا ...... مدثر کی اماں آخر خود بھی تو اپنے ماں باپ کے گھر سے رخصت ہو کر شوہر کے گھر آئی ہوں گی ...... تو کیا انہیں نہیں پتا کہ بہو کا استقبال کیسے کیا جاتا ہے ...... نئی دلہن کی کیسی کیسی خاطریں ہوتی ہیں ...... کتنے ناز اٹھائے جاتے ہیں ...... کم سے کم ایک پلیٹ میں مٹھائی اور ایک گلاس دودھ ہی رکھ دیتیں اس کمرے میں ...... مگر تم کون سی اس گھر کی بہو بن کر آئی ہو ...... اس گھر سے تو تمہارا رشتہ تمہارے یہاں آنے سے پہلے ہی ختم ہو چکا۔''

تسنیم کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

''رونے سے کوئی فائدہ نہیں ...... مگر ہے اب زندگی بھر کا رونا ...... اسی لیے کہتے ہیں لڑکیوں کو بہت سنبھل کر چلنا چاہیے ...... بڑے سمجھاتے ہیں تو لڑکیاں ناک بھوں تو بہت چڑھاتی ہیں مگر سمجھ جائیں تو بُرے وقتوں سے بچ جائیں ...... کوئی کوئی ہوتی ہے مقدر کی دھنی جو پار لگ جاتی ہے ورنہ ہم نے تو اپنی مرضی کرنے والی لڑکیوں کا انجام بُرا ہی ہوتے دیکھا ہے ...... اور بھئی وہ بھی جو مقدر کی دھنی ہو کر پار لگ جاتی ہیں ان کا اپنا ضمیر تو انہیں کچوکتا ہو گا ناں ...... اللہ جانے آئینے میں اپنا سامنا کیونکر کر پاتی ہوں گی۔''

تسنیم نے لاکھ ضبط کرنے کی کوشش کی مگر اس کے منہ سے سسکار نکل گئی۔

''بس چپ کر جاؤ ......'' ثریا نے اس کے آنسو اسی کے پلو سے پونچھتے ہوئے کہا۔ ''یہاں میرے سوا کوئی نہیں تمہارے آنسو دیکھنے والا۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''ہیں ...... ہیں! آہستہ! وہ لوگ سمجھیں گے خوامخواہ رونا پیٹنا ڈال رہی ہے۔ بس رات ہی تو گزارنی ہے۔

صبح تم اپنے گھر اور میں اپنے گھر ......'' اسے اپنی سسکیاں سینے میں گھونٹنے میں کچھ دیر لگی۔

''چچ ...... چچ! آنٹی کا چہرہ بار بار یاد آ رہا ہے مجھے ...... ایمان سے ایسے ہو رہا تھا جیسے مُردہ! ماں باپ بے چارے تو ایسے واقعات سے جیتے جی مر جاتے ہیں ...... اللہ جانے لڑکیاں اتنی بے صبری کیوں ہوتی ہیں ...... بھئی شادی تو ہونا ہی ہوتی ہے ایک نہ ایک دن ...... بڑوں کی مرضی سے عزت کے ساتھ ہو جائے تو اچھا ...... لڑکی سسرال میں بھی بھاری رہتی ہے ...... یہ جو اپنی مرضی سے یا ماں باپ کے گھر سے بھاگ کر جانے والی لڑکیاں ہوتی ہیں انہیں سسرال میں وہ عزت کبھی نہیں ملتی جو عزت سے بیاہ کر آنے والی کو ملتی ہے ...... اللہ سے توبہ کر کے کہتی ہوں اپنی سسرال میں میری وہ عزت ہے کہ کیا بتاؤں ...... یہ جو مدثر کے چھوٹے بھائی کی بیوی ہے لاکھ اچھا کھائے پیے، لاکھ سونے میں پیلی دکھائی دے سسرال والوں کی نظروں میں اس کی وہ عزت تو نہیں دِکھتی جو گھر کی بہو کی ہونی چاہیے ...... مگر خیر ...... وہ اس گھر میں بس تو گئی ...... تمہارے ساتھ تو یہ بھی نہیں ہوا۔'' ثریا جو ٹیپ ریکارڈر میں لگی کیسٹ کی طرح مسلسل آن تھی جمائی لیتے ہوئے بستر پر لیٹنے کے درپے ہوئی۔ ''بھئی مجھے تو اب آ رہی ہے نیند ...... تم بھی سو جاؤ ...... بیٹھے بیٹھے کمر بھی تختہ ہو گئی ہو گی تمہاری ...... بتی بجھا دوں؟''

''اگر آپ کو کوئی پرابلم نہ ہو تو کھلی رہنے دیں ...... مجھے اندھیرے سے ڈر لگے گا۔''

''ذرا سوچو تو ...... عزت سے بیاہ کر آئی ہوتیں تو ڈر لگتا تمہیں۔'' ثریا کوئی وار خالی نہ جانے دیتی تھی مگر جو کچھ اس نے کہا تھا وہ کیا غلط تھا۔ ایک سرد آہ مرغِ بسمل کی صورت تسنیم کے سینے میں پھڑپھڑائی۔

''بھابی! دروازے کا لاک چڑھا دوں؟'' اس نے آہستگی سے نمناک آواز میں پوچھا۔

''مرضی ہے تمہاری۔''

وہ دبے پاؤں اٹھی اور اس نے دروازہ اندر سے لاک کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ثریا کے خراٹے کمرے میں گونجنے لگے۔ تسنیم کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور اور کان دروازے پر لگے تھے ...... ایک آس تھی کہ ...... دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر مدثر کہے گا ...... ''میں ہوں مدثر ......'' وہ نہ چاہتے ہوئے بھی دروازہ آہستگی سے کھول دے گی ...... مدثر سر جھکائے کہے گا ...... ''سوری تسنیم ...... بہت بڑی غلطی ہو گئی مجھ سے۔''

ڈھائی تین بجے کے لگ بھگ ثریا نے ذرا کی ذرا آنکھ کھولی اور اسے جاگتے دیکھ کر کہا۔ ''تم سوئی نہیں؟''

''نیند ہی نہیں آ رہی۔''

''نیند آئے گی بھی کیسے؟'' ثریا نے یہ کہتے ہوئے کروٹ لی اور دوبارہ سو گئی۔ رات بھر نیند اس کی آنکھوں سے دور رہی۔

صبح دس بجے تک ناشتے پانی کا کچھ پتا نہیں تھا۔ ثریا صبح سویرے جاگ کر گھر کے دو چکر لگا چکی تھی۔ دوسرا چکر لگانے کے بعد کمرے میں واپس لوٹنے پر اس نے کہا۔ ''سب پڑے سو رہے ہیں ...... تم آزما لینا ...... یہ جو گندے، منحوس لوگ ہوتے ہیں نا یہ دیر تک پڑے سوتے رہتے ہیں ...... اللہ کے نیک بندے تو اسے یاد کرنے کے لیے صبح سویرے اٹھ جاتے ہیں۔''

''چھٹی کا دن ہے ناں بھابی۔''

''چھٹی کا دن ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ مسٹنڈے پڑے اینڈتے رہیں ...... اللہ کو تو ہر روز یاد کیا جاتا ہے ...... پتا نہیں کب آئیں گے تمہارے گھر والے تمہیں لینے کے لیے ...... ہمارے ہاں تو بھائی آیا کرتے ہیں

ناشتا لے کر...... مگر تمہارا بھائی تو بے چارہ دور...... ویسے اسے پتا تو ہوگا؟''

''نہیں...... تقدیم آپی بتا رہی تھیں...... مونس کو نہیں بتایا گیا۔''

''چلو اچھا ہی ہوا...... کون سی ایسی کوئی خوشی کی بات ہے جو بتانا ضروری ہوتی۔ بھائی بے چارہ شرمندہ ہوتا...... اچھا بھئی میں تو چائے بنانے جا رہی ہوں...... یہ منحوس مارے تو پتا نہیں کب اٹھیں گے...... اپنا تو یہ حال ہے کہ صبح جب تک ایک پیالی چائے نہ پی لوں گاڑی کو گیئر ہی نہیں لگتا۔''

''مجھے اکیلے ڈر لگے گا بھابی۔''

''ذرا سوچو...... تم اس گھر میں سچ مچ بہو بن کر آئی ہوتیں تو ڈر لگتا تمہیں؟ ارے بھئی تمہارا اپنا گھر ہوتا...... یہیں جینے یہیں مرنے والا حساب...... مگر تم نے خود اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری۔'' ثریا نے پھر موقع جانے نہ دیا۔

''ہاں...... ہاں بھابی......'' وہ روہانسی ہو کر بھرّائی ہوئی آواز میں بولی۔'' آپ جو کہہ رہی ہیں ٹھیک کہہ رہی ہیں...... میں نے غلطی کی...... اپنے پیروں پر آپ کلہاڑی ماری لیکن اس نے تو میرے ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیے...... ساری زندگی بھی ان ٹکڑوں کو جوڑتی رہوں گی تو نہ جوڑ پاؤں گی...... میں نے غلطی کی مگر اس نے ظلم کیا ہے۔''

''ظلم کبھی پنپا ہے جو وہ پنپ لے گا۔'' ثریا نے کہا اور چائے بنانے چلی گئی۔ تسنیم سر نیہوڑائے بیٹھی رہی۔ آنسو اس کی گود میں گر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ثریا چائے کی دو پیالیاں لیے واپس آئی۔ ایک اس نے تسنیم کی طرف بڑھائی۔

''نہیں بھابی...... دل نہیں چاہ رہا۔''

''ارے بھئی پیو...... کھانا پینا تو اپنے کسی بہت پیارے کے مر جانے پر بھی نہیں چھُوٹتا۔''

تسنیم کی آنکھوں میں جل تھل سی مچ گئی۔ کیسے بتاتی وہ ثریا کو کہ یہ اس کے لیے کسی بہت پیارے کی موت سے بھی بڑھ کر موت تھی۔

''یہ تو زندگی بھر کا رونا ہے بھئی۔'' ثریا نے یہ بات دوبارہ کہی مگر اس بار قدرے دلسوزی سے۔

سوا گیارہ بجے کے لگ بھگ کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور تسنیم کا دل بے مہار دھڑکنے لگا۔ ثریا نے دروازہ کھولا۔ باہر ہی باہر سے کسی نے ناشتے کی ٹرے ثریا کو پکڑا دی۔

''آئیں آنٹی اندر آجائیں۔'' تسنیم نے ثریا کو کہتے سنا۔

''نہیں...... بس ٹھیک ہے۔'' سرد لہجے میں کہا گیا۔ ثریا ٹرے لیے واپس پلٹی اور ٹرے میز پر رکھ کر میز آہستگی سے بیڈ کے نزدیک کھینچا۔ چائے، بریڈ، آملیٹ اور مکھن۔

''تمہاری ساس تھیں۔'' ثریا نے بتایا۔''خود ناشتا دے گئی ہیں لگتا ہے نوکرانی سے بھی پردہ رکھا گیا ہے۔''

اس کے دل پر دھموکا سا پڑا۔

کیا اس گھر میں وہ کسی سے کوئی رشتہ رکھنے کا دعویٰ کرسکتی تھی! ثریا کے اصرار کے باوجود اس نے ناشتے کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔

''سمجھ گئی۔'' ثریا نے کہا۔''جس گھر نے تمہیں عزت نہیں دی...... خوشی نہیں دی...... تم اس گھر کا نمک بھی نہیں چکھنا چاہتیں۔''

ساڑھے گیارہ بجے کے لگ بھگ دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔ ثریا نے آنے والے سے دروازے پر کھڑے کھڑے بات کی پھر مڑ کر اس کی طرف آتے ہوئے بتایا۔

''تمہارے گھر والے آگئے ہیں...... مدثر کی بھاوج آئی تھی بتانے کے لیے...... چلو...... اٹھو بس ایسے ہی اور اتنا ہی وقت لکھا تھا تمہارے نصیب میں اس گھر کا۔'' ثریا کے الفاظ تھے یا نشتر!

تسنیم کو لگا رنج کی شدت سے اس کا دل پھٹ جائے گا۔ ثریا کے ساتھ وہ لاؤنج میں پہنچی تو ابا، تقدیم اور ایک ناشناسا مرد کو لاؤنج میں بیٹھے دیکھا۔ تقدیم نے اٹھ کر اسے پیار کیا۔ اس کا دل بھر آیا اور تقدیم کی آنکھیں۔ اہلِ خانہ میں سے کسی کو ان کے ساتھ بیٹھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ آخر کار ثریا خود ہی اٹھی۔ ''میں بلاتی ہوں کسی کو۔''

کچھ دیر بعد مدثر کی والدہ قدرے کھنچی کھنچی سی کمرے میں آئیں اور بڑی سرد مہری سے سلام کر کے بیگانگی سے ایک طرف بیٹھ گئیں۔

''بہن آپ خیریت سے ہیں؟'' ابا نے پوچھا۔

''ہاں...... بس اللہ کا شکر ہے۔''

''مدثر کی والدہ۔'' تقدیم نے اویس انصاری کو بتایا۔

''فائن!'' اویس انصاری نے کہا پھر روئے سخن مدثر کی ممی کی طرف کرتے ہوئے بولا۔ ''خاتون! بہتر ہوگا میں اپنا تعارف کرادوں...... میرا نام اویس انصاری ہے...... ان کا وکیل ہوں میں۔'' اس نے تسنیم کی طرف اشارہ کیا۔

مدثر کی ممی ہی نہیں ثریا بھی بے اختیار چونکی...... وکیل کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی!

''میں چاہوں گا کہ ہماری اس نشست میں آپ کے صاحبزادے مدثر صاحب اور اگر آپ لوگ ضرورت محسوس کریں تو ان کے والد صاحب بھی موجود ہوں۔''

''مجھ سے بات کریں۔'' مدثر کی ممی نے اکھڑ انداز میں کہا۔

''سوری! مجھے آپ سے نہیں اپنی مؤکلہ کے سابقہ شوہر سے بات کرنی ہے کیونکہ اہلِ معاملہ وہی ہیں...... ہمیں معاملات انہی سے طے کرنے ہیں۔''

''کیسے معاملات؟'' مدثر کی ممی نے ابرو چڑھائی۔

''یہ میں ان کے سامنے ہی بتاؤں گا...... بار بار دُہرانا میرے وقت کا زیاں بھی ہوگا آپ کے وقت کا بھی۔''

''مدثر گھر میں نہیں ہے۔'' مدثر کی ممی نے ناگواری سے کہا۔

''ٹھیک ہے...... ہم پھر آجائیں گے...... میں آپ کو اپنا کارڈ دیے دیتا ہوں۔ مدثر صاحب گھر پر آئیں تو میری بات کرادیجیے گا ان سے...... میں ان سے وقت طے کر کے آؤں گا۔'' اویس انصاری نے اپنی جیب سے والٹ اور والٹ میں سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر تقدیم کی طرف بڑھایا۔ تقدیم نے کارڈ مدثر کی ممی کی جانب بڑھا دیا۔

''میرا خیال ہے چلا جائے۔'' اویس انصاری نے ابا اور تقدیم کو دیکھا۔ ابا اور تقدیم نے اٹھنے کا قصد کیا...... ثریا نے تسنیم کو دیکھا۔ وہ بھی اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

''تسنیم صاحبہ! آپ پورے اطمینان سے یہاں رہیں۔ علاقے کے تھانے کو میں اطلاع کرتا ہُوا جاؤں گا کہ آپ اپنے سابقہ شوہر کے گھر میں ہیں۔''

''آ...... آپ...... ساتھ...... لے کر جائیں ناں۔'' مدثر کی ممی نے ہڑبڑا کر ابا کو دیکھا۔

''جی نہیں ......'' اویس انصاری نے کہا۔ ''میری مؤکلہ یہیں رہیں گی ...... اسی گھر میں۔''

''کیا مطلب؟''

''میرا خیال ہے میں بہت سہل اردو بول رہا ہوں۔'' اویس انصاری نے کہا پھر ایک، ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے مزید کہا۔ ''میری مؤکلہ اپنی عدت مکمل ہونے تک اسی گھر میں رہیں گی۔''

مدثر کی ممی کی ہڑبڑاہٹ دیدنی تھی۔ ''یہ ...... یہ کیسے ممکن ہے؟'' انہوں نے ناگواری سے کہا۔

''بات ممکن یا ناممکن کی نہیں ...... شرعی حکم کی ہے۔''

ثریا محوِ حیرت دم بخود سن رہی تھی۔

''ایک منٹ ...... ایک منٹ ......'' مدثر کی ممی نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں ...... میں مدثر کے ڈیڈی کو بلاتی ہوں۔'' انہوں نے تیزی سے دروازے کا رخ کیا۔

''ایکسکیوز می!'' اویس انصاری نے ان کی عجلت پر اپنے ہاتھ کے اشارے سے بریک لگانے کی کوشش کی۔ ''انہیں تکلیف نہ دیں ...... مدثر صاحب کی موجودگی ان کے والد صاحب کی موجودگی سے زیادہ ضروری اور اہم ہے ...... کوئی بات نہیں، ہم دوبارہ آجائیں گے۔''

''میں ...... دیکھتی ہوں ...... شاید ...... شاید وہ آگیا ہو ...... بیٹھیں ...... آپ بیٹھیں ......'' مدثر کی ممی کا وہ کچھ دیر پہلے کا طمطراق، وہ فرعونیت نہ جانے کہاں رفو چکر ہو چکی تھی۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتی وہ لاؤنج سے راہداری میں نکل گئیں۔

اویس انصاری، تقدیم، ابا، تسنیم اور ثریا کی نظریں باہم ملیں اور ثریا چوکنی ہو کر اویس انصاری کو یوں دیکھنے لگی جیسے وہ کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ہو۔

''آپ کی تعریف؟'' اویس انصاری نے ثریا کی بابت تقدیم سے پوچھا۔ اس سے پہلے کہ تقدیم اسے کچھ بتاتی ثریا نے کہا۔ ''تعریف اس خدا کی جس نے آپ کو بنایا وکیل صاحب۔''

''آداب!'' اویس انصاری نے اپنا دایاں ہاتھ پیشانی تک لے جا کر کہا۔

''ایمان سے تھوڑی دیر کو تو آپ نے دل خوش کر ہی دیا ...... ایسے لوگوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔'' ثریا نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر رازدارانہ انداز میں بولی۔ ''ویسے یہ دھمکی اچھی دی ہے آپ نے کہ تسنیم عدت تک یہیں رہے گی۔''

''یہ دھمکی نہیں ...... حقیقت ہے۔'' اویس انصاری نے کہا۔ ''حقیقت میں ایسا ہی ہوگا۔''

''اچھا جی!'' ثریا کی حیرانی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

''ہاں جی۔'' اویس انصاری نے کہا۔

''مگر ...... میں ...... میں ...... یہاں ...... نہیں رہ سکتی۔'' تسنیم جسے تقدیم نے اس اقدام کے سلسلے میں اعتماد میں لے رکھا تھا اٹکتے ہوئے بولی۔

''آپ کے لیے یقیناً مشکل ہوگا ...... لیکن یہ ضروری ہے۔'' اویس انصاری نے کہا۔

تسنیم مذبذب دکھائی دینے لگی۔

کچھ ہی دیر بعد مدثر اور اس کے والدین مزاحمتی تیوروں کے ساتھ لاؤنج میں تھے۔

(باقی آئندہ)

چاندسی بہو

رابعہ نیازی



''جلدی کھاؤ بیٹا! ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ تم نہ جانے کن سوچوں میں گم بیٹھے ہو۔'' اماں نے میرے چہرے سے یقیناً اندازہ لگا لیا تھا کہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میں نے آں ہاں کر کے ناشتے پر توجہ دی۔ ناشتا بلاشبہ بہت لذیذ تھا۔ میں نے بھرپور طریقے سے انصاف کیا اور پھر ہاتھ صاف کر کے تمام تر ہمت کو جمع کرنے لگا۔

''اماں! وہ مجھے آپ سے کچھ کہنا تھا۔'' میں نے

لڑکھڑاتی زبان کے ساتھ بات کا آغاز کیا تو اخبار پر سے تصویریں دیکھتی اماں نے سر اٹھایا۔

''اماں وہ میں کہنا چاہتا تھا کہ......'' زبان اس سے آگے کچھ بول ہی نہ پا رہی تھی۔ ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا پچھلے کئی دنوں سے میری شادی کے چرچے گھر میں گونج رہے تھے۔ میں جب بھی اس سلسلے میں بات کرنے آتا تو پچھلے کئی گھنٹوں سے ترتیب دیے جملے ذہن سے اُڑن چُھو ہو جاتے یا زبان ہی تالو سے چپک جاتی۔ کومل کے بارے میں بتانا تو دور کی بات میں تو شادی کے ذکر سے ہی شرما جاتا۔ گھر کے ایک محدود ماحول میں اماں کی سادگی نے جو میری تربیت کی تھی وہ مجھے کچھ بھی کہنے سے روک دیتی۔

''ہاں تو بولو ناں بیٹا! کیا سوچنے لگتے ہو؟''

اماں میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو حیرت سے دیکھ رہی تھیں جبکہ میں ایک بار پھر ہمت ہار کے بازو جھٹک گیا۔

''اماں میں کہنا چاہ رہا تھا کہ آپ اپنی صحت کا خیال بالکل نہیں رکھتیں اور...... اور روز بہ روز کمزور ہوتی جا رہی ہیں۔'' میں نے لڑکھڑاتی زبان سے بات بنائی تو وہ کھلکھلا کر ہنس دیں۔

''اب میری عمر نہیں ہے ایسے چونچلوں کی اور نہ ہی جسم میں طاقت باقی ہے کہ اپنے لیے کچھ کروں۔ بس اس کا بھی کچھ اور حل سوچ رہی ہوں۔'' وہ معنی خیزی سے کہتی ہوئی پھر سے فلمی دنیا کا صفحہ دیکھنے لگیں۔ میں جو موضوع بدلنے کے چکر میں تھا تو بات خود ہی میرے پسندیدہ موضوع پر آن ٹھہری تھی۔ ابھی میں پھر سے لب وا کرنے پر تیار ہوا تھا کہ مین گیٹ دھڑ ادھڑ بجنے لگا۔ میں بری طرح بدمزہ ہو کر گیٹ تک گیا۔ توقع کے عین مطابق ثروت آپا اور ندرت باجی اپنے تین اور چار بچوں کی ہمراہی میں تشریف کا ٹوکرا لا چکی تھیں۔ میں نے پھیکی سی مسکراہٹ سے ان کا استقبال کیا، جانتا تھا کہ یہ کس مہم کے تحت روز کا آنا جانا ہو رہا ہے مگر وہ دونوں میرے صدقے واری جاتے نہ تھکتیں۔ انہیں اماں کے پاس برآمدے میں چھوڑ کر خود آفس جانے کے لیے تیار ہونے لگا مگر کان مکمل طور پر برآمدے میں ہونے والی گفتگو پر لگے ہوئے تھے جو وقتاً فوقتاً سنائی دے جاتی۔

''اماں یہ میرے بس کا کام نہیں، میں نے تو بہت کوشش کی ہے مگر کوئی کام کی لڑکی نظر ہی نہیں آتی۔ ہاں کل میری سہیلی نے اپنی نند کا ذکر کیا ہے۔ تصویر میں تو بھلی معلوم ہوتی ہے۔'' ثروت آپا نے آخری جملے میں اپنی سمجھداری کی دھاک بٹھائی۔ ''اب آپ لوگ چل کر خود دیکھ لیں کہ کیسی لڑکی ہے۔ اتنا بڑا فیصلہ میں اکیلے تو نہیں کر سکتی ناں۔ اسی لیے میں ندرت کو بھی راستے سے ساتھ لیتی آئی۔ بس اب آپ جلدی سے تیار ہو جائیں۔''

''لڑکی دیکھنے میں تو اچھی تھی ناں...... ارے میں بتائے دے رہی ہوں۔ میرا تو اکلوتا بیٹا ہے، مجھے اس کے لیے خوب صورت لڑکی چاہیے بھلے اسے زیادہ کچھ آتا ہو یا نہ آتا ہو۔'' اماں نے صاف گوئی سے کہتے ہوئے نواسی کی پونی بنائی۔ بچوں نے سارے گھر کو سر پر اٹھا رکھا تھا۔ میں نے باتیں سننے کے لیے پورا سر کھڑکی میں دے دیا۔

''اماں کیوں فکر کرتی ہیں۔ لڑکی کمال چیز ہے دیکھنے میں۔ جمیلہ نام ہے اس کا اور اپنے نام کی طرح خوب صورت بھی ہے۔'' ثروت آپا نے چائے کے برتن سمیٹتے ہوئے کہا۔

''چلیں اماں بس جلدی سے تیار ہو جائیں۔ آپ کو تو پتا ہے میں دن بھر تو یہاں نہیں رک سکتی ناں! میری ساس کا فوراً منہ بن جاتا ہے۔'' ندرت باجی نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا دیا...... اور میں اپنی کم ہمتی کو ہزاروں صلواتیں سناتا آفس کے لیے نکل گیا۔

☆☆☆

''ارے چھوٹی، تم نے دیکھا کہ جمیلہ خود تو خوب صورت تھی ہی مگر اُن کے گھر میں ہر چیز خوب صورتی اور نفاست سے رکھی تھی۔ گھر کی خوب صورتی اپنی جگہ مثال تھی۔'' ثروت آپا جب سے واپس آئی تھیں ان لوگوں کی تعریفیں کرتے نہ تھک رہی تھیں۔

''اور آپا آپ کو پتا ہے چائے کے ساتھ کھانے کی تمام اشیا گھر میں بنائی گئی تھیں اور تمام کی تمام کتنی لذیذ اور ذائقے دار تھیں۔ اماں آپ کو کچن کے جھنجٹ سے نہ صرف نجات مل جائے گی بلکہ کچن کی آبادکاری، پُررونق اور ذائقے دار بھی ہو گی۔'' ندرت باجی بھی اپنے اعلیٰ بیان کے ذریعے ان کی ہمنوا ثابت ہوئیں، میں پودوں کو پانی دیتا کن انکھیوں سے ان سب کو دیکھ رہا تھا۔

''تم لوگ سب چھوڑو...... جمیلہ تھی کتنی خوب صورت، میرے عاقب کے ساتھ خوب جوڑی سجے گی۔'' اماں نے نہال ہو کر کہا تو میرے ہاتھ سے پانی کا برتن چھوٹ گیا مگر کسی کو میری فکر کہاں تھی سب اپنی کامیابی پر جھوم رہے تھے۔ فون کی گھنٹی تواتر سے بجی تو اماں نے خود ہی سننا مناسب سمجھا۔

''ارے سمدھن جی آپ...... بڑی عمر ہے آپ کی، ہم لوگ آپ کو ہی یاد کر رہے تھے۔'' اماں کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ جہاں ندرت اور ثروت آپا ان کے قریب ہوئیں وہیں میں بھی برآمدے کی کرسی پر آن بیٹھا۔

''جی، جی آپ حکم کریں جو آپ نے کہنا ہے!''

اماں نے دوسری طرف کی گفتگو سنتے ہوئے کہا۔

''کیا کہا بہن آپ نے؟'' نہ جانے انہوں نے کیا کہا کہ اماں کو شدید جھٹکا لگا تھا۔ ''یہ کیسی بات کر دی آپ نے، ایسا بھلا کیسے ممکن ہے؟''

''ارے نہیں تو نہ سہی، اب میں آپ کو اپنا بیٹا تو



گلِ علی، پنجاب

پاؤں کی لغزش سے سنبھلنا تو ممکن ہے لیکن زبان کی لغزش کا کوئی مداوا نہیں۔ ہمیں یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ پرندہ اپنے پروں سے اور انسان اپنی زبان سے پکڑا جاتا ہے۔ جب زبان بے لگام ہو جائے تو اس پر قابو پانا آدمی کے بس میں نہیں رہتا۔

مرسلہ: رقیہ، شکیلہ، اوچ شریف

نہیں دے سکتی ناں۔'' اماں نے غصے سے کہتے ہوئے فون پٹخ دیا۔

''کیا ہوا اماں؟'' ثروت آپا نے بہت بے چینی سے پوچھا۔

''ارے کوئی حال ہے لوگوں کا، جمیلہ کی ماں تھی۔ کہہ رہی تھی کہ بات آگے بڑھانے کا اگر سوچنا ہے تو یہ یاد رکھیے گا کہ عاقب ہمارا گھر داماد بنے گا۔ میری جمیلہ کو کسی اور جگہ کی عادت نہیں...... وہ نہیں جا سکے گی آپ کے گھر......'' اماں کا غصے سے برا حال تھا۔ جہاں سب کو بے چینی اور حیرت کے جھٹکے لگے وہاں میرے اندر سرتاپا سکون ٹھہر گیا۔

''یہ کیا فضول بات کی انہوں نے؟'' ندرت باجی انگشت بدنداں تھیں۔

''ہم نے بیٹے کے لیے بہو لانی ہے نہ کہ بیٹے کو

بیاہ کے بھیجنا ہے۔'' اماں نے فون سیٹ کو پرے دھکیل دیا جیسے وہاں جمیلہ کی اماں بیٹھی ہو۔

''شرم نہیں آئی انہیں ایسی بات کرتے ہوئے۔'' ثروت آپا بڑے افسوس سے بولیں۔ ابھی یہ افسوس رات بھر جاری رہنا تھا مگر میں مطمئن سا سیٹی کی دُھن پر گانا بجاتا اندر کمرے میں چلا گیا کیونکہ اب وہاں سننے کے لیے کچھ باقی نہ تھا۔

☆☆☆

خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا بس یہ میں ہی تھا جو کبوتر کی طرح آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ ابھی چند دن سکون کے نہ گزرے تھے کہ کسی آمنہ نامی موصوفہ کا ذکر گھر میں چکرانے لگا۔ خطرے کی گھنٹی زور شور سے سر پر بجنے لگی تھی۔ میں نے ایک بار پھر کوبل سے کیے عہدو پیماں کو دُہرایا اور کڑے دل سے بات کرنے کی ٹھانی۔

''اماں پھر کل صبح ہی آمنہ کی طرف چلیں گے۔ میں نے فون کر دیا ہے ان لوگوں کو۔'' اس بار نیا رشتہ ندرت باجی لے کر آئی تھیں اس لیے خاصی پُرجوش نظر آرہی تھیں۔ آمنہ ان کے سسرالی رشتے داروں میں کہیں تلاش کی گئی تھی۔ رات کا کھانا اسی تذکرے کے ساتھ جاری تھا کہ میں نے کھانا ختم کرتے ہی گلا کھنکھار کر بات کا آغاز کرنا چاہا۔

''باجی! کل آپ نے صبح جانا ہے ناں...... تو میں بتانا چاہ رہا تھا کہ کل آپ نہ جائیں۔'' مجھے اپنی آواز منحنی سی لگی۔

''ارے نہیں میرے بھائی، میں کل کہاں جارہی ہوں۔'' ندرت باجی تو نہال ہوگئیں۔ ''میں اپنی ساس کو بتا کر آئی ہوں کہ دو تین دن تو میکے میں گزاروں گی۔ آخر کو تمہارا رشتہ پکا کر کے ہی جانا ہے اس بار۔ بڑے ارمان ہیں تمہاری شادی کے۔'' ندرت باجی نے اٹھتے ہوئے لاڈ سے میرے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

''باجی یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ آپ......'' ابھی الفاظ میرے منہ میں ہی تھے کہ ندرت باجی کی زوں فی گلا پھاڑ پھاڑ کر رونے لگی۔ صحن میں گھٹنوں کے بل گری وہ اچھی خاصی زخمی ہوگئی تھی۔ سارے گھر میں ایک افتاد مچ گئی۔ میں اپنی بات منہ میں لیے ہی رہ گیا اور وہ سب اسپتال روانہ ہوگئے۔ ایک حسرت بھری سانس بھر کر میں نے اپنے سر کے بال مٹھی میں جکڑ لیے۔

☆☆☆

آمنہ کی تعریفوں کے پُل باندھے جانے کے بعد منگنی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ صحن میں محفل جمی تھی اور انگوٹھی اور کپڑوں کی خریداری کا پروگرام زیرِ بحث تھا۔ میں سارے گھر میں جلے پیر کے بلّے کے مانند چکراتا پھرتا تھا۔ میرے گھر والوں کی یہ خوشی بھی زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ جس روز منگنی کی انگوٹھی اور سامان آیا اسی روز آمنہ کی خالہ آگئیں۔

''ارے بھلی مانس چائے تو بہت مزے کی تھی۔ اب ذرا کچھ بات وات بھی ہو جائے۔'' انہوں نے اچھی طرح چائے سے لطف اندوز ہو کر پان چباتے ہوئے کہا۔

''خالہ بات تو سب طے ہو چکی ہے۔ ہم لوگ انشاء اللہ اگلے جمعہ کو آجائیں گے شام میں۔'' ندرت باجی کو کچھ زیادہ ہی جلدی تھی۔

''ارے بٹیا! کہاں سب کچھ طے ہے؟ ابھی اصل بات تو رہتی ہے۔'' انہوں نے پان کی پچکاری صحن کے بیچوں بیچ پھینکی۔ ''تمہیں تو پتا ہے کہ آمنہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی ہے۔ اس لیے وہ لوگ...... آمنہ کے مستقبل کی خاطر کچھ تسلی چاہتے ہیں۔'' انہوں نے اٹک اٹک کر اپنی بات مکمل کی۔

''کیسی تسلی بہن؟'' اماں نے بے حد حیرت زدہ

لہجے میں پوچھا۔

''آمنہ کی والدہ چاہتی ہیں کہ اگر آپ لوگ یہ مکان آمنہ کے نام کر دیں تو اس کا مستقبل محفوظ نظر آئے گا۔''

''اور میرا مستقبل......؟ وہ تو کسی سڑک پر نظر آئے گا۔'' اماں نے دہل کر کہا تو آپا...کو بھی یہ بات ناگوار گزری۔ پھر یہ بحث سلجھنے کے بجائے الجھتی چلی گئی اور آخر کار ندرت باجی نے صاف انکار کر دیا۔ آمنہ کی خالہ نے بے بھاؤ کی باتیں سنائیں اور اماں ہائیں ہائیں کرتی رہ گئیں۔

☆☆☆

اب متفقہ رائے کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ یہ کام کسی رشتے کروانے والی کے ذمّے لگایا جائے۔ فوراً سے پہلے رشتے والی ماسی آ گئی اور اسے اپنی مطلوبہ صفات بتا کر چاند سی بہو ڈھونڈنے کا حکم دے دیا گیا۔ ماسی شرافت تو اس کام میں ویسے بھی جانی مانی جاتی تھی۔ چند ہی دنوں میں وہ اپنا ٹوپی والا برقع سنبھالتی ایک رشتہ تلاش کر کے لے آئی۔ میری ''شرما حضوری'' اور ماں بہنوں سے جھجک میں ذرا بھی کمی نہیں آئی تھی۔ سو اپنی آنکھوں سے سارے احوال دیکھ رہا تھا۔

ماسی شرافت کا بتایا گیا رشتہ کسی بہت امیر اور اعلیٰ گھرانے کا تھا۔ ندرت باجی نے ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہی معنی خیز نظروں سے ثروت آپا کو دیکھا تو وہ بھی اپنی جگہ مرعوب نظر آئیں۔ ڈرائنگ روم نہایت قیمتی اشیا سے مزیّن تھا۔ البتہ اماں پہلو پر پہلو بدلے چلی جا رہی تھیں۔

''یہ ماسی شرافت ہمیں کہاں لے آئی ہے۔ اتنے امیر گھر کی لڑکی بھلا ہم جیسوں کے گھر میں ٹک پائے گی؟'' اماں نے خدشہ ظاہر کیا۔

''اماں صبر تو کریں اگر لڑکی اچھی ہوئی تو یہ چانس مِس نہیں کرنا۔ مجھے لگ رہا ہے کسی حیرت کدے میں داخل ہو گئی ہوں۔'' ثروت آپا نے ہر چمکتی چیز پر للچائی نگاہ ڈالی۔

''ہاں اماں، آپا ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں۔ ایسے گھر تو ہم صرف ٹی وی پر ہی دیکھتے ہیں۔ مجھے تو یہ ایک خواب معلوم ہو رہا ہے۔'' ندرت باجی کی باچھیں بھی کھلی پڑی تھیں۔ البتہ اماں بالکل مطمئن نہیں تھیں۔

کچھ ہی دیر بعد ایک پانچ فٹ کی گیند نما لڑکی لوازمات سے بھری ٹرالی دھکیلتی اندر داخل ہوئی۔ اپنی ماں بہنوں کی نسبت وہ انتہائی پستہ قد تھی مگر صحت خوب پائی تھی۔

ندرت باجی اور ثروت آپا نے تمام لوازمات سے خوب انصاف کیا جبکہ گیند نما ثمینہ صوفے میں پھنسی شرمانے کی بھرپور ایکٹنگ کرتی رہی۔ گھر آتے ہی اماں نے ماسی شرافت کو انکار کر دیا۔ ندرت باجی اور ثروت آپا نے بجھے دل سے انکار میں ساتھ دیا تھا۔

''ماسی شرافت، مجھے لڑکی کی ظاہری حالت پر اعتراض نہیں کہ یہ اللہ کی دین ہے مگر اتنے بڑے گھر کی لڑکی میں نہیں لا سکتی۔ میرے گھر میں نہ تو اتنی سہولتیں ہیں اور نہ ہی میرے بیٹے کی اتنی تنخواہ کہ وہ یہ سب کچھ پورا کر سکے۔ اس لیے تمہارا بھلا ہو تم ان لوگوں کو انکار کہلوا دو کہ ہم ان کے برابر نہیں۔'' اماں نے متانت سے جواب دیا تو ماسی شرافت کو یہ وجہ معقول نہ لگی اور وہ ناراض ہو کر چلی گئی۔

افسوس تو دونوں بہنوں کو بھی ہُوا تھا مگر کیا، کیا جاتا اماں سے اختلاف بھی ممکن نہیں تھا۔ سیدھی سادی اماں ایک گھریلو عورت تھیں جنہیں صرف چاند سی بہو کی حسرت تھی نہ کہ کسی اور قسم کا لالچ......

ماسی شرافت کے پیغامِ انکار کو زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ ثمینہ کی والدہ نے فون کھڑکا دیا۔ ثروت آپا جانے کس آس و امید پر اندر بھاگی آئیں اور فون کا پیغام دیا۔ اماں بھی اپنا بھاری بھرکم وجود بہ مشکل سنبھالتی فون تک آئی تھیں مگر دوسری طرف تو جیسے لاوا پھٹ پڑا تھا۔

''بیگم صاحبہ اگر رشتہ نہیں کرنا تھا تو ہمارے گھر تشریف لانے کی کیا ضرورت تھی؟'' ان کی طنز میں ڈوبی آواز اماں کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ ''ارے تم لوگ اس قابل تھے کہ ہمارے اتنے شاندار ڈرائنگ روم میں بیٹھتے؟ اور جو جو لوازمات تم لوگوں کے سامنے رکھے گئے اس سے پہلے کبھی دیکھے تھے تم لوگوں نے؟''

''بہن کیسی باتیں کر رہی ہیں؟'' اماں کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔

''ارے تمہاری جیسی بہن نہیں ہے میری، منہ سنبھال کر بات کرو۔'' ان کی بدتمیزی عروج کو پہنچ گئی تھی۔ ''یہ تم لوگوں کا وتیرہ ہے کہ رشتے کے بہانے لوگوں کے گھروں میں جا کر ٹی پارٹی انجوائے کرتے ہو۔ اگر تمہیں میری بیٹی اتنی ہی بُری لگی تھی تو دیکھتے ہی چلی جاتیں۔ سب کچھ کھا چاٹ کر دفع ہو گئے اور پھر منہ بنا کر انکار بھی کر دیا۔''

''اب آپ زیادتی کر رہی ہیں بہن۔'' اماں ان کی آگ برساتی زبان کے آگے بے بس سی یہی کہہ پائیں۔

''تم لوگوں نے کیا انکار کرنا تھا کہ تمہارا ہمارا جوڑ نہیں۔ انکار تو مجھے کرنا تھا کہ تم جیسے بھوکے ننگے خاندان کو اپنے گھر بلا لیا۔ تمہارا ہمارا واقعی کوئی جوڑ نہیں۔'' انہوں نے بے بھاؤ کی سنائی اور کھٹاک سے فون بند کر دیا۔ اماں بے چاری تو مارے دکھ کے شام تک کچھ بولی ہی نہیں کجا کہ کچھ کھانا پینا۔ انہوں نے بہت دیر کے بعد بیٹیوں کے اصرار پر پوری گفتگو سنائی۔

''سنو عاقب! میری بات سن کر اپنے کمرے میں جانا۔'' میں رات کا کھانا کھا کر اندر بڑھنے لگا تو اماں کی ناراض سی صدا پر ٹھٹک کر رکا۔

''ہم نے بہت کوشش کی تمہارے لیے رشتے تلاش کرنے کی مگر شاید یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔ ہم سے اور کھیل تماشے نہیں ہوتے۔ اب جو بھی کرنا ہے تمہیں خود کرنا ہے۔''

''کیا مطلب اماں! میں سمجھا نہیں؟''

''ہاں تم اتنے چھوٹے بچے ہو ناں کہ تم سمجھے نہیں۔'' انہوں نے بھرپور طنز فرمایا۔

میں نے اُلجھن زدہ نظروں سے پہلے آپا کو اور پھر باجی کو دیکھا مگر ان کے چہروں پر بھی نا سمجھی کی تحریر رقم تھی۔

''میرا مطلب ہے شادی تم نے کرنا ہے تو اپنے لیے لڑکی بھی خود تلاش کرو۔ جو بھی پسند ہو ہمیں بتا دینا۔ ہم جا کر بات پکی کر آئیں گے۔ مگر اس طرح در در کے دھکے کھا کر چاند سی بہو تلاش نہیں کر سکتے۔'' اماں کے لہجے میں حسرت سی در آئی تھی مگر میں تھا کہ شادیِ مرگ کی کیفیت میں...... مجھے لگا کہ میری سماعتوں میں فرق ہے مگر ایسا کچھ نہ تھا۔

''اب پریشان حال کیوں کھڑے ہو۔ ہم بھی بہت پھر لیے جگہ جگہ اور بہت پریشانیاں بھی اٹھائی ہیں۔ اب یہ کام تمہیں خود کرنا ہے اور میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گی۔'' انہوں نے ہاتھ اٹھا کر بات ختم کی اور میں ہوش کی دنیا میں واپس لوٹ آیا۔

''جی...... جی اماں! جیسے آپ کا حکم......'' میں دلی خوشی اندر ہی اندر دباتا ہوا اپنے کمرے کی جانب بھاگا تھا کہ ابھی ساری روداد کومل کو بھی تو سنانا تھی۔ قسمت مجھ پر ایسے مہربان ہوئی کہ جس کی جرأت میں زندگی بھر نہ کر پاتا...... وہ گیند میرے کورٹ میں آن گری تھی۔ کیا آپ کی قسمت اس طرح سے مہربان ہوئی ہے کبھی؟

ناولٹ

کہیں دیپ جلے کہیں دل

قیصرہ حیات

یمنیٰ اپنی اسپورٹس کار میں انتہائی تیز رفتاری سے ایک بہت ہی سنسان سڑک پر جارہی تھی۔ سڑک کے دونوں اطراف سایہ دار درختوں کی قطار کا لامحدود سلسلہ ایک بار بھی سورج کو پوری آب وتاب سے چمکنے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔ درختوں کی اوٹ سے سورج اپنی آنکھیں جھپکا جھپکا کر اپنی روشنی کو کہیں کم اور کہیں زیادہ کرتے ہوئے اپنے ہونے کا ثبوت دے رہا تھا۔ ہوا میں قدرے خنکی تھی ...... اس نے



لیدر کی بلیک پینٹ اور بلیک ہی جیکٹ پہن رکھی تھی جو اس کی سیاہ چمکیلی رنگت کو مزید چمکا رہی تھی، اس کے سیاہ تراشیدہ شولڈر کٹ بال ہوا میں بہت خوب صورت انداز میں لہرا رہے تھے۔ آنکھوں پر سیاہ گاگلز لگائے وہ بلیک بیوٹی بنی ہوئی تھی۔ اس نے فل والیوم میں انگلش میوزک آن کر رکھا تھا اور وہ اپنی ہی لے میں میوزک انجوائے کرتے ہوئے ڈرائیونگ کر رہی تھی کہ اچانک ایک سفید ہنڈا سوک نے اس کا تعاقب کرنا شروع کر دیا اور اس کے بالکل قریب آ کر اونچی آواز میں ایک انتہائی خوب صورت اور نیلی آنکھوں والے لڑکے نے اس پر وہسلنگ کی۔ یمنیٰ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور گاڑی کی اسپیڈ قدرے کم کی۔

''ریس لگاؤ گی......؟'' نیلی آنکھوں والے لڑکے نے شرارتی لہجے میں کہا۔ یمنیٰ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''کیوں بلیک بیوٹی...... کیا خیال ہے......؟ اگر تم ریس جیت گئیں تو ہم سب تمہارے اور اگر ہم جیتے تو تم ہماری......'' نیلی آنکھوں والے لڑکے نے قہقہہ لگا کر پچھلی سیٹ پر بیٹھے دو لڑکوں اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ یمنیٰ کو اس کی بات سن کر انتہائی غصہ آیا مگر وہ خاموش رہی اور گاڑی قدرے آہستہ کر دی۔ لڑکوں نے اس پر بھرپور قہقہہ لگایا۔

''کیا ہوا، ڈر گئیں؟'' لڑکے نے کہا اور یمنیٰ نے ایک دم گاڑی کو اتنی تیز ریس دی کہ لڑکے حیران رہ گئے۔

''یار تیز چلاؤ، وہ دیکھو کیسے گاڑی بھگا رہی ہے۔'' اسی لڑکے نے کہا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے لڑکے نے بھی اپنی انتہائی کوشش سے گاڑی کو تیز رفتاری سے چلانا شروع کیا مگر یمنیٰ دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

''ویری بیڈ...... یار لڑکی کیسے ہمیں ہرا گئی؟'' نیلی آنکھوں والے نے تاسف کا اظہار کیا۔

''کوئی بات نہیں پھر کبھی ملے گی تو بدلہ لے لیں گے اور تب ہم ہی جیتیں گے۔'' ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے لڑکے نے ہنستے ہوئے جواب دیا تو سب منہ بنا کر اسے دیکھنے لگے۔

☆☆☆

''جمال، یمنیٰ ابھی تک نہیں آئی۔ اس لڑکی نے تو حد کر دی ہے۔ فلائٹ کا ٹائم ہو رہا ہے۔'' ایمن نے غصے سے جھنجلاتے ہوئے کہا۔

''افوہ...... آ جائے گی...... ابھی فلائٹ جانے میں چار گھنٹے باقی ہیں۔'' جمال صاحب نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

''جمال...... آپ نے اسے بہت چھوٹ دے رکھی ہے اور اسی وجہ سے وہ خودسر اور ضدی ہوتی جا رہی ہے۔'' ایمن نے انہیں الزام دھرتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں ہوا اسے...... وہ میری بیٹی ہے اور کبھی کوئی غلط حرکت نہیں کر سکتی۔'' جمال صاحب نے کہا۔ اسی لمحے فون کی بیل بجنے لگی اور جمال صاحب نے فون اٹھایا۔

''ہیلو...... کون؟ ایس ایچ او صاحب...... جی فرمائیں...... کیا...... یمنیٰ کا چالان ہو گیا ہے؟ اوہ ...... تو...... میری اس سے بات کرائیں......'' جمال صاحب نہایت پریشانی سے بولے۔

''ہاں...... کہو بیٹا کیا بات ہے۔'' جمال صاحب نے پوچھا

''ڈیڈی...... میں گھر آ کر آپ کو ساری بات بتاتی ہوں مگر ابھی تو کچھ کیجیے......!'' یمنیٰ نے پریشانی سے کہا۔

''اوکے...... اوکے...... ایس ایچ او کو فون دو۔'' جمال صاحب نے کہا تو یمنیٰ نے ایس ایچ او کو فون پکڑا دیا۔

''آپ اسے جانے دیجیے۔ چالان وغیرہ کا معاملہ میرا اسسٹنٹ آ کر آپ کے ساتھ طے کر لے گا۔'' انہوں نے کہہ کر فون بند کیا تو ایمن نے خشمگیں نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

''دیکھ لیا آپ نے...... کس قدر یقین سے کہہ رہے تھے کہ وہ کبھی غلط حرکت نہیں کرے گی۔ جمال اب بھی ٹائم ہے اسے سمجھا لیں ورنہ بہت دیر ہو جائے گی۔'' ایمن نے غصے سے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئیں۔

یمنیٰ گھر آئی تو بہت اپ سیٹ تھی۔

''تمہارا چالان کیوں ہوا؟'' جمال صاحب نے خفگی سے پوچھا۔

''سگنل توڑنے پر......'' وہ آہستہ آواز میں بولی۔

''اور سگنل کیوں توڑا؟'' وہ قدرے خفگی سے بولے۔

''وہ...... کچھ......'' وہ ہکلانے لگی۔

''جمال اس سے گاڑی اور بائیک کی چابیاں لے لیں...... سارا دن آوارہ پھرتی رہتی ہے۔ پڑھائی کی طرف توجہ نہیں دیتی اور اے لیولز کے اس نے ایگزامز دینے ہیں۔'' ایمن نے ایک دم کمرے میں آ کر غصے سے کہا تو یمنیٰ نے قدرے غصے سے ماں کی طرف دیکھ کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

''ایمن! ایک تو تم ڈانٹنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں۔ مجھے پوچھنے تو دو کہ اس نے سگنل کیوں توڑا؟'' جمال صاحب نے غصے سے کہا تو ایمن غصے سے پاؤں پٹختے باہر نکل گئیں۔

''ہاں...... تو کیا ہوا تھا؟'' جمال صاحب نے اس سے پوچھا۔

''میں نے بتایا تو ہے۔'' اس نے برا سا منہ بنا کر جواب دیا۔

''یہی تو پوچھ رہا ہوں سگنل...... کیوں توڑا؟'' انہوں نے قدرے خفگی سے پوچھا۔

''سگنل کسی uncertain سچویشن میں ہی توڑا جا سکتا ہے۔ بس ایسی ہی کوئی مشکل پیش آئی تھی۔'' وہ کہہ کر غصے سے کمرے سے باہر چلی گئی۔

''یمنیٰ...... رکو...... تو......'' جمال صاحب اسے آوازیں دیتے رہ گئے مگر وہ کمرے سے باہر جا چکی تھی۔

☆☆☆

''یمنیٰ تم نے ایک ڈریس بھی ٹرائی نہیں کیا جو میں بوتیک سے تمہارے لیے خرید کر لائی ہوں۔ گھر میں رکو تو پھر ہے ناں۔'' ایمن نے خفگی سے کہا جب وہ گاڑی میں ائرپورٹ کی جانب جا رہے تھے۔

''آپ ڈریسز کیوں لائی ہیں؟'' یمنیٰ نے حیرت سے پوچھا۔

''نیہا کی شادی پر پہننے کے لیے اور کس لیے......؟'' انہوں نے جواب دیا۔

''آئی سی......!'' وہ خاموش ہو گئی۔

''جمال...... آپ کب کراچی آئیں گے؟'' ایمن نے ڈرائیور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے جمال صاحب سے پوچھا۔

''کوشش کروں گا بارات والے دن آ سکوں اور اگر نہ آ سکا تو ولیمے پر ضرور پہنچوں گا۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''آپ بھی کمال کرتے ہیں، خاندان میں کون سی روز روز شادیاں ہوتی ہیں اور میری ایک ہی بہن ہے اور ایک ہی اس کی بیٹی ہے۔ اس کی شادی پر بھی آپ نہ جائیں تو کتنی بری بات ہے۔'' ایمن نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

''کہہ تو رہا ہوں پوری کوشش کروں گا لیکن بزنس کے سلسلے میں ایک فارن ڈیلیگیشن کے ساتھ میٹنگ بھی ہے اور تین ماہ پہلے انہوں نے اس میٹنگ کے لیے ٹائم لیا تھا۔ شادی کی ڈیٹ تو بعد میں مقرر کی گئی ہے۔'' جمال صاحب نے کہا تو وہ خاموش ہو گئیں۔

''یمنیٰ بیٹے! مما کو وہاں جا کر تنگ نہیں کرنا اور زیادہ گھومنا پھرنا نہیں۔'' جمال صاحب نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اوکے ڈیڈی۔'' اس نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

''اور اسے یہ بھی سمجھا دیجیے کہ خوامخواہ کسی سے نہ جھگڑے...... اگر کوئی کچھ کہتا بھی ہے تو

خاموش رہے۔'' ایمن کا بلاواسطہ اشارہ اس کی سیاہ رنگت کی طرف تھا جس کی وجہ سے اکثر لوگ اس کے مختلف نام رکھتے تھے اور وہ سب سے جھگڑتی تھی۔

''ہاں...... بیٹا...... تم لوگ ایک ہفتے کے لیے تو جا رہی ہو...... کیا ضرورت ہے کسی سے اُلجھنے کی۔'' جمال صاحب نے کہا تو وہ خاموش ہو گئی۔

☆☆☆

''بیٹا! کل ردا کے کالج میں فنکشن ہے اور اس کے سوٹ کے ساتھ دوپٹا ٹھیک میچ نہیں کر رہا۔ اب رات کے دس بج رہے ہیں کہاں سے نیا دوپٹا ڈائی کرواؤں۔'' خدیجہ بیگم نے قدرے فکرمندی سے فہام کو بتایا۔

''لائیں ...... میں ڈائی کروا کر لاتا ہوں۔'' فہام نے جواب دیا۔

''یہ لو...... اور سنو، انارکلی سے سوٹ کے ساتھ میچنگ چوڑیاں اور ہرا پراندہ بھی لانا...... اس نے کسی پروگرام میں بھی حصہ لیا ہے۔'' خدیجہ بیگم نے کہا۔

''کیا اس وقت ڈائیرز کی شاپس کھلی ہوں گی؟ رات کے دس بج رہے ہیں۔'' فہام نے پوچھا۔

''امید تو ہے...... تم کوشش کر دیکھو...... خدا کرے دکانیں کھلی ہوں ورنہ ردا نے تو رو رو کر برا حال کر لینا ہے۔'' خدیجہ بیگم نے کہا۔

''آپ فکر نہیں کریں۔ کہیں نہ کہیں سے تو ڈائی ہو ہی جائے گا۔ ردا ہے کہاں؟'' فہام نے پوچھا۔

''اپنے کمرے میں صبح کے فنکشن کی تیاریاں کر رہی ہے۔'' خدیجہ بیگم نے جواب دیا۔

''اچھا...... اب میں جاتا ہوں۔ اس سے کہیے گا فکر نہ کرے۔'' فہام نے مسکراتے ہوئے سوٹ اور دوپٹے والا شاپر پکڑا اور چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد خدیجہ بیگم متفکر سی ردا کے پاس کمرے میں گئیں جو ہاتھ پاؤں اور چہرے پر بلیچ کریم لگائے بیڈ پر لیٹی تھی۔

''دوپٹے کا کیا بنا......؟'' ردا نے ادھ کھلی آنکھوں سے ماں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''فہام گیا تو ہے...... دیکھو...... بے چارہ کب واپس آتا ہے؟'' خدیجہ بیگم نے جواب دیا۔

''مما! اگر دوپٹا ٹھیک میچ نہ ہوا تو میں کیا پہنوں گی؟ آپ نے کام والی کو کیوں بھیجا...... اس کی تو نظر پہلے ہی کمزور ہے؟'' ردا خفگی سے بولی۔

''اس کی بیٹی زاہدہ اس کے ساتھ تھی۔ میں نے سوچا اب میں کیا جاؤں، سکینہ کو ہی بھیج دیتی ہوں۔ دوپٹا ہی تو ڈائی کرانا ہے...... مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ پیچ کے بجائے اورنج کلر کروا لائے گی......'' خدیجہ بیگم نے جواب دیا۔

''اللہ کرے اب فہام بھائی ٹھیک کلر کروا لائیں۔'' وہ پریشانی سے بولی۔

''ردا! تم بہت خوش قسمت ہو جو تمہیں اتنے چاہنے، محبت کرنے والے اور جان چھڑکنے والے بھائی ملے ورنہ آج کل کے زمانے میں بہن، بھائی کہاں ایک دوسرے سے اتنی محبت کرتے ہیں اور ان کی تو تم میں جان ہے۔ حاتم، عاصم تو جو محبت کرتے ہیں فہام ان سے کئی گنا زیادہ تم سے محبت کرتا ہے۔ تمہاری آنکھ میں ایک آنسو سے جتنا تڑپتا ہے، وہ میں ہی جانتی ہوں۔'' خدیجہ بیگم نے فرطِ جذبات سے نم آنکھوں کے ساتھ کہا۔

''ہاں...... کالج میں میری دوستیں بھی مجھ پر رشک کرتی ہیں۔ جب میں انہیں بتاتی ہوں کہ فہام، حاتم اور عاصم میرے لیے خود شاپنگ کرتے ہیں۔ میرے کپڑوں کے ساتھ میچنگ جیولری بھی خود خریدتے ہیں اور میری کاسمیٹکس بھی۔'' ردا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''خدا کرے تم بہن بھائیوں میں یہ محبت کبھی کم نہ ہو۔'' خدیجہ بیگم نے اسے دعا دی اور خاموشی سے اس کے کمرے سے باہر نکل آئیں۔

فہام رات کو ایک بجے لوٹا تھا نہ جانے کہاں کہاں سے گھوم کر وہ دوپٹا درست ڈائی کروا کر

لایا تھا اور اس کے ساتھ میچنگ چوڑیاں اور ایک عدد نیا ریڈی میڈ سوٹ کہ اگر اسے وہ پسند آجاتا ہے تو وہ پہن لے۔ دوپٹے کا کلر بھی ٹھیک میچ ہو گیا تھا اور ردا بہت خوش تھی۔

''تھینک یو فہام بھائی......'' ردا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میری سوئٹ ڈولی شکریہ کس بات کا؟ میرا تو دل چاہتا ہے کہ تم فرمائشیں کرتی رہو اور میں انہیں پورا کرتا رہوں۔'' فہام نے مسکرا کر اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا تو وہ بھی مسکرا دی۔

☆☆☆

''واؤ...... تمہارا ڈریس تو بہت زبردست ہے۔ کہاں سے خریدا؟'' ردا کی دوست رشنا...... نے فہام کے لائے ہوئے ریڈی میڈ سوٹ کی بھرپور انداز میں تعریف کرتے ہوئے پوچھا جو اس نے فنکشن کے بعد پہنا تھا۔

''فہام بھائی رات کو خرید کر لائے ہیں...... معلوم نہیں کہاں سے خریدا۔'' ردا نے مسکرا کر جواب دیا۔

''یار...... تمہارا بھائی بڑا زبردست ہے اگر کوئی بھابی نہیں ڈھونڈی تو میرے بارے میں بھی غورو خوض کیا جا سکتا ہے۔'' رشنا نے ..... ہنستے ہوئے کہا۔

''منہ دھو رکھو...... ان کی میری خالہ زاد شمیلہ سے منگنی ہو چکی ہے اور پورے ایک ماہ بعد شادی ہے۔'' ردا نے کہا۔

''منگنی کا کیا ہے، ٹوٹ بھی سکتی ہے اور اب ویسے منگنی تو میری بھی ہو چکی ہے مگر فراز میرے ٹیسٹ کا نہیں...... ہر وقت منہ بنائے سوبر بنا رہتا ہے۔ مجھے تو تمہارے بھائی جیسے شوقین مزاج مرد پسند ہیں۔'' رشنا نے ہنستے ہوئے کہا۔

''مگر...... فہام بھائی کو تو شمیلہ شروع سے ہی پسند ہے۔ تمہارے بارے میں تو وہ سوچ بھی نہیں سکتے۔'' ردا نے کہا۔

''نہ سوچیں...... میں کون سا سیریس ہوں۔ فراز نے بھی بہت محبت اور منتوں سے میرے ساتھ رشتہ کروایا ہے۔ میں تو یونہی مذاق کر رہی تھی۔'' رشنا نے...... قدرے خفگی سے منہ بنا کر کہا۔

''شکر ہے، کھٹے انگور جلدی نظر آ گئے۔'' ردا نے ہنس کر کہا تو رشنا بھی ہنسنے لگی۔

ردا گریجویشن کے فائنل ائیر میں تھی اور الوداعی پارٹی میں فورتھ ائیر کی اسٹوڈنٹس نے کئی پروگرامز ترتیب دیے تھے اور ردا نے ان میں سے دو میں شرکت کی تھی۔ وہ کالج کی آؤٹ اسٹینڈنگ اسٹوڈنٹس میں سے ایک تھی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں۔

پارٹی ختم ہوتے ہی رشنا کا بھائی توقیر اسے لینے آ گیا۔ ردا فہام کو بار بار کال کرتی رہی مگر اس کا موبائل آف تھا۔

''آؤ...... میں تمہیں ڈراپ کر دیتی ہوں۔ شام گہری ہو رہی ہے۔'' رشنا نے اسے کہا تو وہ مان گئی اور توقیر کے پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ نئے ڈریس میں سیاہ کھلے لمبے بالوں کے ساتھ بہت خوب صورت لگ رہی تھی اور توقیر کی نظریں اس سے نہیں ہٹ رہی تھیں اس نے اس پر مرر سیٹ کر لیا اور کن انکھیوں سے اسے دیکھنے لگا ردا کو اس پر غصہ آنے لگا مگر خاموش رہی۔

''ردا! ڈرامے میں تمہاری ایکٹنگ بہت زبردست رہی اور تم پنجابی بولتے ہوئے بہت کیوٹ لگ رہی تھیں۔'' رشنا نے پیچھے مڑ کر اسے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بھی مسکرا دی۔

''بائی داوے...... کیا رول ملا کیا ہے...... ردا نے؟'' توقیر نے اچانک پوچھا۔

''ہیر کا اور اتنا زبردست کہ میں آپ کو کیا بتاؤں۔ شاید حقیقت میں ہیر اسے دیکھ لیتی تو وہ آج اس کے سامنے ضرور سرینڈر کر دیتی۔'' رشنا نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہاں...... کچھ لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں کہ جن

کے سامنے خود بخود سرینڈر کرنے کو دل چاہتا ہے۔'' توقیر نے معنی خیز انداز میں کہا تو ردا اس کے جملے کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھ گئی۔

''رشنا...... پلیز مجھے گھر جلدی ڈراپ کر دو، ٹائم بہت ہو رہا ہے۔ فہام بھائی کا فون نمبر بھی نہیں مل رہا۔ وہ یقیناً مجھے کالج پک کرنے گئے ہوں گے۔'' ردا نے توقیر کی سست رفتار ڈرائیونگ سے تنگ آ کر کہا۔

''یار...... ایک تو تمہارے بھائیوں نے تمہیں بالکل ہی اَن کونفیڈنٹ بنا دیا ہے۔ تمہارا ہر کام اپنے ذمے لے کر وہ تمہیں ہیلپ لیس کر رہے ہیں۔ بی کونفیڈنٹ اینڈ انڈیپنڈنٹ۔'' رشنا نے جھنجلا کر کہا۔

''نصیب والی ہیں ردا...... جنہیں اتنے چاہنے والے ملے۔'' توقیر نے آہ بھر کر کہا۔

''توقیر بھائی...... کہیں آپ بھی تو ان چاہنے والوں کی لسٹ میں شامل نہیں۔'' رشنا نے یوں بے باکی سے کہا کہ توقیر کو بھی ایک جھٹکا لگا اور ردا بھی انتہائی حیرت سے آنکھیں پوری کھول کر رشنا کی طرف دیکھنے لگی۔ توقیر اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا اور مرر میں سے ردا کی طرف دیکھنے لگا۔

''کیوں...... توقیر بھائی...... آپ نے بتایا نہیں؟'' رشنا نے قہقہہ لگا کر کہا تو ردا کو غصہ آ گیا۔

''اب بس بھی کرو رشنا...... تم کیا ہر بات کے پیچھے ہی پڑ جاتی ہو۔ ویسے تم اتنی نان سینس ہو سکتی ہو...... مجھے آج یقین آ گیا ہے۔'' ردا نے خفگی سے کہا تو رشنا کو بھی بات اور موقع کی نزاکت کا احساس ہونے لگا۔

''آئی ایم سوری...... یار میں تو بس یونہی مذاق کر رہی تھی۔'' رشنا نے معذرت کی تو ردا خاموش ہو گئی۔ باقی سارا راستہ خاموشی سے کٹا۔

اچانک ردا کا موبائل بجنے لگا۔ اس نے جلدی سے ہیلو کہا۔

''جی...... فہام بھائی...... میں آ رہی ہوں رشنا کے ساتھ۔ آئی ایم سوری...... او کے، بائے۔''

اس نے موبائل بند کرتے ہوئے کہا۔

''کیا ہوا......؟'' رشنا نے اس کے اداس لہجے کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

''فہام بھائی کا کالج سے فون تھا۔ وہ ابھی مجھے لینے گئے تھے اور مجھے وہاں نہ پا کر پریشان ہو گئے۔'' ردا نے بتایا۔

''آئی سی۔'' رشنا نے جواب دیا اور خاموش ہو گئی۔ ردا کو اس کے گھر کے باہر ڈراپ کیا تو رشنا، ردا کی مما سے ملنے اندر چلی گئی۔ ردا جیسے ہی گاڑی سے باہر نکلی تو توقیر نے موقع دیکھ کر اسے آہستہ آواز میں مخاطب کیا۔

''ردا! آپ مجھے بھی اپنے چاہنے والوں کی لسٹ میں شامل سمجھیں۔'' توقیر نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا تو ردا نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور وہ جلدی سے اندر کی طرف بھاگی۔

☆☆☆

شادی کی رسمیں اپنے عروج پر تھیں۔ ڈیفنس میں تین کنال پر محیط وسیع و عریض کوٹھی کو انتہائی اہتمام اور خوب صورتی سے ایک ہفتہ پہلے ہی ڈیکوریٹ کر لیا گیا تھا۔ کوٹھی کی وسعت، خوب صورتی، ڈیکوریشن اور نفاست کو دیکھ کر ہر آنے والا مہمان ضرور چونکتا۔ ایمن کی ایک ہی بہن تھی سدیدہ اور اس کی بھی ایک بیٹی اور بیٹا تھے۔ بیٹی کی شادی کراچی کے انتہائی امیر کبیر خاندان میں ہو رہی تھی۔ نیہا، یمنیٰ سے چار سال بڑی تھی اور انتہائی اسمارٹ و خوب صورت تھی۔ یمنیٰ کے اس کے ساتھ ٹرمز ہمیشہ سے نارمل رہے تھے البتہ اس کے بھائی شہیر کے ساتھ اس کی دوستی کی وجہ شاید دونوں کا ایک ہی کلاس میں ہونا، ٹیسٹ و ایکٹیوٹیز کا مشترک ہونا بھی تھا۔ یمنیٰ کے زیادہ تر شوق لڑکوں والے تھے یا پھر جمال صاحب نے جان بوجھ کر اسے ایسی تربیت دی تھی کہ

وہ زمانے میں بھرپور انداز سے سروائیو کرسکے۔

جمال احمد کے تین جڑواں بیٹے پیدا ہوتے ہی فوت ہوگئے جس کا انہیں شدید دکھ ہوا۔ ایمن تو دو سال سکتے میں رہیں۔ ہروقت روتی اور پریشان رہتیں۔ تینوں بیٹے بہت خوب صورت تھے اور پیدائش کے دو دن بعد ایک، ایک گھنٹے کے وقفے سے فوت ہوگئے۔ اتنا شدید صدمہ اور دکھ سہنے کے بعد ایمن اپنا ذہنی توازن قدرے کھو بیٹھی تھیں بیٹوں کی پیدائش پر جتنی خوشی منائی گئی اتنا ہی دکھ بعد میں سہنا پڑا۔ جمال احمد بہت مشکل سے ایمن کو سمجھا سمجھا کر نارمل زندگی کی طرف لائے مگر وہ ہروقت آہیں بھرتی رہتیں۔

بیٹوں کی وفات کے چار سال بعد یمنیٰ پیدا ہوئی تو ہر کوئی چونک گیا۔ انتہائی دبلی پتلی، مریل اور کالی سیاہ رنگت والی نہ جانے کس پر چلی گئی تھی۔ نہ ننھیال میں کوئی اس جیسا تھا اور نہ ہی ددھیال میں۔ ایمن نے بچی کو دیکھا تو انہیں شدید دھچکا لگا مگر جمال احمد نے انتہائی خوشی منائی خاندان بھر میں مٹھائیاں تقسیم کیں۔ رسمِ عقیقہ دھوم دھام سے کیا گیا مگر ایمن جب بھی اسے گود میں اٹھاتیں تو مایوس اور افسردہ ہوجاتیں۔ دل ہی دل میں خدا سے شکوہ کرتیں۔

''یا اللہ تو نے مجھے لڑکی کی نعمت سے نوازا ہے مگر اسے ایسا بنایا ہے کہ اسے دیکھ کر میرے دل کو کوئی خوشی نہیں ہوئی مگر جمال کا دل کتنا بڑا ہے وہ اسے یوں خوشی خوشی اٹھاتے ہیں جیسے اس سے بڑھ کر خوب صورت اور قیمتی شے ان کے نزدیک کوئی اور نہ ہو۔ میں ماں ہو کر اسے قبول نہیں کر پا رہی اور وہ باپ ہو کر کتنے مہربان ہیں۔ میں کیا کروں...... میرے دل کو اس کی محبت سے بھر دے۔ تو نے بیٹے تو اتنے خوب صورت دیے اور بیٹی کو کیونکر ایسا بنا دیا؟'' وہ اس بات کا ذکر کبھی کبھار جمال احمد سے بھی کرتیں تو وہ غصے میں آجاتے۔

''ایمن! تم خدا کی اتنی ناشکری کر سکتی ہو، مجھے یقین نہیں آتا اور تمہیں کیا معلوم...... یہ بیٹی میرے لیے کتنی بڑی رحمت ثابت ہو رہی ہے جس دن سے اس نے جنم لیا ہے میرا بزنس ترقی کرتا جا رہا ہے۔ محنت تو میں پہلے بھی کرتا تھا مگر اب تو یوں لگتا ہے جیسے خدا مجھ پر بہت مہربان ہو گیا ہے، ہر طرف سے دھن برس رہا ہے اور میری عزت وقار میں بھی روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ بیٹی ہمارے لیے باعثِ برکت ہے۔ تم اس کی شکل صورت پر مت جاؤ۔ نہ جانے یہ کتنے نصیب والی ہو۔ تمہیں اور مجھے کیا معلوم لیکن ان تمام باتوں سے بالا یہ ہماری اولاد ہے اور اولاد تو ماں، باپ کو کائنات کی ہر شے سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ اس لیے آئندہ میں تمہارے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نہ دیکھوں۔'' جمال احمد نے ایمن کو سمجھایا تو رفتہ رفتہ ان کے رویے میں تبدیلی آنا شروع ہو گئی اور ویسے بھی جب کسی کو دیکھنے کا زاویہ بدل جاتا ہے تو ہر شے اس زاویے کے مطابق نظر آنے لگتی ہے اور وہ شے خود بخود خوب صورت دکھائی دینے لگتی ہے۔ چاہے وہ دوسروں کو کتنی ہی بری لگے۔ جیسے ہی ایمن کی نظروں کا زاویہ بدلا انہیں یمنیٰ پیاری لگنے لگی گو کہ اس کے لیے کپڑے خریدتے ہوئے اکثر انہیں دشواری کا سامنا کرنا پڑتا۔ کوئی لائٹ کلر اسے سوٹ نہ کرتا اور ڈارک کلرز میں تو وہ بالکل ہی بھتنی لگتی تب ایمن دل مسوس کر رہ جاتیں۔ کاش اس کی رنگت سانولی ہی ہوتی تو اسے کوئی کلرز تو سوٹ کرتے مگر وہ آہ بھر کر رہ جاتیں۔

یمنیٰ جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی۔ ایمن اور جمال احمد کو وہ اور عزیز تر ہوتی گئی اور اس کی وجہ اکثر اس کی کہی ہوئی باتوں کا درست ثابت ہونا تھا۔ وہ ان بچوں میں سے تھی جو مستقبل میں آنے والے وقت اور واقعات کی پیش گوئیاں کرتے ہیں اور وہ پیش گوئیاں سچ ثابت ہوتی ہیں۔ جمال احمد کو اس کی کہی ہوئی باتوں پر بہت یقین تھا، وہ ہر میٹنگ میں

جانے سے پہلے یمنیٰ کو تنہائی میں بلا کر پوچھتے کہ میٹنگ کامیاب رہے گی یا نہیں اور نتیجہ ہمیشہ اس کے جواب کے مطابق ملتا۔ جمال احمد نے اس بات کو بار ہا آزمایا تھا مگر اس بات کو انہوں نے ایمن کے علاوہ کسی اور پر کبھی ظاہر نہیں کیا تھا۔ وہ جیسے جیسے جوان ہوتی گئی اس کی یہ صلاحیت رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی اور انہوں نے بھی اس طرح کے سوالات کرنا چھوڑ دیے کہ بچی خواہ مخواہ اپنے بارے میں کونشس ہی نہ ہو جائے۔ جمال احمد نے اسے ہرفن مولا بنانے کا منصوبہ سوچ رکھا تھا۔ انہوں نے اس کے لیے انسٹرکٹرز رکھے جو اسے مارشل آرٹس کی تربیت دیتے۔ اس کے علاوہ رائیڈنگ، سوئمنگ، سائیکلنگ بھی وہ خوب کرتی تھی۔ فلائنگ بھی اس نے اے لیولز میں جانے کے بعد سیکھ لی تھی ویسے بھی وہ بلا کی ذہین تھی جو بات ایک دفعہ سن لیتی پھر نہ بھولتی۔

☆☆☆

جمال احمد کا تعلق ایک زمیندار گھرانے سے تھا۔ گاؤں میں ان کی بہت زمینیں اور ایک بہت بڑی حویلی تھی جس کی ساری دیکھ بھال ان کی ماں جی اپنے شوہر کی وفات کے بعد کر رہی تھیں۔ ماں جی صحت مند، عمر رسیدہ، توانا اور جہاندیدہ عورت تھیں۔ مزارعوں اور ٹھیکداروں سے ہر حساب کتاب خود لیتیں۔ جمال احمد ان کے اکلوتے بیٹے تھے، انہیں بزنس کا کریز ہو گیا اور اس غرض سے وہ شہر آ گئے۔ ایمن ان کی چچا زاد تھیں اور یوں دونوں شادی کے بعد ڈیفنس لاہور میں آ بسے۔ جمال احمد اور ایمن کبھی کبھار گاؤں جاتے یا ماں جی ان سے ملنے شہر آ جاتیں اور جب بھی وہ یمنیٰ کو دیکھتیں تو انہیں جمال احمد اور ایمن پر بہت غصہ آتا۔

''جمال! تم اسے دنیا داری کے بارے میں تو سب کچھ سکھا رہے ہو کچھ دین کا علم بھی دیا ہے یا نہیں؟'' ماں جی غصے سے پوچھتیں۔

''ماں جی! قاری صاحب اسے قرآن پاک پڑھانے آتے ہیں۔'' جمال احمد جلدی سے جواب دیتے۔

''بس......؟ کیا آج کل کے زمانے میں صرف رٹا رٹایا قرآن پڑھنا کافی ہے؟ بچوں کو معلوم ہی نہیں کہ قرآن میں لکھا کیا ہے۔ خدا ان سے کیا چاہتا ہے؟ اور ان کو کیسا مسلمان دیکھنا چاہتا ہے۔ انہیں کون سکھائے گا؟ جمال احمد یہ تم جیسے بے خبر والدین کی کمزوری ہے جو بچوں کے سروں پر من بھر کتابوں کا بوجھ تو لاد دیتے ہیں مگر ایک گھنٹا بھی نہ خود دین کا علم سکھاتے ہیں نہ کوئی عالمِ دین مقرر کرتے ہیں۔ بس ان سے فر فر انگریزی سن کر خوش ہوتے رہتے ہیں۔'' ماں جی نے غصے سے دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو ایمن کے تاثرات بدلنے لگے انہیں بھی غصہ آنے لگا۔

''ماں جی! اب ایسی بھی بات نہیں...... میں اور ایمن ہر طرح سے اس کا خیال رکھتے ہیں کہ وہ کیا پڑھ رہی ہے کیا نہیں؟'' جمال احمد نے صفائی دینے کی کوشش کی۔

''خاک خیال رکھ رہے ہو، تم لوگ تو یہی بھول گئے ہو کہ وہ لڑکی ذات ہے اور اس کی تربیت تم لڑکوں جیسی کر رہے ہو۔'' ماں جی انتہائی غصے میں جمال احمد کو کھری کھری سنا رہی تھیں اور اس معاملے میں ایمن بھی ماں جی کی ہمنوا تھیں۔ جمال احمد فون کے بہانے اٹھ کر چلے گئے اور وہ نہ جانے کتنی دیر بڑبڑاتی رہیں۔ ماں جی بڑی جی دار عورت تھیں۔ بڑے رکھ رکھاؤ اور تمکنت والی۔ زمینوں کے معاملات کے سلسلے میں وہ خود بینک اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ جاتیں اور بڑے بڑے افسران سے بھی ملنے میں تامل نہ کرتیں۔ یہ ان کی انا تھی کہ آج تک انہوں نے اپنا کوئی کام جمال احمد سے نہیں کروایا تھا۔ وہ کبھی ان سے شکوہ بھی نہیں کرتیں انہیں اگر شکوہ تھا تو صرف یہی کہ وہ یمنیٰ کی تربیت ٹھیک نہیں کر رہے جبکہ

جمال احمد اپنی جگہ پر مطمئن تھے کہ وہ اپنی بیٹی کی ایسی تربیت کررہے ہیں جو آج تک کسی نے نہیں کی۔

یمنیٰ کو زیادہ محبت اور لگاؤ باپ سے تھا۔ وہ اپنی ہر بات باپ کے ساتھ شیئر کرتی، ایمن کے ساتھ اس کے تعلقات بس نارمل تھے۔ جمال احمد کے اس رویے کی وجہ سے ایمن اکثر چڑ جاتیں اور یمنیٰ کو خوامخواہ ڈانٹتیں، جس سے وہ ماں سے متنفر رہتی گو کہ ایمن کو اس سے بہت محبت تھی مگر انہوں نے اپنی محبت کا بھرپور مظاہرہ کبھی نہیں کیا تھا شاید انہیں محبت کا اظہار کرنا نہیں آتا تھا یا پھر ان کا انداز محبت بہت مختلف اور گھٹا گھٹا تھا کہ یمنیٰ اس محبت کو کبھی بھرپور انداز میں محسوس نہ کرپائی۔ اس لیے وہ باپ کی ہر بات مانتی اور ماں کی اکثر باتوں کو نظر انداز کردیتی جس سے ایمن چڑ کر اسے ضدی اور خودسر کہہ کر بلاتیں اور یمنیٰ اس بات سے مشتعل ہوکر الٹے سیدھے کام کرتی رہتیں۔

☆☆☆

نیہا کو ابٹن لگانے اس کی ساری سہیلیاں اور سسرال سے صرف لڑکیاں اور چند عورتیں آئی تھیں اور سب ہی کراچی کے امیر کبیر اور نامور خاندانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کی بات چیت، فیشن اور اسٹائل دیکھ دیکھ کر ایمن اندر ہی اندر کڑھ رہی تھیں انہوں نے یمنیٰ کے لیے لاہور کے ایک مشہور بوتیک سے پیچ اور سی گرین کومبینیشن میں بہت اسٹائلش سوٹ خریدا تھا مگر جیسے ہی یمنیٰ نے اسے پہنا تو وہ انتہائی بدصورت لگنے لگی۔ اسے وہ سوٹ بالکل نہیں جچ رہا تھا۔

''مما! یہ کیا کومبینیشن آپ نے چوز کیا ہے؟ بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا۔'' وہ غصے سے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''اسی لیے میں تمہیں کہتی تھی کہ میرے ساتھ خود چلو اور اپنی پسند کا ڈریس لے لو مگر تمہیں تو گھومنے پھرنے سے ہی فرصت نہیں تھی۔ اب میں کیا کرسکتی ہوں۔ تمہیں یہی پہننا پڑے گا۔'' ایمن غصے سے بولیں۔

''میں یہ ہرگز نہیں پہنوں گی۔'' یمنیٰ نے بھی غصے سے جواب دیا۔

''پھر کیا پہنوگی؟'' ایمن نے حیرت سے پوچھا۔

''کم از کم یہ نہیں پہنوں گی...... اور ویسے بھی مجھے شادی کے فضول فنکشنز اٹینڈ کرنے کا کوئی شوق نہیں۔'' وہ کہہ کر غصے سے واش روم میں ڈریس بدلنے چلی گئی۔ ایمن سر پکڑ کر بیڈ پر بیٹھ گئیں۔ سدیدہ انہیں ڈھونڈتی ہوئی اُدھر آگئیں۔

''ایمن...... تم یہاں ہو اور میں تمہیں سارے گھر میں تلاش کررہی ہوں۔ بھئی مہمان خواتین آگئی ہیں۔ جلدی سے تیار ہوکر تم اور یمنیٰ نیچے آجاؤ...... سب لوگ تمہارا پوچھ رہے ہیں۔''

''کیا کروں آپا......؟ اس لڑکی نے تو مجھے اتنا تنگ کررکھا ہے کہ کیا بتاؤں، نہ اسے کوئی رنگ جچتا ہے، نہ کوئی فیشن اگر اپنی پسند کا کوئی ڈریس خریدوں تو وہ اسے پسند نہیں آتا۔ ابھی مجھ سے جھگڑ رہی تھی۔ بوتیک سے میں سب سے مہنگا اور خوب صورت سوٹ خرید کر لائی ہوں مگر نہ تو وہ اسے سوٹ کررہا ہے اور نہ وہ خود اسے پسند کررہی ہے۔'' ایمن نے پریشانی سے کہا۔

''ایمن آج کل لڑکیاں رنگ گورا کرنے کے لیے نہ جانے کیا کچھ لگاتی رہتی ہیں تم کیوں اسے کچھ استعمال کرنے کو نہیں دیتیں۔'' سدیدہ نے رازداری سے کہا۔

''آپا! کوئی ایک کریم...... جمال کے ساتھ ہر بزنس ٹور پر میں صرف اس کے لیے کاسمیٹکس خرید کر لاتی ہوں۔ پارلر لے کر جاتی ہوں مگر وہ کچھ استعمال ہی نہیں کرتی۔ ضدی بھی تو بہت ہے۔'' ایمن نے افسردگی سے کہا۔

''ایمن...... تم پریشان مت ہو۔ وہ ہے

کہاں......؟'' سدیدہ نے پوچھا۔

''واش روم میں...... ڈریس چینج کرنے......'' ایمن نے آہستہ سے جواب دیا۔ یمنیٰ ڈریس ہینگر میں لٹکائے واش روم سے باہر نکلی تو اس نے جینز کے ساتھ آف وائٹ کاٹن کا کُرتہ پہن رکھا تھا۔

''یمنیٰ بیٹے! تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں۔ نیہا کی فرینڈز تمہارے بارے میں پوچھ رہی ہیں۔'' انہوں نے محبت سے کہا۔

''کیوں......؟ پھر مجھ پر ہنسنا چاہتی ہوں گی۔ سب چیپ لڑکیاں ہیں۔ آئی ہیٹ دیم...... آنٹی میں ایسی بدتمیز اور اسٹوپڈ لڑکیوں کی کمپنی انجوائے نہیں کرتی۔'' یمنیٰ نے غصے سے کہا۔

''کم آن بیٹا! ایسی بات نہیں۔ اپنے ذہن سے ساری نیگیٹو باتوں کو نکال دو اور تیار ہوکر نیچے آجاؤ۔'' سدیدہ نے کہا۔

''سوری آنٹی...... کل انہوں نے جو بدتمیزی کی تھی، آپ بھول گئی ہوں گی مگر میں نہیں بھولی...... انہوں نے ڈھولک کے ساتھ گانوں میں میرے کتنے نام ڈالے تھے اور آپ سب لوگ ہنستے رہے تھے۔'' یمنیٰ نے غصے سے کہا۔

''بیٹا! شادی بیاہ پر ایسے ہی چلتا ہے۔ مجھے بھی تو نہ جانے کیا کچھ کہہ رہی تھیں تمہاری مما کو بھی...... کوئی بھی مائنڈ نہیں کرتا۔ تم بھی ایسا مت سوچو۔'' انہوں نے اسے سمجھایا۔

''آنٹی مجھے ایسے فنکشنز پسند نہیں۔ میں شہیر کے ساتھ باہر جارہی ہوں اور ویسے بھی میرے پاس کوئی اچھے ڈریسز نہیں...... میں کیا پہنوں؟'' اس نے ایک اور بہانہ گھڑا تو ایمن حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئیں۔

''آپا! یہ ڈریس دیکھیں۔ تیس ہزار کا ہے اور یہ دیکھیں پینتیس ہزار کا...... یہ پچاس ہزار کا...... دو لاکھ کے میں اس کے ڈریسز خرید کر لائی ہوں اور یہ کہہ رہی ہے کوئی اچھا ڈریس اس کے پاس نہیں۔ اوہ گاڈ...... یہ لڑکی تو مجھے پاگل کردے گی۔ میں مر کیوں نہیں جاتی۔'' ایمن ہائپر ہوکر چلّانے لگیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کردیا۔

''ایمن! ایمن...... خدا کے لیے عقل سے کام لو۔ یہ کیا طریقہ ہے بات کرنے کا...... یہ بچی ہے، اسے آرام سے سمجھاؤ۔'' سدیدہ نے بہن کو نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''آپا! اس نے میری زندگی عذاب میں ڈال رکھی ہے۔ جو کہتی ہوں اس سے الٹا کام کرتی ہے۔ ہر بات میں نقص، ہر بات میں کیڑے۔'' ایمن سسکنا شروع ہوگئیں۔

''یمنیٰ بیٹا! ٹھیک ہے تم شہیر کے ساتھ ہی جاؤ میں اسے کہتی ہوں جہاں سے جو ڈریسز تمہیں پسند آئیں وہ تمہیں اس کی شاپنگ کرادے، اوکے......'' سدیدہ نے اسے سمجھایا تو وہ ایمن کی طرف دیکھ کر زیرِلب مسکراتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی اور سدیدہ نے شہیر کو اس کے موبائل پر فون کرکے سب کچھ سمجھادیا۔

''آج کل کے بچے بہت مختلف ہیں۔ ان کے بہت سارے کامپلیکسز ہیں اس لیے انہیں ذرا ٹیکنیکل انداز میں ٹریٹ کرنا چاہیے نہ کہ چیخ چلّا کر اور رو دھو کر اور ایمن ایک بات بتاؤں جب بھی مائیں بچوں کے سامنے یوں رو دھو کر اپنی کمزوری کا اظہار کرتی ہیں تو پھر بچے ساری زندگی ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کو ایکسپلائٹ کرتے ہیں اور بعد میں اس سچویشن کو انجوائے بھی کرتے ہیں۔ تم دیکھو جتنی اسٹرونگ اور dominating مائیں ہیں، ان کے بچے ان کے قابو میں رہتے ہیں وہ انہیں آسانی سے ڈاج نہیں کرسکتے۔ اس لیے تم بھی اپنا اسٹائل بدل لو اب تو وہ خودسر ہوچکی ہے جو وہ چاہے اسے کرنے دو۔ میں نے شہیر اور نیہا کو کبھی اتنی اجازت نہیں دی کہ وہ مجھے ایکسپلائٹ کریں۔'' سدیدہ نے کہا تو ایمن بےبسی سے ان کی طرف

دیکھنے لگیں۔
”آپا! آپ کے شوہر امریکا میں رہتے ہیں اور ساری ذمّے داری آپ ہی پر ہے۔ آپ ہی بچوں کو جیسے چاہیں ٹریٹ کرتی ہیں مگر میرا مسئلہ دوسرا ہے۔ جمال اس کا بھرپور ساتھ دیتے ہیں۔ دونوں کی ایک بات ہے بُرا کون بنتا ہے؟ میں۔ جمال بھی مجھ سے خفا رہتے ہیں کہ میں یمنیٰ کو ٹھیک طریقے سے ٹریٹ نہیں کرتی اور یمنیٰ بھی مجھ سے خفا رہتی ہے کہ ماں ہر وقت اسے ڈانٹتی رہتی ہے۔ آپ خود دیکھیں یہ کیسے کیسے مجھے زچ کرتی ہے۔“ ایمن بڑی بے چارگی سے کہہ رہی تھیں۔
”ہاں ...... تم بھی ٹھیک کہتی ہو لیکن یمنیٰ عام لڑکیوں سے بالکل مختلف ہے۔ اس کا اندازِ گفتگو، اس کا لائف اسٹائل کافی حد تک لڑکوں جیسا ہے اور لڑکوں سے اس کی دوستی بھی زیادہ ہے۔ وہ لڑکیوں کو ناپسند کرتی ہے۔ بہرحال کوئی پریشانی کی بات نہیں۔ ٹھیک ہو جائے گی۔ تم تو تیار ہو کر نیچے آؤ سب مہمان تمہارے منتظر ہیں۔“ انہوں نے نرمی سے بہن کو سمجھاتے ہوئے کہا تو انہوں نے گہری سانس لی اور تیار ہونے لگیں۔

☆☆☆

شہیر، یمنیٰ کو شہر کے مشہور بوتیکس میں لے کر گیا تھا مگر اسے کوئی بھی ڈریس پسند نہیں آرہا تھا۔ وہ بھی تنگ آگیا تھا۔
”یمنیٰ آخر تم کیسا ڈریس چاہتی ہو؟“ شہیر نے جھنجلا کر پوچھا۔
”آئی ڈونٹ نو...... دیکھ تو رہی ہوں جو اچانک اچھا لگے گا وہ خرید لوں گی۔“ اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔
”اتنے اسٹائلش آؤٹ فٹس کو تم ریجیکٹ کر چکی ہو، اب کچھ تو چوز کرو۔“ شہیر نے ایک بوتیک میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔
”کیوں، کوئی زبردستی ہے کیا؟ پسند آئے گا تو خریدوں گی۔“ وہ منہ بنا کر قطعیت سے بولی۔
”اوکے...... جب کوئی پسند آئے تو بتا دینا۔“ شہیر خفگی سے بولا۔ وہ مختلف ڈریسز دیکھنے لگی اور ایک انتہائی آڈ کومبینیشن میں چھوٹی سی شرٹ اور ٹراؤزر اسے پسند آیا۔
”شہیر! یہ سوٹ اچھا ہے، اسے پیک کرالو۔“ یمنیٰ نے سوٹ کی طرف اشارہ کیا۔
”کیا......! یہ ...... یہ ڈریس تمہیں پسند آیا ہے؟“ شہیر نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔
”ہاں، اٹس ویری نائس۔“ وہ مسکرا کر بولی۔
”سوچ لو...... آئی ایم شیور...... تمہاری مما کو یہ بالکل بھی پسند نہیں آئے گا۔“ شہیر نے حیرت سے کہا۔
”چھوڑو انہیں...... مجھے اپنی چوائس کے ڈریسز پہننے ہیں۔ ان کی چوائس کے نہیں۔ تم پیمنٹ کرو۔“ اس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ اس نے پرائس ٹیگ پڑھا پانچ ہزار، شاید بوتیک کا سب سے پرانا اور معمولی سوٹ تھا جو اسے پسند آیا تھا۔ شہیر بھی چونک گیا تھا۔ اس نے پیمنٹ کی اور خاموشی سے دونوں باہر نکل آئے۔ لیمن اور اوپیک گرین کلر کا انتہائی گندا سا کومبینیشن پہن کر جب وہ فنکشن میں آئی تو ہر ایک نے اس کی طرف انتہائی حیرت سے دیکھا۔ ایمن اسے دیکھ کر جل ہی گئیں اور سدیدہ کی طرف بے بسی سے دیکھا۔ سدیدہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ نیہا کی دوستوں نے ایک دوسرے کو اشارے کیے جن کا مفہوم یمنیٰ بخوبی سمجھ گئی۔ نیہا نے بھی حیرت سے اسے دیکھا۔
”یار! تمہارا کلر کومبینیشن بہت ایکسیلنٹ ہے۔ اتنا یونیک ڈریس تم نے کہاں سے لیا اور تمہیں یہ بہت سوٹ بھی کر رہا ہے۔“ نیہا کی ایک دوست دُریّہ نے شرارتی لہجے میں یمنیٰ سے کہا۔
”تم پہن لو۔“ یمنیٰ نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔
”ارے...... ارے نہیں، میں تو یونہی تعریف کر رہی تھی۔“ دُریّہ نے کہا۔
”کیا یہ کومبینیشن تم نے پہلی بار دیکھا ہے جو اتنی crush ہو رہی ہو۔“ یمنیٰ نے قدرے تلخی سے کہا تو دُریّہ خاموش ہو کر رہ گئی۔
”یار نیہا! تمہاری کزن تو بالکل ہی بھڑ ہے، بات کرو تو کاٹنے کو دوڑتی ہے۔ اسے پرابلم کیا ہے؟“ دُریّہ نے موقع دیکھ کر نیہا سے کہا۔
”شاید اپنے کامپلیکیشن کی وجہ سے کسی کامپلیکس کا شکار ہے۔“ نیہا نے توجیح پیش کی۔
”کامپلیکس...... آئی ڈونٹ بلیو اِٹ...... وہ بہت کونفیڈنٹ ہے بلکہ اوور کونفیڈنٹ ہے۔“ دُریّہ نے کہا۔
”وہ شروع سے ہی ایسی ہے۔ اس لیے میں اس کے ساتھ زیادہ کبھی فرینک نہیں ہوئی۔“ نیہا نے بتایا اور دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرنا شروع ہو گئیں۔ یمنیٰ منہ بناتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

☆☆☆

”رشنا پلیز...... مجھے اکنامکس کے نوٹس بھیج دو۔ میں نے پیپر کی تیاری کرنی ہے۔ تم نے کب سے لیے ہیں اور ابھی تک واپس نہیں کیے۔“ ردا نے رشنا کو فون پر کہا۔
”اوکے! آج دوپہر کو جب توقیر بھائی گھر لنچ کرنے آئیں گے تو ان کے ہاتھ بھیج دوں گی، ان سے لے لینا۔“ رشنا نے کہا تو ردا کا دل دھڑکنے لگا۔
”ن...... نن...... نہیں...... تم خود مجھے دینے آجاؤ۔“ ردا بولی۔
”نہیں ردا، میں بہت بزی ہوں۔ بائی داوے ان سے ریسیو کرتے ہوئے تمہیں کیا پرابلم ہے؟“ رشنا نے معنی خیز انداز میں کہا اور خود ہی ہنسنے لگی۔
”اُفوہ...... میں تو یونہی کہہ رہی تھی۔ تم تو خوامخواہ بات کا بتنگڑ بنا لیتی ہو۔“ ردا نے جان چھڑانا چاہی اور غصے سے فون بند کر دیا مگر اس کا دل نہ جانے کیوں زور زور سے دھڑکنا شروع ہو گیا۔ توقیر کا سامنا کرتے ہوئے وہ گھبراتی تھی۔ توقیر خوب صورت اور اسمارٹ تھا مگر نہ جانے کیوں ردا کو وہ کبھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ ویل ایجوکیٹڈ اور ویل گرومڈ پرسنالٹی کا مالک تھا۔ الیکٹریکل انجینئر کے طور پر ایک سرکاری ادارے میں جاب کرتا تھا مگر ردا اس سے ہمیشہ خائف رہتی۔ اس کی وجہ اسے خود سمجھ میں نہ آتی تھی۔ اس نے نہ تو کبھی اس سے کوئی بدتمیزی کی تھی اور نہ ہی وہ چھچھورا تھا مگر کچھ ایسا ضرور تھا جو ردا کو وہ بھاتا نہیں تھا۔ وہ نوٹس دینے آیا تو اس وقت گھر پر کوئی نہیں تھا سوائے اس کے اور خدیجہ بیگم کے اور وہ بھی سو رہی تھیں۔ بیل بجنے پر وہ گیٹ پر گئی تو توقیر چشمہ لگائے کھڑا تھا اسے دیکھ کر اس نے چشمہ اتارا اور مسکرا کر ردا کی طرف دیکھا۔
”کیسی ہیں آپ؟“ توقیر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
”ٹھیک ہوں۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔
”آپ کچھ خفا خفا سی لگ رہی ہیں، کیا بات ہے؟“ توقیر نے آہستہ سے پوچھا۔
”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں کیوں خفا ہوں گی ویسے نوٹس کہاں ہیں؟“ وہ اس سے زیادہ باتیں کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔
”نوٹس بھی مل جاتے ہیں۔ کیا آپ اندر نہیں بلائیں گی؟“ توقیر نے شوخ لہجے میں پوچھا۔
”سوری، اس وقت بھائی گھر پر نہیں......“ اس نے جلدی سے کہا۔
”ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی...... یہ لیجیے اپنے نوٹس...... اور ان کے اندر آپ کو ایک کاغذ ملے گا، اسے اچھی طرح سے پڑھ لیجیے گا۔“ توقیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔
”کیسا کاغذ......؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔
”کوئسچن پیپر......“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔
”کیا مطلب...... میں سمجھی نہیں ؟“
”پڑھ کر سب کچھ سمجھ آجائے گا بلکہ پہلی دفعہ تو

ایسی چیز پڑھ کر چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ یہ میرا تجربہ نہیں۔ اکثر لوگ یہی کہتے ہیں۔" وہ ہنستے ہوئے بولا اور گاڑی میں بیٹھ کر اسے دیکھنے لگا۔ ردا حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی اور بھاگ کر اندر چلی گئی۔ اپنے کمرے میں جا کر جلدی سے نوٹس کھولے تو اس میں سے ایک خط نما کاغذ نکلا۔ اس نے جلدی سے اسے کھولا اور پڑھنے لگی۔

"اس طرح دل میں سماؤ گے
یہ معلوم نہ تھا
اس طرح دل کو تڑپاؤ گے
یہ معلوم نہ تھا
سوچا تھا کبھی یاد نہیں آؤ گے
مگر اس قدر یاد آؤ گے
یہ معلوم نہ تھا

ردا تم میری پہلی اور آخری محبت ہو۔ تمہیں چاہنا، زندگی کی سب سے بڑی تمنا ہے اور تمہیں پانا زندگی کا حاصل..... کیا میں یہ امید رکھوں کہ میری اس چاہت کے حصول میں تم میرا ساتھ دو گی۔

توقیر"

ردا نے کاغذ پڑھ کر پرزے پرزے کر ڈالا۔

"اسٹوپڈ..... نہ جانے اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے..... انتہائی چھچھورا اور فلرٹ قسم کا انسان ہے جسے اتنی تمیز نہیں کہ بہن کی دوست کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیے۔ اس کے ساتھ رومانس شروع کر دیا ہے۔ میرے بھائیوں نے تو کبھی ایسے نہیں کیا۔ میری دوستوں کو ہمیشہ میری طرح ہی سمجھا اور ان کی عزت کی ہے، یہ بھی رشنا کی طرح ہی ہے۔ آئندہ میں دونوں سے ہی نہیں ملوں گی۔" ردا نے غصے سے سوچا اور کاغذ کے پرزے پرزے کر کے ڈسٹ بن میں پھینک دیے اور نوٹس کھول کر پڑھنا شروع ہو گئی مگر پڑھتے پڑھتے اچانک دماغ کسی اور طرف چل پڑتا۔ سوچ کہیں اور بھٹکنے لگتی۔ ذہن میں توقیر کے لکھے ہوئے اشعار گونجنے لگتے اور وہ جھنجلانے لگتی۔

"اُف خدایا! کیا مصیبت ہے..... یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ میرے پڑھنے کے دن ہیں اور کیا بکواس سوچیں میرے ذہن میں آ رہی ہیں اور ان سب کا ذمے دار توقیر ہے اگر میں فیل ہو گئی تو میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گی۔" اسے رہ رہ کر توقیر پر غصہ آنے لگا۔ رات کو سونے لگی تو توقیر کی باتیں، اس کی مسکراہٹ، اس کا شوخ و شریر لب و لہجہ اور اس کا خط اور خط میں اس کی باتیں اس کی چاہت اور تمنا وہ ساری رات سو نہ سکی..... کروٹیں بدلتی رہی اور توقیر کو کوستی رہی۔

"میں نے اس سے ایسا کیا کہا ہے اور کب کہا ہے کہ وہ یوں اظہار محبت کرنے پر مجبور ہو گیا۔" وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اس کی رشنا سے دوستی فرسٹ ائیر سے تھی اور کبھی کبھار وہ ان کے گھر چلی جاتی تھی یا رشنا ان کے گھر آ جاتی تھی۔ توقیر، رشنا کو پک اینڈ ڈراپ کرنے آتا اور اس کے بھائیوں نے بھی اس سے کبھی بات نہیں کی تھی سوائے سلام دعا کے اور وہ کیسے اتنا سب کچھ assume کر بیٹھا..... خود بخود ہی اس نے اسے چاہت اور محبت قرار دے دیا۔

وہ سوچ سوچ کر تھک جاتی مگر ان سب باتوں کے باوجود وہ اس کے دل میں گھر نہیں کر پا رہا تھا اس کے اقرارِ محبت نے ردا کو مسرور نہیں بلکہ اس سے متنفر کر دیا تھا۔ وہ اس کے لیے دل میں کوئی نرم گوشہ نہیں محسوس کر رہی تھی بلکہ اس کا دل اس کے خلاف بول رہا تھا۔ اسے اس سے محبت کے بجائے نفرت سی محسوس ہو رہی تھی جس نے اس کی سوچوں کو منتشر کر دیا تھا۔

"میں تم سے کبھی محبت نہیں کر سکتی اور نہ ہی کروں گی۔" وہ غصے سے سوچتی۔

"اس شخص کو اتنا خیال نہیں آیا کہ میرے ایگزامز شروع ہونے والے ہیں اور ایسی باتیں لکھ کر مجھے ڈسٹرب کر رہا ہے۔ کیا یہ موقع تھا اظہارِ محبت کا.....؟" اسے پھر اس پر غصہ آنے لگا۔

صبح ناشتے کے بعد وہ پڑھنے کے لیے بیٹھی تو رشنا کا فون آگیا۔

"یار..... تجھے نوٹس ملے ہیں کہ نہیں۔ توقیر بھائی سے پوچھتی ہوں تو کہتے ہیں کہ راستے میں کہیں گم ہو گئے۔ اور تمہارا بھی کوئی فون نہیں آیا، میں پریشان ہو رہی تھی۔" رشنا نے فکر مندی سے پوچھا۔

"نوٹس تو وہ مجھے خود دے کر گئے تھے۔ پھر کیوں ایسا کہا؟" ردا نے حیرت سے پوچھا۔

"مجھے تنگ کرنے کے لیے کہا ہوگا۔ سچ بہت مذاق اور چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے تو گھر کی رونق ہیں۔ بہت ہی جولی ہیں۔ اب دیکھنا میں ان کا کیا حال کرتی ہوں۔" رشنا نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں، انہیں چھوڑنا مت..... خوب ان کی بے عزتی کرنا۔" نادانستہ ردا کے منہ سے نکلا۔

"بے عزتی..... کیوں؟" رشنا نے حیرت سے پوچھا تو وہ ایک دم بوکھلا گئی۔

"آئی ایم سوری! یونہی میرے منہ سے نکل گیا۔ دراصل انہوں نے تم سے جھوٹ بولا اس لیے میرے ذہن میں آیا۔" ردا نے جلدی سے بات کو سنبھالنے کی کوشش کی اور فوراً ہی فون بند کر دیا اور پھر سوچ میں پڑ گئی کہ اس نے رشنا سے جو کچھ بھی کہا غلط کہا ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔

☆☆☆

رشنا نے سارے گھر میں اِک ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ ایگزامز کے دوران ہی ردا کی برتھ ڈے تھی۔ اور وہ ردا کی برتھ ڈے بھی سیلیبریٹ کرنا چاہتی تھی مگر پیپر کی تیاری بھی ابھی باقی تھی۔

"کیا کروں..... ابھی گفٹ بھی خریدنا ہے۔" وہ سوچ میں پڑ گئی اور توقیر کے کمرے میں گئی۔ وہ آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔

"توقیر بھائی! پلیز..... میرا ایک کام کر دیں۔" رشنا نے التجائیہ انداز میں کہا۔

"اوہ! کام..... یقیناً ردا کو کچھ دینا یا پھر اس سے کچھ لینا ہوگا۔" توقیر نے مسکرا کر پوچھا۔

"ہاں..... وہ دراصل آج اس کی برتھ ڈے ہے اور کل ہم دونوں کا پیپر بھی اور پیپر بہت ٹف بھی ہے تو....." وہ کہتے ہوئے رکی۔

"تو.....؟" توقیر نے بالوں میں برش کرتے ہوئے رک کر اس کی جانب دیکھ کر پوچھا۔

"تو..... آپ اپنی پسند کا..... آئی مین..... میری پسند کا اچھا سا گفٹ لے کر ردا کو اس کے گھر دے آئیں۔" رشنا نے کہا۔

"سوری، میں فارغ نہیں..... اور بائی دا وے۔ تم نے مجھے اپنا ملازم کیوں سمجھ رکھا ہے کہ میں تمہارا یہ کام کر دوں..... وہ کر دوں۔" توقیر نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

"توقیر بھائی..... پلیز! پہلی اور آخری بار..... اچھا آئندہ نہیں کہوں گی۔" رشنا نے التجا کرتے ہوئے کہا۔

"تم ہر بار یہی کہتی ہو..... اور اگلی بار پھر تم رونی سی صورت بنا کر میرے پاس آ جاتی ہو کہ مجھے تم پر ترس آنے لگتا ہے۔" توقیر نے منہ بنا کر کہا۔

"اس کا مطلب ہے آپ جا رہے ہیں۔" رشنا نے جلدی سے کہا۔

"نہ گیا..... تو..... تم نے ٹینشن میں رہنا ہے اور اگر کل تمہارا پیپر اچھا نہ ہوا تو سارا الزام مجھ پر آئے گا۔" توقیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تھینک یو..... وری مچ! توقیر بھائی..... آئی ایم سو گریٹ فل..... یہ لیں پیسے اور ان سے ردا کے لیے گفٹ خرید لیجیے گا۔" رشنا نے پانچ ہزار کا نوٹ اسے پکڑاتے ہوئے کہا۔

"اتنے تھوڑے پیسے..... ان میں کیا آئے گا؟" توقیر نے پانچ ہزار کا نوٹ پکڑ کر منہ بناتے ہوئے کہا۔

''کیا واقعی......؟ مگر ان پیسوں سے تو بہت اچھا گفٹ آسکتا ہے۔'' رشنا نے کہا۔

''ہاں......تم خریدو گی تو ضرور آسکتا ہے۔ اگر میں خریدوں تو کچھ بھی نہیں آئے گا۔'' توقیر نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''تو......آپ کوئی نارمل سا گفٹ خریدلیں۔'' رشنا نے کہا۔

''لیکن انسلٹ تو میری ہوگی کہ گفٹ دینے میں گیا اور وہ بھی نارمل سا...... اس لیے تم اپنے پیسے اپنے پاس رکھو...... میں کوئی اچھا سا گفٹ خرید کر اسے دے دوں گا۔'' وہ کوٹ پہن کر اپنا آفس بیگ اٹھاتے ہوئے بولا تو رشنا مسکرانے لگی۔

☆☆☆

توقیر نے رشنا کی طرف سے بہت قیمتی پرفیوم، کیک اور خوب صورت بوکے خریدا اور اپنی طرف سے شاعری کی کتابوں کا ایک سیٹ اور چاکلیٹس کا ایک پیک اور ایک کتاب میں اپنی طرف سے ایک محبت نامہ لکھ کر اسے خوب صورتی سے پیک کروا کر دینے چلا گیا۔ ردا اپنے کمرے میں پیپر کی تیاری کرنے میں مصروف تھی جب زاہدہ (ملازمہ) نے اسے اطلاع دی کہ کوئی اس سے ملنے آیا ہے وہ چونکی اور حیرت کے تاثرات چہرے پر لیے ڈرائنگ روم میں گئی تو دیکھا توقیر گفٹس کے ڈھیر کے ساتھ وہاں موجود تھا۔

''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو......'' توقیر نے بڑی خوش دلی سے اسے وِش کیا۔

''آپ......؟'' ردا نے انتہائی حیرت سے کہا۔

''ایکچو ئیلی...... رشنا ایگزامز کی وجہ سے نہیں آسکی۔ اس لیے اس نے مجھے یہ گفٹس دے کر بھیجا ہے۔'' اس نے بوکے، کیک اور پرفیوم کا پیک اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اور یہ میری طرف سے۔'' بقیہ گفٹس دیتے ہوئے توقیر نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''آپ......آپ نے کیوں تکلف کیا؟'' وہ بہ مشکل بولی۔

''محبت میں تکلف کیسا......؟'' توقیر نے فوری جواب دیا۔

''کیسی محبت......؟'' ردا نے خفگی سے کہا۔

''وہی جو میں آپ سے کرتا ہوں۔'' توقیر نے جواب دیا۔

''پلیز! آئی ایم سِک آف اِٹ...... ہر وقت محبت...... محبت آپ کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ میں نے آپ سے کہا ناں......'' وہ خفگی سے بول رہی تھی کہ اسی لمحے خدیجہ بیگم ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔

''ارے......توقیر بیٹا...... کیسے ہو؟'' خدیجہ بیگم نے محبت سے اس کے سر پر پیار دیتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہوں آنٹی!'' وہ مسکرا کر بولا۔

''ردا بیٹے کوئی چائے وغیرہ...... زاہدہ سے کہو......'' خدیجہ بیگم نے کہا۔

''نہیں آنٹی......پھر کبھی سہی......ابھی میں بہت بزی ہوں۔'' توقیر نے مؤدبانہ کہا اور اجازت لے کر چلا گیا۔ ردا کے چہرے پر غصے کے تاثرات تھے۔

''ارے واہ! رشنا تو تم پر آج کل بہت مہربان ہے۔ اتنے زیادہ تحائف بھیج دیے۔'' خدیجہ بیگم نے تحائف کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ردا جواب میں زبردستی مسکرا دی اور تحائف اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گئی۔ توقیر کے تحائف کو اس نے ریپر پھاڑ کر ٹیبل پر پھینک دیا اور خود پڑھنے میں مصروف ہوگئی۔ اسے توقیر پر بار بار غصہ آرہا تھا۔ وہ اس کے دیے ہوئے گفٹس کو دیکھتی تو اور غصہ آنے لگتا۔

☆☆☆

توقیر نے اپنے دل کی بات ردا تک پہنچائی تھی اور اب وہ منتظر تھا کہ ردا کا کیا ری ایکشن ہوتا ہے۔ وہ سارا وقت منتظر رہا کہ ردا جب اس کے دیے ہوئے تحائف کو کھول کر دیکھے گی تو اس کے اندر اس کا

لکھا ہوا پیغامِ محبت پا کر ضرور اسے کال کرے گی۔ اٹھتے بیٹھتے اس کا ذہن ردا کے خیالوں میں ہی کھویا رہا۔ جیسے ہی اس کا موبائل بجتا تو وہ مضطرب ہو کر موبائل اٹھاتا کہ شاید ردا کی کال آئی ہو......مگر ہر بار کسی اور کی کال ہوتی۔

''ردا کے پیپرز ہو رہے ہیں۔ وہ کیسے کال کرسکتی ہے۔'' وہ اپنے دل کو تسلی دے کر مطمئن ہوجاتا......مگر دل تھا کہ اس کی بات سن کر ایک لمحے کو مطمئن ہوتا تو اگلے ہی لمحے مزید مضطرب ہو کر بے قرار ہونے لگتا۔

''ممکن ہے......ردا نے تحائف ہی نہ کھولے ہوں۔'' وہ سوچتا اور پریشان ہوجاتا...... ''مجھے رشنا سے پوچھنا چاہیے......ردا نے اسے تو کچھ بتایا ہوگا۔'' وہ یہی سوچ کر رشنا کے کمرے میں گیا۔

''تھینک یو ویری مچ توقیر بھائی...... ردا بہت خوش تھی اور وہ مجھے بہت تھینکس بول رہی تھی۔ آپ کی چوائس کا پرفیوم اسے بہت پسند آیا...... کیک اور بوکے بھی...... تھینکس اَلاٹ......'' رشنا قدرے پُرجوش انداز میں جذباتی ہو کر بولی۔

''اور ......اور اس نے کچھ نہیں بتایا؟'' نادانستہ توقیر کے منہ سے نکلا۔

''کیا......؟'' رشنا کے منہ سے حیرت سے نکلا۔

''آئی مین...... گفٹس کے بارے میں۔'' توقیر نے ذو معنی انداز میں پوچھا۔

''میں نے بتا تو دیا ہے۔ پرفیوم، کیک اور بوکے کے بارے میں......آپ اور کون سے گفٹس کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ کیا کوئی اور بھی......؟'' رشنا نے شرارت سے پوچھا۔

''نہیں......نہیں میں انہی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔'' توقیر جلدی سے بولا۔

''تھینک یو! توقیر بھائی...... آئی ایم پراوڈ آف یو۔'' رشنا نے کہا تو وہ مسکرا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

ردا کا آخری پیپر تھا اور وہ بہت خوش تھی کہ ایگزامز سے جان چھوٹی اور اب وہ جی بھر کر سوئے گی۔ نہ اب پیپرز کی ٹینشن ہوگی اور نہ کالج جانے کی فکر۔

''امی آج میں نے بہت سونا ہے۔ کوئی مجھے نہ اٹھائے۔'' اس نے کالج سے آکر ماں سے کہا۔ اس کی آنکھیں نیند اور تھکاوٹ سے بند ہو رہی تھیں۔

''بیٹا! کھانا کھا کر سوجانا۔'' خدیجہ بیگم نے محبت سے کہا۔

''نہیں امی...... مجھے صرف اور صرف سونا ہے۔'' وہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور جیسے ہی بیڈ پر لیٹی تو اس کے موبائل پر کال آنے لگی، اس نے بیزاری سے ہیلو کہا تو دوسری جانب توقیر تھا۔

''سوری فار ڈسٹربنگ یو......بس میں تو آپ کے ایگزامز ختم ہونے کا شدت سے انتظار کر رہا تھا۔'' توقیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیوں...... آپ کو میرے ایگزامز سے کیا کنسرن......؟'' ردا خشک لہجے میں بولی۔

''آپ کی ہر بات سے مجھے کنسرن ہے۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''کیوں......؟'' ردا نے چونک کر پوچھا۔

''اچھا یہ بتائیں آپ کو شاعری کی کتابیں کیسی لگیں......آئی مین میرا انتخاب......شاعری کے بارے میں......میں بہت choosy ہوں۔'' وہ بولا۔

''کون سی کتابیں...... کیا میرے پاس اتنا ٹائم تھا کہ میں اپنی کورس کی کتابیں چھوڑ کر شاعری کی کتابیں پڑھتی اور ویسے بھی مجھے شاعری سے کوئی لگاؤ نہیں۔ زاہدہ نے شیلف میں لگا دی ہیں کسی روز وقت ملے گا تو دیکھ لوں گی۔'' اس نے منہ بنا کر بیزاری سے کہا۔

''ردا.....آپ کے لہجے میں اتنی بیزاری کیوں ہے۔ کیا آپ...... میرے بارے میں کچھ محسوس نہیں کرتیں؟ توقیر نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"پلیز...... مجھ سے یہ فضول باتیں مت کریں...اور بتائیں آپ نے اس وقت فون کیوں کیا ہے؟" وہ خفگی سے بولی۔

"ٹھیک ہے تو سنیں، مجھے آپ سے بہت محبت ہے، آپ کو پرپوز کرنا چاہتا ہوں اور اسی سلسلے میں...... میں اپنے گھر والوں کو آپ کے ہاں بھیجنا چاہتا ہوں۔" توقیر نے کہا تو ردا کو غصہ آ گیا اور اس نے موبائل آف کر کے رکھ دیا۔ وہ کمرے کی لائٹ آف کر کے لیٹ گئی مگر نیند اب اس سے روٹھ چکی تھی۔ وہ بے چین ہو کر کروٹیں بدلتی رہی۔

☆☆☆

نیہا کی مہندی کی رسم کی تیاریاں سرِ شام ہی شروع ہو چکی تھی۔ مہندی کا فنکشن ایک بہت بڑے ہوٹل میں ہونا تھا۔ گھر کے سب لوگ سہ پہر سے ہی تیاریوں میں مصروف تھے۔ ایمن نے یمنیٰ کا سوٹ نکال کر پریس کروا کر رکھ دیا تھا۔

"ایمن...... یمنیٰ کہاں ہے؟" سدیدہ نے اس کے کمرے میں آ کر پوچھا۔

"شہیر کے ساتھ کہیں گئی ہوگی......" ایمن نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"اچھا...... شہیر بھی گھر پر نہیں...... پھر دونوں کہیں گئے ہوں گے، آج صبح سے میں نے اسے نہیں دیکھا تو پریشان ہو گئی تھی۔" آپا نے کہا تو ایمن بھی چونک گئیں۔

"ہاں میں نے بھی اسے صبح سے نہیں دیکھا...... شہیر کو فون کر کے پوچھیں کہ وہ کہاں ہے اور کیا یمنیٰ بھی اس کے ساتھ ہے؟" ایمن نے پریشانی سے کہا۔

"ٹھیک ہے...... میں اسے فون کرتی ہوں۔"

"ہیلو بیٹا! اس وقت کہاں ہو؟" سدیدہ نے بیٹے کو فون کر کے پوچھا۔

"ممی! میں اپنے فرینڈز کے ساتھ بزی ہوں۔" شہیر نے جواب دیا۔

"کیا یمنیٰ بھی تمہارے ساتھ ہے؟" سدیدہ نے پوچھا۔

"نہیں تو......" شہیر نے جواب دیا۔

"ہم لوگ تو یہی سمجھ رہے ہیں کہ وہ تمہارے ساتھ گئی ہے...... تو پھر وہ کہاں ہے؟" سدیدہ نے فکر مندی سے پوچھا۔

"آئی ڈونٹ نو...... مما! بٹ اینی وے میں گھر آ رہا ہوں، آپ لوگ پریشان مت ہوں۔" شہیر نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

"آپا! کیا یمنیٰ، شہیر کے ساتھ نہیں تو پھر وہ کہاں گئی؟ یہاں تو وہ کسی کو نہیں جانتی...... آپ کی ساری گاڑیاں گھر پر ہی ہیں ناں؟" ایمن نے پریشانی سے پوچھا۔

"نیچے ڈرائیور سے پوچھتی ہوں۔" سدیدہ اور وہ نیچے آ گئیں۔ ڈرائیور سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ شہیر کی گاڑی کے علاوہ ساری گاڑیاں بھی گھر پر ہیں۔

"تو پھر وہ کہاں جا سکتی ہے؟" ایمن نے فکر مندی سے سوچا اور اس کا موبائل نمبر ملایا مگر وہ آف جا رہا تھا۔

"یا اللہ! میں کیا کروں؟ اس لڑکی کو کہاں ڈھونڈوں۔" ایمن نے گھبرا کر کہا۔ گھر میں ہر طرف یمنیٰ کی گمشدگی کا ذکر ہونے لگا۔ شہیر بھی آ گیا اور سدیدہ کے شوہر ظہیر بھی پریشان ہو کر ادھر اُدھر تلاش کرنے لگے۔ ڈیفنس کے ایریے سے وہ کہاں غائب ہو سکتی ہے۔ وہ یقیناً خود ہی کہیں گئی ہوگی۔

"ظہیر بھائی آپ جمال کو فون کریں اور انہیں یمنیٰ کے بارے میں بتائیں۔" ایمن نے روتے ہوئے کہا۔

"ایمن حوصلہ کرو...... پہلے ہمیں ڈھونڈ لینے دو پھر دیکھتے ہیں۔" ظہیر نے انہیں سمجھایا۔

"ہائے میری بیٹی کہاں چلی گئی......" ایمن کو اچانک ہول سا اٹھا۔ انہوں نے زور سے چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئیں۔

(باقی آئندہ ماہ پڑھیں)

سیر سوا سیر

شاہدہ ملک



گھر ٹوٹتے ہیں تو سب سے زیادہ اذیت ان گھروں میں بسنے والے بچوں کے حصے میں آتی ہے۔ اُن کی شخصیت کس طرح ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوتی ہے۔ کوئی نہیں جان سکتا۔

شیراز چاچا کی ازدواجی زندگی پر تقدیر نے جدائی کا وار اس وقت کیا جب اس بندھن کو دو دہائیاں گزر چکی تھیں۔ میاں، بیوی کے درمیان معمولی سی تلخ کلامی تقدیر کا کاری بہانہ ٹھہرا۔ یوں غموں سے آشنائی اور محرومیوں سے معانقہ ایک طویل عرصے کے لیے ان کے بچوں کا مقدر بن گیا۔ اچھے میاں (اور چھوٹوں کے اچھے بھیا) جو اس وقت تقریباً انیس سال کے تھے اور خاندان میں اپنی بہترین عادات کی بنا پر اس نام سے پکارے جاتے تھے۔ ان سے چھوٹی تین بہنیں اور ایک بھائی جو بالترتیب ڈھائی ڈھائی تین سال کے فرق سے دنیا میں تشریف لائے تھے۔ سبھی نے اس واقعے کا شدید اثر لیا مگر اچھے بھیا زیادہ حساس طبیعت واقع ہوئے تھے، دوسرے جوانی کے اس نازک موڑ پر وہ اکثر الگ تھلگ بیٹھے جانے کیا سوچا کرتے۔

ایک دن ان کے گھر برتن بجنے اور ٹوٹنے لگے۔ انہوں نے چھوٹے بہن بھائیوں کو بات بے بات مارنا شروع کر دیا اور اس قدر شدید...... یوں لگتا کہ جو بھی ان کے سامنے آئے گا اسے جان سے مار ڈالیں گے۔ عجب عالم میں وہ گھر سے باہر نکل گئے۔ تب محلے کے چند جوانوں نے انہیں زبردستی پکڑ کر رسیوں سے باندھا۔ ڈاکٹر نے آ کر انہیں نیند کا انجکشن لگایا۔ وقتی طور پر تو وہ ٹھیک ہو گئے مگر پھر تین ماہ میں انہیں ایسے کئی دورے پڑے۔ پھر گہری نیند کا انجکشن...... ہوش میں آنے پر ایک طویل چپ اور پھر بولنا شروع کرتے تو بولتے ہی چلے جاتے۔ ڈاکٹر نے انہیں نفسیاتی امراض کے اسپتال میں داخل کروانے کو کہا گھر کے معاشی حالات پہلے ہی دگرگوں تھے۔ اب مزید خراب ہوتے

جار ہے تھے۔ کچھ بہترین علاج بھی نہیں ہو رہا تھا۔

☆☆☆

چھوٹی بہن ثانیہ کی شادی دور دراز علاقے میں ہو گئی تھی۔ اگرچہ میکا اتنی دور تھا کہ سال چھ ماہ میں ایک آدھ بار ہی آنا ہوتا تھا مگر وہ اپنے گھر اور بچے میں مگن تھی۔ شوہر اس کا دکاندار تھا۔ صبح سویرے قریبی قصبے میں اپنی دکان پر چلا جاتا اور شام ڈھلے واپس لوٹ آتا۔ دسمبر کی بارش جھڑی کی چھتری تانے چھاجھوں چھاجھ برس رہی تھی۔ وہ اس وقت انگیٹھی میں آگ جلائے کھانا بنا رہی تھی۔ ہانڈی اتار کر نیچے رکھی اور ابھی توا چڑھانے والی تھی کہ ٹھک کی زوردار آواز کے ساتھ دروازہ کھلا، اندر آنے والے اچھے بھیا تھے۔ ثانیہ حق دق رہ گئی۔ یوں اچانک بغیر اطلاع بھیا کیوں آگئے اور پھر اس قدر سخت سردی اور برستی بارش میں انہیں سڑک سے بستی تک کا چار میل فاصلہ پیدل طے کر کے آنے کی کیا ضرورت تھی۔

''اچھے بھیا! آپ یوں اچانک...... فون کر دیتے تو فرقان آپ کو لینے چلے جاتے۔''

''اٹھ میں تجھے لینے آیا ہوں۔ بھاگ آئی ہے یہاں فرقان کے ساتھ اور اب رنگ رلیاں منا رہی ہے۔'' انہوں نے ایک موٹی سی گالی دے کر اس کا بازو کھینچا۔

''آپ کھانا کھا لیں پھر میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔'' وہ سمجھ گئی کہ ان کی دماغی کیفیت اس وقت درست نہیں ہے۔

''نہیں، میں انتظار نہیں کر سکتا میرے پاس وقت نہیں ہے۔'' انہوں نے اکڑ کر جواب دیا تھا۔

''آپ کو انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ سالن تیار ہے بس روٹی ڈال دیتی ہوں۔'' وہ دعا کر رہی تھی کہ فرقان جلد از جلد آجائیں۔ اگر بھیا نے توڑ پھوڑ شروع کر دی تو پکڑنا محال ہو جائے گا۔

''ہو سکتا ہے تو نے سالن میں زہر ملا دیا ہو۔''

اب کے انہیں نئی سوجھی تھی۔

''تو میرے سامنے سالن بنا میں خود دیکھوں گا۔'' انہوں نے نیا آرڈر جاری کیا تھا ثانیہ نے چپ چاپ نیا سالن بنانے کی تیاری شروع کر دی۔

''ارے، اچھے بھیا آئے ہیں۔'' تبھی ساتھ والے گھر سے اس کا دیور کامران کسی کام سے اُدھر آیا تو انہیں دیکھ کر خوش اخلاقی سے باچھیں پھیلا کر بولا۔

''بھائی جان، یہ بہت بُری ہے...... آپ کے گھر میں گھس آئی ہے میں اسے لینے آیا ہوں۔ مجھے ابا نے بھیجا ہے۔'' انہوں نے پھر گالی دے کر بات کی۔

''ایک منٹ، میں ابا کو فون کر کے پوچھتی ہوں۔'' کامران کے آنے سے ثانیہ کی ہمت بھی بندھی تھی۔ سو ذرا ترشی سے بولی اور ریک پر رکھے موبائل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اچھے بھیا نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بیگ اٹھایا اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ پگڈنڈی پر چڑھ کر سرپٹ بھاگتے ہوئے انہوں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ ان کے پیچھے کوئی نہیں آرہا۔ پھر وہ کس سے ڈر کے بھاگے چلے جا رہے تھے۔ بستی اس جگہ پر تھی جہاں آگے جا کر پھر چڑھائی شروع ہو جاتی تھی اس کے بعد چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں اور ان کے درمیان راستے بنے ہوئے تھے۔ ثانیہ وہیں صحن میں کھڑی تھی جب بھاگتے ہوئے اچھے بھیا ان پہاڑیوں کے درمیان نمودار ہوئے، بارش میں تیزی آچکی تھی۔ وہ کندھے پر بیگ اٹھائے کبھی ایک پہاڑی کے پیچھے چھپتے اور کبھی دوسری پہاڑی کے دامن میں۔ دور اپنے گھر کے صحن میں کھڑی ثانیہ کی آنکھوں سے بھی ساون بھادوں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ ماں جائے کی فکر نے اسے بھی اس بات سے بے نیاز کر دیا تھا کہ وہ برستی بارش میں کھڑی بھیگ رہی ہے۔

فرقان آدھے گھنٹے تک دکان سے گھر واپس آچکا تھا۔ ثانیہ نے اسے بھیجا کہ وہ گاؤں کی طرف جانے والے راستوں پر پتا کرے۔ فرقان تھوڑی ہی

دیر میں ناکام واپس آگیا۔

☆☆☆

''انکل میرا خیال ہے یہ مناسب نہیں ہوگا۔ آپ ان لوگوں کو ساری حقیقت بتا دیں۔'' ثانیہ نے سب کے شدید اختلاف کے باوجود اصرار کیا تھا۔ ان کے چچا اچھے میاں کا رشتہ کروا رہے تھے۔

''بیٹا کیسی باتیں کر رہی ہو۔ پتا ہے کہ پہلے بھی اچھے میاں کا رشتہ طے ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کو اس کی بیماری کی بھنک پڑ گئی تھی۔''

''انکل رشتے تو آسمانوں پر طے ہوتے ہیں۔ ہوگا وہی جو مقدر میں لکھا ہوگا مگر آپ حقیقت ان لوگوں پر واضح کر دیں تو بہتر ہوگا۔''

''بیٹا جی! وہ تو فوراً انکار کر دیں گے۔''

''پھر جو رب کو منظور، ویسے بھی ڈاکٹر نے کہا تو ہے کہ اگر بھیا کی شادی کر دیں تو اس صورت میں یہ نارمل ہو جائیں گے اور نئی زندگی کی شروعات سے ان کی سوچ میں مثبت تبدیلی آئے گی۔''

''اس صورت میں تو ان لوگوں کو کچھ بھی بتانے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔'' اب کے ابو نے پُرزور انداز میں چچا کی تائید کی تھی۔

☆☆☆

ایمرجنسی میں ثانیہ میکے آئی تھی۔ اچھے میاں کی حالت بے حد خراب تھی۔ انجکشن لگانے پر وہ نیند کی آغوش میں چلے جاتے مگر آنکھ کھلتی تو دوبارہ توڑ پھوڑ شروع کر دیتے۔ اس لیے سوتے میں انہیں رسیوں سے باندھ کر رکھا جاتا تھا۔ ابھی ان کی شادی کو بمشکل تین ماہ ہی ہوئے تھے۔ ان کے جنونی دوروں کا وقفہ مہینوں کے بجائے گھٹ کر دنوں پر محیط ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ وہ بھیانک انکشاف تھا جو شادی کے بعد اُن پر ہوا تھا۔ اصل میں قریب کے رشتے داروں اور جاننے والوں میں تو ان کی بیماری اور گھر کے حالات کی وجہ سے کوئی رشتہ دینے پر تیار نہ تھا۔ اب جبکہ ان کی دو چھوٹی بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں تو بڑے چچا جن کی ڈیوٹی ایک دور دراز کے پسماندہ علاقے میں مچھلی فارم پر تھی۔ انہوں نے اپنے جاننے والوں کے توسط سے ایک رشتہ ڈھونڈ نکالا۔ پردے کے سخت ماحول کی وجہ سے لڑکی ان کے سامنے نہ آئی۔ اب اتنے دور دراز کا سفر کر کے کون خاتون دیکھنے جاتی۔ سو دیکھے بھالے بغیر ہی رشتہ طے ہو گیا تھا۔ صرف اتنا معلوم تھا کہ لڑکی اچھے میاں سے بھی تین چار سال بڑی ہے۔ وہ خود بھی چوبیس سال کے ہو چکے تھے۔ بارات لے کر صرف دو عورتیں اور چار پانچ مرد گئے کیونکہ لڑکی والوں نے منع کر دیا تھا کہ زیادہ لوگ نہ لائے جائیں۔ واپس آکر بھی سرگوشیاں ہوتی رہیں۔ شادی کے بعد وہ زیادہ گم صم رہنے لگے۔ پھر ایک روز انہوں نے اپنی بیوی ملکہ کو پکڑ کر مارنا شروع کر دیا۔

''تم نے میری زندگی برباد کر دی ہے۔'' وہ اپنی جان بچانے کے لیے بھاگی ورنہ لگ رہا تھا کہ وہ تو اسے جان سے مار دیں گے۔ حسبِ معمول انہیں پھر سے باندھ دیا گیا، ملکہ بھی یہ جان کر حق دق تھی کہ وہ نفسیاتی مریض ہیں اور انہیں اس قسم کے جنونی دورے پڑتے ہیں۔ دوسری طرف اچھے میاں کی حالت کا سبب یہ جان جانا تھا کہ ملکہ ایک طلاق یافتہ عورت ہے جسے اولاد نہ ہونے کی وجہ سے طلاق ہوئی تھی اور ڈاکٹروں کے مطابق اس کی گود ہری ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ سیر کو سوا سیر مل جانے پر حالات یوں بگڑ گئے تھے۔ ثانیہ ساری بات جان کر سر پکڑے سوچ رہی تھی کہ شادی بیاہ جیسے مقدس بندھن میں حقائق سے پردہ پوشی کرتے ہوئے ہم یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ سود و زیاں کے پلڑے میں آخری فیصلہ صرف تقدیر کا نہیں ہوتا ہے بلکہ ہمارے اپنے اعمال اور غلط فیصلوں کی بدولت یہ مقدس بندھن خسارے کا شکار ہو جاتا ہے۔

مکمل ناول

اگر وہ مہرباں ہوتا

غزالہ عزیز



یونیورسٹی کے سالانہ تقریری مقابلے میں ماس کمیونیکیشن ڈیپارٹمنٹ کے عمر ارسلان کی ''سیاست میں طلبہ کا کردار'' کے موضوع پر دھواں دھار تقریر نے پوری یونیورسٹی میں دھوم مچادی تھی کیونکہ یہاں کے تدریسی ماحول میں سیاست بازی کے باعث آئے دن تعلیمی سرگرمیاں متاثر ہوتیں۔ جن کا نقصان حقیقی طالب علم کو ہی بھگتنا پڑتا۔ لہٰذا تقریر کے موضوع کے خلاف اپنے مضبوط دلائل پیش

کرتے ہوئے عمر نے سیاست میں طلبہ کے کردار کی بھرپور مخالفت کی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ طلبہ کو دورانِ تعلیم سیاست اور سیاسی سرگرمیوں سے دور رہنا چاہیے۔ ساتھ ہی ساتھ اساتذہ پر زور دیا تھا کہ انہیں تعلیمی عمل میں طلبہ کی کردار سازی اور ان میں قائدانہ صلاحیتوں کو ابھارنے میں اپنا بھرپور کردار ادا کرنا چاہیے تاکہ مستقبل میں ایک صحت مند رجحان کی حامل بہترین صلاحیتوں کی مالک لیڈر شپ تیار ہو سکے۔ اس کے لیے ہر تعلیمی ادارے میں طلبہ کی رہنمائی اور مشاورت کے لیے ایک تنظیمی کمیٹی ہونی چاہیے جو اس سلسلے میں اپنا بھرپور کردار ادا کر سکے اور اس کے اراکین میں طلبہ کی نمائندگی بھی یقینی بنائی جائے اور اس کے خیال میں یہ فریضہ اساتذہ کرام ہی انجام دے سکتے تھے۔ چنانچہ اس کے جذباتی لب و لہجے اور مضبوط دلائل نے جہاں انتظامیہ کی مقرر کردہ جیوری کو متاثر کیا وہیں طلبہ میں بھی جوش و خروش پیدا کیا۔ لڑکے، لڑکیاں سب اسے پسندیدہ نگاہوں سے دیکھ اور سراہ رہے تھے سوائے چند طلبہ کے...... جن کا خیال تھا کہ یہ محض مقابلہ جیتنے کے دلائل ہیں اب عملی طور پر ناممکن ہے۔ اس مخالف پارٹی میں شہباز اینڈ کمپنی نمایاں تھی جنہوں نے... اسے کامریڈ عمر ارسلان کہنا شروع کر دیا تھا۔

دراصل شہباز ایک بہت بااثر سیاسی وڈیرے کا بیٹا تھا۔ وہ اور اس کے دوست یونیورسٹی میں اکثر ساتھی طلبہ کے ساتھ لڑائی جھگڑے میں ملوث پائے جاتے تھے۔ اس لیے تمام کلاس فیلوز نے شہباز اور اس کے دوستوں کو شہباز اینڈ کمپنی کہنا شروع کر دیا تھا اور بدقسمتی سے انابیہ بھی اس کمپنی میں شامل تھی۔ اس کی شہباز اور اس کے دوستوں سے اچھی خاصی فرینڈشپ تھی اور اب انابیہ جس نے عمر کے مقابلے پر ...... موضوع کے حق میں دلائل دیے تھے...... ہار گئی تھی۔ انابیہ کو اپنی شکست سے زیادہ اپنے کلاس فیلو اور فرینڈ شہباز کے اس طعنے نے غصہ دلایا تھا جو اس نے عمر ارسلان کے حوالے سے اسے دیا تھا۔

''شیم، شیم! اِک معمولی سے مڈل کلاس پھٹیچر نے انابیہ سیال کو ہرا دیا۔ بے چاری انابیہ!'' یہ جملہ انابیہ کی انا کو ہرٹ کر گیا تھا۔ اسے شہباز کے بجائے عمر پر غصہ آیا۔ جس کی وجہ سے وہ آج میرے ساتھ کھڑی الجھ رہی تھی۔ کیونکہ میں نے اور عمر نے اسے شرجیل کی بُری شہرت کی وجہ سے شہباز کی کمپنی سے دور رہنے کے لیے کہا تھا اور وہ الٹا ہم دونوں سے ناراض ہو گئی۔ میں انابیہ کو اپنے ساتھ لے آیا تھا تاکہ اس کے غصے کو کینٹین میں بیٹھ کر ٹھنڈی ٹھار کولڈ ڈرنک پلا کر کم کیا جا سکے۔ تب میں نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔

''دیکھو بیہ! ایمان داری سے دیکھا جائے تو واقعی عمر کے دلائل بے حد مضبوط تھے۔ اس نے کسی خاص بندے کے بجائے ملک کے ایک مخصوص طبقے کا ذکر کیا۔ جو پچھلے ساٹھ پینسٹھ سالوں سے اس ملک کے غریب عوام کا استحصال کر رہا ہے۔''

''تم اس کے دوست ہو، ظاہر ہے، اسی کی حمایت کرو گے لیکن کیا تم جانتے نہیں ہو کہ وہ پاپا اور ان کے بزنس کے حوالے سے کتنی بری رائے رکھتا ہے۔ میں جانتی ہوں اچھی طرح یہ سب محض ڈراما ہے، یہ انقلابی نعرے! یہ ایمان داری اور حق و انصاف کی باتیں...... سب ملک کی بڑی سیاسی تنظیموں کی نظروں میں آنے کی پلاننگ ہے اور کچھ نہیں، ایسے مڈل کلاس انقلابی ہمیشہ سے سوسائٹی اور سیاست میں اپنی قیمت بنانا خوب جانتے ہیں اگر یہاں ناکامی ہوئی تو جرنلزم کا میدان بھی ان جیسے لوگوں کے لیے کھلا ہوتا ہے۔ میں تمام جرنلسٹوں کو نہیں کہہ رہی مگر زرد صحافت کے ذریعے شہرت پانے والوں کی بھی کمی نہیں۔'' اور شاید یہ عمر ارسلان کی برداشت کی حد تھی۔ اس سے پہلے کہ میں انابیہ کو اشارے سے پیچھے کھڑے عمر کی آمد سے آگاہ کرتا۔ عمر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ کچھ دیر پہلے یہاں آیا تھا اور انابیہ کی ساری باتیں سن چکا تھا۔ وہ تیزی سے جارحانہ انداز میں انابیہ کے سامنے آیا۔

''اگر تمہیں میری کامیابی اور اپنی ہار اتنی ہی چُبھ رہی ہے تو میری ٹرافی تم رکھ لینا۔ مجھے ان ظاہری اعزازات کی حاجت ہرگز نہیں...... رہی بات مجھے اِن فیوچر کرپٹ اور بکاؤ مال ثابت کرنے کی اور ہم جیسے مڈل کلاس ٹین کی چھتوں کے دو کمروں میں رہنے والے لوگوں کی اوقات کی تو ہم تمہارے پاپا فیضان سیال کی طرح کرپٹ اور بلیک میلر ہرگز نہیں ہوتے جو چھوٹے سے بزنس سے راتوں رات شہر کے لینڈ لارڈز میں شمار ہونے لگتے ہیں۔ تم ہم جیسے لوگوں کو جاننے کا دعویٰ کر رہی ہو۔ جسے یہ تک معلوم نہیں کہ اس کا اپنا باپ ایک چھوٹے سے کاروباری آدمی سے محض چند سالوں میں شہر کے امیر ترین صنعت کاروں میں کیسے شامل ہو چکا ہے؟ جو اپنے اخبار اور اثر و رسوخ کے ذریعے کس طرح سیاست کے گندے تالاب کی بڑی بڑی مچھلیوں کے پیٹ سے ملکی خزانے کی لوٹی ہوئی دولت میں سے اپنا حصہ وصول کرتا ہے۔'' وہ ایک لمحے کے لیے رکا تھا اور سامنے بیٹھی انابیہ کے غصے کا پارا ہائی لیول کراس کر چکا تھا۔

''شٹ اپ دِس نان سینس! میرے پاپا کو بلیک میلر کہتے ہو۔''

''یو شٹ اپ! تم...... تم انابیہ سیال! تم جیسے لوگ اب ہماری دیانت داری کا کیا یقین کریں گے! حق حلال کی روٹی کھانے والے کبھی ملک و قوم سے غداری نہیں کرتے۔ انابیہ سیال! تم دیکھنا میں تمہیں ایسا کر کے دکھاؤں گا۔'' انابیہ غصے سے کانپتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''شٹ اپ! جسٹ شٹ یور ماؤتھ عمر ارسلان! اب تم نے اِک اور لفظ بھی میرے پاپا کے بارے میں کہا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' انابیہ نے انگلی اٹھا کر عمر کو وارننگ دی۔

''تم سے واقعی بُرا اس وقت میرے لیے دنیا میں کوئی ہے بھی نہیں...... لیکن کیا تم واقعی حقیقت سے بے خبر ہو یا سچائی کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتیں؟'' اور اس سے پہلے کہ سچ مچ انابیہ آؤٹ آف کنٹرول ہو جاتی، میں اسے بازو سے تھام کر کینٹین سے باہر لے گیا۔ اس بات سے بے خبر کہ انابیہ کے الفاظ اور رویے نے عمر کو کتنا ہرٹ کیا ہوگا۔ میں جو انابیہ کو پارکنگ تک چھوڑ کے واپس آیا کہ عمر وہیں کینٹین میں اسی جگہ کھڑا ہوگا مگر وہ وہاں سے جا چکا تھا۔ مجھے کبھی اس بات کی سمجھ نہیں آئی کہ انابیہ کے اندر عمر کے لیے اتنا زہر کب اور کس نے بھر دیا تھا؟ بچپن میں تو وہ ایسی نہ تھی۔ بچپن میں تو وہ عمر کا سایہ بنی رہتی تھی۔ میں جہاں تک عمر کو جانتا ہوں وہ بے حد ٹھنڈے مزاج کا نرم اور پیار کرنے والا انسان تھا۔ وہ میرا چچازاد ہی نہیں، میرا بہترین دوست بھی تھا۔ عمر ہی نہیں انابیہ سے بھی میری بہت اچھی دوستی تھی وہ ہماری مشترکہ کزن تھی اور ہماری فیلڈ بھی ایک تھی۔ سب سے بڑھ کر ہم تینوں کا خود سے عہد تھا کہ ہم تینوں عملی زندگی میں آنے کے بعد اپنے نوجوانوں کو یہ ترغیب دیں گے کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ملک سے باہر جا کر دولت کمانے کے بجائے اپنے ملک، اپنے لوگوں کی خدمت کریں۔ اپنی صلاحیتوں اور ہنر کو اس دھرتی کی خوشحالی و ترقی کے لیے استعمال کریں کیونکہ ہمیں اپنے ملک کو بنجر نہیں کرنا ہے۔ اس دھرتی کو سرسبز و خوشحال بنانا ہے۔ بہرحال انابیہ تو آرام سے گھر چلی گئی تھی۔ اس لیے اب مجھے اس سے زیادہ عمر کی فکر تھی۔ انابیہ نے اس کے ساتھ بہت برا کیا تھا اور اس وقت عمر کو میری زیادہ ضرورت تھی۔ مجھے پتا تھا وہ اندر ہی اندر کڑھتا رہے گا۔ خود کو کسی نہ کسی طریقے سے اذیت دیتا رہے گا۔ انابیہ سے جب بھی اس کی جھڑپ ہوتی تھی۔ وہ خود کو سزا دیتا آیا تھا۔ مجھے اس کی یہ منطق سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟ بہرحال اسے کینٹین میں موجود

نہ پا کر میں نے اسے فون کر کے بتایا کہ مما نے اسے لنچ پر بلایا ہے میں جانتا تھا کہ وہ مما کی بات کبھی نہیں ٹال سکے گا۔

☆☆☆

میں شاور لے کر باہر نکلا تو وہ دیوان پر نیم دراز نہ جانے ۔۔ کتنی سگریٹیں پھونک چکا تھا۔ چائے کا خالی مگ بھی ٹرے میں رکھا تھا۔ میں نے اپنے کمرے کی مکدر فضا پر جسے عمر نے دھویں سے آلودہ کر دیا تھا۔ اسے گھور کر دیکھا جس کا اس پر ہنوز کوئی اثر نہیں ہوا۔

''یار اگر اتنی سی عمر میں سگریٹ پھونکنے کا روگ پال لیا تو مستقبل میں کوئی صحت مند حسینہ تمہیں لفٹ کرانے کی بھی غلطی نہیں کرے گی اور مجبوراً مجھے رشتہ کرانے والی خواتین کی طرح گھر گھر جا کر تمہارے لیے لڑکی ڈھونڈنے کی خاطر اپنے جوتے گھسنے پڑیں گے کیونکہ ایسے اسپیشل بندے کے لیے کوئی بہت اسپیشل لڑکی ہی ڈھونڈنی ہوگی۔''

''اگر تو مجھے اتنا اسپیشل سمجھے گا تو لڑکی ڈھونڈنے کے لیے تجھے مینٹل ہاسپٹل جانا پڑے گا کیونکہ اسپیشل لڑکی تجھے وہیں سے دستیاب ہو سکے گی۔'' عمر کے مسکرانے پر میں نے سکون کی سانس لی تھی ورنہ اسے موڈ میں واپس لانے کے لیے مجھے جانے کتنے جتن کرنے پڑتے۔ میں جانتا تھا اس وقت اس کی ذہنی حالت انابیہ کی وجہ سے کیا ہوگی۔ بہرحال میری بات بلکہ مذاق نے عمر کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔ اگلے لمحے وہ چیئر سے اٹھا اور بے اختیار مجھے بھینچ کر سینے سے لگا لیا اور میں جو اس کے اس بے ساختہ اقدام پر بھونچکا رہ گیا تھا اگلے لمحے اس کی محبت کا یہ دل پذیر انداز دیکھ کر مکمل سکون کی حالت میں آ گیا تھا۔ میں جان گیا تھا کہ اس کا یہ بے ساختہ اقدام کیوں تھا! ہم دونوں ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔

''یار میں سچ کہہ رہا ہوں، یہ مذاق نہیں ہے، تیرے لیے دنیا کی سب سے اچھی لڑکی ڈھونڈنے کے لیے بڑا مسئلہ ہو جائے گا۔'' میں نے اِک بار پھر اس سے الگ ہوتے ہوئے مسکرا کر کہا تو جانے وہ کس موڈ میں تھا کہ پہلی بار اپنا اندر مجھ پر عیاں کر گیا۔

''تجھے میرے لیے یہ مشقت کرنی نہیں پڑے گی۔ وہ تو بہت پہلے میری زندگی میں آچکی ہے۔ جانے وہ مجھے مل بھی سکے گی یا آج کی طرح چار الزامات لگا کر ہمیشہ کے لیے چھوڑ جائے گی مجھے؟''

بے اختیار اس کے لبوں سے شکوہ پھسلا تھا اور یہ انکشاف مجھے ساکت کر گیا کہ وہ انابیہ کو پسند کرتا ہے مگر جلد ہی خود کو کمپوز ڈ کر کے میں نے شرارتاً اس واردات قلبی کی تفصیلات جاننا چاہی تھی کہ عمر ارسلان کی زندگی میں محبت نامی معجزہ کیسے رونما ہو گیا؟ وہ تو ڈیپارٹمنٹ میں ''اسٹون مین اور اینگری بوائے'' کہلاتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات سے مکر جاتا، میں نے اس کے منہ سے سب کچھ اگلوانے کی کوشش شروع کر دی۔

''اچھا تو وہ زمانے بھر کی نک چڑھی اور جھگڑالو لڑکی انابیہ سیال تمہاری چوائس ہے۔'' میرا تیر ٹھیک نشانے پر لگنے پر وہ بے اختیار گڑبڑا کے میری سمت دیکھتے ہوئے تردید کرنے لگا۔

''واٹ ربش یار! تو سوچ بھی کیسے سکتا ہے کہ میں انابیہ سے؟...... ہرگز نہیں، اگر وہ دنیا کی آخری لڑکی ہوگی میرے لیے تب بھی نہیں۔'' وہ جانتا تھا کہ اس معاملے میں اب مجھے بے وقوف بنانا آسان نہیں تھا مگر اس نے پھر بھی اپنا بیان بدل دیا۔

''اچھا تو پھر وہ جو پہلے ہی زندگی میں آچکی ہے۔ اس بدنصیب کا نام بتانا پسند کریں گے آپ!'' میں نے بھی اسے اتنی آسانی سے نہیں چھوڑنا تھا۔ اسی لیے اس کے کہے الفاظ دُہرائے تھے۔

''وہ جو کوئی بھی ہے۔ وقت آنے پر تمہیں خود ہی پتا چل جائے گا مگر وہ تمہاری بدتمیز کزن ہرگز نہیں

ہے۔ فی الحال ڈائننگ ہال میں چلو۔ چچی جان کھانا ٹیبل پر سرو کر چکی ہوں گی۔'' عمر اٹھ کر کھڑا ہوا تھا۔ تب میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ میں فوری طور پر عمر کو اس ذہنی اذیت کے فیز سے باہر نکالنے میں کامیاب ہو گیا ورنہ انابیہ نے تو اسے شدید ذہنی اذیت سے دوچار کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور میں تو عمر کو شاید خود عمر سے بھی زیادہ سمجھتا اور جانتا تھا۔ مجھے واقعی انابیہ کی سوچ پر بڑا افسوس ہوا تھا، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ ہمارے آپس کے چھوٹے موٹے اختلافات کی وجہ سے عمر کے سامنے اتنی جذباتی ہو جائے گی۔ شاید اس لیے کہ کچھ ماہ پہلے شہباز اینڈ کمپنی کے حوالے سے عمر اور انابیہ کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ اس نے انابیہ کو شہباز اینڈ کمپنی سے دور رہنے کے لیے کہا تھا۔ تب میں یہ سمجھا تھا کہ شاید وہ کزن ہونے کی حیثیت سے انابیہ کو سمجھا رہا ہے اور اب پتا چلا کہ وہ انابیہ کے لیے اپنے دل میں کس قدر نرم گوشہ رکھتا ہے۔ مجھے انابیہ پر غصہ آ رہا تھا اگر وہ جان جاتی کہ عمر ارسلان اس کے لیے اپنے دل میں کیا جذبات رکھتا ہے؟.. تو شاید وہ کبھی اسے اس اذیت سے دوچار نہیں کرتی۔

آخر عمر میں کس بات کی کمی تھی؟ ہینڈسم، ویل مینرڈ، کلچرڈ اور سب سے بڑھ کر اس کا چچا زاد مگر کچھ ذاتی نوعیت کے گھریلو اختلافات بھی تھے جن کے باعث ان کے درمیان تلخی اس حد تک بڑھ گئی مگر اب عمر کے دل کی خواہش جاننے کے بعد میں نے سوچ لیا تھا کہ انابیہ کے دل سے عمر کے لیے ساری کدورتیں نکال کر رہوں گا۔ اسے بتاؤں گا کہ وہ دنیا کی سب سے قیمتی دولت (محبت) کو اپنے ہاتھوں اپنے در سے ٹھکرا رہی ہے۔

آج مما نے عمر کا پسندیدہ لنچ تیار کیا تھا۔ ابھی ہم لوگ ڈائننگ ٹیبل پر آ کر بیٹھے تھے۔ تب ہی انابیہ بھی وہیں چلی آئی۔ مما نے اسے بھی انوائٹ کیا تھا۔ دراصل انابیہ اور ہمارا گھر ایک ہی لائن میں تھا اور مما تو بچپن سے ہی ہم تینوں کی پسند ناپسند کا خیال رکھتی آئی تھیں۔ تب ہی تو وہ بھی یہاں موجود تھی۔

انابیہ کو دیکھ کر عمر نے وہاں سے اٹھنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے اس کا ہاتھ تھام کر آنکھوں ہی آنکھوں میں ملتجی ہو کر اصرار کیا تو وہ بیٹھ گیا اور میں دل میں دعا کرنے لگا کہ کم از کم کھانے کی ٹیبل پر ان دونوں کے مابین کسی قسم کا مزید جھگڑا نہ ہو جائے۔

کھانے کے دوران مما نے عمر کو مخاطب کیا تھا۔

''اور بیٹا! تمہاری اسٹڈیز کیسی چل رہی ہیں؟''

''بہت اچھی چچی جان! میں نے تو ابھی سے ایک اخبار جوائن کر لیا ہے۔ جس میں ہر ہفتے مجھے ایک کالم لکھنا ہوتا ہے۔''

مما نے اسے ستائشی نگاہوں سے دیکھا اور انابیہ نے استہزائیہ مسکراہٹ پاس کی تھی۔ میرے ہاتھ دبانے پر عمر ضبط کر گیا لیکن میری اگلی بات نے ہی دونوں کے مابین نیا محاذ کھول دیا۔

''مما! عمر کو مبارک باد دیں۔ اس نے ''آل یونیورسٹی ڈیبیٹ کمپی ٹیشن'' جیتا ہے۔''

''جی نائلہ آنٹی! کچھ لوگ بس زبانی کلامی کتابی باتوں میں لوگوں کو الجھا کر خود کو فاتح سمجھتے ہیں مگر پریکٹیکل لائف میں ان کے نظریات اور انقلابی جذبات کی کوئی ویلیو نہیں ہوتی۔ ایسے لوگ کبھی کامیاب نہیں ہوتے جو زمینی حقائق سے بے خبر ہوں۔'' اور میں سوچ رہا تھا کہ وہ کیا بات ہے جس نے عمر کو روکے رکھا ہے؟ وہ کیوں انابیہ کو منہ توڑ جواب نہیں دے رہا؟ وہ چپ چاپ اپنے پسندیدہ ویجی ٹیبل رائس کھانے میں مگن تھا اور اسی بات نے انابیہ کو اور جھلسا دیا تھا جبکہ میرا خیال تھا کہ صرف محبت ہی ہے جس کے دامن میں اتنی کشادگی اور ظرف ہوتا ہے کہ وہ محبوب کی ہر خطا بنا کسی شرط و سزا کے معاف یا درگزر کرنے کی اپنے اندر برداشت رکھتی ہے۔ میں عمر کے ضبط کی حد دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ انابیہ کتنی خوش قسمت ہے، کتنی دھنی ہے کہ اسے عمر جیسا

محبت کرنے والا اعلیٰ ظرف شخص ملا ہے۔ ورنہ مردوں کے حوصلے اور برداشت کی حد اتنی زیادہ نہیں ہوتی۔

''پلیز بیہ! کھانے کی ٹیبل پر یونیورسٹی کی کوئی بات نہیں کرنی ہے۔ آرام سے کھانا کھاؤ۔ اس کے بعد باتیں کرنا۔ میں تم لوگوں کے لیے آئس کریم لا رہی ہوں۔''

شکر تھا مما نے ہی بات کو وہیں ختم کرا دیا۔ وہ بھی کچھ کچھ انابیہ کے لب و لہجے سے اخذ کر چکی تھیں اور میری طرح انہیں بھی عمر بہت عزیز تھا۔ مما اور انابیہ کی ممی شائستہ آنٹی دونوں کی شفقت و محبت ہی نے تو عمر کی زندگی میں ماں کی نرم و شفیق محبت کے خلا کو پُر کیا تھا۔ ورنہ شاید وہ آج اتنا نارمل اور سلجھا ہوا بندہ ہرگز نہ ہوتا اور اس بات کا اظہار وہ برملا کرتا تھا۔

مما کچھ دیر بعد ہمارے پسندیدہ آئس کریم فلیورز رکھ گئیں۔ میرا اور عمر کا پسندیدہ فلیور ونیلا اور انابیہ کا چاکلیٹ تھا اور پھر باقی کا مرحلہ بڑی خاموشی اور سکون سے گزر گیا مگر اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب غلطی نہ ہونے کے باوجود عمر، انابیہ سے اپنے رویے کی معذرت کر رہا تھا۔

''سوری بیہ! مجھے اتنا روڈ نہیں ہونا چاہیے تھا اور پھر ہار جیت تو ہر healthy activity کا حصہ ہوتی ہے۔ اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے؟ لیکن اگر تم ہرٹ ہوئی ہو تو آئی ایم ریئلی ویری سوری۔''

صرف میں ہی نہیں خود انابیہ بھی حیرت سے یک ٹک عمر کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شاید اسے عمر سے معذرت کی توقع نہیں تھی۔ حالانکہ زیادتی سراسر انابیہ کی تھی۔

''مجھے تمہاری جیت سے کوئی فرق نہیں پڑتا عمر! میں کوئی اسکول گرل تھوڑی ہوں جو ہار، جیت پر رونے بیٹھ جاؤں۔ بس آئندہ میرے اور اپنے معاملے میں میرے گھر والوں کو شامل مت کرنا۔ میں اپنے پاپا کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتی۔'' وہ چیئر دھکیل کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ وہ کس معاملے کی بات کر رہی ہے؟ اگلے لمحے وہ وہاں سے جا چکی تھی اور تھوڑی دیر بعد عمر بھی اپنی بائیک پر واپس اپنے فلیٹ چلا گیا۔ آج کل وہ رینٹ پر ایک فلیٹ میں رہ رہا تھا۔

☆☆☆

عمر اور میں نے پوری فیملی میں ڈاکٹر، انجینئر، ایم این اے اور بزنس مین ہونے کے باوجود کوئی ہائی فائی پروفیشنل ڈگری لینے کے بجائے جرنلزم کی فیلڈ کا انتخاب کیا تھا۔ جس کے بارے میں عثمان بھائی کا خیال تھا کہ یہ ایک تھرڈ کلاس عام سی فیلڈ ہے۔ لوگ اور کچھ نہیں بن پاتے تو ٹیچر اور صحافی بن جاتے ہیں۔ یہ عثمان بھائی کی سوچ تھی، جو خود ایم بی اے تھے۔ حالانکہ انابیہ بھی اسی فیلڈ سے وابستہ تھی لیکن وہ عمر کو نیچا دکھانے کے لیے کبھی کبھی مجھے بھی گھسیٹ لیا کرتے تھے جبکہ وہ سچے اور محبِ وطن صحافی برادری کو سراہتے بھی تھے۔ وہ اس بات سے بھی آگاہ تھے کہ آج میڈیا اس قدر طاقتور ہو چکا ہے کہ اقتدار کے ایوانوں کے در و دیوار تک ہلا کے رکھ دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لوگ کسی جرم کی پاداش میں عدالت میں وکیل کی جرح سے تو بچ سکتے ہیں لیکن صحافی کی پہنچ سے نہیں۔ شاید عثمان بھائی بھی اسی لیے مجھ سے خائف رہا کرتے کیونکہ میں عمر کی حمایت کیا کرتا تھا۔

☆☆☆

ارسلان انکل اور ہادیہ آنٹی کی ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ڈیتھ کے بعد تایا جان یعنی فیضان سیال نے عمر کو ایڈاپٹ کر کے بظاہر اس کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھا تھا لیکن اس طرح ارسلان انکل جو تایا جان کے ساتھ بزنس پارٹنر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے کا سارا سرمایہ (حصہ) خود بخود تایا جان کے بزنس کی ساکھ کو سہارا دینے میں صرف ہو گیا جبکہ میرے پاپا شایان سیال کا خیال تھا کہ عمر کے

حصے کی ساری رقم بینک میں ڈپازٹ کرا دی جائے تاکہ وہ جوان ہو کر اس رقم کو اپنی مرضی سے استعمال کر سکے مگر تایا جان نے بڑی ہوشیاری سے اس رقم کو عمر کی پرورش و تعلیم پر استعمال کرنے کا بہانہ بنا کر پاپا کو تو چپ کرا دیا۔ پاپا بھی ان سے الجھنے کے بجائے بڑے بھائی کے احترام میں خاموش ہو گئے۔ حالانکہ انہوں نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ عمر کی تعلیم و پرورش کے اخراجات وہ خود اٹھانے کے لیے تیار ہیں اس لیے وہ عمر کے حصے کی رقم بینک میں رکھ دیں لیکن تایا جان کے آگے ان کی ایک نہیں چلی۔ مجبوراً انہیں تایا جان کے معاملات سے کنارہ کش ہونا پڑا۔

تایا جان کے دو بیٹے عثمان بھائی اور نعمان تھے جبکہ انابیہ اکلوتی لاڈلی بیٹی تھی۔ عمر اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا۔ صرف چھ برس کی عمر میں وہ ماں باپ کی شفقت کی چھاؤں سے محروم ہو گیا تھا۔ شکر تھا کہ تائی جان ایک پڑھی لکھی اور سلجھی ہوئی اچھی نیچر کی خاتون تھیں۔ انہوں نے مما کے ساتھ مل کر عمر کو ماں کی کمی کا احساس کبھی نہیں ہونے دیا۔

ہم دو بہن بھائی تھے۔ مجھ سے بڑی اریشہ آپی جو شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ کینیڈا میں مقیم تھیں۔ ہمارے والدین میڈیکل کے شعبے سے منسلک ہونے کے باعث شہر کے معروف اسپتال میں جاب کر رہے تھے۔ پہلے ہم ایک ہی گھر میں اوپر نیچے کے پورشن میں رہتے تھے لیکن تایا جان سے عمر کے اختلافات کے باعث ہم علیحدہ گھروں میں شفٹ ہو گئے۔ یہ بات سب کے لیے باعث حیرت تھی کہ کچھ سال پہلے چھوٹے پیمانے پر شروع کیا جانے والا بزنس اتنا ترقی کر گیا کہ تایا جان دیکھتے ہی دیکھتے کروڑوں کے مالک بن گئے۔ عثمان بھائی اور نعمان اپنی اپنی بزنس فرم چلا رہے تھے۔ جبکہ تایا جان اب اخبار اور دیگر بزنس کے بعد عنقریب ایک چینل لانچ کرنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ اگرچہ پاپا کو اندازہ تھا کہ راتوں رات ایسے دھن دولت کی بارش کن ذرائع سے ہوتی ہے لیکن انہوں نے تایا جان کے معاملات سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ البتہ ہم کزنز کے آپس میں کسی حد تک دوستانہ تعلقات تھے جو شعور کی منازل طے کرنے کے بعد آہستہ آہستہ اختلافات کا شکار ہو رہے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ شعور سنبھالنے کے بعد یونیورسٹی پہنچتے تک عمر کو بھی تایا جان کے ناجائز اور بلیک میلنگ کے ذریعے سے دولت کمانے کا علم ہو چکا تھا۔ لہٰذا اس نے انہیں یہ کہہ کر اپنی کفالت کی ذمے داری سے سبکدوش کر دیا کہ اب وہ اس قابل ہے کہ اپنے اخراجات خود اٹھا سکے۔ اس نے ٹیوشنز کے ساتھ مختلف میگزینز اور اخبارات میں آرٹیکلز لکھنا شروع کر دیے تھے۔ بس اسی بات نے تایا جان اور عمر کے درمیان اختلافات اور کدورتوں کی دیوار کھڑی کر دی جبکہ نعمان نے تو عمر کو اپنے ٹکڑوں پر پلنے کا طعنہ بھی دے ڈالا۔ معلوم نہیں وہ یہ کیسے بھول گیا کہ اس ساری دولت جسے وہ صرف اپنا اور اپنے بہن بھائی کا حق سمجھ رہا تھا اس میں عمر کا بھی حصہ تھا۔ شاید اسے یہ خدشہ تھا کہ ایک روز عمر بھی اس ساری جائداد میں حصے دار بن کر کھڑا ہو جائے گا اور ان حالات نے مل کر عمر کو تایا جان سے اور انابیہ کو عمر سے متنفر کر دیا تھا مگر تقدیر نے ان دونوں کے لیے کچھ اور ہی سوچ رکھا تھا۔

اس روز میں نے یونیورسٹی سے چھٹی کی تھی۔ شدید سردی کے باعث مجھے بخار اور زکام ہو گیا تھا۔ اسی روز یونیورسٹی میں ہونے والے سیمینار کی وجہ سے انابیہ اور عمر کو بھی گھر دیر سے آنا تھا لیکن شاید وہ واپسی کی تیاری کر رہے ہوں گے تب ہی ملک میں ایک اندوہناک واقعہ رونما ہو گیا جس کی شاید کسی کو امید تو کیا کسی نے ایسا سوچا بھی نہیں تھا۔ اس روز ملک کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی کی سربراہ ایک سانحے میں موقع پر ہی جاں بحق ہو گئی۔ ردِعمل کے طور پر شہر میں چاروں طرف ہنگامہ آرائی اور بھگدڑ مچ گئی۔

میں نے ٹی وی پر نیوز دیکھتے ہی عمر کے سیل فون پر کال کر کے ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا تھا۔ وہ فوراً ہی انابیہ کو آڈیٹوریم لینے پہنچا تھا۔ انابیہ، شہباز اینڈ کمپنی کے ساتھ اس واقعے سے بے خبر بیٹھی گپ شپ کر رہی تھی۔

''تم لوگ یہاں بے فکری سے بیٹھے ہو، وہاں شہر میں ہنگامے کی وجہ سے پوری یونیورسٹی خالی ہو چکی ہے۔ انابیہ! تم چلو میرے ساتھ۔ اپنی گاڑی لاک کر کے یہیں پارکنگ میں چھوڑ دو۔ ورنہ مسئلہ ہو جائے گا۔ مشتعل لوگ غم و غصے سے شہر کی املاک اور گاڑیوں کو جلا رہے ہیں۔''

انابیہ اور شہباز کے ساتھ ان کے دوست بھی ڈر گئے تھے۔ کچھ تو نزدیکی رشتے داروں کے گھر جانے لگے۔ ان کے گھر والوں نے انہیں فون کر کے منع کیا تھا کہ وہ واپس گھر پہنچنے کی کوشش مت کریں۔ اس روز واقعی بہت سے لوگ جو صبح اپنے گھروں سے نکلے تھے واپس اپنے گھروں کو نہیں لوٹ سکے تھے۔ ایک قیامت کا عالم تھا۔ لیکن انابیہ نے عمر کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔

''تمہیں میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود چلی جاؤں گی۔ ابھی عثمان یا نعمان بھائی میں سے کوئی مجھے لینے آجائے گا۔'' عمر کو اس کی بات پر بے حد غصہ آیا تھا۔

''ان میں سے کوئی بھی تمہیں لینے نہیں آسکے گا سمجھیں تم، تایا جان اور ارسل نے ہی مجھے فون پر تمہیں ساتھ لانے کو کہا ہے۔ دیکھو! شہر کے حالات بہت خراب ہیں۔ ہم خیریت سے گھر پہنچ جائیں یہی غنیمت ہے۔ تمہیں شاید اندازہ نہیں ہے۔'' عمر نے درشتی سے کہہ کر اس کا ہاتھ تھاما اور زبردستی اسے وہاں سے لے کر پارکنگ کی جانب بڑھنے لگا۔

''چھوڑو مجھے، جنگلی انسان۔ یو آر ہرٹنگ می۔''

عمر نے بے اختیار اس کی کلائی چھوڑی تھی۔

''میں تمہاری اس کھٹارا پر ہرگز نہیں بیٹھوں گی۔ میں اپنی گاڑی میں جا رہی ہوں۔''

انابیہ اپنی وہائٹ آلٹو کی جانب بڑھی تھی اور تب ایک بار پھر جارحانہ انداز میں عمر نے اس کی کلائی پکڑ کے اسے اپنی طرف کھینچا تھا۔ شکر تھا وہ عمر سے ٹکرائی نہیں۔ ورنہ وہ اس کا حشر کر دیتی۔

''تمہیں اگر بے موت مرنے کا شوق ہے تو ضرور پورا کرنا مگر میں بے قصور لوگوں کی طرح کسی کی وحشت زدگی کا شکار ہو کر اندھی موت مرنا نہیں چاہتا...... چپ چاپ بائیک پر بیٹھ جاؤ۔ ورنہ میں خود تمہیں اٹھا کر بائیک سے باندھ دوں گا۔'' وہ اتنی جھنجلاہٹ کا شکار تھا کہ انابیہ نے ڈر کر اس کی بائیک پر بیٹھنا گوارا کر لیا۔ اس سے پہلے وہ کبھی موٹر بائیک پر نہیں بیٹھی تھی۔ وہ جانتا تھا وہ کبھی بائیک پر نہیں بیٹھی ہے۔ اس لیے اسے ہدایت دینا نہیں بھولا تھا۔

''دیکھو سنبھل کر مضبوطی سے پکڑ کے بیٹھنا۔ گر گئیں تو میری ذمے داری نہیں۔ ہمیں جلد از جلد گھر پہنچنا ہے۔ میں بائیک کی اسپیڈ فاسٹ رکھوں گا۔''

اس کے بیٹھتے ہی عمر نے بائیک اسپیڈ میں آگے بڑھا دی تھی۔ سارا راستہ انابیہ گرنے کے خوف سے مجبوراً عمر کے بازو کو زور سے پکڑ کے خوف سے ہلکان ہوتی رہی۔ وہ جو انابیہ کی بدتمیزی کی وجہ سے خاصا ٹینس تھا۔ شہباز اینڈ کمپنی کے سامنے اتنی بحث کرنے پر غصے میں بھی تھا۔ اس کے نرم ہاتھ کے لمس نے لمحوں میں اس کی کیفیت کو یکسر بدل ڈالا۔ غیر اختیاری طور پر انابیہ کے خوف کو کم کرنے کے لیے اس نے بائیک کی اسپیڈ کو کم کر دیا تھا۔ اگلے لمحے وہ مکمل طور پر انابیہ کی مہکتی، دلفریب قربت کے سحر زدہ حصار کی گرفت میں تھا۔ اس نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ انابیہ سیال کبھی اس کے ساتھ اس کی بائیک پر بیٹھے گی۔ وہ اسے جتنا اپنے دل سے قریب محسوس کرتا تھا وہ بے خبر اتنی ہی اس سے متنفر ہوتی جاتی۔ وہ کب جانتی تھی کہ پورے ڈیپارٹمنٹ میں بہت ریزروڈ اور روڈ کہلانے والا عمر ارسلان اپنی اس نک چڑھی کزن

انابیہ سیال کی محبت میں اتنی شدت سے مبتلا ہے کہ وہ اس کی بڑی سے بڑی خطا اور بدتمیزی کو بھی بڑی آسانی سے معاف کر دیتا ہے۔ یہی نہیں وہ اپنے بارے میں انابیہ کی بے حد تکلیف دہ رائے جاننے کے باوجود خود کو اس کی پروا کرنے، اس سے محبت کرنے اور اسے دن میں ایک مرتبہ کسی نہ کسی بہانے سے دیکھنے کے لیے بلاوجہ ہی فیضان ولا کا چکر لگانے پر بے بس ہے۔ وہ ہر بات سے بے خبر تھی اگر جان لیتی تو اپنی قسمت پر رشک کرتی۔

حالات کی سنگینی کے پیشِ نظر اگلے لمحے اس نے پھر بائیک کی اسپیڈ بڑھائی تھی۔ وہ جلد از جلد انابیہ کو محفوظ مقام پر پہنچانا چاہتا تھا۔ نتیجتاً اس نے خود کو گرنے سے بچانے کے لیے مزید مضبوطی سے عمر کو تھام رکھا تھا۔ البتہ اب اسے راستے میں موجود جلی ہوئی گاڑیوں اور اپنی جان بچاتے، کسی محفوظ مقام تک پہنچنے کی تگ و دو میں بھاگتے دوڑتے لوگوں کو دیکھ کر حالات کی سنگینی کا احساس ہوا تھا۔

کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ صبح اپنے گھروں سے آفس، اسکول، کالج اور دیگر کاموں کے لیے نکلنے والے لوگ زندہ سلامت گھر پہنچ سکیں گے یا نہیں۔ زیادہ تر لوگوں نے تو گھر پہنچنے کی کوشش ترک کر کے اپنے قریبی رشتے داروں کے گھر رات بھر کے لیے پناہ اختیار کر لی تھی۔ تب میں نے تائی جان اور سب گھر والوں کو جو انابیہ کی وجہ سے بے حد پریشان تھے حوصلہ دیا تھا کہ عمر اس کے ساتھ ہے اور ہر حال میں اسے صحیح سلامت گھر پہنچائے گا۔ مجھے پورا بھروسا تھا اور کیوں نہ ہوتا؟ صرف میں ہی تو عمر کے لیے انابیہ کی ذات کی قدر و اہمیت سے آگاہ تھا۔ وہ بھی جانے کن کن گلیوں سے بچتا بچاتا تقریباً آدھے شہر کا چکر کاٹنے کے بعد انابیہ کو لے کر رات ایک بجے فیضان ولا کے گیٹ پر پہنچا تھا۔ ڈری سہمی اور گم صم انابیہ، عمر کی آواز سن کر چونکی تھی۔ وہ بائیک سے آہستہ سے اتری۔

بہت دکھ ہوا

لبنیٰ عروج کے انتقال کا پڑھ کر بے حد دکھ ہوا کہ میں آپ کو بتا بھی نہیں سکتی۔ میری سسرال والے سرگودھا کے ہیں۔ میرا بھی ہر وقت سرگودھا آنا جانا لگا رہتا ہے اور سرگودھا کے لوگ بے حد محبت کرنے والے ہوتے ہیں۔ مجھے تو لبنیٰ عروج کی تحریریں بہت پسند ہیں۔ اس خصوصی نمبر میں ان کی تحریر بھی ضرور لگائیں۔

پروفیسر شیریں سلیم، لاہور

یقین نہیں آرہا

مجھے یقین نہیں آرہا...... کہ لبنیٰ عروج ہمیں چھوڑ کر جا چکی ہیں۔ ہمارے دلوں میں تو آج تک خالدہ اسد، عظمت عزمی، چاندنی کی یادیں کم ہونے میں نہیں آئیں کہ اب لبنیٰ عروج بھی روانہ ہو گئیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ ان کی مغفرت فرمائے، آمین

صفیہ بیگم، لالہ موسیٰ

''جاؤ تم اندر جاؤ۔ سب گھر والے بے حد پریشان ہیں تمہارے لیے۔ میں واپس فلیٹ جا رہا ہوں۔'' عمر نے اسے مخاطب کر کے کہا تھا جبکہ وہ خود بائیک پر ہی تھا۔ تب جانے کیسے وہ بے اختیار ہی عمر کے قریب چلی آئی۔

''اس وقت اتنے خراب حالات میں تم کہاں جا رہے ہو؟ کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں کہیں جانے کی۔ بس میرے ساتھ گھر کے اندر چل رہے ہو تم۔ آج رات یہیں ٹھہر جاؤ۔ صبح چلے جانا۔ حالات اتنے خراب ہیں اگر راستے میں تمہیں کچھ ہو گیا تو!'' وہ عمر کا ہاتھ تھامے بول رہی تھی اور عمر تو گویا اس معجزے پر ہکا بکا اپنے سامنے کھڑی فکر مند سی انابیہ کو دیکھ رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے جو کچھ عمر سے کہا تھا۔ عمر نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ کبھی اس کے لیے یہ الفاظ بولے گی۔

شاید خود انابیہ کو بھی اندازہ نہیں تھا۔ تب ہی تو یکدم ہی عمر کی آنکھوں میں اترتے خوشی کے جگنوؤں کی روشنی میں اپنا عکس نہیں دیکھ سکی۔ وہ کچھ دیر تک اس کے چہرے کو خاموشی سے تکتا رہا... پھر بائیک اندر پورچ میں کھڑی کر کے اس کے پیچھے چل دیا۔

وہ دونوں اندر داخل ہوئے تو سب لاؤنج میں ہی موجود ان کا انتظار کر رہے تھے۔ خوف زدہ سی انابیہ بھاگ کر تائی جان کے سینے سے لگ چکی تھی۔ حالات کی سنگینی کے پیشِ نظر تایا جان نے انابیہ کو صحیح سلامت گھر پہنچا دینے پر آگے بڑھ کر عمر کا شکریہ ادا کیا تھا۔

''پلیز تایا جان! یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ اس میں شکریے کی کیا بات ہے؟ اپنی فیملی کو مشکل حالات سے نکالنے کی ذمّے داری فیملی کے لوگوں کی ہی ہوتی ہے۔ میں نے ایسا کیا انوکھا کیا ہے؟ انابیہ کو میں کسی مشکل میں کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟'' اس کے آخری جملے پر تائی جان نے بے ساختہ اس کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ تب اسے اپنے کہے ہوئے جملے کا بروقت احساس ہوا تھا اور وہ خجالت سے وہاں سے جانے کی اجازت لینے لگا۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں جانے کی۔ میں تمہارا کمرا کھلوا چکی ہوں۔ شہر کے حالات اتنے خراب ہیں تم ایسا سوچ بھی کیسے سکتے ہو؟'' تائی جان نے بے اختیار اسے سرزنش کی تھی اور وہ چپ چاپ ان سے اجازت لے کر چلا آیا۔ باقی سب بھی اپنے اپنے کمروں کی جانب چلے گئے تو تائی جان انابیہ کو لے کر اس کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

☆☆☆

یونیورسٹی دو دن کے لیے بند ہو چکی تھی۔ شہر میں رات بھر کی تباہیوں کے بعد ہُو کا عالم تھا۔ رات عمر مجھے فون پر ساری صورتِ حال سے آگاہ کر چکا تھا۔ اس لیے میری رات بھی چین سے گزری کہ وہ محفوظ ہے اور تایا جان کے گھر ٹھہر گیا ہے۔ اگلی صبح میں نے اسے اپنی طرف بلالیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں لاؤنج میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ وہ مجھ سے تقریباً ہر بات شیئر کرتا تھا۔ انابیہ کو یونیورسٹی سے جبراً اپنے ساتھ لانے کی ساری روداد بھی اس نے مجھے سنائی کہ کس طرح انابیہ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کے باعث اس کے ساتھ آنے کو تیار نہیں تھی...... غصے میں اسے اپنے نفع، نقصان کا بھی خیال نہیں رہتا تھا اور میں نے اسے یقین دلایا کہ میں انابیہ کو سمجھاؤں گا۔

اس وقت ہم ٹی وی پر نیوز چینل ہی دیکھ رہے تھے۔ جو اس واقعے بلکہ حادثے کی تفصیلات اور بعد کے تجزیے و تبصرے پیش کر رہے تھے۔ ملک کی اتنی بڑی سیاسی شخصیت کا قتل معمولی واقعہ نہیں تھا۔ پورا شہر ہی نہیں پورا ملک سوگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایسے میں نیوائیر کی پارٹیز کے حوالے سے شہر میں جو گہما گہمی دیکھنے میں آتی ہے وہ بھی قدرے محدود تھی لیکن شہباز نے اپنے فارم ہاؤس پر نیوائیر پارٹی کا سارا انتظام کیا تھا۔ جہاں صرف اس کے یونیورسٹی فیلوز اور کلوز فرینڈز انوائٹڈ تھے۔ انابیہ کا موڈ نہیں تھا لیکن شہباز نے اتنا اصرار کیا کہ مروتاً اسے حامی بھرنی پڑی حالانکہ میں نے اور عمر نے اسے منع کیا تھا۔ تایا جان اور ان کے دونوں بیٹے تو اس قسم کی پارٹیوں میں شرکت کرنا اپنی سوسائٹی کی روایات کا حصہ سمجھتے تھے۔ اس لیے انہوں نے انابیہ کو بھی روکا نہیں۔ میں اور عمر دونوں انابیہ کے حوالے سے پریشان تھے۔ اسے لوگوں کی پہچان نہیں تھی اور سب جانتے ہیں کہ اپر کلاس کی ان نیوائیر پارٹیز میں کیا کچھ ہوتا ہے...... جبکہ میں اور عمر تو شہباز کی کمپنی اور کیریکٹر دونوں سے ہی خائف تھے۔ البتہ تائی جان نے اسے شہر سے دور شہباز کے فارم ہاؤس پارٹی میں جانے سے منع کر دیا تھا لیکن اس نے انہیں یہ کہہ کر اطمینان دلا دیا کہ وہ جلد ہی واپس آجائے گی۔

''ممی! آپ فکر نہ کریں، ڈرائیور میرے ساتھ ہوگا۔'' اس کی ضد کے آگے ہمیشہ ہی تائی جان کو ہار ماننا پڑتی تھی سو اب بھی یہی ہوا۔ شہباز اپر کلاس کے بگڑے ہوئے امیر زادوں کے سارے شوق رکھتا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کی یہ ایکٹی ویٹیز انابیہ کی آنکھوں سے اوجھل تھیں۔ ویسے بھی انسان کی یہ ازلی فطرت ہے۔ اسے جس کام سے روکا جاتا ہے وہ اسے کرنے کا ذاتی تجربہ ضرور کرتا ہے۔ چاہے اسے ٹھوکر کھانے کے بعد کسی بڑے نقصان سے ہی دوچار ہونا پڑے۔

ہم تینوں ہی ایگزامز سے فارغ ہو چکے تھے۔ عمر نے شہر کے بڑے نیوز پیپر گروپ کو جوائن کر لیا تھا۔ جبکہ تایا جان نے خاص طور پر مجھ سے ریکوئسٹ کی تھی کہ میں اُن کا اخبار جوائن کروں اور انابیہ کے ساتھ مل کر ان کے نیوز چینل کے لیے بھی کام کروں۔ جو عنقریب لانچ ہونے والا تھا۔ مروتاً مجھے حامی بھرنا پڑی۔ بہرحال اکتیس دسمبر کی یخ بستہ شام انابیہ ڈرائیور کے ساتھ شہباز کے فارم ہاؤس کی طرف نکل گئی تھی۔ مجھے یاد ہے اس شام عمر بہت بے چین اور فکرمند تھا۔ میں اسے دیر تک سمجھاتا رہا تھا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ انابیہ بہت سمجھدار لڑکی ہے۔ دوسرے ڈرائیور بھی اس کے ساتھ ہے مگر عمر کی بے چینی کی وجہ سے میں واقف تھا۔ اس لیے زیادہ اصرار نہیں کر سکا۔ کچھ دیر بعد وہ مجھ سے اجازت لے کر گھر جانے کے لیے نکلا تھا لیکن انابیہ کو کسی بھی قسم کے نقصانات سے محفوظ رکھنے کے لیے وہ کسی کو بتائے بغیر بائیک فلیٹ پر چھوڑ کر بذریعہ ٹیکسی اس کے پیچھے شہباز کے فارم ہاؤس پہنچ گیا۔

☆☆☆

شہباز کے فارم ہاؤس کی وسیع پارکنگ میں شہر کے امیر زادوں کی مہنگی ترین شاندار گاڑیاں کھڑی تھیں۔ پارٹی فارم ہاؤس کے ڈنر ہال میں اپنے عروج پر تھی۔ یہاں آکر انابیہ کو پارٹی کی اصل حقیقت پتا چلی۔ جہاں انتہائی ماڈرن لڑکے اور لڑکیاں بڑی بے پروائی سے اپر کلاس کے نام نہاد طور طریقوں پر آزادی سے عمل پیرا تھے۔ انابیہ نے اس سے پہلے کوئی نیوائیر پارٹی اٹینڈ نہیں کی تھی۔ گھر میں شروع سے ہی تایا جان اور دونوں بھائی اپنی بزنس گیدرنگز سوشل ایکٹی ویٹیز میں حصہ لیتے مگر تائی جان اور انابیہ کو اس قسم کی پارٹیز سے دور ہی رکھتے تھے۔ دوسرے تائی جان کو خود بھی یہ سب پسند نہیں تھا۔ وہ ایک مکمل ہاؤس وائف تھیں۔ انابیہ تو شدید سردی کی وجہ سے نیوائیر نائٹ پر شام سے ہی کمرے میں گھس کر لیٹ جاتی۔ اسی لیے یہاں آکر وہ خود کو اس ماحول میں مس فٹ محسوس کر رہی تھی۔ شہباز نے ہی اسے اصرار کر کے روکا ہوا تھا۔ بارہ بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ جب وہ اسے سب سے الگ تھلگ بیٹھے دیکھ کر اس کے پاس چلا آیا۔

''یار عجیب بورنگ لڑکی ہو۔ وہ دیکھو سب کتنا انجوائے کر رہے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر بعد اور مزہ آئے گا۔'' شہباز نے ہال کے سینٹر میں موجود لڑکے، لڑکیوں کی جانب اشارہ کرتے کہا تھا جو اپنے اپنے پارٹنرز کے ساتھ ڈانس کر رہے تھے۔ ہال کے بے حد نیلگوں روشنی کے رومینٹک ماحول میں ایک دوسرے میں مگن لڑکے، لڑکیاں...... انابیہ کو بے حیائی اور آزاد خیالی کے یہ کھلے عام مظاہرے بالکل اٹریکٹ نہیں کر رہے تھے۔ وہ دوستی کے نام پر ایک دوسرے سے فلرٹنگ میں مصروف تھے۔ تب ہی شہباز نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام کر اٹھایا تھا۔

''چلو یار! وہاں سب کے ساتھ مل کر انجوائے کرتے ہیں۔''

''سوری سنی! میں تو تمہاری دوستی کا لحاظ کر کے آگئی ورنہ مجھے اس قسم کی پارٹیز میں جانا پسند نہیں ہے۔ میں بہت بور ہو رہی ہوں۔ میں اب گھر جاؤں گی تم اپنے دوستوں کے ساتھ انجوائے کرو۔'' انابیہ نے صاف انکار کرتے شہباز کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا تھا۔ تب اس نے انابیہ کو بہلانے

کی کوشش کی۔

''کم آن یار! بس تھوڑی دیر اور رک جاؤ۔ پلیز یار! میری خاطر رک جاؤ۔'' شہباز اس کا بازو تھام کر ہال کے سینٹر میں لے آیا تھا۔ جیسے ہی اس نے ڈانس کے لیے انابیہ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ایک دم ہی ہال کی تمام لائٹس آف ہوئی تھیں۔ ہیپی نیو ائیر کا شور بلند ہوا..... اسے اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ شہباز نے اسے کھینچ کر اپنے قریب کیا تھا۔ وہ بوکھلا کے لڑکھڑائی تھی اور اسی لمحے اس نے پوری قوت لگا کر شہباز کو خود سے دور دھکیلا تھا۔ اسی وقت تمام لائٹس پھر سے آن ہوئی تھیں۔ شہباز اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا جبکہ انابیہ کا غصے سے برا حال تھا۔ وہ شہباز کو کینہ توز نگاہوں سے گھور رہی تھی جبکہ دوسرے لڑکے لڑکیاں اپنے شغل میں مگن تھے۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے شہباز؟ تم جانتے ہو۔ میں یہ سب بالکل پسند نہیں کرتی...... اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تمہاری اس نیو ائیر پارٹی میں ایسا طوفانِ بدتمیزی مچایا جائے گا تو میں ہرگز یہاں نہ آتی۔'' شہباز کے چہرے کے رنگ کے ساتھ لہجہ بھی یکدم بدلا تھا۔ وہ استہزائیہ انداز میں اس کی طرف بڑھا تھا۔

''اچھا! تو تم واقعی اتنی پارسا اور معصوم ہو یا پھر مجھے احمق بنا رہی ہو۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ ہماری اپر کلاس کی ینگ لورز پارٹیز میں کیا کچھ ہوتا ہے؟'' شہباز نے آگے بڑھ کر اس کا بازو دبوچا تھا اور وہ جو صرف یہاں آنے پر ہی دل ہی دل میں خود کو کوس رہی تھی، شہباز کی اس حرکت پر سراسیمہ ہو کر سفید پڑ گئی۔ شہباز کا چہرہ کوئی اور ہی کہانی سنا رہا تھا۔ جانے اس کے دل و دماغ میں کیا چل رہا تھا۔ انابیہ نے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کی۔

''چھوڑو مجھے! میں تو تمہیں اپنا دوست سمجھتی تھی۔ تم اتنا گر سکتے ہو۔ مجھے اندازہ بھی نہیں تھا۔''

شہباز عجب انداز میں ہنسا تھا۔

''دوست! لڑکے، لڑکی کی دوستی ہماری سوسائٹی میں بس ایسی ہی ہوتی ہے۔'' شہباز نے ہاتھ کے اشارے سے ہال میں ایک دوسرے کی بانہوں میں جھولتے، نشے میں نیم مدہوش لڑکے، لڑکیوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔ تب وہ شہباز کے ہاتھ کی مضبوط گرفت میں بے بسی سے سوچنے لگی کہ عمر کی بات نہ مان کر اس نے کتنی بڑی غلطی کی۔ کاش! وہ شہباز اور اس کی دوستوں کی اصلیت سے پہلے ہی واقف ہو جاتی تو یوں دوستی کے نام پر شہباز جیسے چیپ شخص کے سامنے کھڑی اپنی بے بسی کا تماشا نہ دیکھ رہی ہوتی۔ اس سے پہلے کہ وہ بے بسی کی انتہا پر پہنچ کر رونے لگتی۔ ہال کے داخلی دروازے سے اندر آتے عمر کو اس نے اپنی جانب بڑھتے دیکھا تھا۔ اسے لگا جیسے آنسوؤں کی دھند میں وہ اس کا ہیولا ہے لیکن اگلے ہی لمحے عمر نے اس کی کلائی شہباز کی گرفت سے آزاد کرا کے شہباز پر مکوں کی بارش کردی۔ وہ جنونی کیفیت میں اسے پیٹ رہا تھا۔ شہباز کے زیادہ تر دوست نشے میں نیم مدہوش تھے اور ملازم کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ تب ہی پھٹے ہوئے ہونٹ سے رستے خون کو اپنے دائیں ہاتھ سے روکتا شہباز لڑکھڑاتا ہوا عمر کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ شہباز کے سنبھلتے ہی ملازموں نے عمر کو سختی سے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ انابیہ دور کھڑی بے آواز رو رہی تھی۔

''تم ہوتے کون ہو ہم دونوں کے بیچ بولنے والے...... یہ میری دوست ہے اور ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ میں اسے پرپوز کرنا چاہتا ہوں اور ہماری اپر سوسائٹی میں اس طرح کی گیدرنگز میں یہ سب کرنا بالکل معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ یہاں سب لائف انجوائے کرنے آتے ہیں۔ ستی ساوتری ثابت کرنے نہیں مگر عمر تمہیں اس حرکت کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ بڑا ہیرو بننے کا شوق ہے تمہیں..... تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھا کر اچھا نہیں کیا۔''

عمر نے خون آشام آنکھوں سے شہباز کی

طرف دیکھا تھا۔ تب ہی ڈرائیور اندر ہال میں چلا آیا۔ انابیہ کی حالت دیکھ کر وہ بھی گھبرا گیا۔ اس نے عمر سے وہاں سے چلنے کے لیے کہا تھا۔

''پلیز عمر بھائی یہاں سے چلیں۔ انابیہ بی بی کی حالت دیکھیں۔ انہیں کچھ ہو گیا تو......!'' عمر نے جھٹکے سے خود کو شہباز کے آدمیوں سے چھڑایا اور انابیہ کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے نکلتا چلا گیا۔ وہ مستقل رو رہی تھی۔

عمر بذریعہ ٹیکسی وہاں آیا تھا اور اب انابیہ کے ساتھ واپس جا رہا تھا۔ ڈرائیور نے پوری اسپیڈ میں گاڑی شہر جانے والی روڈ پر دوڑا دی تھی۔ عمر، انابیہ کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔

''میں نے اور ارسل نے تمہیں کتنا منع کیا تھا کہ شہباز اور اس کی کمپنی سے دور رہو۔ وہ شریف گھرانوں کی لڑکیوں سے دوستی کرنے کے لائق نہیں لیکن میں تو تمہیں سدا سے اپنا دشمن لگتا ہوں ناں...... تم نے کبھی مجھے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اب شہباز اور اس کے دوستوں کی اصلیت جاننے کے بعد تمہیں پتا چل گیا ہوگا کہ شہباز جیسے لڑکے کسی بھی کلاس کی لڑکی کے دوست بننے کے قابل نہیں ہوتے۔ دوستی اتنی ارزاں اور بے وقعت نہیں ہوتی ہے۔'' وہ انابیہ کی ذہنی کیفیت اور حالت کا اندازہ کیے بغیر اپنے اندر کا غبار اس کے سامنے نکال رہا تھا۔ اور شاید انابیہ کی برداشت کی حد یہیں تک تھی۔ اگلے لمحے اس کی سسکیوں کی آواز گاڑی میں گونجنے لگی۔ رات کی تاریکی میں عمر کو اچانک ہی اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا تھا۔ اس نے بے اختیار انابیہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ خفت اور بے بسی کے احساس سے وہ زرد ہو رہی تھی۔ اگلے لمحے کا اقدام بالکل بے اختیار تھا۔ اس نے بہت نرمی اور محبت سے انابیہ کو اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے اپنی انگلیوں سے اس کے بالوں کو تھپک رہا تھا تاکہ اس کے رونے کی شدت میں کمی آسکے۔

''آئی ایم سوری! پلیز مجھے معاف کردو۔'' عمر نے ڈیش بورڈ پر رکھی منرل واٹر کی بوتل اٹھا کر انابیہ کی طرف بڑھائی تو اس نے آہستہ سے خود کو عمر کے بازو کے حصار سے الگ کیا تھا۔ پانی پی کر اس نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائی تھی۔ ڈرائیور نے بہت تیز گاڑی چلا کر جلد ہی انہیں فیضان ولا پہنچا دیا۔ عمر ہی انابیہ کو گاڑی سے بڑے آرام سے اتار کر اندر لے گیا تھا۔ سردی کی شدت کے باعث اس وقت گھر کے تمام مکین اپنے اپنے کمروں میں بند تھے اور مرد حضرات تو شاید گھر پر تھے ہی نہیں۔ عمر نے اسے اس کے کمرے تک چھوڑا پھر خود جانے کس خیال کے تحت وہیں فیضان ولا میں رات ٹھہرنے کے لیے رک گیا۔ وہ انابیہ کی طرف سے بہت فکر مند تھا۔ دوسرے شہباز نے اپنے اور انابیہ کے حوالے سے کچھ دیر پہلے جو انکشاف کیا تھا۔ اس نے عمر کی ذہنی حالت کو بے حد ابتر کر دیا۔ اس کا دل یہ ماننے کو ہرگز تیار نہیں ہو رہا تھا کہ انابیہ، شہباز کی ذات میں انٹرسٹڈ ہو گی مگر شہباز کے لبوں سے وہ یہ بالکل برداشت نہیں کر سکا تھا۔ انابیہ تو اس وقت کچھ بھی کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ لہٰذا اس کی طرف سے کسی قسم کی تائید یا تردید کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ وہ وہاں سے بہت تھکے ہوئے انداز میں گیسٹ روم کی جانب چل دیا تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح نشہ اترنے کے بعد شہباز نے فیضان ولا فون کیا۔ تایا جان ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے تھے۔ جب ملازم نے انہیں کارڈلیس لا کر دیا۔ دوسری جانب شہباز غصے سے گرج رہا تھا۔

''وہ جاہل! اجڈ شخص! اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا۔ میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔ وہ پھٹیچر مڈل کلاس! خود کو سمجھتا کیا ہے؟ اسے معلوم نہیں کہ میں اس شہر کے سب سے کامیاب بزنس مین کا بیٹا ہوں۔ اپنے بھتیجے کو سمجھا دیجیے گا۔ اگلی بار وہ اپنے پیروں پر

گھر واپس نہیں آئے گا۔ میں اسے اتنی آسانی سے معاف نہیں کروں گا۔" وہ اور بھی جانے کیا بکواس کر رہا تھا مگر عمر کا نام سنتے ہی فیضان سیال نے کال ڈس کنیکٹ کر دی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ تائی جان سے عمر کے حوالے سے جھگڑ رہے تھے۔ شور کی آواز سے نعمان اور عثمان بھائی بھی اپنے کمروں سے باہر نکل آئے تھے۔ تائی جان کے کہنے پر ملازم عمر کو بلا لایا تھا۔ عمر کو وہاں آتا دیکھ کر نعمان نے نخوت و بیزاری سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ جو ذہنی کشمکش کے باعث آدھی رات تک جاگتا رہا تھا۔ اس اچانک افتاد پر نیند کی کمی سے جلتی سرخ آنکھوں کے ساتھ وہاں چلا آیا۔ تایا جان غصے سے تنتناتے وہاں ٹہل رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی برس پڑے۔

"آخر تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو، کیا اوقات ہے تمہاری... جو تم اس جمشید کے بدتمیز بیٹے سے جھگڑا کر کے یہاں آئے ہو؟ تم جانتے ہو، وہ ہمارے بزنس رائیول (مخالف) کا بیٹا ہے۔ تمہاری اس حرکت کی وجہ سے وہ اپنے اخبار میں اسکینڈل بنا کر فیلڈ میں ہماری ساکھ خراب کرنے کی کوشش کرے گا۔ تمہاری حیثیت کیا ہے اس سے کسی قسم کا افیئر افورڈ کرنے کی۔ وہ مجھے دھمکیاں دے رہا تھا۔ تم اپنے معاملات خود تک رکھو تو زیادہ بہتر ہوگا۔ ہم میں سے کسی کو بیچ میں گھسیٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اگر مرحوم بھائی کا لحاظ نہ ہوتا تو کب کا تم سے ہر تعلق توڑ چکا ہوتا۔ میں تمہارے جنگجو مزاج کی دشمنیوں کو اپنے کھاتے میں ڈال کر اپنی فیملی کو کسی مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ بہتر ہے کہ تم خود کو اور اپنی پرابلمز کو میری فیملی سے دور رکھو۔" وہ چپ چاپ لب بھینچے کھڑا تھا۔ آج تائی جان بھی اس کی حمایت میں کچھ بھی کہنے سے قاصر تھیں۔ تایا جان کے غصے نے انہیں بھی ہولا کر رکھ دیا تھا۔ تب ہی سوجے ہوئے پپوٹوں اور اترے ہوئے چہرے کے ساتھ انابیہ ڈائننگ ہال میں داخل ہوئیں۔ اس کی ابتر حالت کی جانب بیک وقت سب متوجہ ہوئے تھے۔ عمر کا دل تو جیسے اسے اس حالت میں دیکھ کر کٹ کے رہ گیا۔ تائی جان تیزی سے اس کی جانب بڑھی تھیں۔ کل رات انابیہ کے ساتھ پیش آنے والی صورتِ حال سے سب بے خبر تھے۔ اس کے لب کھولتے ہی جیسے وہاں موجود تمام نفوس کو سانپ سونگھ گیا۔ وہ غیر یقینی نگاہوں سے انابیہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"بس کیجیے پاپا! عمر کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ہاں یہ قصور ضرور ہے کہ اس نے کل رات شہباز کی نیو ائیر پارٹی سے آپ کی بیٹی کو صحیح سلامت اور عزت کے ساتھ فیضان ولا پہنچا دیا اگر وہ بروقت وہاں نہیں پہنچتا تو شہباز نے جو بدتمیزی میرے ساتھ کی اسے دیکھ کر تو آپ شہباز کو جان سے مار دیتے۔ عمر نے یہ دشمنی آپ کے لیے آپ کی بیٹی کی حفاظت کے لیے مول لی تھی۔ اس کا بس اتنا ہی قصور ہے۔"

سب کے لبوں کو چپ لگ گئی۔ انابیہ نے پچھلی رات کے واقعے کی ساری تفصیل انہیں بتا دی۔ تائی جان نے تو بے اختیار آگے بڑھ کر عمر کی پیشانی چوم لی تھی۔ دوسری جانب تایا جان کے ساتھ ساتھ دونوں بیٹے بھی ساری حقیقت جاننے کے بعد شرمندہ نظر آ رہے تھے۔ سب کو حقیقت سے آگاہ کر کے وہ وہاں رکی نہیں تھی۔ اس میں وہاں ٹھہرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ یہ دیکھے بغیر کہ اس کے پیچھے کس طرح تایا جان نے شرمندہ لہجے کے ساتھ عمر سے معذرت کرتے ہوئے اس کے اس احسان کا شکریہ ادا کیا تھا اگر آج ان کی لاڈلی بیٹی کو کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچ جاتا تو وہ نہ جانے کیا کر بیٹھتے، عثمان بھائی اور نعمان نے بھی اپنے گزشتہ رویوں کی معذرت کرتے عمر کا شکریہ ادا کیا تھا۔

تائی جان نے ہی مجھے فون کر کے وہاں بلایا تھا اور میں وہاں کھڑا عقیدت و محبت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ تایا جان اتنا لعن طعن کرنے کے بعد اس کا احسان مانتے اسے سینے سے لگاتے وہ کسی بھی قسم کی وضاحت دیے بغیر وہاں سے چپ چاپ

چلا گیا۔ واقعی اسے وہاں مزید ٹھہرنا نہیں چاہیے تھا۔ تایا جان نے بغیر حقیقت جانے اس کی اتنی تضحیک کی تھی، وہ اس کے ماں باپ کے رشتے کے حوالے سے اس پر اپنا احسان جتا رہے تھے اور وہ ان پر اتنا بڑا احسان کر کے خاموشی سے وہاں سے چلا گیا تھا۔ عثمان بھائی اور نعمان بھی کھسیا کے وہاں سے اپنے اپنے کمروں کی جانب چل دیے۔

ہمیشہ کی طرح مجھے لگا تھا کہ انابیہ سے زیادہ عمر کو اس وقت میری ضرورت ہوگی۔ انابیہ کے پاس تو تائی جان تھیں۔ لہٰذا میں عمر کے پیچھے گیا لیکن وہ وہاں سے جا چکا تھا اور تب میں واپس اپنے گھر چلا گیا تھا تاکہ مما کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کر کے انہیں لے کر عمر کے فلیٹ پر چلا جاؤں۔ میرا خیال تھا کہ وہ مما کی بات نہیں ٹالے گا اور کچھ دن ہمارے ساتھ ہمارے گھر آ کر رہے گا۔ میں چاہتا تھا کہ ان حالات میں وہ کم از کم کچھ دن اکیلا نہ رہے۔ اسے ہماری اپنائیت، خلوص اور اخلاقی سہارے کی ضرورت تھی اور میں اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اس روز پہلی بار تایا جان کے ساتھ ساتھ دونوں بیٹوں نے بھی آفس سے آف کیا تھا۔ وہ سب ڈائننگ ہال میں جمع تھے۔ شہباز کی جرأت کے بارے میں سوچ سوچ کر تایا جان کا غصے سے برا حال تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ شہباز کو اپنے ہاتھ سے شوٹ کر دیں جبکہ عثمان بھائی اور نعمان نے اس سارے معاملے کے تناظر میں کچھ اور ہی سوچا تھا۔ جسے تایا جان کے سامنے بیان کرنے میں ہی انہیں اپنا مستقبل محفوظ نظر آیا۔

"پلیز پاپا! آپ اتنا جذباتی ہو کر مت سوچیں۔ یہ سب تو آپ کو انابیہ کو اتنی زیادہ آزادی دیتے وقت سوچنا چاہیے تھا کہ وہ ایک لڑکی ہے اور بالآخر اسے شادی کر کے کسی معزز گھرانے کی بہو بننا ہے۔ اسے کیا ضرورت تھی شہباز کے فارم ہاؤس پر تنہا جا کر نیو ائیر پارٹی اٹینڈ کرنے کی؟"

تایا جان نے خشمگیں نگاہوں سے نعمان کو گھورا تو جواباً وہ یکدم ہی خاموش ہو گیا اور بقیہ بات عثمان بھائی نے سنبھالنے کی کوشش کی۔

"دیکھیں پاپا! اطمینان سے سوچیں۔ جمشید خان کوئی معمولی آدمی نہیں۔ جس کے خلاف انتقامی کارروائی کے لیے ہم بنا سوچے سمجھے کوئی قدم اٹھا سکیں۔ ہم اس کی دشمنی بھی آسانی سے افورڈ نہیں کر سکتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں وہ ایک بااثر شخصیت کا مالک ہے۔ دوسرے پولیس وغیرہ تک معاملہ گیا تو ہماری فیملی کی بدنامی ہوگی۔"

تایا جان کے غصے اور برداشت کی حد یہیں ختم ہوئی تھی۔ عثمان بھائی اور نعمان کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ انابیہ سے کتنی محبت کرتے ہیں...... انابیہ انہیں کتنی عزیز ہے۔

"بکواس بند کرو تم لوگ۔ تمہارا خیال ہے کہ میں اپنی بیٹی کے ساتھ بدتمیزی کرنے والے شخص کو اتنی آسانی سے معاف کر دوں گا۔ تم لوگ دیکھنا! میں اسے کہاں لے جا کر مارتا ہوں؟ میں اسے ایسے کیس میں پھنساؤں گا کہ آدھی زندگی جیل کی کوٹھری میں قید ہو کر گزارے گا۔ میں بزنس کے حوالے سے اس کی کسی قسم کی دشمنی افورڈ نہیں کر سکتا ہوں لیکن جب بات میری فیملی پر آ جائے تو میں ہرگز اسے معاف نہیں کروں گا۔ تم لوگوں کو اس معاملے میں بولنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے!"

"لیکن پاپا! کچھ بھی کرنے سے پہلے ہمیں انابیہ کے بارے میں سوچنا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ آپ کسی اچھے گھرانے میں جلد از جلد اس کی شادی کر دیں۔ اگر جمشید خان نے اسے ہماری کمزوری بنا کر اسکینڈلائز کیا تو کیا ہوگا؟"

یہ عثمان بھائی نہیں، ان کی پڑھی لکھی اور ضرورت سے زیادہ سمجھدار مسز رخشندہ بھابی کی سوچ بول رہی تھی .... اتنے بڑے بزنس ایمپائر میں وہ نعمان کو ہی یہ مشکل برداشت کرنے پر

تیار ہوئی تھیں۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس ساری جائداد میں صرف ان دونوں بھائیوں کا برابر کا حصہ ہوگا جبکہ تایا جان نے تو انابیہ کے فیوچر کے حوالے سے بھی بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔ وہ اس کی دلچسپی اور شوق کے پیشِ نظر اس کے لیے پورا ایک نیوز چینل لانچ کررہے تھے اور یہ پلان رخشندہ بھابی کے ساتھ عثمان بھائی اور نعمان کو بھی پسند نہیں آیا تھا۔ وہ تو چاہتے تھے کہ انابیہ عام لڑکیوں کی طرح شادی کر کے اپنی سسرال رخصت ہوجائے۔ بہرحال تایا جان کی بروقت تنبیہہ نے انہیں محتاط کردیا۔

''وہ میری بیٹی ہے ...... میری ذمّے داری ہے۔ اس کے بارے میں جو بھی فیصلہ لینا ہے وہ اس کی خواہش اور مرضی کے مطابق ہوگا۔ تم لوگ اپنے آپ کو اس معاملے سے دور رکھو۔ مجھے تمہارے مشوروں کی ضرورت نہیں۔'' تایا جان اپنی بات مکمل کر کے وہاں رکے نہیں تھے بلکہ انابیہ کے کمرے کی جانب چلے گئے تھے۔ عثمان بھائی اور نعمان اچھی خاصی عزت افزائی کے بعد کھسیا کے وہاں سے گئے۔

وہ ہلکی سی دستک دے کر اندر داخل ہوئے تو تائی جان اسے اپنی آغوش میں سمیٹے بیٹھی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی...۔ وہ خاموشی سے آکر انابیہ کے بائیں جانب بیڈ پر بیٹھ گئے۔

''آپ نے ہمیشہ اس کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ اسے غلط سمجھا ہے۔ آخر وہ آپ کا خون ہے...... آپ کے سگے چھوٹے بھائی کی اولاد ہے۔ آپ اس کے لیے اپنے دل میں اتنی کدورت کیوں پالے بیٹھے ہیں؟ وہ تو بچپن سے انابیہ کا بے حد خیال رکھتا آیا ہے۔''

تائی جان نے انہیں خائف نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''پلیز شائستہ! اس وقت میں بہت ڈپریسڈ ہوں۔ جاؤ تم ملازمہ سے کہو جا کر وہ میرا اور انابیہ کا ناشتا یہیں لے آئے۔''

تائی جان کو یکدم ہی انابیہ کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ اب تایا جان اسے اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لیے بیٹھے تھے۔ وہ چپ چاپ وہاں سے اٹھ کر باہر نکل گئیں۔

انہوں نے بڑی محبت و نرمی سے خاموش بیٹھی انابیہ کے ہاتھوں کو تھاما۔

''دیکھو بیٹا! تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے تمہارے فیوچر کے لیے بہت کچھ سوچ رکھا ہے۔ مجھے یقین ہے تم میرے سارے خوابوں کو پورا کروگی۔ میں تمہارے ساتھ کبھی کسی قسم کی ناانصافی ہونے نہیں دوں گا۔ اگر وہ تمہیں پسند ہے تو اس سے تمہاری شادی پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ عمر نے تو ہم سب سے بڑھ کر تمہارا خیال رکھا ہے۔'' انابیہ نے چونک کر انہیں دیکھا تھا۔

''وہ پڑھا لکھا ہے، ذہین اور قابل بھی ہے۔ تم دونوں اپنے پروفیشن میں مل کر بہت آگے جاسکتے ہو۔ میں جانتا ہوں وہ بہت خود دار اور محنتی ہے۔ میری سپورٹ وہ کبھی پسند نہیں کرے گا اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس میں اتنی صلاحیت ہے کہ وہ اس فیلڈ میں اپنا بہت اچھا مقام بنا سکتا ہے۔ بس بیٹی مجھے تمہاری خوشی عزیز ہے۔ اگر تم چاہو گی تو......!'' اور انابیہ چپ چاپ اُن کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی پھر یکا یک ان کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔ اس کے رونے سے تایا جان ایک بار پھر پریشان ہوگئے۔

''پاپا کی جان! خود کو سنبھالو، تم دیکھنا! میں اس شہباز کے بچے کو کیسا ذلیل و خوار کرواتا ہوں۔ تم بالکل پریشان مت ہو بیٹا! میں اور تمہاری امی ہمیشہ تمہارے ساتھ ہیں۔'' انابیہ نے سر اٹھا کر عقیدت و محبت سے انہیں دیکھا۔

''پاپا! میں بہت خوش قسمت ہوں کہ مجھے آپ جیسے پیار کرنے والے والدین ملے ہیں۔ تھینک گاڈ! تھینک یو پاپا، آئی لو یو پاپا۔ آئی لو یو سو مچ۔'' انابیہ

اک بار پھر ان کے سینے سے لگ گئی تھی اور تایا جان محبت سے اس کے سر کو چومنے لگے۔ تائی جان اسی وقت ملازمہ کے ساتھ ناشتا لیے کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔ باپ بیٹی کی محبت کا یہ خوب صورت منظر دیکھ کر ان کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ وہ خدا سے دل ہی دل میں انابیہ کے لیے دعا کرتے آگے بڑھ گئیں۔

☆☆☆

اتنا سناٹا کہ جیسے ہو سکوتِ صحرا
ایسی تاریکی کہ آنکھوں نے دہائی دی ہے
دور اِک فاختہ بولی ہے، بہت دور کہیں
پہلی آواز محبت کی سنائی دی ہے

کتنی عجیب بات ہے اس نے کبھی اس بارے میں سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ عمر نے کبھی اس کا برا نہیں چاہا تھا...... ہمیشہ اس کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار رکھنا چاہے تھے لیکن وہ ہر بار کسی نہ کسی وجہ سے اسے دکھ پہنچاتی آئی تھی۔ اگرچہ یہ دانستہ نہیں ہوتا تھا مگر چھوٹے چھوٹے اختلافات نے بچپن کی اس معصوم دوستی کو کدورتوں میں بدل دیا تھا اور اب وہ عمر کے ایک، ایک عمل کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اپنے کمرے کے باہر ٹیرس کی ریلنگ سے ٹیک لگائے وہ بظاہر ڈوبتے سورج کی دلکشی میں کھوئی ہوئی تھی مگر دھیان کے پردے پر عمر کا دلکش خیال ابھرا تھا۔ وہ اتنے دن اپنے کمرے میں بند رہی۔ وہ ایک بار بھی اس کے پاس نہیں آیا تھا۔

شاید اس بار وہ انابیہ سے کچھ زیادہ ہی ناراض ہوگیا تھا۔ جبکہ پہلی مرتبہ انابیہ کو اس کی سب سے زیادہ ضرورت محسوس ہوئی۔

میں اتنی دیر سے .... اس کے پیچھے کھڑا یہی سوچ رہا تھا کہ اس کے انہماک کو کیسے توڑوں؟ مگر مجھے انابیہ کو اس واقعے کی حساسیت سے باہر نکالنا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اسے اپنے دل و دماغ پر مستقل طاری کرلے۔ اسی لیے چلتا ہوا آکر اس کے ساتھ کھڑا ہوگیا۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا تھا۔

''وہ...... عمر نہیں آیا تمہارے ساتھ؟ کہاں ہے، وہ ٹھیک تو ہے؟'' اور اس بار چونکنے کی باری میری تھی لیکن میں مسکرا دیا وہ استفسار کرتی نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

''وہ ٹھیک ہے، بس آج کل اپنی نئی جاب کے سلسلے میں مصروف ہے۔ اس نے نیو ورلڈ پبلی کیشن ہاؤس کو جوائن کرلیا ہے۔'' میں نے دانستہ جمشید گروپ کا نام نہیں لیا تھا۔ پرنٹ میڈیا کی دنیا میں ملک کے دو ہی بڑے گروپ آگے تھے۔ جن میں

ایک تایا جان اور دوسرا جمشید خان کا تھا اور جمشید خان، تایا جان کے بزنس کے ساتھ ساتھ نیوز پیپر انڈسٹری میں بھی بڑا حریف تھا۔ دوسرے شہباز کے حوالے سے اب یہ خجالت سراسر دشمنی میں بدل چکی تھی۔ مجھے یقین تھا تایا جان اتنی آسانی سے شہباز کو نہیں بخشیں گے۔ اب یہ دو بڑے سفید ہاتھیوں کی جنگ تھی۔ جس میں جیت کس کی ہوتی تھی؟ یہ خدا بہتر جانتا تھا بہر حال میں انابیہ کو اپنے ساتھ لے جانے آیا تھا۔

''تم جلدی سے چینج کر کے آؤ۔ ہم باہر جا رہے ہیں۔''

''لیکن کہاں ارسل؟ میرا بالکل موڈ نہیں ہے۔'' اس نے بڑی بیزاری سے انکار کیا تو مجبوراً مجھے اصل بات بتانا پڑی۔

''بھول گئی ہو، آج عمر کا برتھ ڈے ہے۔ میں نے اسے سرپرائز دینے کا پروگرام بنایا ہے اور تم میرے ساتھ چل رہی ہو۔''

''مگر ارسل! میں نے تو اس کے لیے کوئی گفٹ بھی نہیں لیا ہے۔'' وہ روہانسی ہونے لگی۔

''کم آن یار! راستے میں پیک کرالیں گے۔ بس تم جلدی سے تیار ہو کر آجاؤ۔''

وہ مسکراتی ہوئی اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ میں نے اتنے دنوں بعد اسے دل سے مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ ورنہ شہباز کے واقعے نے اس کی شخصیت کی ساری دلکشی اور رعنائی ماند کر دی تھی۔ کچھ دیر بعد جب وہ بے بی پنک اور وائٹ کمبی نیشن کے اسٹائلش سوٹ میں تیار ہو کر آئی تو میں حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ خوشی ہمیشہ انسان کے اندر کے موسم کی دلکشی کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ اندر کی خوشی اور محبت انسان کو مزاجاً طور پر مکمل بدل کر رکھ دیتی ہے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ انابیہ بھی عمر سے محبت کرتی ہے لیکن اس کے چہرے کی دلکشی اور خوب صورتی، اندر کی خوشی سے دمکنے لگی تھی۔ تب مجھے لگا کہ شاید انابیہ بھی عمر کو پسند کرنے لگی ہے۔ میں اسے ستائشی نگاہوں سے سراہتے ہوئے اپنے ساتھ نیچے پورچ میں لے آیا تھا۔ تائی جان کو پہلے ہی اپنے پروگرام سے آگاہ کر چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہم شہر کے بہترین ریسٹورنٹ میں موجود تھے۔ عمر ہمارے اس سرپرائز سے قطعی بے خبر تھا۔ میں نے ہی فوری طور پر اسے ریسٹورنٹ پہنچنے کی تاکید کی تھی اور وہ آ رہا تھا۔ اس کی زندگی میں ہم دو ہی ایسے لوگ تھے جن کی بات وہ کبھی رد نہیں کر سکتا تھا مگر پھر بھی اس کی ناراضی کا سوچ کر انابیہ نے اپنے خدشے کا اظہار کیا تھا۔

''کیا وہ یہاں آ جائے گا؟''

''کیوں نہیں! آخر وہ میرا بہترین کزن اور جگری دوست ہے۔''

''پتا نہیں! کبھی وہ میرا بھی ایسا دوست بن سکے گا یا نہیں۔'' اس نے خود کلامی کے انداز میں افسردگی سے کہا تھا اور میں نے جان بوجھ کر ان سنی کر دی۔ میں فی الحال اس معاملے میں ان دونوں کے مابین پل کا کردار ادا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ محبت کو سہاروں کی حاجت نہیں ہوتی۔ یہ ہوتی ہے یا پھر نہیں ہوتی اگر ان دونوں کے مابین یہ خوب صورت احساس دلوں میں پل رہا ہوا تو وہ بنا کسی سہارے کے ایک دوسرے کے دلوں تک رسائی پا لیں گے۔ ابھی میں انابیہ کے لیے کچھ منگوانے کا سوچ رہا تھا کہ دیکھا سامنے گلاس ڈور دھکیل کر عمر اِدھر ہی آ رہا تھا۔ بلیو جینز اور وائٹ ٹی شرٹ میں وہ خاصا فریش لگ رہا تھا۔ قریب پہنچ کر اس کے لبوں کی مسکراہٹ انابیہ کو وہاں بیٹھے دیکھ کر یکدم غائب ہوئی تھی۔ کم از کم میں نے یہ ضرور محسوس کیا تھا وہ تحیّر سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''کم آن عمر! یہ انابیہ ہی ہے۔ اس کا بھوت نہیں ہے جو تم یوں گھور رہے ہو۔ بیٹھ کر جلدی سے آرڈر کرو۔ مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔'' وہ یکدم جھینپ کر انابیہ کے چہرے سے نظر پھیر کے مسکرایا

تھا۔ خوشی اس کی آنکھوں کے کٹوروں میں لبالب بھری ہوئی تھی۔ یہاں آتے وقت اس نے قطعی نہیں سوچا ہوگا کہ وہ اپنی پسندیدہ ہستی کو اپنے سامنے موجود پائے گا۔ وہ خوشگواریت کے احساس کے ساتھ انابیہ کے عین سامنے والی چیئر پر بیٹھ گیا۔

''مگر آرڈر میں کس خوشی میں کروں گا؟ بلایا تم نے ہے بھائی آرڈر بھی تم ہی کرو۔'' وہ بے نیاز سا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کے لبوں پر شرارتی مسکراہٹ تھی۔ میں نے انابیہ کی طرف دیکھا۔ وہ عمر کی طرف بڑے انہماک سے دیکھ رہی تھی۔ بہت عرصے بعد میں عمر کو اتنے بھرپور موڈ میں دیکھ رہا تھا۔ یقیناً یہ خوشگوار تبدیلی اور اس کے لہجے سے چھلکتی ہنسی انابیہ کی موجودگی کی مرہون منت تھی۔ اس لیے میں نے سوچا کہ اب اس سرپرائز کو اس کے لیے پرائز بنا دینا چاہیے۔

''جناب! آج تمہاری برتھ ڈے ہے۔ لہٰذا ٹریٹ بھی تمہاری طرف سے ہوگی۔ ورنہ ہم دونوں اپنے اپنے گفٹس واپس گھر لے جائیں گے۔'' عمر نے حیرت اور خوشی سے گنگ ہوتے ہم دونوں کی طرف دیکھا تھا۔ ویٹر کیک اٹھائے ہماری جانب آرہا تھا۔ عمر کو کب توقع تھی کہ انابیہ بھی کبھی اس کی برتھ ڈے سیلیبریٹ کرنے اس کے سامنے موجود ہوگی۔

''مینی مینی ہیپی ریٹرنز آف دی ڈے۔ ہیپی برتھ ڈے عمر!'' انابیہ نے مسکراتے ہوئے عمر کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔ ہیپی برتھ ڈے ڈیئر عمر!'' میں نے کھڑے ہو کر اسے وش کیا تھا۔ جواباً اس نے بے ساختہ اٹھ کر مجھے اپنے سینے میں سمو لیا۔ میں ان دونوں کے لیے بہت خوش تھا۔ مجھے یقین تھا کہ آج کے بعد عمر اور انابیہ کے مابین خود ساختہ ناراضی اور بیزاری کی یہ برف پگھل جائے گی۔ ان پر زندگی کی انمول خوشیوں کے در کھلتے نظر آرہے تھے۔ عمر نے کیک کاٹا تو انابیہ نے ہم دونوں کو سرو کیا تھا پھر انابیہ نے بیگ سے گفٹ نکال کر اسے تھمایا تو اس نے حیرت و نشاط کی ملی جلی کیفیت میں باری باری ہم دونوں سے گفٹس وصول کر کے شکریہ ادا کرتے ہوئے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔

''یہ میری زندگی کی سب سے یادگار شام ہے۔ میں اسے کبھی نہیں بھولوں گا، تھینکس الاٹ میرے یارا!''

اسے یقین ہوگیا تھا کہ انابیہ کو یہاں تک لانے کا آئیڈیا میرا ہی ہے۔ سو ایک بار پھر اس کی آنکھوں کے کٹورے خوشی و تشکر کے احساس سے لبالب بھر گئے۔ میں صرف مسکرا دیا تھا۔ اب انابیہ کے سامنے تو کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

مجھے یقین ہونے لگا تھا کہ آج کے بعد ان کے درمیان ساری کدورتیں، سب بدگمانیوں کے بادل چھٹ جائیں گے لیکن انابیہ کی اگلی بات نے اچانک ہی عمر کا موڈ برہم کر دیا۔ وہ اسے تایا جان کا اخبار جوائن کرنے کی آفر کر رہی تھی۔

''تم پاپا کا اخبار جوائن کر لو عمر! پھر ہم تینوں مل کر اپنے اس خواب کو مکمل کریں گے۔ جو ہم تینوں نے اپنی ایجوکیشنل لائف میں مل کر دیکھا تھا۔ تمہیں یاد ہے! ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ اس ملک کے زرخیز ہنر مند ذہنوں کو ملک سے باہر جانے سے روکیں گے، انہیں اپنی چھت اور اپنے آسمان تلے اپنی صلاحیتوں کو آزمانے کے مواقع فراہم کریں گے۔'' وہ بڑی آس اور مسکراتی نگاہوں سے عمر کی طرف دیکھ رہی تھی جبکہ وہ یکدم ہی سنجیدہ ہوا تھا۔

''سوری! میں پہلے ہی نیو ورلڈ والوں کو جوائن کر چکا ہوں۔''

''تو کوئی بات نہیں...... تم ان سے معذرت کرلو۔ پاپا نے میرے فیوچر کے لیے بہت سے پروگرام بنائے ہیں۔ وہ عنقریب نیوز چینل بھی لانچ کر رہے ہیں۔ ارسل نے بھی پاپا کی آفر قبول کر لی ہے۔ تم بھی ہمیں جوائن کر لو۔ ہم مل کر نئی دنیا تسخیر کریں گے۔'' اس لمحے میں نے انابیہ کی آنکھوں میں عمر کی شبیہہ کا عکس واضح طور پر دیکھا تھا۔ جانے وہ کیا کچھ سوچ رہی تھی اور عمر نے اس کے برعکس ردِ عمل کا اظہار کیا تو وہ بھی ششدر رہ گئی۔

''آئی ایم سوری! مجھ جیسے بلیک میلر صحافی اور تھرڈ کلاس انقلابی جو ٹین کی چھتوں کے دو کمروں سے نکل کر راتوں رات اپنی قیمت وصول کر کے ڈیفنس کے عالی شان بنگلوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ وہ تمہارے پاپا کی آرگنائزیشن میں کیسے ایڈجسٹ ہو پائیں گے؟ اور انہیں میری ضرورت بھی نہیں ہوگی انابیہ!'' انابیہ تو کیا خود مجھے بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنے روز پہلے والی انابیہ کی بات کو اب تک نہیں بھولا ہوگا۔ لمحے بھر میں انابیہ کا دمکتا چہرہ اور مسکراتی آنکھیں دھواں دھواں ہوئے تھے اور اپنی اتنی سخت بات کا ردِعمل انابیہ کے چہرے پر دیکھنے کے بعد وہ خود ہی ڈپریشن کا شکار ہو کر سگریٹ لبوں سے لگا کر سلگانے لگا تھا۔ خود کو اذیت سے دوچار کرنے کا یہ انوکھا طریقہ تھا اس کا۔ مجھے اس سے ہمدردی کے بجائے اس پر غصہ آیا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے خود پر خوشیوں کے در بند کرنے جا رہا تھا اور میں اسے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے سرزنش کرتا، انابیہ اس سے معذرت کرنے لگی۔

''آئی ایم سوری عمر! اس روز میں غصے میں تھی۔ میں جانتی ہوں، تم ایسے نہیں ہو...... نہ کبھی ہو سکتے ہو مگر پھر بھی مجھے معاف کر دو۔''

''اچھا! اس اعتبار کی کوئی خاص وجہ تو ہوگی۔ رئیلی تمہارے منہ سے اپنے لیے یہ رائے سن کر میں حیران بلکہ شاکڈ ہوں۔'' جانے عمر کو کیا ہوگیا تھا، میرا ضبط جواب دے رہا تھا۔ انابیہ نے سر اٹھا کے خائف نگاہوں سے عمر کی طرف دیکھا پھر یکدم میز سے چابی اٹھاتے ہوئے کرسی سے اٹھ کر تیز قدموں سے ریسٹورنٹ سے باہر نکل گئی۔ میں نے بے اختیار عمر کو خفگی سے دیکھا اور انابیہ کے پیچھے تقریباً بھاگا تھا۔ وہ پارکنگ میں کھڑی گاڑی کا لاک کھول رہی تھی۔ میں تیزی سے اس کے قریب پہنچا تھا۔

''پلیز انابیہ! اس کا مطلب تمہیں ہرٹ کرنا نہیں تھا۔ پتا نہیں اسے اچانک کیا ہوگیا؟ مگر وہ تمہیں کبھی ہرٹ نہیں کر سکتا۔'' میرے قطعی لہجے پر وہ رک کر خاموشی سے میرا چہرہ تکنے لگی۔ میں نے سوچا کہ عمر کی پوزیشن کلیئر کرنے کا یہ اچھا موقع ہے۔ وہ خود تو شاید کبھی انابیہ سے کچھ کہہ نہیں سکے گا۔ لہٰذا مجھے ہی کچھ کرنا ہوگا۔ ورنہ ان کے مابین بے گانگی اور انا کی دیواریں مضبوط خلیج بن کر حائل ہو جائیں گی۔

میں عمر کے دل کا حال اس پر عیاں کرنا چاہتا تھا لیکن واقعی وہ عمر کے رویے سے ہرٹ ہوئی تھی۔ اس لیے اگلے لمحے وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر تیزی سے گاڑی آگے بڑھا گئی اور میں وہیں تاسف سے کھڑا رہ گیا۔

☆☆☆

اک خواب ہے، اس خواب کو کھونا بھی نہیں ہے
تعبیر کے دھاگوں میں پرونا بھی نہیں ہے
لپٹا ہوا ہے دل سے کسی راز کی طرح
وہ شخص جسے میرا ہونا بھی نہیں ہے

میں واپس آیا تو عمر افسردہ سا وہاں بیٹھا تھا اور میرا سارا غصہ جو عمر کے لیے کچھ لمحے پہلے دل و دماغ میں ابھرا تھا۔ خود بخود اس کی مایوس صورت دیکھ کر ختم ہوگیا۔

''آج وہ تیرے پاس بڑی امیدیں لے کر آئی تھی مگر تو نے اسے بے حد مایوس کیا۔ آخر تجھے ہو کیا گیا تھا؟'' میں نے اس کے سامنے شکوہ کیا۔

''پتا نہیں یار! وہ کبھی مجھے سمجھ بھی سکے گی یا نہیں! مگر میں اسے ہرگز ہرٹ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ پتا نہیں مجھے کیا ہوگیا تھا؟ آئی ایم سوری یار!'' اور اس بار مجھے اس سے پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی کہ وہ یہ کس کے بارے میں کہہ رہا ہے؟ کیونکہ مجھے پتا تھا کہ اب وہ تردید ہرگز نہیں کرے گا۔ مجھے بے ساختہ

ہی اس پر پیار آیا تھا۔
''تو! تو اسے بتا کیوں نہیں دیتا؟'' میں نے اسے اظہار کے لیے اکسایا تھا۔
''نہیں، میں شاید یہ کبھی نہیں کرسکوں گا۔ مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ اس کے دل میں میرے لیے کہیں کوئی نرم گوشہ ہے بھی یا نہیں۔ وہ میرے بارے میں کیا سوچتی ہے؟ مجھے کوئی خوش فہمی نہیں ہے ارسل۔'' میں نے دکھ سے اس کے اداس چہرے کی طرف دیکھا۔ زندگی میں انسان بہت سی محرومیوں کا سامنا کرتا ہے لیکن اس وقت مجھے لگا جیسے یہ محرومی عمر کے لیے جھیلنا بہت کٹھن ثابت ہوگی مگر میں نے بھی حوصلہ نہیں ہارا۔
''مگر یار تجھے ڈر کس بات کا ہے؟ ضروری تو نہیں کہ وہ انکار کردے۔ کیا پتا وہ بھی تجھ سے......''
''پتا نہیں! میں اس کی طرف سے کبھی خوش فہم نہیں ہوا۔''
''لیکن مجھے لگتا ہے۔ اسے تجھ سے تھوڑا بہت لگاؤ ضرور ہے۔ ورنہ وہ اس وقت یہاں تیری برتھ ڈے سیلیبریٹ کرنے موجود نہیں ہوتی۔''
''بہت مشکل ہے...... میں اس سے کبھی یہ نہیں کہہ سکوں گا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ ارسل! میں اسے کبھی یہ بتا نہیں پاؤں گا کہ اس کے بغیر جینا میرے لیے کتنا کٹھن ہوگا۔ میں اسے کبھی نہیں بتا پاؤں گا کہ میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں۔'' وہ روہانسا ہونے لگا تھا۔ میں نے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگالیا۔
''جانتا ہے ارسل! بچپن میں اِک دن جب میں اپنے کمرے میں سوتے ہوئے ڈر گیا تھا۔ اس روز بہت طوفانی بارش ہورہی تھی۔'' میں نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ انابیہ کی باتیں کرتے اس کی آنکھوں میں کیسے ڈھیروں جگنو روشن ہو جایا کرتے تھے۔ ہم دونوں وہیں چیئر پر بیٹھ گئے۔
''میں خوف کی وجہ سے روتے ہوئے تائی جان کے کمرے میں چلا گیا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ مجھے اکیلے کمرے میں ڈر لگ رہا ہے۔ تب تائی جان نے بھی اسی طرح مجھے کھینچ کر اپنی نرم آغوش میں سمیٹ لیا تھا اور انابیہ...... وہ مجھے روتا دیکھ کر اپنے سارے کھلونے اٹھا کر میرے پاس چلی آئی تھی اور مجھے دیتے ہوئے اپنی معصومیت کے ساتھ کہنے لگی۔
''عمر! تم میرے سارے کھلونے لے لو۔ پلیز روؤ مت۔'' اس رات تائی جان مجھے انابیہ کے کمرے میں لے آئی تھیں پھر ساری رات وہ ہم دونوں کے ساتھ رہیں اور صبح انابیہ بڑی معصومیت سے کہنے لگی۔ ''عمر! تم میری آدھی مما کو رکھ لو۔ وہ تمہیں بہت سا پیار کریں گی اور پھر میں بھی تمہارے ساتھ کھیلوں گی۔'' اور ارسل! آج بھی مجھے اس کی ضرورت ہے، کیا وہ کبھی یہ بات سمجھ سکے گی؟ کیا وہ میرے بلانے پر میرے پاس آئے گی؟ وہ مجھ سے پھر سے ناراض ہوگئی ہے۔''
عمر نے تاسف سے کہا تھا۔
''وہ ضرور آئے گی عمر! جن سے ہم محبت کرتے ہیں۔ جبران کے مطابق ہمیں انہیں آزاد چھوڑ دینا چاہیے۔ اگر وہ ہمارے ہیں تو جہاں بھی رہیں گے ہمارے ہو کر رہیں گے اور ہمارے ہی پاس لوٹ کر آئیں گے۔ میں جانتا ہوں، تیرے جذبوں میں وہ حدت اور طلب میں وہ شدت ہے جو پتھر کو بھی پگھلا سکتی ہے مجھے یقین ہے وہ اِک دن تجھے یہ بتانے ضرور آئے گی کہ وہ بھی تجھ سے محبت کرتی ہے مگر ابھی شاید وہ خود بھی ان جذبوں سے بے خبر ہے۔''
عمر نے بے اختیار میرے ہاتھوں کو تھام کر لبوں سے لگالیا۔
''تیری محبت اور خلوص پر مجھے ہمیشہ فخر رہے گا۔ اس دنیا میں تو وہ پہلا شخص ہے جو مجھ سے بے ریا محبت کرتا ہے۔''
''نہیں یار! میں پہلا نہیں دوسرا شخص ہوں۔ پہلی انابیہ سیال ہوگی انشاء اللہ! اور اس کے بعد مما،

پاپا اور تائی جان کو تو بھول گیا ہے اور اریشہ آپی بھی یاد نہیں رہیں تجھے۔'' میں نے شرارتی لہجے میں اسے یاد دلایا تو وہ مسکرانے لگا۔
''سوری یار! واقعی تائی جان اور چچی جان نے مجھے ماں کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ ورنہ میری شخصیت کی تعمیر میں کہیں نہ کہیں کوئی کمی ضرور رہ جاتی اور اریشہ آپی ...... انہوں نے بہن بھائی کے سب سے خوب صورت رشتے سے روشناس کرایا۔ میں کبھی تم سب کی انمول محبتوں کا قرض چکا نہیں پاؤں گا۔'' وہ اِک بار پھر سنجیدہ ہونے لگا تھا۔
''بس، بس یار! اب اتنا زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہاں ایک بات یاد رکھنا! محبتیں قرض نہیں فرض ہوتی ہیں۔ بس اب چلنے کی کرو۔ مما نے کہا تھا کہ وہ تمہاری برتھ ڈے کی خوشی میں بہترین ڈنر تیار کررہی ہیں۔ اس لیے فوراً اٹھ جاؤ۔'' اور ہم دونوں مسکراتے ہوئے وہاں سے گھر کے لیے نکل گئے۔

☆☆☆

مجھے پتا تھا وہ کبھی انابیہ کو خود نہیں بتائے گا۔ اس لیے میں نے بڑی صفائی سے عمر کی پرسنل ڈائری اس کے بیڈ کی دراز سے نکال کر انابیہ تک پہنچادی تھی۔ وہ ڈائری ہاتھ میں تھامے مجھے سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔
''میں جانتا ہوں۔ تم اس سے ناراض ہو لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم اس کے لیے کس قدر اہم ہو۔ وہ تمہیں کبھی ہرٹ نہیں کرسکتا اور وہ کبھی کہے گا بھی نہیں کہ وہ تم سے کتنی محبت کرتا ہے۔ تم خود اس کی یہ پرسنل ڈائری پڑھ لو۔'' حیرت سے اس کی سیاہ غلافی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔
''ہاں انابیہ! تم اپنی انا کے ناز اٹھاتے اٹھاتے تھک جاؤ گی۔ اس سے پہلے کہ وقت ہاتھوں سے ریت کے مانند پھسل جائے اور بعد میں صرف پچھتاوے باقی رہ جائیں۔ اسے جا کر بتادو کہ تم بھی اسے چاہتی ہو۔ میں جانتا ہوں میں غلط نہیں کہہ

رہا۔'' انابیہ نے بے اختیار اس کی سیاہ مخملی ڈائری کھولی تھی۔

''اگر وہ مہرباں ہوتا!
تو میری آنکھوں میں
نہ جھلملاتی نمی ہوتی
نہ میرے دل کی وادی میں
خزاں کا قافلہ رکتا
اگر وہ مہرباں ہوتا
میری بے نور آنکھوں میں
ستارے قید کر دیتا
میری زخمی ہتھیلی پر
وہ کوئی پھول رکھ دیتا
میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر
وہ یہ کہہ دیتا
محبت روشنی ہے، رنگ ہے، خوشبو، ستارہ ہے
قسم مجھ کو
مجھے تم سب سے پیارے ہو
مگر ایسا وہ تب کہتا
اگر وہ مہرباں ہوتا

محبت ایسا ہی بے بس اور بے اختیار کر دینے والا جذبہ ہے۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ میں کب انابیہ کی محبت میں مبتلا ہو گیا! وہ جو بچپن میں سائے کی طرح میرے ساتھ رہتی تھی، وہ جو مجھے روتا دیکھ کر اپنے سارے کھلونے مجھے دے دیا کرتی تھی، وہ معصوم سی، دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی اب بڑی ہو کر مجھ سے نفرت کرنے لگی ہے۔ میں اس سے دوستی کرنا چاہتا ہوں لیکن وہ مجھے ہر بار مایوس کر دیتی ہے۔ مجھے پتا ہے اک دن اس کی نفرت مجھے مار دے گی۔'' اس سے آگے انابیہ سے مزید پڑھا نہیں گیا۔

میں تو پہلے ہی عمر کی ڈائری پڑھ چکا تھا۔ اس لیے انابیہ کی کیفیت میں اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔ میرا قیاس بھی غلط نہیں تھا۔ وہ بھی عمر کو چاہتی تھی لیکن دونوں بکار سی بے مقصد باتوں کے اختلافات میں الجھ کر انا پسندی کا شکار ہو گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ انابیہ کچھ کہتی۔ میرا سیل فون بجا تھا۔ میرا دل یکدم ہی انجانا نمبر اسکرین پر دیکھ کر گھبرایا تھا۔ عمر پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔ دوسری جانب کوئی مقامی اسپتال کے ریسپشن سے آگاہ کر رہا تھا لیکن سیل فون میرے ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے گر گیا۔ عمر اسپتال کے آئی سی یو میں تھا۔ میرے چہرے کی بدلتی رنگت دیکھ کر وہ سراسیمہ ہو کے آگے بڑھی تھی۔

''کیا ہوا ہے ارسل، کس کا فون تھا؟''

''عمر پر کسی نے قاتلانہ حملہ کیا ہے، اسے گولیاں لگی ہیں۔ وہ اسپتال میں ہے۔'' میرے لبوں سے بے ساختہ نکلا تھا اور وہ سکتے کی کیفیت میں زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ میرا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ میں نے تیزی سے نیچے بیٹھی انابیہ کا بازو تھام کر اسے اٹھایا تھا۔

''پلیز انابیہ! جلدی چلو ہمیں دیر نہیں کرنی ہے۔ تم نے پہلے ہی بہت دیر کر دی۔'' میرے لبوں سے بے ربط جملے ادا ہوئے تھے اور وہ کسی روبوٹ کی طرح میرے ساتھ کھنچتی چلی گئی۔ راستے میں، میں نے انابیہ کے سیل فون سے گھر کے باقی لوگوں کو آگاہ کیا تھا۔ تھوڑی دیر میں اسپتال کے آئی سی یو روم کے باہر گھر کے سب لوگ جمع ہو چکے تھے۔ عثمان بھائی اور نعمان پہنچ گئے تھے۔ مما اور تائی جان وہیں آئی سی یو کے باہر ویٹنگ روم میں جانماز بچھائے دعا کرنے میں مشغول تھیں۔ اس روز میں نے پہلی مرتبہ تایا جان کو اتنا پریشان اور دکھی دیکھا تھا اور انابیہ...... اس کی حالت بیان سے باہر تھی۔ اسے تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ بالکل خاموش پتھر کی مورت بنی بیٹھی تھی۔ تایا جان اس کے ساتھ تھے۔ میں ڈاکٹر کے روم میں عمر کی کنڈیشن کے بارے میں پتا کرنے چلا آیا۔ اس کا آپریشن ہو چکا تھا مگر وہ اب تک ہوش میں نہیں آیا تھا۔ اس کے سینے اور پیٹ کے قریب گولیاں لگی تھیں۔ بہت قریب سے ٹارگٹ کیا گیا تھا۔ یہ سوچنے کا تو کسی کو بھی موقع نہیں ملا کہ عمر کے ساتھ یہ دشمنی

کس نے نبھائی تھی۔ بہر حال میں ڈاکٹر سے عمر کو بچانے کے لیے ریکویسٹ کر رہا تھا۔ میں اسے کھونے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

''پلیز ڈاکٹر! اسے بچا لیں۔''

''دیکھیں! ہم نے پوری کوشش کی ہے۔ اگر پیشنٹ کو ہوش آ گیا تو وہ خطرے سے کسی حد تک باہر آ جائے گا بعد میں ہم مونیٹر کرتے رہیں گے۔ آپریشن کامیاب ہے لیکن پیشنٹ کی اصل صورتِ حال کا اندازہ اس کے ہوش میں آنے کے بعد ہی ہو سکے گا۔'' ڈاکٹر نے تسلی کے باوجود خاصی بے رحمی سے آخری جملہ ادا کیا تھا اور میں بے بسی سے دعاؤں کا وِرد کرتا... وہاں سے چلا آیا۔ میں آئی سی یو کے ایگزٹ گلاس ڈور کے پاس کھڑا اندر بیڈ پر سینے تک سفید پٹیوں میں جکڑے آنکھیں موندے لیٹے عمر کو دیکھ رہا تھا۔ جس کے ہونٹ زخموں کی شدت سے نیلے پڑے تھے۔

''پلیز عمر جانا نہیں۔ دیکھ! وہ تجھے بتانے آئی ہے کہ وہ بھی تجھ سے بہت محبت کرتی ہے۔ پلیز عمر! اس کی بات سنے بغیر جانا نہیں۔ وہ تجھے روکنے آئی ہے، وہ تجھے جانے نہیں دے گی۔'' میں وہاں کھڑا اختیار بے اختیار آنسو بہا رہا تھا پھر مڑ کے انابیہ کے پاس چلا آیا اور اسے لے کر واپس اسی جگہ جا کھڑا ہوا۔ وہ گلاس کے اس پار کھڑی ساکت نگاہوں سے عمر کو دیکھ رہی تھی۔

''پلیز بیہ! اب اور دیر مت کرو۔ اندر جا کر اس کے پاس بیٹھ جاؤ۔ دیکھو! اگر آج تم نے کہنے میں دیر کر دی تو ساری عمر ان کہی کی کسک جھیلتی رہو گی۔ جاؤ! جا کر اسے بتا دو کہ تم بھی اس سے محبت کرتی ہو۔ وہ تمہیں چھوڑ کر جا نہیں سکے گا۔''

میں نے ڈاکٹر سے پرمیشن لے لی تھی۔ انابیہ نے میری طرف دیکھا اب میں وہاں مزید نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ اس لیے تایا جان اور پاپا کے پاس چلا آیا۔

وہ گلاس ڈور دھکیل کر دہلیز پر کھڑی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ صرف محبت میں اتنی طاقت نہیں ہوتی۔ یہ عشق کا ہی اعجاز ہوتا ہے جب بندہ کشف کے مراحل سے گزرنے لگتا ہے۔ عمر کے زخموں سے چور بدن میں بھی جنبش ہوئی تھی۔ ان لمحوں میں اس کے وجدان کو بھی کشف ملا ہو گا تب ہی تو انابیہ کے اندر داخل ہوتے ہی اس نے نیم بے ہوشی کی حالت میں آنکھیں کھولی تھیں۔ انابیہ کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ اتنی اذیت کے باوجود مسکرایا تھا۔ اسے اپنے سامنے پا کر اس کی آنکھوں کی بجھی قندیلیں جل اٹھی تھیں لیکن یہ وہ مرحلہ تھا جب بجھنے سے پہلے شعلہ تیز روشنی کے ساتھ بھڑکتا ہے اور پھر ہمیشہ کے لیے بجھ جاتا ہے۔

میں انابیہ سے چیخ چیخ کر کہنا چاہتا تھا کہ آگے بڑھو، جا کر عمر کو نویدِ حیات دے دو مگر اس کا وجود تو جیسے پتھر کی طرح ساکت ہو چکا تھا۔ وہ گلاس ڈور تھامے کھڑی تھی۔ جیسے زمین نے اس کے قدم جکڑ لیے ہوں۔

''تم آ گئیں انابیہ! دیکھو! میں نے تمہارا کتنا انتظار کیا۔ بس چند سانسیں خدا سے اور مانگ لی ہیں مگر دیکھو! یہ کیسی عجیب خواہش میرے اندر سے ابھر رہی ہے کہ خدا میری سانسیں واپس لوٹا دے۔ میں مرنا نہیں چاہتا، تمہارے ساتھ جینا چاہتا ہوں۔''

میں قریبی بینچ سے تیزی سے اٹھ کر انابیہ کی طرف آیا تھا۔ میں نے گلاس ڈور کے پار دیکھا۔ عمر کے ہونٹ کپکپائے تھے۔ آنکھیں مسکرا رہی تھیں اور اگلے لمحے اس نے آنکھیں موند لیں۔ چراغ آخری لو کے ساتھ بھڑک کے ہمیشہ کے لیے بجھ گیا تھا۔

میں بلند آواز سے چیخ چیخ کر رو رہا تھا اور جیسے شاید آنسوؤں کے دریا بہا دینے چاہیے تھے، وہ کسی سنگی مجسمے کی طرح گلاس ڈور تھامے ساکت کھڑی تھی۔ میرے رونے کی آواز سن کر قریب ویٹنگ روم میں بیٹھے سب گھر والے دوڑ کے مجھ تک پہنچے تھے۔

مما اور تائی جان نے انابیہ کے بے جان وجود کو اپنے قریب کرتے سہارا دے کر وہاں سے ہٹایا

تھا۔ جبکہ پاپا نے مجھے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا تھا۔ میں کسی بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر ان کے وجود سے لپٹا رو رہا تھا۔ عمر چلا گیا تھا۔ ہم سب کو چھوڑ کے، انابیہ کو چھوڑ کے اور انابیہ! وہ عمر بھر کے لیے ان کہی کی کسک اور اذیت جھیلنے کے لیے خالی ہاتھ رہ گئی۔ اِک آنسو بھی اس کی آنکھ کی سرمئی جھیلوں سے نہیں ٹپکا۔

انتہا درجے کا صبر تھا یا شدید قسم کا صدمہ! میں آج تک صحیح فیصلہ نہیں کر پایا کہ انابیہ اس وقت کس اذیت سے گزر رہی تھی۔ میں اور انابیہ دونوں ہی صدمے کی کیفیت میں ہوش وحواس سے بیگانہ تھے۔ تایا جان ہی عمر کی ڈیڈ باڈی لے کر اور دیگر معاملات اسپتال انتظامیہ سے طے کر کے آئے تھے۔

اریشہ آپی کو خبر کر دی گئی تھی۔ وہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ دوسرے دن پہنچ گئی تھیں۔

رشتے دار، دوست احباب اور ملنے والوں کے ساتھ جانے کہاں سے لوگ تعزیت کے لیے چلے آرہے تھے اور جب اسے پاکیزہ و معطر لباس پہنا کر آخری آرام گاہ کی طرف لے جانے کی تیاری تھی تو میں اور اریشہ آپی چیخ چیخ کر بچوں کی طرح رو رہے تھے۔ تائی جان مستقل انابیہ کو سنبھالے بیٹھی تھیں...... اور پھر دوسری بار فیضان ولا سے اس کی ہمیشہ کے لیے رخصتی ہوگئی۔ اِک بار وہ فیضان ولا چھوڑ کر گیا تھا۔ دوسری بار اسے یہاں سے اس کی مرضی کے خلاف لے جایا گیا تھا۔ دوست تو دوست دشمن بھی ایسی جوان موت پر کانپ اٹھے تھے۔ پتھر بھی دکھ کی شدت سے پگھل جاتے ہیں۔ جمشید خان بھی ساری دشمنی اور اختلافات بھلا کر تایا جان کے پاس عمر کے سوم والے دن تعزیت کے لیے آیا تھا۔ تب یکدم ہی اسے دیکھ کر میرے ذہن میں جھماکا ہوا تھا۔ عمر کا تو کوئی دشمن نہیں تھا۔ نہ ہی وہ اخبار کا کرائم رپورٹر تھا پھر عمر پر جان لیوا حملہ کون اور کیوں کرا سکتا تھا؟ کہیں شہباز نے تو......! اس روز جمشید خان کو دیکھ کر مجھے شہباز کا خیال آیا تھا۔ نیو ائیر نائٹ پر شہباز نے عمر کو دھمکی دی تھی۔ اس نے بارہا یہ کہا تھا کہ وہ عمر کو نہیں چھوڑے گا۔

"تو کیا شہباز نے عمر کو!" بے ساختہ ہی میرے لبوں سے نکلا تھا۔ تایا جان اب جمشید خان کے ساتھ باہر جا رہے تھے۔

"تایا جان! عمر کو شہباز نے قتل کرایا ہے۔ اسی نے کہا تھا کہ وہ اسے جان سے مار دے گا۔ پلیز تایا جان! آپ پولیس کو فون کریں۔ میں عمر کا خون یوں رائگاں جانے نہیں دوں گا۔" تایا جان، جمشید خان کو رخصت کر کے پلٹے تھے۔ جب میں نے انہیں بتایا تو وہ حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو ارسل؟ ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں تایا جان! جمشید نے عمر کو انابیہ کو باعزت بچا کر اس کے فارم ہاؤس سے لے جانے کی سزا دی ہے۔ پلیز تایا جان! شہباز کا نام ایف آئی آر میں درج کرائیں۔ ورنہ اس کا باپ پہلے کی طرح اسے عین وقت پر فرار کرا دے گا۔" میں نے تایا جان کو یاد دلایا۔ شہباز نے انابیہ کے ساتھ بدتمیزی کی تھی تو تایا جان نے کچھ ماہ پہلے شہباز کو ایک کیس میں پھنسانے کی کوشش کی تھی لیکن اس کی قسمت اچھی تھی۔ عین وقت پر جب شہباز کے فارم ہاؤس پر ریڈ پڑنا تھی پیشگی اطلاع ملنے پر شہباز وہاں سے فرار ہو چکا تھا اور یہ مہربانی کسی ایسے ...... بے ضمیر پولیس والے نے کی تھی جو جمشید خان جیسے بااثر لوگوں کی سرپرستی میں پلتے ہیں اور سارے محکمے کو بدنام کرتے ہیں۔

"پلیز تایا جان! عمر کی جان انابیہ کی خاطر گئی ہے اگر آپ نے اس کے قاتلوں کو بچ کر جانے دیا تو انابیہ کے ساتھ میں بھی آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔"

میں نے تایا جان کو جھنجوڑتے ہوئے کہا تھا اور شاید وہ بھی دل سے عمر کی موت کے صدمے کو جھیل رہے تھے۔ اسی لیے مجھے تسلی دیتے ہوئے بولے تھے۔

"تم فکر کیوں کرتے ہو ارسل؟ وہ میرے سگے بھائی کا بیٹا تھا، میرا اپنا خون تھا۔ میں اس کے قاتلوں کو کیسے معاف کر سکتا ہوں؟ میں اپنی بیٹی کو شدید اذیت اور دکھ سے دوچار کرنے والے کو ہرگز معاف نہیں کروں گا۔ تم اطمینان رکھو، میں ابھی آئی جی سے بات کرتا ہوں۔"

تایا جان نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی تھی اور میں واپس ان کے ساتھ اندر جانے کے بجائے فیضان ولا کے سوگوار در و دیوار کی وحشت سے گھبرا کے اپنے گھر چلا آیا۔ مما کی گود میں سر رکھ رونے کی خواہش اچانک ہی ہوک کی طرح میرے دل سے ابھری تھی۔ آج عمر کی موت کو تیسرا دن تھا مگر مجھے اب بھی صبر نہیں آرہا تھا۔

☆☆☆

شام ڈھلے جب سارے پرندے لوٹتے ہیں روپڑتے ہیں
اس کی قسمیں، اس کے وعدے سوچتے ہیں روپڑتے ہیں
اجڑا کمرا، بکھری چیزیں، بوجھل دل اور بھیگی پلکیں
اپنی حالت دیکھ کے اکثر ہنستے ہیں روپڑتے ہیں

آج عمر ارسلان کو ہم سے جدا ہوئے پورے چار سال ہو چکے ہیں۔ تایا جان نے شہباز کے خلاف پوری ایمان داری سے کارروائی کرنے کی کوشش کی تھی لیکن پہلے کی طرح اس بار بھی وہ اپنے باپ کی بروقت کوششوں کی وجہ سے ملک سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ شہباز نے اپنے باپ کے سامنے اعتراف کیا تھا کہ اس نے ہی عمر کو کرائے کے قاتلوں کے ذریعے مروایا تھا۔ وہ انابیہ کو پسند کرتا تھا لیکن اسے عمر کی مداخلت نے ہمیشہ کے لیے اس سے دور کر دیا۔ لہٰذا غصے میں اس نے یہ ساری پلاننگ کی۔ جبکہ عمر تو جمشید خان کے اخبار میں جاب کرتا تھا یہ بات کسی اندرونی ملازم کے ذریعے تایا جان تک پہنچ چکی تھی۔ جمشید خان نے تایا جان کے اثر ورسوخ سے خوف زدہ ہو کر بروقت کوشش کر کے شہباز کو سوئٹزر لینڈ بھجوا دیا تھا لیکن کہتے ہیں کہ خدا کے انصاف کی لاٹھی بے آواز پڑتی ہے۔ پچھلے سال سوئٹزر لینڈ میں ایک صبح شہباز اپنے فلیٹ میں مردہ پایا گیا۔ اس کی سوئس گرل فرینڈ کے ایکس بوائے فرینڈ نے اسے قتل کر دیا تھا۔ قدرت نے عمر کے قاتل کو کیفرِ کردار تک بالآخر پہنچا دیا تھا۔

پچھلے چار سالوں میں انابیہ کسی حد تک نارمل ہو چکی ہے۔ وہ میرے ساتھ تایا جان کا لانچ کیا ہوا نیوز چینل چلا رہی ہے اور تایا جان کے اصرار پر ہی چار سال پہلے مما، پاپا اور میں پھر سے فیضان ولا میں شفٹ ہوگئے ہیں۔ کیونکہ اب وہاں عثمان بھائی اور نعمان نہیں رہتے۔ وہ دونوں شادی کے بعد اپنے اپنے گھر میں رہتے ہیں۔

تایا جان اور تائی جان کو انابیہ کی بہت فکر ہے۔ وہ لوگ اس کی شادی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ہر سال عمر کی برسی والے دن اس کی قبر پر فاتحہ کے لیے جاتی ہے اور پورا دن وہاں گزارتی ہے۔ مجھے ہی اسے لے کر جانا پڑتا ہے۔ تایا جان اس کی شادی کرنا چاہتے ہیں اور میں سوچ رہا ہوں کہ وہ عمر کی محبت کی امانت ہے اسے کوئی اور کیسے پوری ایمان داری سے سنبھال سکتا ہے؟ وہ عمر کے بعد محبت کے نازک و کومل جذبات واحساسات سے عاری صرف اور صرف کام کرنے والی روبوٹ مشین بن کر رہ گئی ہے۔ میں جانتا ہوں ...... وہ تایا جان کی بات کبھی نہیں مانے گی۔ نہ ہی تائی جان کی اولین خواہش اس کے دل کو پگھلا سکے گی۔ لہٰذا میں نے سوچا ہے کہ پچھلے چار سالوں ...... نہیں بلکہ پچھلے کئی سالوں سے میں نے انابیہ سے جو سچ چھپایا ہے۔ میں اسے آج بتا دوں گا کیونکہ میں عمر کی طرح دیر کرنا نہیں چاہتا کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ میں انابیہ کی طرح ان کہی کی آگ میں عمر بھر سلگتا رہوں۔

میں انابیہ کو بتا دوں گا کہ میں بھی اس سے محبت کرتا ہوں۔ آج سے نہیں ...... کئی سالوں پہلے سے لیکن جب مجھے پہلی بار پتا چلا کہ عمر انابیہ سے محبت کرتا

ہے تو میں نے اپنے عزیز از جان دوست کی خاطر اس سچ کو ہمیشہ کے لیے اپنے دل کے نہاں خانوں میں دبالیا تھا مگر اب مجھے لگتا ہے......عمر کی محبت کے لیے، انابیہ کے لیے اور اپنی محبت کے لیے مجھے سچ بولنا پڑے گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ کوئی اور شخص انابیہ تمہاری زندگی میں شامل ہو کر عمر کی محبت کو پوری ایمان داری سے نہیں نبھا سکے گا اور میں بھی شاید کسی اور لڑکی کے ساتھ عمر بھر شادی کے نام پر سمجھوتے کی زندگی نہیں جی سکوں گا۔ میں اسے لینے جا رہا ہوں۔

☆☆☆

ڈی ایچ اے کے وسیع و عریض قبرستان میں داخلی راستے سے گزرتے دائیں جانب عمر کی قبر پر واٹر للی کے پھول رکھے ہیں۔ قریب انابیہ سفید لباس میں درخت سے ٹیک لگائے کھڑی ہے۔ وہ ہمیشہ یہیں کھڑی ہوتی ہے۔ درخت کی ٹھنڈی چھاؤں براہِ راست عمر کی قبر پر پڑ رہی ہے۔

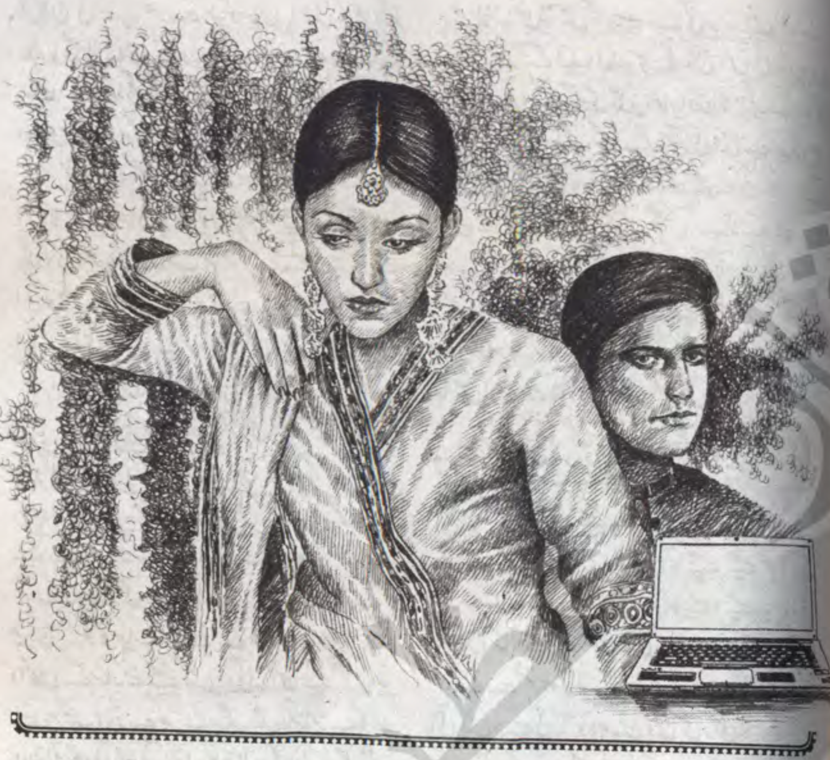
میں چپ چاپ چلتا ہوا آ کر اس کے قریب کھڑا ہو گیا اور فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ وہ پھر بھی چپ کھڑی رہی تھی۔ یہاں تک کہ میں فاتحہ سے فارغ بھی ہو گیا۔

''جو باتیں اسے تمہارے ساتھ شیئر کرنی چاہیے تھیں۔ وہ اس نے اپنی ڈائری کے سپرد کر دیں۔ شاید وہ ہمت جُٹا نہیں پایا ہوگا مگر میں ایسا نہیں کروں گا۔'' آخری جملہ میں نے بہت پُراعتماد ہو کر کہا۔ انابیہ بے ساختہ میری طرف دیکھنے لگی۔

''ہاں انابیہ! میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں......کبھی کہہ نہیں سکا......اس لیے نہیں کہ عمر کی طرح مجھ میں حوصلہ نہیں تھا کہ شاید تم رد کر دو بلکہ اس لیے کہ مجھے پتا چل گیا تھا کہ عمر تمہیں بے حد چاہتا ہے۔ اس لیے میں نے سوچا وہ محبت کے بہت رشتوں سے محروم ہے اس لیے دنیا کی سب سے قیمتی دولت کو اس کے حصے میں آنا چاہیے۔ ہاں! تمہاری محبت اس کے لیے اتنی ہی انمول تھی۔'' میں اِک لمحے کے لیے رکا تھا۔ وہ ساکت کھڑی مجھے سن رہی تھی۔

''تم یہ مت سمجھنا کہ میں نے عمر کے لیے یہ قربانی دی۔ وہ مجھے اتنا ہی عزیز تھا کہ میں ہنسی خوشی اس کے لیے جان بھی دے سکتا تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ تمہیں جا کر سب کچھ بتا دے مگر تقدیر نے اسے یہ موقع ہی نہیں دیا۔ میں تم سے بھی یہی کہوں گا انابیہ......یہ ان کہی کی اذیت ناک تکلیف تم سے جھیلی نہیں جائے گی۔ کہہ دو! آج اسے سب کچھ بتا دو۔ مجھے یقین ہے وہ تمہاری آواز سن رہا ہوگا۔ تمہارے دل اور روح پر دھرا بوجھ ہلکا ہو جائے گا اور اس کی روح بھی شاد ہو جائے گی۔'' اب میں براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ اچانک وہ بیٹھ گئی۔ تب ایک شفاف موتی اس کی آنکھ سے ٹپکا اور عمر کی قبر کی مٹی میں جذب ہو گیا۔ مجھے لگا جیسے عمر اپالو بن گیا ہے اور بیہ اس کی قبر پر بیٹھی آنسو بہا رہی ہے اور ایک وقت ایسا آئے گا جب عمر کی قبر کی مٹی سے ایک خوش نما پھول والا پودا سر باہر نکالے گا۔ محبت کی جدائی کا پھول ''ہائی سنتھ کا پھول'' بن جائے گا۔

''تائی جان اور تایا جان تمہارے لیے بہت فکر مند رہتے ہیں۔ وہ تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ عمر کے بعد کوئی ایسا شخص نہیں ہوگا جو عمر کے درد کو تمہارے ساتھ بانٹ سکے۔ عمر کی محبت کو سنبھال سکے، اسے سمجھ سکے۔ پر...... میں ایسا کر سکتا ہوں انابیہ! اگر تم عمر کی طرح مجھے مایوس نہیں کرو تو......! میں باہر گاڑی میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' میں اپنی بات مکمل کر کے وہاں سے چلا آیا تھا۔ اس لیے نہیں کہ عمر کے سامنے انابیہ کو اعتراف کرتے دیکھ نہیں سکتا تھا...... بلکہ اس لیے کہ میں چاہتا تھا کہ انابیہ اپنے سارے دکھ عمر کے حوالے کر کے واپس زندگی کی طرف لوٹ آئے۔ مجھے یقین تھا عمر اس کے سارے دکھوں کو ہنسی خوشی سمیٹ لے گا اور وہ زندگی کی طرف لوٹ آئے گی...... ہاں مجھے پکا یقین تھا......



لَو میرج کی گرہیں

نور العین ساحرہ

کمرے میں ہر طرف دُلہناپے کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ دلہن کی چوڑیوں کی کھنک، مہندی اور ابٹن کی مہک مل جل کر ایک خواب ناک سا ماحول پیدا کر رہی تھی۔ بیڈ کے اردگرد لٹکی موتیے اور گلاب کی لڑیاں شادی کے تیسرے دن تک بھی مرجھائی نہیں تھیں بلکہ کمرے کو خوب معطر کرنے کے ساتھ ساتھ دل میں عجیب دبا دبا ہیجان پیدا کرنے کا سبب بن رہی تھیں۔ سیما کی جھینپی جھینپی شرمیلی سی مسکراہٹ اور

فرقان کی خوب صورت سرگوشیاں ماحول کو سحر انگیز بنا رہی تھیں۔ اسی لمحے دروازے پر زوردار دستک کے ساتھ ناشتے کی ٹیبل پر فوراً پہنچنے کا حکم سنتے ہی دونوں ہڑبڑا کر رہ گئے۔

فرقان اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ ایک جھٹکے سے اس کا نازک حنائی ہاتھ یوں چھوڑا جیسے وہ ہاتھ نہ ہو بلکہ کوئی خطرناک سانپ ہو جو ایک لمحے کی تاخیر سے ان کو ڈس لے گا۔ سیما کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا اور اچانک اپنی شدید بے عزتی کا بھی احساس ہوا اور وہ گھبرا کر سراسیمگی سے انہیں دیکھنے لگی۔

''میں باہر جا رہا ہوں، تم بھی ایک سیکنڈ میں فوراً باہر آ جاؤ۔ ہمارے گھر میں سورج نکلنے کے بعد کمرے کا دروازہ بند رکھنے کا رواج بالکل نہیں ہے۔ کل صبح چھ بجے سے روزانہ یہ دروازہ چوپٹ کھل جایا کرے گا۔ تم نے تو ویسے بھی وعدہ کیا ہے ناں کہ تم ہماری اس ''لو میرج'' کو کامیاب بنانے کے علاوہ کبھی میرا سر گھر والوں کے سامنے جھکنے نہیں دو گی۔ اس لیے تمہیں سر سے پیر تک ہمارے گھر کے رنگ میں رنگنا پڑے گا اور ان تمام چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھنا پڑے گا۔''

یہ سب کہتے کہتے فرقان آدھی چپل پیروں میں پھنسائے، اسے بھی جلدی آنے کی تاکید کے ساتھ ساتھ سہاگ رات کے تمام وعدے یاد دلا کر گویا مستقبل میں پیش آنے والی آزمائشوں کے لیے ذہنی طور پر تیار کرتے ہوئے باہر چلے گئے۔ وہ ہکا بکا انہیں اتنی ایمرجنسی میں باہر جاتا ہوا دیکھنے لگی۔ وہ ذہنی طور پر الجھ سی گئی اور غائب دماغی سے اٹھ کر باہر جانے سے پہلے اپنا دوپٹا ٹھیک کرنے لگی۔

اپنے دوپٹے کو دیکھتے وہ بری طرح ٹھٹکی اور بلاوجہ ہی ڈھیروں آنسو بن بادل برسات بنے برسنے کو تیار ہو گئے۔ دل میں ایک ہوک سی اٹھی اور اس کے پورے وجود کو کسی ٹائم مشین کی طرح چند دن پرانے ''ماضی'' میں گھسیٹ لے گئی...... اس کے دوپٹے زرتار کے ایک ایک ٹانکے میں اس کی ماں کی محبت اور چاہت گندھی تھی۔ سارا دن کام کرنے کے بعد کتنی راتیں جاگ جاگ کر اس کی امی نے یہ دوپٹا مکمل کیا تھا۔ کتنی بار ان کے ہاتھ میں سوئی لگنے سے خون نکلا تھا۔ ساری انگلیاں چھلنی کرنے کے بعد بھی وہ پہلے سے زیادہ پیار سے دوبارہ بنانے بیٹھ جاتی تھیں اور ہر ٹانکے میں اس کے لیے ڈھیروں دعاؤں کے علاوہ ہر گرہ میں ایک نصیحت بھی ضرور باندھے جاتیں اور اسے بتانا بالکل نہیں بھولتیں۔

''یاد رکھنا میں نے دوپٹے کے ہر کونے پر تمہاری یادداشت کے لیے ایک ایک گرہ لگائی ہے جو تمہیں زندگی بھر ہر مسئلے کے حل اور صحیح راستے کا تعین کرنے میں مدد دیتی رہے گی۔ جیسے جیسے تم اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتی جاؤ گی ویسے ویسے یہ ساری گرہیں ساتھ ساتھ کھولتی چلی جانا۔ سب کام اچھے طریقے سے ختم ہونے کے بعد ان گرہوں کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔'' وہ ہمہ تن گوش سنتی رہتی۔

''سب سے پہلی گرہ ہے بڑوں کا ادب جو ہر حال میں تم پر واجب ہے چاہے وہ کتنے ہی غلط کیوں نہ ہوں۔ انہیں ان کی غلطی کا احساس ضرور دلانا لیکن اپنی ذہانت اور فراست کے ساتھ نہ کہ جاہلوں کی طرح اپنی زبان چلا کر ہماری تربیت خاک میں نہ ملا دینا۔

''دوسری گرہ ہے تمہارے شوہر کی موجودگی اور غیر موجودگی میں اس کی جان و مال اور عزت و ناموس کی حفاظت...... تمہیں جو شکایت ہو صرف شوہر سے کہنا۔ اس کے علاوہ سسرال یا میکے میں اس کا اظہار کر کے اپنے شوہر کا سر مت جھکانا۔'' امی بتاتی رہتیں اور وہ سنتی رہتی۔

''تیسری گرہ ہے اپنے نفس کے علاوہ اپنے

بچوں کی اچھی تربیت اور گھر کا ماحول جو تم نے اسلامی اور معاشرتی دونوں تقاضوں کو ان کے مقام کے حساب سے اہمیت دے کر مکمل کرنا ہے۔'' وہ بتاتی رہیں۔

''چوتھی اور آخری گرہ ہے۔ خود اپنے آپ سے پیار کرنا۔ ان لوگوں کی زمانے میں کوئی قدر نہیں ہوتی جو خود اپنے نہیں ہوتے۔ اگر تم چاہو دوسرے تمہاری عزت کریں تو پہلے تم خود اپنی عزت کرو۔ اپنے آپ کو وقت دینا اور اپنا بہت سا خیال رکھنا۔ ذہنی بھی اور جسمانی طور پر بھی۔ لہسن پیاز کی بو میں بسی بیوی صرف شوہر کے کچن کی باورچن تو بن سکتی ہے مگر دل کی رانی نہیں۔''

ابھی سیما کو صرف تین دن ہوئے تھے اپنی ماں سے بچھڑے مگر ایسا لگ رہا تھا تین صدیاں بیت چکی ہیں۔ وہ اس لمحے میں بالکل بھول ہی گئی کہ اسے فوراً باہر جا کر اپنے شوہر کی عزت بڑھانی ہے بلکہ وہ ابھی تک شیشے کے سامنے بے دھیانی سے کھڑی یادوں کی پرتیں کھولتی جا رہی تھی۔

''دیکھو سیم...... تم میری بیٹی ہو...... دل کی بہت اچھی ہونے کے باوجود مزاج کی کچھ تنک ہو۔ اسی بات کی مجھے بہت فکر رہتی ہے۔ ویسے بھی تمہاری پسند کی شادی ہے۔ ہمارے خاندان میں سات پشتوں میں کبھی ''لو میرج'' نہیں ہوئی ''طلاق'' بھی نہیں ہوئی۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا اور اپنی انا کو میکے کے دروازے پر چھوڑ جانا۔ شوہر کے ساتھ خوش خوش آؤ گی تو سب دیدہ و دل فرشِ راہ کریں گے اور جو کبھی ناراضی سے آئیں تو سب دروازے بند ملیں گے۔''

''حد کر دی بے پروائی اور غیر ذمے داری کی...... وہ بھی پہلے ہی دن۔ کہاں رہ گئی تھیں تم؟ کہا بھی تھا کہ دیر مت کرنا۔'' فرقان لال انگارہ آنکھوں سے اسے دیکھ کر چیخا۔

دم...... سادھے وہ اسے دیکھنے لگی۔ کیا یہ وہی شخص ہے جو صرف پانچ منٹ پہلے اسے دیوانگی کی حد تک چاہنے کا یقین دلا رہا تھا۔ سخت بے یقینی کے عالم میں ڈبڈبائی آنکھوں سے اپنے محبوب شوہر کا یہ بالکل نیا اور عجیب وحشیانہ سا روپ دیکھ کر وہ بھونچکا رہ گئی اور اپنی جگہ سے قدم بھی نہ ہلا سکی۔

''نہیں، نہیں یہ میرا فرقان نہیں ہو سکتا۔'' اس کا معصوم دل مچلنے لگا...... سارے ریشمی لمحے ایک ایک کر کے ریت کی طرح اس کی مٹھی سے پھسلنے لگے اور ایسا لگا جیسے وہ تن تنہا آزمائشوں کے تپتے صحرا میں ننگے پیر آبلہ پائی پر مجبور کر دی گئی ہے۔ حیرت اور صدمے سے آنسو جہاں اٹکے تھے وہیں اٹکے رہ گئے۔

''چلو بھی اب ملکۂ عالیہ...... ویسے تو تم نے... میری انسلٹ کروا ہی دی ہے، میں نے ان لوگوں سے وعدہ کیا ہوا ہے کہ میں پوری زندگی بڑے بھیا کی طرح کبھی زن مرید نہیں بنوں گا، تم بھی یہ بات جتنی جلد سمجھ لو اتنا ہی اچھا ہو گا۔ ایسے نخرے وخرے مجھے بالکل پسند نہیں۔'' وہ اسے بے دردی سے گھسیٹتا ہوا باہر کی طرف بڑھا۔

اُف کیسا درد اٹھا دل میں اور وہ کراہ بھی نہیں سکتی تھی...... ایک تو ابھی بالکل نئی شادی تھی، دوسرے اسے یہ ''لو میرج'' ہر حال میں کامیاب بنا کر دکھانا تھی۔ ویسے بھی وہ ساری کشتیاں جلا کر اس سفر پر روانہ ہوئی تھی۔ آنکھوں میں آنسو، لبوں پر خاموشی کا پہرہ تھا۔ اس لیے چپ چاپ کسی معمول کی طرح اس کے پیچھے گھسٹتی ہی چلی گئی۔

ٹیبل پر فرقان کے امی، ابا، دو بڑے بھائی ان کی بیویاں اور دو شادی شدہ نندیں اپنے اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ موجود تھیں۔ سب اس کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے...... ساسو ماں کی آنکھوں میں فتح مندی کی واضح جھلک دیکھی

جاسکتی تھی۔ وہ جیت گئی تھیں۔ ان کے چھوٹے بیٹے نے اپنی نئی نویلی دلہن کو جس طرح بدتمیزی سے گھسیٹ کر ٹیبل تک پہنچایا تھا اس سے ثابت ہوگیا تھا فرقان ہی ان کی اولاد میں ایک اصلی مرد ہے ورنہ باقی دونوں تو صرف جورو کے غلام تھے۔ ان کے خیال میں مرد صرف وہی ہوتا ہے جو اپنی بیوی کو لگام ڈال سکے اور فرقان اس مردانگی کی آزمائش پر خوب پورا اترتا محسوس ہورہا تھا اور دلچسپ بات تو یہ تھی کہ خاندان کی اتنی مخالفتوں کے بعد اپنی پسند کی بیوی لانے والے فرقان نے پہلے دن ہی ثابت کردیا تھا کہ وہ اپنے بڑے بھائیوں کی طرح کبھی زن مرید نہیں بنے گا۔

☆☆☆

شادی کو ابھی ایک ہفتہ ہی ہوا تھا۔ وہ سب لوگ شام کی چائے پی رہے تھے جب کسی ٹی وی کی خبر پر تبصرہ کرتے کرتے اچانک فرقان کی امی نے کہا۔

''ارے بھئی عورت تو ہوتی ہی فتنہ پرور ہے۔ پوری شر کی وجہ...... پورے سماج میں سارا فساد ان عورتوں کا ہی پھیلایا ہوا ہے۔'' اپنی بات کو سچ ثابت کرنے کے لیے ثبوت کے طور پر وہ کسی نہ کسی کی بہو کا کوئی کارنامہ بھی بیان کرتی جارہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اپنی اور اپنی بیٹیوں کی ان کے سسرال میں لازوال قربانیوں کی مثال دینا بھی نہیں بھولی تھیں۔ اپنی اور اپنی بیٹیوں کی محنت، ہمت اور ایثار ثابت کرنے کو زمین و آسمان کے قلابے ملائے جارہے تھے جب کہ تمام بہوؤں کو مکروفریب اور مجسم فتنہ قرار دیا جارہا تھا۔

ساس کے منہ سے یہ باتیں سن کر اسے حیرت ہوئی کوئی انہیں ایسی گفتگو کرنے سے روک کیوں نہیں رہا۔ ایک بات اس نے خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ بڑی بھابی یہ گفتگو شروع ہوتے ہی سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں جبکہ چھوٹی بھابی ماتھے پر سخت ناگواری لیے خاموش بیٹھی تھیں۔ بیٹے اور بیٹیاں بھرپور طریقے سے اپنی امی کی ہاں میں ہاں ملا کر مختلف حوالوں سے عورت یعنی دنیا کی ہر ''بہو'' کو واقعی فتنہ ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے ماسوائے اپنی ماں اور بہنوں کے جو اُن کے نزدیک مجسم راحت وسکون کا پیکر تھیں۔

سیما کے لیے یہ سب بہت نیا اور غیر یقینی تھا۔ وہ حیرت سے منہ کھولے ایک ایک کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ غصے اور خفت سے اس کا اپنا چہرہ لال بھبھوکا ہورہا تھا۔ اس کے لیے یہ بات ناقابلِ برداشت تھی کہ ایک عورت بھلا خود ہی اپنی صنف کے بارے میں ایسی غیر اخلاقی گفتگو کیسے کرسکتی ہے۔ حد تو اس وقت ہوئی جب ساسو ماں نے خود اسے بھی گھسیٹ لیا اور تصدیق کروانا چاہی کہ ''تم ہی بولو چھوٹی دلہن کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟''

یہ سن کر اس کا خون ہی تو کھول گیا اور وہ لاکھ چاہنے پر بھی ان کو کھری کھری نہیں سنا سکی۔

اسے دکھ ہورہا تھا کہ انہیں یہاں کوئی بھی یہ بات بتانے والا کیوں نہیں ہے کہ ایک عورت زمین پر کسی مرد کے لیے دنیا کا سب سے خوب صورت تحفہ ہوتی ہے خیر اس نے بھی دل میں ٹھان لی کہ کسی نہ کسی دن ان کا یہ خیال بدل کر کم سے کم اپنی امی کی لگائی پہلی گرہ تو کھول ہی ڈالے گی۔

☆☆☆

اس کے سسر کی ''مریدکے'' میں ایک چھوٹی سے لیدر فیکٹری تھی اور فرقان سمیت تینوں بھائی وہیں نوکری کرتے تھے۔ وہ بہت امیر نہ سہی مگر غریب بھی ہرگز نہیں تھے۔ اچھی خاصی عیاشی کی زندگی گزر رہی تھی۔ سارے بھائی اور شوہر ساری کمائی لاکر ساسو ماں کے ہاتھ میں تھما دیتے اور وہی سارے گھر کے اخراجات چلاتی تھیں۔ کسی کی جرات اتنی نہیں تھی کہ اس بارے میں ان سے کوئی سوال کرتا۔

اس کی دونوں بڑی نندوں صبا اور حنا کے گھر بھی ان کے قریب اقبال ٹاؤن میں ہی تھے۔ وہ صبح صبح اپنے اپنے شوہروں اور بچوں کے جانے کے بعد سیدھی اپنے میکے کا رخ کرتی تھیں...... گھر میں کوئی نوکر وغیرہ بھی نہ تھے صرف ایک ماسی صفائی کے لیے آتی باقی سارا بار صرف بھابیوں پر ہی تھا گویا وہ انسان نہ ہوں چلتی پھرتی مشین ہوں۔ سب لوگ مل کر زور زور سے چیختے، فلمی اداکاروں پر بحث سارا دن جاری رہتی۔ خوب ہلڑ بازی مچتی، کھانا وغیرہ بھی یہیں کھایا جاتا اور بار بار بھابیوں سے چائے کی فرمائش بھی کی جاتی۔ ان کے بچے بھی اسکول سے واپسی پر سیدھے یہیں آجاتے اور خوب فرمائشیں کر کر کے کھانے پکواتے۔ شام کو گھر جاتے ہوئے دونوں نندیں یہیں سے اپنے شوہروں کے لیے کھانا بھی لے جاتی تھیں۔

یہ سارا ماحول سیما کے لیے نہ صرف بے حد عجیب اور نیا بلکہ بہت اذیت ناک بھی تھا۔ اس کے اپنے گھر میں سب دھیما دھیما بولتے کوئی کسی پر بوجھ بننا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کے بھائی اور ابو بھی اپنے سارے کام خود کرنے کے عادی تھے مگر یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا تھا گھر سے باہر والوں کے کام بھی بہوؤں کو کرنے پڑتے تھے۔

ایک دن شام کو جب سب ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ اچانک فرقان کا سیل فون بجا تو وہ اٹھا کر دیکھنے لگی۔ اپنی ہی کزن کا میسج دیکھ کر بے اختیار اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ ابھی وہ جواب دینے بھی نہ پائی تھی کہ فرقان نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے سیل فون چھین لیا اور ڈانٹ کر بولا۔

''ارے یہ کیا' میسج؟ پاگل تو نہیں ہوگئیں، تم اپنی کزن کو منع کرو فوراً ابھی اور اسی وقت......خبردار جو کبھی اس نے دوبارہ میسج کیا ہو۔ تمہیں تو معلوم ہے، میسج کا جواب دینے کے لیے پیسے کٹتے ہیں اور میں نے وہ سروس نہیں لی ہوئی۔ عجیب جاہل لوگ ہیں یعنی جب گھر میں فون موجود ہے تو سیل پر ٹیکسٹ کرنے کا مطلب کیا بنتا ہے؟''

سیما حیرت اور غم کے احساس سے بجھ کر رہ گئی۔ سب کے سامنے کچھ بولنے کا مطلب اپنی ہی شامت بلوانا تھا۔ اتنا تو وہ اپنے شوہر کو سمجھ ہی گئی تھی۔ اس لیے خون کے گھونٹ پی کر خاموش ہورہی اور سچائی نہ بتا پائی کہ کس طرح فرقان کی بہنیں سارا سارا دن فون پر قابض رہتی ہیں۔ وہ تو اپنے میکے بھی بات نہیں کرسکتی۔

اس کی کزن نے بھی کئی بار اس کے گھر فون کرنے کی کوشش کی تھی اور فون نہ مل سکنے پر اس کی امی کے ہاتھ شکایت بھجوائی تھی۔ اس کے دوست، احباب اسے فون کرنے کی بار بار کوشش کرتے مگر فون یہ کہہ کر رکھ دیا جاتا کہ ابھی ہم بیرون ملک کال پر ہیں آپ ایک گھنٹے بعد دوبارہ کریں اور وہ گھنٹا کبھی نہ آپاتا کیونکہ بعد میں کوئی دوسرا یہی جملہ دوبارہ سے بول کر آنے والا فون بند کروا دیتا تھا۔

سیما اکثر دل ہی دل میں اپنی ''بے بس'' زبان کی لمبائی ناپتی جس کے لمبا ہونے کا خوف اس کی ماں کو کبھی چین نہیں لینے دیتا تھا اور کبھی اپنی ڈگریوں کا انبار کھول کر بیٹھ جاتی۔ وہ جو اُن سب سے زیادہ پڑھی لکھی تھی۔ ان سب کو ہر بات کا منہ توڑ جواب دے سکتی تھی۔ اس کے پاس ڈھیروں دلیلیں ہوتیں اور وہ تمام دھاروں کا رخ موڑ دینے کی ہمت بھی رکھتی تھی مگر حقیقی دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے اسے یہ علم ہی نہیں تھا کہ باہر سے آنے والے طوفان اپنے ہی قدموں سے اٹھتے ہیں تو ان کی غیر معمولی طاقت اور تباہی انسان کو کسی بھی پیش بندی سے پہلے ہی اوندھے منہ گرا کر ختم کردیتی ہے اور اس وقت سیما کے لیے خود اس کے اپنے شوہر کا رویہ ہی سب سے زیادہ خطرناک طوفان بن چکا تھا۔

ایک دن فرقان کے بڑے بھائی عرفان کا لیپ ٹاپ خراب ہوگیا تو وہ بوکھلائے بوکھلائے اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔

سیما نے کہا ”لائیں میں دیکھ لوں بھیا...... شاید گھر پر ہی ٹھیک ہوجائے کیونکہ میں نے تو کمپیوٹر ہی پڑھا ہوا ہے۔ میں ابھی چیک کرلیتی ہوں۔“

یہ سنتے ہی عرفان بھائی طنزیہ انداز سے ہنسنے لگے اور بولے۔”نہیں بھئی چھوٹی دلہن! تم رہنے ہی دو۔ ہم نے ٹھیک کروانا ہے برباد نہیں کروانا۔“

اسے سن کر بہت برا لگا مگر پھر بھی بہت نرمی سے بولی۔”تسلی رکھیں خراب نہیں ہوگا کم سے کم خرابی کی وجہ تو بتادوں گی باقی آپ بے شک کسی اور سے ٹھیک کروالیجیے گا۔“ یہ کہہ کر زبردستی لیپ ٹاپ کے سامنے بیٹھ کر دیکھنے لگی۔ ابھی دو منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ فرقان نے وہاں آتے ہی اس کے ہاتھ سے لیپ ٹاپ چھین لیا اور غصے سے بولے۔

”ارے ارے یہ کیا غضب کررہی ہو، چھوڑو اسے، پاگل ہوئی ہو کیا؟ تباہ کردوگی تم تو لیپ ٹاپ کو۔ لڑکیوں کا کام صرف ہانڈی چولھا دیکھنا ہے۔ یہ کمپیوٹر وغیرہ لڑکوں کے کام ہیں۔ تم برائے مہربانی دوبارہ بھی اسے ہاتھ مت لگانا۔“

ایسے موقع پر ساس بھلا کیوں پیچھے رہتیں فوراً بولیں...... ”معاف کرو بھئی پہلے اگر ہمارے پانچ سو روپے لگنے ہیں تو تمہارے ہاتھ لگانے کے بعد کہیں پانچ ہزار نہ لگ جائیں۔“ ساسوماں کے ایسا کہتے ہی سب بدتمیزی سے ہنسنے لگے اور سیما خفت سے بری طرح لال ہوگئی۔

”مگر میں نے بیچلرز کیا ہے کمپیوٹر ہارڈ ویئر میں۔“ وہ خفگی سے دبا دبا احتجاج کرتے ہوئے بولی۔

”تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ پڑھنے میں اور پریکٹیکل کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ رٹا لگا کر پاس ہونا اور بات ہے اور اصلی کمپیوٹر ٹھیک کرنا بالکل اور بات۔“ اس کی نند کا اٹھارہ سالہ بیٹا بھی مذاق اڑانے میں اپنے خاندان سے ہرگز کم نہیں تھا۔ ”یہ تو مردوں کے کام ہیں، جس کا کام اسی کو ساجھے آپ کچن میں جا کر ہمارے لیے چکن تکہ اور ریشمی کباب بنائیے پلیز۔“

وہ پلٹ کر بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر پھر کچھ سوچ کر خاموشی سے اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔

اس نے کئی بار فرقان کے سیل پر کوئی کام کرنا چاہا یا گھر کے کمپیوٹر کو ٹھیک کرنا چاہا مگر ہر بار اسے مذاق کا نشانہ بنا کر سختی سے روک دیا گیا۔ بلکہ صحیح معنوں میں دونوں چیزیں اس کے ہاتھوں سے چھین لی گئیں۔ ٹھیک کرنا تو بہت دور کی بات اسے تو چھونے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ رفتہ رفتہ وہ کمپیوٹر اور سیل فون کو مکمل طور پر بھولنے لگی۔ اب تو اسے خود بھی یاد نہیں رہا تھا کہ اس نے بیچلرز کر رکھا ہے۔ اگر کبھی ہاتھ لگاتی بھی تو صرف اپنی کوئی میل پڑھ کر فوراً بند کرنے کا آرڈر تھا۔ اس کے علاوہ وہ کسی سائٹ پر نہیں جاسکتی تھی۔ یا کمپیوٹر پر کوئی کام نہیں کرسکتی تھی۔

وہ جتنا خاموش رہ کر صبر کے گھونٹ پی کر اپنا آپ مار کر اچھی بہو بننے کی کوشش کرتی اتنا ہی دوسری طرف سے تضحیک کا نشانہ بنایا جاتا۔ اگر انسان کسی کی بات مانتا چلا جائے تو سب اسے مفت کا مال سمجھ کر دباتے ہی چلے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا۔ فرقان بند دروازے کے پیچھے اس کے لیے ریشم بن جاتا اور دروازے کے باہر کھدر جیسا سخت اور کھردرا۔ ہر بات میں احساس دلاتا کہ جیسے لو میرج کو کامیاب بنانا صرف سیما کی ہی ذمے داری ہو۔

☆☆☆

اسی طرح دن پر دن گزرنے لگے۔ زمین نے جتنی دیر میں سورج کے گرد اپنے چار چکر مکمل کیے تھے

اتنی دیر میں تین سالہ حرا اور دو سالہ عدنان بھی سیما کو اپنا مرکز منتخب کرکے اس کے گرد چکرانے لگے تھے۔ وہ بھی اپنی کہکشاں میں شامل ہونے والے ان دو خوب صورت سیاروں میں کھوسی گئی۔ اب وہ کسی بات پر حیران نہیں ہوتی تھی۔ گھر اور گھر والوں کا وہی وتیرہ تھا۔

ایک دن ہمسائے سے ایک لڑکی عالیہ اپنا ایک کمپیوٹر اسائنمنٹ سیما کے پاس اٹھا لائی۔ صبح اس کا پیپر تھا اور اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ سیما نے کمپیوٹر پر میل چیک کرنے کے علاوہ چار سال سے کچھ نہیں کیا تھا۔ وہ سب کچھ بھول چکی تھی۔ اسے خود بھی کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ عالیہ کو کیا بتائے۔ اس نے کافی یاد کرنے کی کوشش کی مگر دماغ کے ہر خانے سے ماں کی نصیحتوں اور ساس کی فضیحتوں کے علاوہ کچھ نہ نکلا۔ کافی سر کھپانے کے بعد اسے کچھ کچھ یاد آنے لگا۔ سارے گھر والے طنزیہ انداز سے اسے تک رہے تھے۔ کافی کوشش کے بعد اسے سمجھ آہی گیا اور اس نے عالیہ کا مسئلہ حل کرکے اس کو بھیج دیا۔

آج اس کی بڑی بھابی نے اسے اپنا سیل دے کر کہا۔”ذرا انٹرنیٹ سے ”میں تیرے پیار میں پاگل“ یہ والا گانا تو اپ لوڈ کردو مجھے بڑا پسند ہے۔ میں چاہتی ہوں اسی گانے کی گھنٹی بنالوں۔“

وہ سیل فون اپنے ہاتھ میں دیکھ کر گھبرا گئی اور حیران ہوکر بولی۔ ”مگر میں کیسے کروں؟ مجھے تو سیل میں سینڈ والے بٹن کے علاوہ کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ میں نے تو کئی سالوں سے سیل فون کو چھوا تک نہیں۔“

”کیا؟“ حیرت سے بڑی بھابی کی چیخ بلند ہوگئی۔”یہ کیا کہہ رہی ہو؟ مگر تم تو ہر وقت کمپیوٹر کی تعلیم کے جھنڈے گاڑتی رہتی ہو۔ کیا رشوت دے کر پاس ہوئی تھیں جب کہ تمہیں تو سیل فون پر نیٹ سے ایک گانا تک ”اپ لوڈ“ کرنا نہیں آتا؟“

وہ بری طرح شرمندہ ہوگئی۔ ”دراصل فرقان کبھی مجھے اپنے سیل فون کو ہاتھ نہیں لگانے دیتے نہ ہی لے کر دیا ہے اس لیے مجھے اس کے فنکشنز کا بالکل علم نہیں ہے۔“

”ارے چھوڑو بھئی یہ تو بس بہانے ہیں۔ کیا پتا تمہیں کمپیوٹر بھی آتا ہے یا نہیں ورنہ ڈگریاں تو فٹ پاتھ پر دو دو ہزار میں عام مل جاتی ہیں۔ ایسے ہی تو فرقان تمہیں کبھی کمپیوٹر کو ہاتھ نہیں لگانے دیتا۔ ظاہر ہے تمہاری اصلیت جانتا ہی ہوگا۔ اپنی اسٹوڈنٹ لائف میں وہ دو سال تمہارے چھوٹے بھائی کو ٹیوشن پڑھانے تمہارے گھر جو جاتا رہا ہے۔“

ان کی بات سن کر وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ اس کے دونوں بچے بھی بڑی حیرانی سے اپنی ماں کو بے عزت ہوتا دیکھ رہے تھے۔ لاکھوں ان بہے آنسو اس کے دل پر بھی جمنے لگے کہ غم کی دیمک تو پہلے سے ہی اسے کافی کھوکھلا کرچکی تھی۔

”نہیں نہیں۔ اب نہیں......“ اس کے اندر بغاوت کا ایک طوفان اٹھا۔”نہیں میری ماں...... مجھے اب یہ گرہیں کھولنی ہوں گی جو آپ نے میری اچھی زندگی کے لیے لگائی تھیں۔ اب ان کے کھول دینے کا وقت آچکا ہے کیونکہ میں خود اپنی اولاد کے سامنے بے عزت نہیں ہوسکتی۔“ وہ کافی دیر تک جاگتی رہی اور نئی زندگی کے نئے منصوبے بناتے بناتے جانے کب آنکھ لگ گئی۔

آدھی رات کا وقت تھا جب خوفناک چیخوں سے اس کی آنکھ کھلی۔ گھر میں ڈاکو گھس آئے تھے۔ سارا زیور اور گھر میں موجود کیش کے علاوہ جاتے جاتے فرقان کو بھی اس شرط پر ساتھ لے گئے تھے کہ جلد ہی ساٹھ لاکھ کا انتظام کرکے اسے چھڑوالینا ورنہ تین دن بعد لاش کے ٹکڑے گھر کے قریبی کوڑے کرکٹ کے ڈھیر سے اٹھالینا۔

سارے گھر والے حیران پریشان کھڑے بے بسی سے یہ سب ہوتا دیکھ رہے تھے اور سیما کے تو جیسے پیروں کے

نیچے سے زمین نکل گئی۔ اس کی تو دنیا ہی اندھیر ہو گئی تھی۔

جیسے تیسے کر کے دو دن میں فیکٹری اور گھر کو نیلام کر کے، کچھ دوستوں کی مدد سے پچپن لاکھ کا انتظام کیا گیا اور وہ لوگ خود کچھ دن کے لیے بڑی نند کے گھر منتقل ہو گئے پھر بھی پانچ لاکھ کسی صورت نہیں بن رہے تھے۔ سیما کے گھر والوں نے بڑی مشکل سے اپنی زمین گروی رکھ کر باقی پانچ لاکھ کا انتظام کر دیا۔

تیسرے دن فرقان گھر تو آ گیا مگر اسے زندہ سلامت واپس لانے تک وہ لوگ خود فقیروں سے بھی برے حالوں میں آ گئے۔ ایک ہفتے تک تو بڑی نند صبر کرتی رہی مگر پھر صبح شام کی مہنگائی کا رونا اور جگہ کی تنگی کی شکایت بڑھتی ہی چلی گئی۔ وہ لوگ اس کی بدتمیزی سے بھرپور تقریریں سن سن کر بے حد شرمندہ ہوتے رہتے مگر انسان بھی عجیب معاشرتی جانور ہے۔ مجبوری کی انتہا اسے بھی اکثر بے غیرت بن جانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ تینوں بھائیوں نے صرف ''گریجویشن'' کیا ہوا تھا۔ ان کو بھی فی الحال کہیں نوکری نہیں مل رہی تھی۔ سارا سارا دن نوکری کی تلاش میں مارے مارے پھرتے اور شام کو ناکام واپس جوتیاں چٹخاتے۔ بہن کے در پر دوبارہ بے عزت ہونے لوٹ آتے۔

سب لوگ فرقان اور سیما سے کٹے کٹے رہتے کہ جیسے سارا قصور ان دونوں کا ہی ہو اور دونوں جان بوجھ کر ان کی بربادی کی وجہ بنے ہوں۔ صرف تین ہفتے میں وہ لوگ زندگی کے ایک ناقابلِ یقین موڑ پر آ گئے تھے جہاں اندھیرا تھا، ذلت تھی، بے بسی تھی اور امید کی کوئی کرن نظر نہیں آ رہی تھی۔ کہتے ہیں حالات بدلتے دیر نہیں لگتی وہی ان کے ساتھ ہوا تھا۔

سیما نے اخبار میں کمپیوٹر کی ویکنسی کا اشتہار دیکھتے ہوئے ڈرتے ڈرتے فرقان سے نوکری کی اجازت مانگی۔ جسے سنتے ہی پہلے تو وہ غصے سے لال ہو گیا مگر پھر موجودہ صورتِ حال اور بہن کے طعنے اور بھائیوں کی بے روزگاری نے ہونٹوں پر مجبوری کی مہر لگا دی اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا سر انکار کے بجائے اقرار میں ہل گیا۔

انٹرویو میں کامیاب ہوتے ہی اگلے ہفتے اسے جاب کا لیٹر مل گیا اور وہ سب لوگ اپنی بچی کھچی عزت سمیٹے پرانی انارکلی کے ٹوٹے پھوٹے گھر میں دو ہزار کرایہ کے مکان میں اُٹھ آئے۔ اس کی دونوں بڑی نندیں اب اس گھر میں کبھی جھانکتی بھی نہیں تھیں۔ اس کی ساس اکثر بڑبڑاتی رہتی تھیں۔

''جانے کیوں یہ کمبخت دولت جاتے جاتے ساری محبتوں کو بھی اپنے ساتھ بہالے جاتی ہے کہ خونی رشتے بھی غیر ہو جاتے ہیں۔'' سب یہ سن کر خاموش رہتے۔ کسی کے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔ وہ محنت کش لوگ تھے پھر سے ایک دن انہیں ...خوشحال ہونا ہی تھا مگر فی الحال تو خوشیوں بھرے گھر میں اب بھوک، مفلسی، تنہائی اور مایوسی نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ بھائیوں کو بھی بعد میں کچھ چھوٹی موٹی نوکریاں مل گئی تھیں۔ جیسے تیسے کر کے وہ جسم و جاں کا رشتہ قائم رکھنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور دوبارہ سے اپنا بزنس شروع کرنے کے طریقوں پر غور کر رہے تھے۔

ایسے میں جب سیما کو جاب سے پہلا چیک ملا تو اس نے گھر کی پرانی روایت برقرار رکھتے ہوئے باقی تینوں بیٹوں کی طرح، گھر میں داخل ہوتے ہی بہوؤں کو فتنہ قرار دینے والی ساس کے ہاتھ میں اسے تھما دیا تو جانے کیوں وہ تڑپ اٹھی تھیں اور کچھ بھی کہے بغیر اتنے سالوں میں پہلی بار سیما نے کوئی بھی بدتمیزی کیے بغیر صرف اپنی ذہانت اور فراست سے ایک بزرگ کو اس کی غلطی کا احساس دلا کر اپنی ماں کی لگائی ہوئی پہلی گرہ تو کھول ہی دی تھی اور اسے یقین تھا کہ بہت جلد باقی گرہیں بھی وہ کھول دے گی جن کے پار ایک روشن زندگی صرف اس کی نہیں بلکہ سب کی منتظر تھی۔



لبنیٰ عروج کی یاد میں

انجم انصار

دل غم سے بوجھل ہے

بعض دفعہ معمولی سی بات بھی جب پلٹ کر آتی ہے تو وہ معمولی سے غیر معمولی بن جاتی ہے جب ہم بولتے ہیں تو کچھ پتا نہیں ہوتا کہ ان باتوں میں سے کیا سچ ہونے والا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں نے اپنی مایہ ناز مصنفہ شازیہ چوہدری کی رحلت کے بعد شازیہ چوہدری نمبر نکالا تھا تو اس کو پڑھ کر لبنیٰ عروج نے ہنس کر مجھ سے کہا تھا۔

''انجم پاکیزہ میں تمہیں میرا بھی ایسا ہی نمبر نکالنا ہوگا۔''

تب میں نے ہنس کر کہا تھا۔ ''اس کے لیے تو مرنا ہوگا بھئی۔ زندگی میں رائٹرز کو کم کم ہی اتنا چاہا جاتا ہے۔''

اس پر وہ ہنس کر بولی تھی ''ہم پاکیزہ پر تو مرتے ہیں ناں۔ یہ کیا کم ہے نمبر تو تمہیں ضرور نکالنا ہوگا۔''

بات ہنسی کی تھی اور مذاق میں ہی ختم ہو گئی مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے حقیقتاً اس کی وفات کے بعد لبنیٰ عروج نمبر نکالنا ہوگا۔

لبنیٰ عروج کے بارے میں کیا لکھوں کہ وہ بحیثیت دوست کتنی اچھی تھی یا بحیثیت رائٹر...... دونوں کے بارے میں، میں یہ کہوں گی کہ وہ بہترین تھی۔ بات کرنے کا دھیما انداز، لہجے میں جیسے مسکراہٹ گھلی ہوتی تھی اور بات کرنے کے بعد اس کا زندگی سے بھرپور قہقہہ ایک شگفتگی سی عطا کرتا تھا۔ وہ ایک بہت اچھی ماں تھی اپنی اکلوتی بیٹی سے بہت محبت کرتی تھی کتنی دفعہ اس نے مجھ سے یہ بات کی تھی۔

''انجم جب اکلوتی بیٹی کو بیاہ دیا جاتا ہے تب ماں کیسے رہ پاتی ہے، وہ تو اپنی بیٹی کو بہت یاد کرتی ہوگی۔''

اور میں اسے سمجھاتی کہ ''جب بیٹی اپنے گھر میں

خوش ہوتی ہے تو ماں سے زیادہ کوئی دوسرا خوش ہونے والا نہیں ہوتا تب بیٹی بھاگ بھاگ کر میکے نہ بھی آئے تو ماں کو کوئی فرق نہیں پڑا کرتا۔"

"اچھا مجھے تو جب یہ تجربہ ہوگا تب پتا چلے گا۔ میں تو جب یہ سوچتی ہوں کہ منی میرے پاس سے چلی جائے گی تو میرے دل کو کچھ ہونے لگتا ہے۔" اسی طرح وہ اپنے دونوں بیٹوں سے بے حد محبت کرتی تھی اور اطیب کا ذکر تو ہمیشہ ہی ہوا کرتا تھا۔ بحیثیت رائٹر وہ عموماً سچی کہانیوں پر قلم اٹھاتی تھی۔ بعض دفعہ مجھے اس کے افسانے کے اختتام سے اختلاف ہوتا تھا تو وہ کہتی کہ حقیقت میں تو واقعی ایسا ہی ہوا تھا۔ تب ہم باہم مشورہ کر کے اختتام کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا کرتے۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ وہ ناول لکھے اور ٹی وی کے لیے ڈرامے بھی لکھے اور میں نے اپنی ایک اسکرپٹ ایڈیٹر دوست کو اس کا نام بھی دے دیا تھا مگر اس کی زندگی میں اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکی۔ لبنیٰ کی کہانیاں اپنے پڑھنے والوں کو ایک آگاہی دیتی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے قاری کو اسی ماحول میں لے جاتی ہیں جس میں اس کے کردار چلتے پھرتے اور باتیں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک بہت پیاری رائٹر ہم سب کو چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ اس کی مغفرت کے لیے دعا کرنا اور پڑھ کر بخشنا اس کا یہ حق ہے جو ہم سب پر ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ ہماری ہر قاری بہن اس کے لیے دعا کرے گی۔ آئیں اس کے پیاروں کی دل گداز تحریریں پڑھنے سے پہلے اس کے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ لبنیٰ عروج کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔

میری شریکِ حیات

کمانڈر ظفر اقبال ملک

میں اپنی شریک حیات کے بارے میں کیا لکھوں۔ وہ مجسمۂ شرافت، خوش گفتار، خوش کردار، خوش لباس، خوش خوراک، محبت کا ایک سمندر اور ہر حال میں خوش رہنے والی خاتون تھیں۔ اس نے ہمیشہ محبتیں بانٹیں اور محبتیں سمیٹیں۔ میں نے آج تک اسے کبھی کسی بھی حال میں پریشان نہیں دیکھا۔ شکوہ نہ شکایت ...... ہمیشہ مسکراتے رہنا۔ اپنی 28 سالہ ازدواجی زندگی میں، میں نے صرف دو مرتبہ انہیں پریشان دیکھا۔ پہلی مرتبہ جنوری 1993ء میں جب ان کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہوا اور دوسری مرتبہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں جب وہ اپنی بیماری کی وجہ سے سخت تکلیف میں تھیں۔ ان کو اپنے بچوں سے بہت لگاؤ اور پیار تھا اور ان کو اس بات کا بہت قلق تھا کہ وہ پچھلے ایک سال سے اپنے بچوں کے لیے اپنے ہاتھ سے کچھ نہیں بنا پا رہی تھیں کیونکہ وہ چلنے پھرنے سے قاصر تھیں۔ اپنے بچوں سے روزانہ کہتی تھیں کہ مجھے معاف کر دینا کہ آپ سب میری وجہ سے بہت تکلیف میں ہیں اور میں آپ لوگوں کی پسند کی چیزیں آپ کو بنا کر نہیں دے سکتی۔ اپنی وفات سے چند روز قبل انہوں نے مجھ سے کہا کہ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اپنے تمام رشتے داروں سے اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کی (اگر کوئی ہے تو مجھے تو نہیں یاد پڑتا کہ میں نے کبھی کسی سے لڑائی کی ہو یا اس کے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات کہی ہو) معافی مانگ لوں۔ چنانچہ اس نے فرداً فرداً ہر ایک کو فون کیا اور ان سے معافی مانگی۔ آخری دنوں میں کہتی تھیں کہ ظفر اقبال میں نے تمہیں چھوڑ جانا ہے اور ان بچوں کی شادیاں تمہیں اکیلے ہی کرنا پڑیں گی۔ میں کہتا تھا کہ آپ مایوسی کی باتیں کیوں کرتی ہیں۔ تو وہ کہتی تھیں کہ اس بیماری نے مجھے زندہ نہیں رہنے دینا اور میں چاہتی ہوں کہ میں آپ کے ہاتھوں میں ہی دَم دے دوں اور آپ اپنے ہاتھوں سے مجھے قبر میں اتاریں کیونکہ میں نے سنا ہے کہ جو عورتیں اپنے خاوندوں کے ہاتھوں میں دم دے دیتی ہیں وہ سیدھی جنت میں جاتی ہیں۔ تم مجھے اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارنا اور تجہیز و تکفین کے تمام اخراجات خود کرنا۔ برداری والوں سے کوئی روٹی یا خرچہ نہ لینا۔ جب بھی میرا ختم دلانا اس میں peach کا جوس ضرور رکھنا کیونکہ یہ مجھے پسند ہے۔ کہنے لگیں کہ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کبھی تمہاری کوئی نافرمانی کی ہو لیکن پھر بھی اگر

آپ کے دل میں کوئی ایسی بات ہو تو مجھے معاف کر دو۔ اس نے ہمیشہ دوسروں کے بارے میں سوچا اور جتنا بھی لکھا وہ معاشرے کی اصلاح کے لیے لکھا۔ اس نے زندگی میں جو چاہا اللہ نے اسے دیا۔ اس نے بڑے بیٹے کی پیدائش سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اس بیٹے کو میں ائر فورس میں بھیجوں گی، وہ ائر فورس میں گیا۔ وہ کہتی تھیں کہ میری سب سے بڑی خواہش ہے کہ میرا بیٹا فوج میں جائے اور جب اس کو کمیشن ملے تو سب سے پہلے مجھے سلیوٹ کرے اور ایسا ہی ہوا۔ بیٹی کے وقت اس نے کہا تھا کہ میں اسے ڈاکٹر بناؤں گی تاکہ وہ میرا علاج کر سکے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ آخری وقت میں C.M.H راولپنڈی میں اس کی بیٹی ہی اس کے پاس تھی۔ اسامہ کو اس نے انجینئر بننے کا کہا وہ بھی ماشاءاللہ اگلے سال جون میں انجینئرنگ کی ڈگری Nust یونیورسٹی سے لے لے گا۔ مرحومہ بہت ہی Organised تھیں اور ان کو ہر چیز سنبھال کر رکھنے کا بہت شوق تھا۔ انہوں نے سیکڑوں افسانے لکھے (150 کی لسٹ تو میرے پاس ہے) ان سب کے مسودات آج تک محفوظ ہیں۔ مرنے سے چند منٹ پہلے تک وہ مجھ سے رابطے میں تھیں۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ اس جہانِ فانی کو چھوڑنے والی ہیں۔ ہماری کام والی آخری وقت میں ان کے پاس تھی، وہ بتاتی ہے کہ صاحب جب آپ کا فون ختم ہوا تو باجی نے کہا۔ "بُوا میری بات کو غور سے سنو۔ میرے مرنے کے بعد تم نے میرے بچوں کا خیال رکھنا ہے۔ ان کے ساتھ ضد نہیں لگانی۔ جو وہ کہیں وہ بنا کر دینا۔ ہاں میرے میاں کو بعض دفعہ غصہ آ جاتا ہے ان کا غصہ صرف پانچ دس منٹ کا ہوتا ہے اس کا بُرا نہ منانا اور میرے بعد ان کا خیال رکھنا۔ کہنے لگیں بوا میری بڑی خواہش تھی کہ میں اپنے بچوں کی شادی اپنے ہاتھ سے کرتی لیکن وقت نے مجھے مہلت نہ دی پھر کہا بوا تم میرے ساتھ ساتھ کلمۂ شہادت پڑھو۔" چنانچہ انہوں نے تین مرتبہ کلمۂ شہادت پڑھا۔ پانی پیا اینڈ شی اِز نو مور۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کو جنت الفردوس میں بلند مقام عطا فرمائے۔ راہ میں ساتھی چھوڑ گیا ہے بس یادیں ہیں اور تنہائی ہے۔ بڑے بیٹے کے خواب میں آئیں اور اس سے وعدہ لیا کہ وہ پاکستان کے لیے اپنی جان قربان کرے گا۔

میری پیاری اماں

فلائٹ لیفٹیننٹ محمد اطیب ملک

2 اگست 2012ء دن کے بارہ بج کر تیس منٹ اماں ہم سے رخصت ہوگئیں۔ ایسا لگا کہ جیسے میرے سر پر موجود چھت اُڑ گئی ہو۔ مجھ سے وہ سایہ دار درخت چھن گیا جس کی چھاؤں میں بیٹھ کر میں اپنے آپ کو دنیا کی فکروں سے آزاد سمجھتا تھا۔ مجھ سے اس گہرے کنویں کی ملکیت چھن گئی جس میں آج تک اپنی پریشانیوں کی گٹھڑیاں باندھ باندھ کے پھینک آیا تھا۔ اماں 16 اکتوبر 1957ء کو پیدا ہوئیں۔ ان کے والد فیض محمد خان اردو زبان کے شاعر تھے اور والدہ انگریزی زبان کی پروفیسر تھیں۔ ادب اماں کو ورثے میں ملا تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ انہوں نے آٹھویں جماعت میں اپنا پہلا افسانہ لکھ ڈالا۔ اماں ذرا مختلف قسم کی خاتون تھیں۔ سرگودھا جیسے بیک ورڈ علاقے میں پیدا ہونے کے باوجود ان کی سوچ ہمیشہ پروگریسو تھی۔ وہ ہر وقت غور و فکر کیا کرتی تھیں۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ ان کی دوستی بچپن میں ہی ہوگئی تھی اور اسی دوستی کی بنا پر انہوں نے میری پیدائش سے دو ماہ قبل ایک ڈیل کی تھی۔ انہوں نے اللہ میاں سے کہا کہ "اے اللہ میاں اگر تو نے مجھے بیٹا دیا تو میں اسے تیرے پاکستان کی حفاظت کے لیے ائر فورس میں بھیج دوں گی۔" اور اللہ نے جیسے کہا ہو کہ بی بی میں نے تیری سن بھی لی اور مان بھی لی اب اپنی بات پر قائم رہنا۔ یوں 9 ستمبر 1985ء کو مابدولت اس دنیا میں تشریف لے آئے۔ جب اماں کی پرانی باتیں میں اب یاد کرتا ہوں تو ان میں سے ایک چیز جو سب سے زیادہ اُمڈ کر سامنے آتی ہے وہ اقبال کا ایک شعر ہے

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

یہ شعر اماں نے مجھے اس وقت سکھایا جب میں



لبنیٰ عروج اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ

غالباً پہلی جماعت میں تھا۔ مجھے اس شعر کا مطلب نہیں پتا تھا۔ اماں نے کبھی سمجھایا بھی نہیں تھا لیکن آج تک یہ شعر میرے دل و دماغ پر لکھا ہوا ہے۔ جب ہوش سنبھالا اور اس شعر کا مطلب سمجھ آیا تو اماں کی شخصیت کا ایک اور ہی پہلو نظر آنا شروع ہوا۔ اماں کے متعلق یہ تو میں بتا چکا ہوں کہ وہ ذرا مختلف قسم کی خاتون تھیں۔ مختلف وہ اس لیے تھیں کیونکہ وہ پرفیکٹ تھیں۔ زندگی کے جس شعبے میں بھی انہوں نے قدم رکھا وہ بلندیوں کی طرف پرواز کرتی گئیں افسانہ نگاری ان کا شوق تھا اور اس میں انہوں نے اتنا نام کمایا کہ اپنی تمام تر دیگر ذمے داریوں کے باوجود ان کے سیکڑوں افسانے چھپ چکے ہیں اور ایک کتاب کی بھی وہ مصنفہ ہیں۔ کھانے پکانے کا اتنا شوق تھا کہ اس زمانے میں جب شاذ و نادر ہی کسی نے لفظ پیزا سنا ہوگا وہ ہمیں پیزا بنا دیتی تھیں۔ اماں کی بنائی ہوئی کوکیز اور کیکس کا تو جواب ہی نہیں تھا۔ اماں مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں اور مجھے اپنی اماں سے بہت پیار تھا۔ وہ مجھے بچپن میں نبیوں کے قصے سناتی تھیں اور میں جواب میں کہتا کہ وسیم اکرم یوں بالنگ کرواتا تھا۔ اپنے اس جواب کو اب میں سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ اگر میں اماں کی جگہ ہوتا تو اپنے بیٹے کے سارے دانت توڑ دیتا۔ اماں مجھے کچھ نہیں کہتی تھیں وہ الٹا مجھے پیار کرتی تھیں۔ ان کے تینوں بچوں میں سے انہیں سب سے زیادہ محبت مجھ سے تھی۔ شاید میں پہلا بچہ تھا اس لیے۔ میرے دونوں چھوٹے بہن بھائی اکثر اماں کو فلم دیوار کا یہ ڈائیلاگ بول کر تنگ کیا کرتے تھے کہ ”ماں کی لوری میں بھی بڑے بھیا کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔“ جب میں رسالپور اکیڈمی سے گھر آتا تھا تو انہیں یہ فکر ہوتی تھی کہ وہ جلدی مجھے کھانا دے دیں۔ میرے والد، میری بہن، چھوٹا بھائی اور کام والی سب کی شامت آجاتی تھی۔ اماں کہتی تھیں اطیب آگیا ہے فلاں چیز بھی لے آؤ اور فلاں چیز بھی لے آؤ پھر محبت سے پاس بٹھا کر کہتی تھیں۔ ”میں نے چکن بنایا ہے میرا بچہ روٹی کھالو۔“

اور میں کہتا تھا۔ ”اماں یار سانس تو لینے دیا کریں میرے آتے ہی آپ کو روٹی کی فکر پڑ جاتی ہے۔“

اس پر وہ دکھی سی ہو کر کہتیں۔ ”اچھا اب میں کچھ نہیں بولتی۔“ پھر چند سیکنڈز کے لیے فضا میں خاموشی

چھا جاتی اور اگلے ہی لمحے اماں میری طرف دیکھ کر کہتیں۔ ”اچھا پھر ٹھنڈا روح افزا بنوا دوں۔“ میری ہنسی نکل جاتی اور اماں کام والی کو کہتیں جلدی ٹھنڈا روح افزا لے آ۔ انہیں جب پتا لگتا کہ میں سفر پر نکلنے لگا ہوں تو وہ نہ جانے کون کون سی سورتیں اور کون کون سی دعائیں پڑھتیں۔ جب تک میرا سفر ختم نہ ہو جاتا وہ پڑھتی رہتیں اور میرے چہرے کو اپنے تصور میں لاکر پھونکیں مارتی رہتی تھیں۔ مجھے ہمیشہ ہدایت کرتی تھیں کہ سفر کی دعا اور آیت الکرسی ضرور پڑھا کر۔ میں کہتا کہ جب آپ پڑھ رہی ہیں تو مجھے کیا ضرورت ہے۔ اس پر وہ بہت محبت سے میری طرف دیکھتیں اور کہتیں۔ ”نہ میرا بچہ ایسا نہیں کہا کرو۔ ضرور پڑھ لیا کرو اللہ تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔“ لیکن میں اماں کی ایک نہیں سنتا تھا۔ اماں نے جب میرے لیے لڑکی کی تلاش شروع کی تو عام لوگوں کی طرح شریف لوگ ہوں اور لڑکی پڑھی لکھی ہونے کے ساتھ ایک اور شرط بھی لگادی جس کا ذکر انہوں نے جب مجھ سے کیا تو میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا کہنے لگیں۔ ”لڑکی میں ذرا اسٹائل بھی ہونا چاہیے۔“ یہ بات وہ خاتون کر رہی تھیں جو ٹی وی کا چینل تبدیل کرتے کرتے نعت سننے کے لیے رک جاتی تھیں اور نعت سنتے وقت ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے۔ اماں کو حضورؐ سے بہت محبت تھی۔ نعتیں سنتے ہوئے ان کے آنسو دیکھ کر مجھے اب سمجھ آنی شروع ہوئی تھی کہ اماں مجھے اقبال کا وہ شعر کیوں سکھاتی تھیں۔ میں کبھی کبھی اپنی طرف سے دین کا پروفیسر بن کر اماں کو کوئی نئی معلوم ہونے والی حدیث بتانے لگتا اور میں صرف اتنا ہی کہہ پاتا تھا کہ اماں آپ کو پتا ہے کہ حضورؐ نے کہا تھا...... اور ان کی آنکھیں بھیگ جاتی تھیں۔ اماں کو لفظ اماں سخت ناپسند تھا۔ وہ کہتی تھیں کہ میں ابھی اتنی بوڑھی نہیں ہوئی کہ تم نے مجھے اماں کہنا شروع کر دیا ہے لیکن ہماری اپنی مجبوریاں تھیں، ہم ڈرتے تھے کہ اگر مما کہا تو دوسرے بچے ہمیں ممی ڈیڈی بچے کہیں گے۔ امی اور ابو ہمیں سکھایا ہی نہیں گیا تھا لیکن اماں تو اماں تھیں۔ انہوں نے ایک پسماندہ علاقے سے تعلق ہونے کے باوجود 1985ء میں اپنے بچے کو مما اور پاپا کہنا سکھایا تھا حالانکہ اس زمانے میں عام طور پر ماں، باپ کو ابا اور امی جی کہا جاتا تھا۔ آج اگر اماں کو پتا لگے کہ میں ان کے بارے میں کچھ لکھ رہا ہوں اور اس تحریر کا عنوان اماں ہے تو شاید وہ مجھے جوتے ماریں۔ اماں ہماری سالگرہ بہت شوق سے منایا کرتی تھیں بہت وسیع پیمانے پر پارٹیاں ہوا کرتی تھیں۔ Navy کے گلاس اور اسٹیورڈز آتے تھے ڈھیروں مہمان ہوتے تھے اور ماں اِدھر سے اُدھر بھاگتی پھرتی تھیں۔ وہ بہت اچھے دن تھے اماں صحت مند اور تندرست تھیں پھر ان کو ذیابطیس ہوگئی اور اس کے بعد ہم نے کبھی ان کو صحت مند نہیں دیکھا۔

تقریباً دو ماہ پہلے C.M.H راولپنڈی کے ڈاکٹرز کے ایک بورڈ نے ہمیں بتایا کہ اماں کو کینسر ہوگیا ہے۔ ہمارے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی جب ہم ہاسپٹل کی پارکنگ میں واپس آکر گاڑی میں بیٹھے تو سب چُپ تھے۔ دلوں پر بہت بوجھ تھا اور ماں Peach کا جوس مانگ رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں۔ ”کم بختوں اب تو پینے دو۔ چینی مجھے کچھ نہیں کہتی اور اب کینسر سے بڑی مجھے اور کیا بیماری ہونی ہے۔“ وہ بہت حوصلے والی تھیں لیکن دیکھتے ہی دیکھتے اگلے کچھ دنوں میں اماں کی حالت خراب ہوتی گئی۔ کینسر ان کی ہڈیوں میں سرایت کر چکا تھا جس کی وجہ سے انہیں بہت تکلیف تھی۔ وہ سیدھا لیٹ نہیں سکتی تھیں۔ وہ بیڈ سے ٹانگیں لٹکائے دو ماہ بیٹھی رہیں کیا دن اور کیا رات انہیں کسی صورت چین نہیں آتا تھا۔ ایک ہی پوزیشن میں بیٹھ بیٹھ کر پورا جسم سُوج چکا تھا۔ آہستہ آہستہ اماں کا دل کھانے پینے سے بھی اٹھ گیا۔ جو چیزیں کبھی انہیں بہت پسند تھیں اب ان سے ان کو نفرت ہوگئی تھی۔ صبح ناشتے میں ایک رس اور ایک چائے کا کپ پیتی تھیں اور پورا دن ایسے ہی گزار دیتی تھیں۔ میں ایک ماہ کی چھٹی لے کر گھر آگیا، انہیں اٹھانا بٹھانا اپنے ذمے لے لیا مجھے بہت تکلیف ہوتی تھی۔ میں چھپ چھپ کر روتا تھا۔ میری اماں اتنی تکلیف میں تھیں وہ درد سے چیختی تھیں۔ بچوں کی طرح اونچا اونچا روتی تھیں۔ بعض



لبنیٰ عروج اپنے بیٹے کے ساتھ

اوقات روتے ہوئے وہ میری طرف دیکھتیں تو ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سا درد ہوتا تھا۔ شاید وہ مجھے بتانا چاہتی تھیں کہ وہ کس قدر تکلیف میں تھیں لیکن وہ درد قابلِ بیان ہی نہیں تھا۔ ایک دن میں نے بیڈ سے اٹھا کر وہیل چیئر پر بٹھایا پھر ان کے پاؤں میں ان کی چپلیں پہنائیں پھر ان کی چپلوں کے نیچے ہاتھ رکھ کر ان کے پاؤں آہستہ سے اٹھا کر وہیل چیئر کے Foot rest پر رکھے، وہ درد سے چیخ رہی تھیں میرے والد وہیل چیئر پکڑ کے پیچھے کھڑے تھے اور خاموشی سے یہ سب دیکھ رہے تھے اور ان کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ جب میں اماں کے پاؤں Foot rest پر رکھ چکا تو وہ بولیں۔ ''اطبیب مجھے معاف کر دو۔'' میں ابھی تک نیچے ہی بیٹھا تھا۔ میں نے ان کی طرف حیران ہو کر دیکھا اور کہا۔ ''کس بات پر اماں؟ یہ کیسا بات کی ہے یار آپ نے۔ ایسا کیوں کہہ رہی ہیں؟'' تو کہنے لگیں ''تمہیں میری چپلوں کے نیچے ہاتھ رکھنے پڑتے ہیں اور میں تم سے اس بات پر بہت شرمندہ ہوں۔''

میں نے اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اماں کو گلے لگایا اور وہ پھر سے رونے لگیں۔ ابا ان کو باتھ روم لے گئے جب وہ واپس آئیں تو میں ان کے بیڈ کے پاس کھڑا تھا تا کہ انہیں وہیل چیئر سے اٹھا کر بیڈ پر بٹھا دوں جب وہیل چیئر بیڈ کے پاس پہنچی تو وہ مجھے کہنے لگیں۔ ''اطیب میں مر رہی ہوں، مجھے بچا لو۔'' میرا دل ٹوٹ گیا۔ میں نے اپنے آنسو روکنے کی بہت کوشش کی۔ بہت کوشش کی پتا نہیں وہ رُکے یا نہیں۔ آخری دنوں میں اماں کی ضد تھی کہ مجھے نیسلے کا پیچ والا جُوس پینا ہے۔ میری بہن ڈاکٹر ہے اور اس نے اماں کی غذا پر پابندیاں لگا رکھی تھیں ممنوعہ غذا میں نیسلے جوسز سرِ فہرست تھے۔ ایک دن میں نے بہن سے نظر بچا کر گلاس میں پیچ والا جوس ڈالا اور اماں کے پاس لے گیا۔ میں کارپٹ پہ بیٹھ گیا اور اماں سے کہا۔ ''جلدی جلدی پی لیں اس سے پہلے کہ ڈاکٹر منی ڈنڈا لے کر آ جائے۔'' اماں نے چھوٹے بچوں کی طرح سارا جوس جلدی جلدی پی لیا پھر مجھے کہنے لگیں۔ ''ایک بات کہوں تو تم یاد رکھو گے۔'' میں نے کہا جی اماں کیا بات ہے۔ کہنے لگیں۔ ''جب میں مر جاؤں تو تم لوگ میرا ختم تو دِلوایا کرو گے تو اس میں یہ پیچ والا جوس ضرور رکھا کرنا۔'' میں یہ بات سن کر ان کو دانتظار رہا لیکن وہ تو جیسے سن ہی نہیں رہی تھیں انہوں نے مزے سے ٹی وی کا ریموٹ اٹھایا اور چینل بدلنے لگیں۔ 2 اگست 2012ء کو گیارہ بج کر تیس منٹ پر میں نائٹ ڈیوٹی کر کے اپنے کمرے میں آیا اور اماں کو فون کیا۔ اماں اپنے بازو کی فریکچر شدہ ہڈی کے آپریشن کے لیے C.M.H راول پنڈی میں داخل تھیں۔ میں نے پوچھا کہ ڈاکٹرز نے آپریشن کا کیا ٹائم بتایا ہے تو بولیں ابھی کچھ نہیں بتایا۔ ان کی آواز ایسی ہی تھی جو اس وقت ہوتی جب وہ ٹھیک ہوا کرتی تھیں۔ مجھے بہت تسلی ہوئی میں نے کہا جو بھی ڈاکٹرز کہیں وہ آپ نے مجھے بتانا ہے۔ کہنے لگیں تم اپنا فون Silent پر کر دیتے ہو اور میری کال اٹینڈ نہیں کرتے۔ میں نے کہا نہیں اماں میرا فون Silent پر نہیں ہے۔ آپ کال کیجیے گا میں ضرور اٹینڈ کروں گا۔ اس کے بعد میں سونے کے لیے

لیٹ گیا تقریباً بارہ بج کر تیس منٹ پر فون کی گھنٹی بجی، میں آدھی نیند میں تھا فون اٹھا کر دیکھا تو اس پر ڈیڈ لکھا ہوا آ رہا تھا۔ میں نے سوچا ابا نے بتانا ہوگا کہ ڈاکٹرز نے آپریشن کا کیا ٹائم دیا ہے۔ جب میں نے فون اٹھایا اور ہیلو کہا تو ابو کی آواز آئی۔ ''یار یور مدر اِز نو مور۔'' مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ میرا حلق خشک ہو گیا میرا جسم سُن ہو گیا اور رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے کہا ''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' دوسری طرف سے پھر وہی جملہ دُہرایا گیا۔ ''یار یور مدر از نو مور۔'' مجھے پھر بھی یقین نہیں آیا میں نے تیسری دفعہ پوچھا کہ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس بار بھی وہی جواب آیا۔ میری آنکھوں میں آنسو آنے لگے دل بیٹھ گیا اور جسم ڈھیلا پڑ گیا پھر میں نے ہمت کی اور پوچھا کہ کیسے؟ ابو بولے اسے Cardiac arrest ہوا اور میں نے فون بند کر دیا۔ میں اپنے کمرے سے باہر نکل گیا جا کر دھوپ میں کھڑا ہو گیا پھر چھاؤں میں آ گیا اور پھر دھوپ میں چلا گیا۔ اماں مجھے چھوڑ کر کیسے جا سکتی تھیں وہ تو میری اماں تھیں مجھ سے بہت پیار کرتی تھیں۔ دماغ State of denial میں چلا گیا، میں باغی ہو گیا۔ میں نے ماننے سے انکار کر دیا کہ اماں نہیں رہیں پھر میں آفیسر کمانڈنگ کو اطلاع کرنے کے بعد دیوانہ وار گاڑی چلاتا ہُوا شور کوٹ سے نکل کر سرگودھا کی طرف چل پڑا۔ اماں کی میّت راول پنڈی سے سرگودھا پہنچ گئی۔ ہزاروں خیال اور لاکھوں سوچیں میرے ذہن سے گزرتی گئیں۔ اماں کیسے جا سکتی ہیں؟ اماں کیسے جا سکتی ہیں؟ انہوں نے تو مجھے فون کرنا تھا۔ انہوں نے مجھے جنم دیا تھا، انہوں نے تو مجھے اللہ کے سامنے اس وقت جُھکنا سکھایا تھا جب مجھے اللہ کی ضرورت نہ تھی اور تب بھی جب مجھے اللہ کی ضرورت تھی اور میں جُھکنے کو تیار نہ تھا۔ وہ تو میری زندگی کا محور تھیں وہ تو میری اماں تھیں۔ اس دن جب میں گاڑی میں بیٹھا تو پہلا خیال جو میرے ذہن میں آیا وہ یہ تھا کہ اطیب آج سفر کی دعا اور آیت الکرسی مجھے خود ہی پڑھنا پڑے گی اور پھر میں نے بسم اللہ پڑھ کر یہ دونوں کلام پڑھے۔ میرے سرگودھا

پہنچنے کے دس منٹ بعد امّاں کی میّت بھی وہاں پہنچ گئی۔ وہ پُرسکون لیٹی ہوئی تھیں۔ دو ماہ سے وہ سیدھی نہیں لیٹی تھیں لیکن آج وہ لیٹی ہوئی تھیں۔ وہ میری طرف دیکھ نہیں رہی تھیں، میں بھوکا تھا، پیاسا تھا انہوں نے کسی کو آوازیں نہیں دیں کہ اطیب کے لیے کھانے کو کچھ لے آؤ۔ انہوں نے مجھے نہیں کہا کہ میرا بچہ روٹی کھا لے وہ بس چُپ چاپ لیٹی ہوئی تھیں۔ میں اماں کے جنازے کے پاس زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ میرے دونوں بہن بھائی زار و قطار رو رہے تھے۔ میری آنکھیں سُوکھی تھیں میں بس اماں کو دیکھ رہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے میرے اماں کے ساتھ گزارے 27 سال...... ان کی باتیں، ان کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ لوگ مجھے پکڑ پکڑ کر حوصلہ دے رہے تھے کہہ رہے تھے تم بڑے ہو تم نے نہیں رونا۔ چھوٹوں کو سنبھالو لیکن میں تو تباہ ہو چکا تھا۔ میرے اندر آتش فشاں پھٹ چکا تھا۔ میں اندر ہی اندر ہی سلگ رہا تھا۔ تمام فکریں اور پریشانیاں مجھ پر ہنس رہی تھیں وہ سب جگہ موجود تھیں کوئی چھت سے نیچے جھانک رہی تھیں تو کوئی دروازے کی اوٹ سے وہ قہقہے لگا رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ اطیب اب نہیں بچے گا اب اس کی ماں نہیں رہی۔ رات کے چار بجے میں قبر کے اندر کھڑا تھا جس ماں نے مجھے پیدا کیا تھا مجھے آفیسر بنایا تھا انہیں میں خود اپنے ہاتھوں سے قبر میں اُتار رہا تھا۔ انہوں نے ایک دن مجھے کہا تھا۔ ''یہ جو تم مجھے اٹھا کر وہیل چیئر پر بٹھاتے ہو اور پھر وہیل چیئر سے اٹھا کر بیڈ پر بٹھاتے ہو یہ اللہ تمہیں پریکٹس کروا رہے ہیں۔'' میں نے پوچھا تھا۔ ''کس چیز کی اماں؟'' تو وہ بولی تھیں۔ ''عنقریب ہی تم نے مجھے اسی طرح قبر میں اتارنا ہے۔'' ہم سب اس بات پر ان سے بہت ناراض ہوئے تھے۔ اس وقت میں شور کوٹ میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا ہوں اور رات کے ڈھائی بج رہے ہیں نیند نہیں آ رہی۔ اماں کو ہم سے بچھڑے بائیس دن ہو چکے ہیں۔ جن کپڑوں میں اماں ہم سے رخصت ہوئی تھیں وہ سامنے پڑے ہیں لیکن اماں نہیں ہیں۔ اماں اب کبھی نہیں ہوں



لبنیٰ عروج اپنے بیٹے فلائٹ لیفٹننٹ اطیب اور اسامہ کے ساتھ

گی۔ اماں کبھی نہیں آئیں گی۔ اماں اللہ کرے آپ مجھ سے خوش ہوں، آپ بہت یاد آتی ہیں۔ اللہ آپ کو جنت میں جگہ دے آپ کے بغیر میری زندگی ادھوری ہے۔

میری جان سے پیاری اماں

محمد اسامہ ملک

زندگی میں، میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک دن میں صبح اٹھوں گا تو میری ماں کا سایہ موجود نہ ہوگا۔ 13 رمضان بروز جمعرات 2 اگست 2012ء کا آغاز بھی دیگر دنوں کی طرح ہوا مگر مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ دن مجھ سے میری ماں ہمیشہ کے لیے دور لے جائے گا۔ صبح 10:30 بجے خود اسپتال سے کال کر کے میری خیریت دریافت کرنے والی میری ماں بارہ بجے اس دنیا سے کوچ کر چکی ہوں گی یہ بات میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا مگر جب میں C.M.H پہنچا اور ڈاکٹرز کو اپنی آخری کوششیں کرتے دیکھا تو دل ڈوب گیا اور میں بے اختیار اللہ کے آگے ہاتھ جوڑ کے اماں کے بچ جانے کی دعا مانگنے لگا مگر اس کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے اور 12:30 بجے ڈاکٹرز نے مجھے اور میرے والد کو وہ الفاظ کہے جو خدا کبھی کسی دشمن کو بھی نہ سنائے۔ ”شی اِز نو مور۔“ ان الفاظ کا سننا تھا کہ میرے حواس اُڑ گئے اور میں پانچ منٹ تک کھڑا دیوار کو دیکھتا رہا۔ میرے پاؤں میں چلنے کی سکت نہیں تھی۔ منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی اور دماغ جیسے سن ہو گیا تھا۔ یہ وہ لمحات تھے جن میں میرا دماغ اس تلخ حقیقت کو تسلیم نہیں کر پا رہا تھا پھر آہستہ آہستہ میری اماں کی پوری زندگی کی فلم میری آنکھوں کے سامنے چلنی شروع ہو گئی۔ ان کا کہا ہوا ایک، ایک لفظ کانوں میں گونجنے لگا اور ان کا کیا گیا ایک ایک فعل میری آنکھوں کے سامنے چلنے لگا۔ مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ وہ جتنا پیار مجھ سے کرتی تھیں کسی اور سے نہیں کرتی تھیں شاید یہی وجہ تھی کہ اماں اکثر اپنے دل کی باتیں مجھ سے کیا کرتی تھیں اور کہا کرتی تھیں کہ تم سے ہی میں اپنے دل کی بات کرتی ہوں۔ ماں کی زندگی کے آخری تین چار ماہ انہیں جس قدر تکلیف میں، میں نے دیکھا اس تکلیف کو دیکھ کر مجھے لفظ بے بسی کا مطلب سمجھ آیا کہ آپ اپنی ماں کو اس قدر تکلیف میں دیکھ رہے ہوں دل چاہتا ہے کہ بس کوئی اس جگہ کا نام بتا دے جہاں اس چیز کا علاج ہو تو میں اُڑ کر اپنی ماں کو وہاں لے جاؤں مگر آپ کچھ بھی نہیں کر پاتے۔ اپنی ماں کے منہ سے یہ الفاظ سن کر کہ ”اسامہ بس اب ختم ہو گیا سب کچھ۔“ اور حقیقت جانتے ہوئے بھی ان کو تسلی دینا کہ نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا اور آپ کا علاج ہو جائے گا اور ان کا ایک چھوٹے بچے کی طرح میری بات پر یقین کر لینا اور پورے اعتماد سے مجھ سے پوچھنا۔ ”میں ٹھیک ہو جاؤں گی ناں؟“ یہ چیز مجھے نہیں بھولتی اور اس وقت میرے دل پر کیا گزرتی تھی اس کا احساس کوئی نہیں کر سکتا۔ وفات سے ایک دن پہلے جب ہم نے انہیں اسپتال لے جانے کے لیے بازوؤں میں اٹھایا تو ان کے منہ سے نکلے ہوئے یہ الفاظ سن کر میرا دل بہت دُکھا۔ ”بس اسی طرح تم لوگوں نے کاندھے پر اٹھا کر مجھے قبر میں اتارنا ہے۔“ اس بات پر ہم سب بہت دُکھی تھے مگر وہ بڑے اطمینان سے یہ بات کر دیتی تھیں اور اس سے اگلے ہی دن ان کی کہی ہوئی یہ بات من وعن پوری ہو گئی جب میں نے اپنے کاندھوں پر اپنی والدہ کی میت کو ان کی آخری آرام گاہ تک پہنچایا۔ اماں کو کبھی ڈر نہیں لگا تھا مگر وہ اندھیرے سے بہت گھبراتی تھیں اور جب بھی لائٹ چلی جاتی یا کمرے میں روشنی کا بندوبست نہ ہوتا تو اماں فوراً شور کرتیں کہ لائٹ جلاؤ اسی لیے میں اکثر رات کو ان کے لیے لائٹ کا کوئی نہ کوئی بندوبست کر کے اپنے کمرے میں سونے کے لیے جاتا۔ جب اماں کو ان کی آخری آرام گاہ میں اپنے ہاتھوں سے اتارا تو ایک دم سے کانوں میں ایک آواز آئی۔ ”اسامہ میرے لیے روشنی کا کوئی بندوبست کر دو۔“ مگر افسوس کہ اماں کے لبوں کی طرف دیکھا تو احساس ہوا کہ یہ لب اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکے ہیں۔ وہ رات میری زندگی کی پہلی رات تھی جب میں نے سونے سے پہلے اماں کو گلے نہیں لگایا ورنہ میرا روز کا معمول تھا کہ ان کو مل کر خدا حافظ کر کے جانا اور گلے بھی ضرور مل کر جاتا۔ وفات سے پہلی رات انہوں نے اسپتال میں ہی مجھے گلے لگانے کے لیے اپنے ہاتھ اٹھائے اور مجھے قریب بلایا مگر جانے کیوں مجھے خیال آیا کہ میرا زکام کہیں اماں کو نہ لگ جائے اور میں نے گلے ملنے سے انکار کر دیا۔ اب خیال آتا ہے کہ کاش میں نے اپنی ماں کو آخری بار گلے لگا لیا ہوتا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور خیال بھی آیا کہ اماں روزانہ ہم سب پر آیت الکرسی پڑھ کر پھونکتی تھیں اور آج کی رات ہم پر کوئی آیت الکرسی پڑھنے والا بھی نہیں پھر ذہن نے حضرت موسیٰؑ کا واقعہ یاد دلایا کہ ”موسیٰ سنبھل کر اب تیرے پیچھے تیرے لیے دعا کرنے والی ماں نہیں۔“ اور میرا دل ڈوب گیا۔ اماں ایک ایسی ہستی تھیں جن سے میں دل کی ہر بات کر سکتا تھا اور جب بھی مجھے کوئی پریشانی ہوتی تو میں ان کی گود میں جا کر سر رکھ کر لیٹ جاتا اور یوں محسوس ہوتا جیسے میں اب اس دنیا کی ہر تلخی سے محفوظ ہو گیا ہوں اور میری ماں مجھے ہر قسم کی مصیبت سے بچا لے گی۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ 6th کلاس میں سیکشن تبدیل ہونے پر میں بہت رویا تھا اور کلاس میں بیٹھتے ہی مجھے خیال آیا تھا کہ کسی بھی طریقے سے میں اپنی اماں کے پاس پہنچ جاؤں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہی کیفیت ہر مشکل میں میری ہوتی تھی اور اماں کو بھی پتا نہیں کیسے احساس ہو جاتا تھا وہ خود ہی پہچان لیتی تھیں کہ میں پریشان ہوں اور پوچھنا شروع کر دیتیں اور جب میں انہیں بتاتا تو یوں معلوم ہوتا جیسے اب میں آزاد ہوں۔ اب میری اماں ہی میری پریشانی کا حل تلاش کریں گی مگر ان کی وفات کے بعد میری پریشانی کو اپنا بنا لینے والا کوئی شخص اس دنیا میں نہیں۔ ایف ایس سی میں اکثر میں اردو نظموں اور غزلوں کی تشریح کے لیے اماں سے مدد لیتا تھا اور ان کو بالخصوص حمد و نعت میں بہت لطف آتا تھا اور مجھے سمجھاتے سمجھاتے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ اگر کبھی کوئی نعت سنتیں تو آنکھیں اشکبار ہو جاتیں اور اکثر ہچکی بندھ جاتی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے رب اور اپنے رسولؐ سے کتنا پیار کرتی تھیں۔ اماں مجھ سے اکثر پوچھتی تھیں۔ ”اسامہ وہ اللہ کبھی مجھے اپنے در پہ بلائے گا؟“ تو میں کہتا کیوں نہیں اماں ضرور اپنی زندگی کے آخری دنوں میں تو مجھ سے کہتی تھیں۔ ”تم مجھے اپنے کاندھوں پر بٹھا کر حج ادا کرا دو گے؟“ تو میں کہتا تھا۔ ”اماں کیوں نہیں آپ خود چل کر کریں گی۔“ مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ اللہ انہیں ویسے ہی اپنے پاس بلانے والے ہیں۔ اب بھی اکثر بیٹھے بیٹھے کانوں میں اماں کی آواز گونجتی ہے اور میں ایک لمحے کے لیے بے ساختہ اماں کے کمرے کی طرف لپکتا ہوں مگر دوسرے ہی لمحے خیال آتا ہے کہ اب میری اماں کبھی مجھے آواز نہیں دیں گی۔ ان کے کمرے کے باہر سے گزرتے ہوئے اکثر بے اختیار منہ سے السلام علیکم نکل جاتا ہے اور دعاؤں میں ابھی تک ان کی صحت کی دعا مانگ بیٹھتا ہوں۔ جب بھی ان کے کمرے میں جاؤں ان کی سب چیزیں اسی طرح پڑی دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ شاید اماں باتھ روم میں ہیں ابھی آ جائیں گی مگر اب شاید ان کا دیدار ہمیں کبھی نصیب نہ ہو۔ کالج سے آتے ہی میرا پہلا کام اماں کو سلام کرنا ہوتا تھا جس کا وہ بھرپور طریقے سے جواب دیتیں پھر میں اپنا کھانا لے کر ان کے پاس ہی بیٹھتا اور وہ دن بھر کی ساری مصروفیت مجھے سناتیں اور ساتھ ہی مجھ سے دو نوالے بھی ضرور لیتیں۔ اماں اب میں گھر آ کر کس کو سلام کروں گا اور کس کو نوالے بنا کر کھلاؤں گا۔ اماں سے میں کہا کرتا تھا کہ اماں میں نے بس دبئی چلے جانا ہے اور آپ کو بھی اپنے ساتھ لے جانا ہے وہیں مل کر خوب گھومیں گے اور انجوائے کریں گے تو اماں فوراً تیار ہو جاتیں اور کہتیں ہاں میں نے تمہارے ساتھ ہی رہنا ہے اور پھر مذاق میں کہتیں۔ ”تیری



لبنیٰ عروج اوران کی بیٹی ڈاکٹر منیٰ ظفر

بیوی نوں میں کراں گی تنگ جس طرح تو نے بچپن میں مجھے تنگ کیا تھا۔'' مگر اماں آپ نے اتنی جلدی کی جانے میں کہ میری انجینئرنگ مکمل ہونے کا بھی انتظار نہیں کیا۔ آپ تو کہتی تھیں کہ آپ اپنے پوتے پوتیوں کی تعلیم کی بنیاد خود رکھیں گی تو پھر اتنی جلدی کیوں کی آپ نے کسی بچے کی شادی تک نہ دیکھی آپ نے ...... اماں کے جانے کے ساتھ ہی مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ جیسے میری دنیا اُجڑ گئی ہے اس دنیا میں رہنے کا مقصد ختم ہوگیا ہے اور نہ جانے کیوں میں اس دنیا میں زندہ ہوں کہ جب میری ماں ہی نہیں رہی تو میں اس دنیا میں کیا کر رہا ہوں۔ ابھی تو آپ سے بہت ساری باتیں کرنی تھیں مجھے۔ اماں بہت سے مراحل پر مجھے آپ کی دعاؤں اور آپ کے ساتھ کی ضرورت تھی۔ ابھی تو آپ کی 16 اکتوبر کو سالگرہ تھی۔ پلاننگ بھی کر رکھی تھی میں نے دل ہی دل میں' آپ نے سب کچھ بیچ میں ہی چھوڑ کر یکدم ہی سفرِ آخرت کے لیے کمر باندھ لی۔ اکثر دل میں یہ خیال آتا ہے کہ اپنی زندگی شاید کبھی اپنی والدہ کے بغیر تصور ہی نہ کی تھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہ اماں کے ختم ہونے کے ساتھ ہی سب ختم ہوگیا ہے۔

اس کی یاد میں جسے میں کبھی بھولی ہی نہیں

پروفیسر عظمیٰ ارحم

لبنیٰ عروج میری کزن تھی اور میری ماں کی بھی ...... مگر اس سے کہیں بڑھ کر یہ کہ وہ نہایت نفیس، مہذب، شریف النفس اپنی حدوں سے پیار کرنے والی، مثبت روّیوں کی ترجمان فرشتہ صفت انسان تھی۔ وہ چاہتوں میں گندھی معصوم اور پاکیزہ سی ہستی تھی۔ وہ خوشبوؤں جیسی باتیں کرنے والی لڑکی آج ہمارے درمیان نہیں۔ اسے ملکِ عدم سدھارے چند روز ہوئے ہیں۔ ابھی تو گہری اُداسی تن کے کھڑی ہے حصارِ غم ہے کہ ٹوٹ نہیں پا رہا صبر آتے آتے آئے گا۔ ابھی تو لگتا ہے کہ شاید کبھی نہ آئے۔ بہت سال پہلے میں نے پتا نہیں کس کیفیت میں ایک شعر کہا تھا

بچھڑ گئی ہو تو یادیں بھی ساتھ لے جاؤ
تمہارے بعد میری زندگی ہے پاگل سی

اس نے جا کر یہ سچ کر دکھایا۔ وہ بچھڑی تو راتیں اور لمبی اور کالی ہوگئیں۔ نیند جیسے پلکیں مونده کے کہیں دور کونے میں چُھپ کر بیٹھ گئی۔ ایسی روٹھی کہ سو جتن کر کے بھی نہ مانی۔ مجھے اس احساس نے توڑ کر رکھ دیا کہ اب اس سے نہیں ملنا۔ میں اسے بھول بھی کیسے جاؤں کہ اس کا عکس میری آنکھوں میں ٹھہر سا گیا ہے۔ اس کی گہری کالی شریری آنکھوں میں ایک الوہی چمک تھی وہ آنکھیں کہ جہاں دیکھتی تھیں ایک رشتہ قائم کر دیتی تھیں۔ حیا کی دبیز اوڑھنی اوڑھے وہ بہت الگ بہت جُداسی تھی۔ اس کے لمبے کالی گھٹاؤں جیسے بال اس کی خوب صورتی کو چار چاند لگا دیتے تھے۔ اس کے لہجے میں پاکیزگی کا عجب بہاؤ تھا۔ اس کی آواز صوتی اثرات سے بھرپور تھی۔ بولتی تھی تو کانوں میں شہد سا گُھلنے لگتا تھا۔ وہ بہت اچھی سامع تھی۔ زیادہ سنتی اور کم بولتی۔ اس کی پہچان کانچ کی ست رنگی چوڑیوں کی کھنک جیسی مدھر سُریلی اور سدابہار ہنسی تھی۔ حسِ ظرافت اتنی باکمال کہ اِدھر کوئی بات ہوئی اور اُدھر وہ ہنس ہنس کر دوہری ہوجاتی۔ احساس کی شدت سے وہ زور سے آنکھیں میچ لیتی اور قدرے پیچھے کی طرف جھک جاتی۔ گزرتے ہوئے وقت نے اس کو چُھوا تک نہیں تھا۔ عجب دوشیزگی تھی اس کی کہ جوان بچوں کی ماں بن کر بھی پوری تمکنت سے اس کے وجود کے گرد ہالہ بنی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے اندر کی لڑکی کو کبھی مرنے نہیں دیا اور یہی اس کی کامیابی تھی۔ وہ دوستی کو ایمان سمجھنے والی، بکھرے ہوؤں کو یکجا کرنے والی زندہ دل الھڑ سی لڑکی تھی۔ وہ کہتی تھی میں امن کی سفیر ہوں۔ زندگی اسے بہت دُلار سے ملی اُسے عزت، نام، محبت، چاہت سبھی کچھ ملا مگر یہ ملاقات بہت مختصر رہی۔ کاش وہ کچھ اور زندہ رہتی۔ اسے یاد کرتے ہوئے میں 80ء کی دہائی میں لوٹوں تو وہ سردیوں کی روپہلی دھوپ اور گرمیوں کی خنک شاموں جیسی حیات آفریں لڑکی تھی۔ اس کے نرم لہجے میں زندگی کی کھنک تھی۔ اس کے جان دار قہقہے پورے ماحول کو کھلکھلانے پر مجبور کر دیتے۔ زندگی اس کو دیکھ کر جیتی تھی۔ سبھی چھوٹے بڑے اس کے حلقۂ یاراں کا حصہ تھے۔ ہم سب اس کا نام لیتے تھے مگر وہ کبھی معترض نہ ہوئی۔ وہ ایک رشتے سے میری خالہ بھی تھی مگر اس کے بے تکلف روّیے نے ہمیں ادب و آداب کے نئے رستے دِکھا دیے۔ ہم دوست بن گئے اور یہ رشتہ سبھی حوالوں پر بھاری ہوگیا۔ اس دور میں میری اس سے خط و کتابت بھی رہی۔ کالج کے زمانے میں، میں نے اسے ایک قاری بن کر خط لکھا مگر اس نے مجھے پہچان لیا۔ سنا ہے وہ خطوط اس کے پاس ابھی تک محفوظ ہیں۔ اس نے ہمیں لتا اور کشور کے گانے سننے اور ان سے لطف اندوز ہونے کا شعور دیا۔ اس کے ڈیک پر انڈین گانے سننا ہمارا محبوب مشغلہ ہوا کرتا تھا۔ اس نے ہمیں فیض اور پروین شاکر سے متعارف کروایا۔ ہم بہنوں کی رائے تھی کہ اس کی شکل نازیہ حسن سے ملتی ہے۔ صد افسوس کہ نازیہ کی طرح اسے بھی کینسر کے مرض سے لڑنا پڑا۔ اسے گھمنڈ تھا کہ اسے بہت چاہا بہت سراہا گیا اور اس میں کچھ کلام بھی نہیں۔ ہم بہن بھائیوں کی اس سے محبت میں عقیدت کا رچاؤ تھا۔ وہ بڑے سلیقے کے ساتھ اس محبت کا مان رکھتی رہی۔ وہ کہیں بھی رہی ہم اس کے بارے میں خبر گیری کرتے رہے۔ شہروں کے فاصلے کے باوجود ہم نے اسے ہمیشہ اپنے آس پاس محسوس کیا۔ جب میں نے اُس کے نہ ہونے کی خبر سنی تو بے ساختہ میری زبان سے نکلا اگر آج میرے ابو زندہ ہوتے تو انہیں بہت دکھ ہوتا اور اب وہ بہت دور ہو کر بھی سہانی چاندنی اور سحر انگیز مہک کی طرح ہمارے احساس پر چھائی ہے۔ ہم اسے دیکھ نہیں پا رہے اسے سن نہیں سکتے مگر وہ ہمارے درمیان ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ وہ پچھلے سال جولائی میں اپنی فیملی کے ساتھ میرے گھر آئی۔ ان دنوں بھی اس کی ٹانگ میں شدید درد تھا۔ اس شام ہم نے ایک بار پھر مل کر پرانے وقت کو یاد کیا۔ گانے سنے اور خوب ہنسے پھر جب وہ اسلام آباد واپس گئی تو میں نے اسے فون کیا۔ مجھے اس کا شرارت آمیز لہجے میں یہ کہنا کبھی نہیں بھولے گا۔ ''میں دہی بھلے کھا رہی ہوں تم کھاؤ گی؟'' اور میری تسلی ہوگئی کہ وہ اتنی بیمار نہیں۔ میری ڈھارس بندھی کہ وہ

ٹھیک ہے۔ اسے اپنی کیفیت چھپانے میں ملکہ حاصل تھا۔ زندگی ریت کی طرح اس کے ہاتھوں سے پھسل رہی تھی مگر۔ جینے کی امنگ ابھی ماند نہیں پڑی تھی۔ وہ کہتی تھی میں ناول نہ لکھ سکی۔ اب ضرور لکھوں گی عید پر سرگودھا آؤں گی تو سب کے گھر ملنے جاؤں گی۔ سرگودھا کی گلیاں میرے گھر کے دیوار و در پوری بانہیں پھیلائے منتظر رہے مگر وہ آئی مہر بہ لب، ساکت و چپ چاپ۔ اپنی خواہشوں کو سُلا کر سفید کفن میں لپٹی۔ نہ عید پر آنے کا پیمان نبھایا۔ نہ ناول لکھنے کی ضد پوری کی تقدیر نے اس کا قلم ہی توڑ دیا۔ ہم سبھی دل گرفتہ تھے۔ جس گھر میں وہ کبھی دلہن بن کر آئی تھی آج اس کی چوکھٹ سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو رہی تھی۔ وہ اپنے شہر سرگودھا کی مٹی کو آخری بوسہ دے کر اپنی امی اور سلمٰی باجی کے درمیان جا سوئی۔ عید پر وہ نہیں تھی زندگی پھیکی پڑ گئی۔ سب کچھ سنسان ہو گیا۔ کسی نے عید نہ منائی ملتان میں میری امی کے گھر میرے بہن بھائی غم کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبے تھے۔ اسی روز چھوٹے بھائی ازور کی سالگرہ تھی مگر کوئی کیک نہ کاٹا گیا۔ ہم نے اپنا غم اپنے ساتھ منایا کہ ہماری دوست ہم سے بچھڑی تھی کسی سے کچھ کہنے کا یارا نہیں تھا۔ اس تعلق کا کوئی شمار ہی نہیں کر سکتا تھا۔ 28 جولائی کی صبح میں نے فون پر اسے آخری بار سنا۔ وہ بہت ٹوٹ چکی تھی۔ اس کی آواز میں تڑپ تھی۔ اسے علم ہو چکا تھا کہ وہ ساری کشتیاں جلا بیٹھی ہے۔ وہ رو رہی تھی، شدید درد نے اسے ہلکان کر دیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار میں ایک اور لبنٰی سے ملی۔ جس کی آواز آنسوؤں سے بھیگی تھی۔ وہ رو رو کر کہہ رہی تھی کہ مجھ سے ملنے آؤ۔ ثوبیہ کہاں ہے اسے بھی لے کر آؤ، اس طرح کی شدید خواہش اس نے پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ کاش وہ کہہ دیتی وہ بتا دیتی کہ اس کا وقتِ روانگی آن پہنچا ہے۔ بس اب رخصتی کا پروانہ جاری ہونے کو ہے کیونکہ بعد میں مجھے پتا چلا کہ اس نے اسی روز بیلا باجی کو فون کر کے کہا کہ ''بیلا سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔'' کاش وہ مجھے بھی کہہ دیتی تو میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس سے ملنے اُڑ کر پہنچ جاتی۔ پتا نہیں کہاں سے ایک یقین میرے اندر تھا کہ کینسر جیسا مطلق العنان مرض بھی چند سالوں کی زندگی کی خیرات دے ہی دیا کرتا ہے۔ اس لیے ابھی وہ اور جیے گی۔ میری بیٹی کے پریکٹیکلز تھے مجھے 31 جولائی تک سرگودھا ہی میں رکنا تھا۔ آخری فون پر اس نے روتے روتے کہا تھا۔ ''بہت سی محبتوں کا قرض اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی۔'' میں رو پڑی کہ جانے کی باتیں نہ کرو۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا یا دے نہ سکی۔ ہم دونوں روتی رہیں اور اب میں اکیلی روتی ہوں۔ میری بیٹی کے پریکٹیکلز ختم ہوئے تو میں نے اسے اپنے آنے کے متعلق بتانے کے لیے یکم اگست کو فون کیا۔ بار بار کیا مگر ریسیو نہیں ہوا۔ ایک انجانا سا خوف مجھے ہلا گیا میں نے شاہدہ خالہ کے گھر فون کیا۔ منال نے بتایا کہ ہمارا بھی رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔ رات بھر بے چینی رہی اور اگلی صبح وہ سارے بندھن توڑ کر منوں مٹی تلے جا سوئی۔ ایک گہرا پچھتاوا میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اسے اندھیرے سے بہت ڈر لگتا تھا۔ ''کالے پردوں میں چھپی راتیں مجھے غمگین کر دیتی ہیں۔'' دوستی شروع سے اس کا شیوہ رہی ہے۔ خدا کرے کہ اس نے قبر کی تنہائیوں سے دوستی کر لی ہو۔ اسے کبھی وحشت نہ ہو۔ رحمتِ خداوندی کا نزول ہمیشہ اس کی لحد پر جلوہ فگن رہے، آمین۔ میری ساری دعائیں اس کے ساتھ ہیں۔

خوش اخلاق خاتون

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی

پاکیزہ ڈائجسٹ ہاتھ میں آیا تو لبنٰی عروج کے انتقال کی خبر ملی، میرا ذہن ماؤف ہو گیا۔ اب میری صحت اس قابل نہیں کہ میں دل دہلا دینے والی خبریں سن سکوں۔ لبنٰی عروج بہت ملنسار اور خوش اخلاق خاتون تھیں۔ ان کے Nore کے پروگرام یاد آ رہے ہیں جہاں ہم لوگ شرکت کیا کرتے تھے۔ وہ محبت سے بُلاتی تھیں۔ ہم جاتے بھی ضرور تھے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اسے جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے،

آمین۔ دنیا فانی ہے ہر کسی کو پلٹ کر وہیں جانا ہے۔ موت برحق ہے۔ اللہ تعالیٰ سے توبہ استغفار کرتے رہنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کے گناہ معاف کرے اور اپنی رحمت کی پناہ میں رکھے، آمین۔

لبنٰی عروج کے لیے

عنیزہ سید

موت ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس پر نہ چاہنے کے باوجود نہ صرف یقین بلکہ صبر بھی کرنا پڑتا ہے۔ موت ایک برحق حقیقت ہے لیکن کچھ اموات ایسی ہوتی ہیں جو ایک عرصے تک ناقابلِ یقین لگتی ہیں اور ان پر صبر آنے میں بھی کئی سال لگ جاتے ہیں۔ لبنٰی عروج کی موت بھی ایسی ہی اموات میں سے ایک ہے۔ میں جس لبنٰی عروج کو جانتی ہوں وہ زندگی، رنگوں، قہقہوں، اُمنگوں اور جذبوں کا نام تھی۔ ایک خوش گفتار، خوش اخلاق اور خوش اطوار شخصیت جس سے برسوں میرا خطوط اور کارڈز کے ذریعے رابطہ رہا۔ کبھی کبھار فون پر بھی بات ہو جاتی تھی۔ لبنٰی اتنی پُرخلوص، محبت کرنے والی اور ملنسار دوست تھی کہ جب زندگی کی مصروفیات میں گم ہو کر اس سے رابطہ منقطع ہو گیا تو بھی یہ احساس دل میں موجود رہتا تھا کہ اِسی ملک کے ایک خوب صورت شہر میں وہ پیاری دوست رہتی ہے جس سے جب بھی رابطہ یا ملاقات ہو گی سالوں کا فاصلہ ایک دم کہیں غائب ہو جائے گا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ ایک اچانک رابطے، ایک سرپرائزنگ ملاقات سے پہلے ہی وہ اچانک ہمیں چھوڑ کر چلی جائے گی۔ لبنٰی ایک قابلِ رشک خاتونِ خانہ، ماں اور دوست ہونے کے علاوہ ایک انتہائی قابل لکھاری بھی تھی۔ ڈائجسٹ کی دنیا میں وہ ایک جانا پہچانا اور مستند نام تھی۔ اس نے بے شمار کہانیاں لکھیں جن میں سے کئی ایک یادگار کہانیاں تھیں۔ مجھے اس کا ایک افسانہ ماسیاں کبھی نہیں بھولے گا۔ طبقاتی فرق پر لکھی گئی یہ کہانی طنز و مزاح کا رنگ لیے انتہائی سنجیدہ طمانچہ تھی۔ جس کا اثر بہت سے لوگوں نے شاید عرصے تک رخسار پر محسوس کیا ہو گا۔ چند ماہ بیشتر اس کا جو ناولٹ پاکیزہ میں شائع ہوا وہ حقیقت نگاری کا شاہکار تھا۔ مجھے علم نہیں زندگی سے بھرپور اس شخصیت کو ذہانت سے بھرپور اس ذہن کو اس موذی مرض نے کب اپنے شکنجے میں جکڑا اور کتنا عرصہ میری پیاری دوست نے اس مرض سے فائٹ کی۔ میری نظروں کے سامنے تو فیس بک کے کسی گروپ میں درج وہ اطلاع ہی ٹھہری گئی ہے کہ ہماری ایک بہت ہی پیاری رائٹر لبنٰی عروج ہم سے جُدا ہو گئیں۔ صرف لبنٰی عروج نہیں بلکہ رنگ، خوشبو، جاندار الفاظ، زندگی، خوب صورتی اور روشنی کا ایک حسین امتزاج ہم سے جدا ہو گیا۔ اس کی موت پر نہ یقین آتا ہے نہ صبر۔ اس کے جانے سے حلقۂ احباب میں اور ڈائجسٹ کی دنیا میں جو خلا پیدا ہوا ہے وہ برسوں پُر نہیں ہو گا۔ اللہ تعالیٰ اس کے درجات بلند کرے۔ ظفر بھائی اور اس کے بچوں کو صبر عطا فرمائے، آمین۔ دل اس کی وفات کے غم سے بوجھل ہے اور ذہن پر غبار سا چھایا ہوا ہے۔ آنکھوں کے سامنے وہ دُھندلے مناظر جو اس سے ملاقاتوں کے دوران بنے۔ لیڈیز کلب کا وہ فنکشن جس میں اس نے مجھے خاص طور سے مدعو کیا اور جس میں اس نے مجھے وی آئی پی پروٹوکول دلوایا، میری زندگی کی حسین ترین یادوں میں سے ایک ہے۔ اللہ اس کو غریقِ رحمت کرے اور اسے جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔

بے حساب دکھ

سیما مناف

نہ کبھی ملاقات ہوئی نہ فون پر بات ہوئی بس ایک تحریری تعارف ہے مگر جب انجم انصار نے مجھے فون کر کے بتایا تو کوئی چیز چھن سے اندر ہی اندر ٹوٹ گئی۔ تمام لکھاری خواہ کہیں بھی رہتے ہوں بے شک ایک دوسرے سے ناواقف بھی ہوں مگر تحریری طور پر ایک دوسرے کو بخوبی جانتے ہیں کہ تحریریں وہ آئینہ ہیں جس میں لکھنے والے کی شخصیت صاف نظر آتی ہے اور مجھے تو اب ہر ایک کی تحریر کا انداز اتنا یاد رہتا ہے کہ نام پڑھے

بغیر بھی بتا سکتی ہوں کہ اس کو رفعت سراج نے لکھا ہے اس کو ماہا ملک نے لکھا ہوگا اور یہ تحریر انجم انصار کی ہے اور یہ شائستہ عزیز کی اسی طرح مجھے لبنیٰ عروج کا انداز تحریر نہ صرف پسند تھا بلکہ میں اسے پہچان بھی لیا کرتی تھی۔ ایک اچھی رائٹر کے جانے کا یقیناً سب کو ہی دکھ ہے، مجھے بھی ہے مگر یہ ماہنامہ پاکیزہ کی اچھی روایت ہے کہ وہ اپنی مصنفات کو بے حد اہمیت دیتا ہے اور انجم انصار تو ہر مصنفہ کے ساتھ دِلی محبت کرنے میں ہمیشہ آگے رہتی ہیں۔ بہنوں کی محفل ایک ایسا سرکل ہے جس نے پورے پاکیزہ کو ہی نہیں تمام قارئین کو اپنا اسیر کر رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ جب کسی نے بشریٰ رحمٰن سے یہ پوچھا تھا کہ آپ پاکیزہ میں سب سے پہلے کیا پڑھتی ہیں تو انہوں نے ہنس کر کہا انجم کی بہنوں کی محفل اور اس محفل کو صرف خواتین ہی نہیں مرد حضرات تک بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ اس لیے اگر میں یہ کہوں کہ لبنیٰ عروج کے جانے کا دکھ ان کے ہزاروں لاکھوں قارئین کو بے حد اور بے حساب ہوگا جس میں مرد و زن دونوں شامل ہیں تو غلط نہیں ہوگا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ لبنیٰ عروج کو جنت الفردوس میں خاص مقام عطا فرمائے اور دیگر تمام مصنفات اور شاعرات کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور عمرِ طویل عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔

لبنیٰ جی

امینہ عندلیب

بیہ کون چلا گیا میرا شہر چھوڑ کر
آنکھوں نے رکھ دیا دریا نچوڑ کر

ستمبر کا پاکیزہ منگوایا اچانک وہی صفحہ کھل گیا آہ لبنیٰ عروج...... یہ پڑھتے ہی دل غم کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ آنسوؤں کا سیلاب کہ لبنیٰ عروج کی تصویر تک بھیگ گئی۔ خود کو سنبھالا انا للہ وانا الیہ راجعون اللہ تعالیٰ لبنیٰ عروج کو جنت الفردوس میں اعلیٰ درجات میں مقام عطا فرمائے، آمین۔ ان کے بچوں اور فیملی کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، آمین۔ ہاں لبنیٰ عروج میرے ہی شہر سرگودھا میں ہمیشہ کے لیے ابدی نیند سوگئیں، مجھے خبر تک نہیں ہوئی۔ ہماری ایک پیاری رائٹر شگفتہ مزاج، کیوٹ سی آپی مجھ سے جدا ہوگئیں۔ اللہ تعالیٰ کی یہی رضا تھی سوائے صبر کے کچھ نہیں۔ میرے پاس تو الفاظ ہی نہیں۔ وضو کے بعد فوری نوافل، سورۂ فاتحہ، سورۂ اخلاص پڑھ کر ان کی روح کو ایصال کیا۔ ہم اپنے پیاروں کے لیے یہی تحفہ بھیج سکتے ہیں۔ باجی انجم انصار کو تعزیتی فون کیا تو باجی اتنی افسردہ، اتنی غمگین تھیں۔ تبصرہ نگار فرزانہ سلیم کی وفات کا بھی بتایا چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرزانہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔ اللہ تعالیٰ ننھے بچوں کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، ان کے لواحقین کو بھی، آمین۔

میری پیاری بہن

محمد عامر ضیا خان (صحافی)

میں سوچ رہا تھا کہ میں کہاں سے شروع کروں پہلے میں اپنا تعارف کروا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ مجھے محمد عامر ضیا کہتے ہیں اور میں مصنفہ لبنیٰ عروج کا بڑا بھائی ہوں وہ مجھ سے فقط دو ہی سال چھوٹی تھی اور ہم دونوں بہن بھائی میں بے حد پیار تھا۔ ہم لوگ سرگودھا میں اکٹھے ہی پلے بڑھے۔ ہم نے بچپن میں بہت شرارتیں بھی کیں۔ وقت گزرتا رہا اور تعلیم مکمل کرنے کے بعد لبنیٰ کی شادی ہوگئی اور میں روزگار کے سلسلے میں سعودی عرب چلا گیا۔ لبنیٰ شادی کے بعد کراچی چلی گئی اور میں سعودی عرب آتے جاتے لبنیٰ کے گھر پر قیام کرتا تھا اور جب ہم تمام لوگ یعنی میں لبنیٰ اور اس کے بچے اکٹھے بیٹھتے تو ہم دونوں بہن بھائی اپنی بچپن کے قصے اور شرارتیں بچوں کو سنایا کرتے اور پرانی یادیں جو بے حد خوشگوار تھیں تازہ کرنے سے خود بھی تازہ دم ہو جاتے۔ بچے بھی ہماری باتوں سے بہت محظوظ ہوتے۔ ظفر صاحب (لبنیٰ کے شوہر) کی ہم سب ہی بہن بھائیوں سے خوب بنتی تھی وہ بھی ہم سب کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کرتے۔ میری بیگم صبیحہ عامر جو

پیشے کے حوالے سے ٹیچر ہیں وہ بھی افسانہ نگار ہیں۔ لبنیٰ نے تو آٹھویں جماعت ہی سے افسانے لکھنے شروع کر دیے تھے جب میری بیگم نے بھی افسانے لکھے تو لبنیٰ نے اپنی بھاوج کے افسانوں کی بے حد تعریف کی اور انہیں آئندہ بھی لکھتے رہنے کا مشورہ دیا۔ وہ اکثر ہی ان سے کہتی کہ تم نے بہت اچھے افسانے لکھے اور بھی لکھو مگر وہ کہتی کہ بس اسکول سے آ کر وقت نہیں ملتا کیا کروں۔ لبنیٰ کی وفات سے صرف ایک دن قبل ہی دوپہر کے وقت میری لبنیٰ سے کافی طویل گفتگو ہوئی لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ وہ میری لبنیٰ سے آخری گفتگو ہے۔ کچھ دن پہلے جب میں لبنیٰ کی عیادت کے سلسلے میں اسلام آباد گیا تو بچے کہنے لگے۔ ''ماموں جان جب آپ آتے ہیں تو اماں جی بھر کے کھانا کھاتی ہیں لیکن جب آپ لوگ چلے جاتے ہیں تو وہ بھی اداس ہو کر کھانا پینا چھوڑ دیتی ہیں۔'' جن دنوں لبنیٰ شدید علیل تھی میں نے اس کا جی خوش کرنے کو کہا کہ تم جلدی سے بھلی چنگی ہو جاؤ کیونکہ پھر تم نے اپنے بیٹے اطیب کی شادی میں ڈانس بھی کرنا ہے کیونکہ محفل تاں سج دی جے نچے منڈے دی ماں میری بات سن کر وہ کچھ اداس سی ہوگئی پھر بولی۔ ''عامر بھائی بس آپ میرے لیے دعا کیا کریں۔'' میں عرصہ 32 سال سے سرگودھا میں پیشہ صحافت سے منسلک ہوں لہٰذا میں نے لبنیٰ سے کہا کہ تمہاری کتاب کی رونمائی میں پریس کلب میں کرواؤں گا مگر وہ صحت یاب نہ ہو سکی۔ وفات سے قبل اس نے وصیت کی کہ میری قبر والدہ کی قبر کے ساتھ ہو۔ آپ یقین کریں کہ گورکن نے کہا کہ یہاں پر اتنی جگہ نہیں ہے لیکن جب کھدائی شروع ہوئی تو قبر کی جگہ بنتی چلی گئی اور اسے وہیں والدہ کے ساتھ ہی ہمارے آبائی شہر سرگودھا میں ہی سپردِ خاک کیا گیا۔ بس اس کی جدائی کا غم ابھی بالکل تازہ ہے میری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے شوہر، بچوں اور ہم سب کو صبرِ جمیل عطا کرے۔ اللہ تعالیٰ لبنیٰ کو جوارِ رحمت میں جگہ دے، آمین...... ثم آمین۔

لبنیٰ میری دوست

صبیحہ شاہ

لبنیٰ سے میری دوستی کیسے اور کب ہوئی؟ آج میں سوچوں تو کوئی سرا ہاتھ نہیں آتا۔ وہ مجھ سے عمر میں چھوٹی تھی (تھی...... آہ)

بس اتنی سی حقیقت تھی فریبِ خوابِ ہستی کی
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے

میں اور وہ دو مختلف شہروں کی پروردہ ہیں۔ میری اور اس کی بالمشافہ ملاقاتیں انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں جو شاید دوسرے ہاتھ کی پہلی انگلی پر ہی ختم ہو جائیں۔ ہم ایک دوسرے کے گھر شاید دو یا تین مرتبہ ہی گئے ہوں گے لیکن پھر بھی ہماری دوستی کم از کم چھبیس برسوں کی کہانی تو ہے۔ وہ مری دوست تھی بہت پیاری، بہت جگری۔ وہ کراچی میں تھی تو ہماری اتنی لمبی لمبی ٹیلی فون تک باتیں ہوتی تھیں کہ ہم دونوں کے میاں فون کے بل دیکھ کر آدھے سے زیادہ ہم دونوں کے کھاتے میں ڈال کر جی بھر کر فضیحتہ کر لیتے تھے۔ لبنیٰ نے ایک دن مجھے اپنے مخصوص انداز میں کھلکھلاتے ہوئے بتایا۔ ''ظفر کہہ رہے تھے کہ یہ تو مجھے پتا ہے کہ تم دونوں نہ تو کھانوں کی ترکیبیں ڈسکس کرتی ہو نہ سسرالیوں کے بخیے اُدھیڑتی ہو پھر آخر باتیں کیا ہوتی ہیں؟'' واقعی کیا باتیں ہوتی تھیں جو بے انت تھیں۔ شاید لبنیٰ سے میری پہلی ملاقات این آر او کلب کے زیرِ اہتمام ایک تقریب میں ہوئی تھی جس میں پاکیزہ کی رائٹرز مدعو تھیں اور لبنیٰ اس تقریب کی کرتا دھرتا تھیں۔ گپلو گپلو، بھلی بھلی سی لبنیٰ عروج کی پہچان اس کی کھنکتی ہوئی ہنسی تھی۔ اس کی سادگی اور معصومیت تھی۔ بات ہیلو ہائے سے آگے بڑھ کر دوستی بنی تو اسلام آباد چلے جانے کے بعد بھی جب وہ گھریلو بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے جلدی جلدی فون نہ کر سکتی تھی ہم میں کوئی فاصلہ درمیان میں نہیں آیا۔ شروع میں تو کتابوں، افسانوں، افسانہ نگاروں، حالاتِ حاضرہ پر باتیں ہوتیں پھر زندگی، زندگی کے مسائل و فضائل پر

باتیں ہونے لگیں۔ رشتے داروں، بہن بھائیوں، شوہر بچوں کی باتیں ہونے لگیں۔ اس کی میرے کسی بہن بھائی سے ملاقات نہیں ہوئی لیکن وہ ان سب کو ناموں اور کاموں سے جانتی تھی۔ میں کبھی لبنیٰ کی آپا، جمنی، یمنیٰ، ہانیہ سے نہیں ملی، بیلا باجی (نبیلہ باجی) سے نہیں ملی عامر سے نہیں ملی مگر میں جانتی ہوں ان سب کو ان کے مزاجوں کو۔ میری اور لبنیٰ کی تاریخ پیدائش ایک ہی تھی۔ چھ اکتوبر اور وہ ہر مرتبہ وش کرنے میں پہل کر جاتی۔

''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو اینڈ می۔'' کہہ کر وہ زور سے ہنستی تھی۔ لبنیٰ جب میرے گھر پہلی مرتبہ آئی تو اس کے تینوں مؤدب بچوں میں چھوٹا بچہ اسامہ اس قدر سنجیدہ اور فلاسفر قسم کا تھا کہ میری بیٹی یسمی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''ہائے اللہ یہ تو خلیل جبران ہے۔'' اور لبنیٰ اس قدر ہنسی تھی کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے اور پھر اُسامہ کو ہم خلیل جبران ہی کہہ کر اس کا ذکر کرتے تھے۔

''آپ کے خلیل جبران نے فرسٹ پوزیشن لی ہے۔'' وہ بتاتی۔ خلیل جبران نے آج یہ کہا، آج یہ کیا۔ لبنیٰ کے تینوں بچے ماشاء اللہ بہت لائق اور مؤدب بچے ہیں اور ان بچوں کی لیاقت وسعادت مندی کا تمام تر کریڈٹ بلا مبالغہ صرف اور صرف لبنیٰ کو جاتا ہے کیونکہ اس کی زندگی کا مرکز ومحور صرف اور صرف شوہر اور بچے تھے۔ اس میں ذرا سا وقت جو کبھی بچ رہتا وہ اس وقت میں قلم تھام لیتی اور بس فیشن، آؤٹنگ، تیری میری غیبتیں، باتیں سسرال کے قصے۔ ان سب باتوں سے اسے دور سے بھی سروکار نہیں تھا۔ صرف ایک مرتبہ اس نے اپنی نند کا ذکر کیا تھا۔ اس روز اس نے بیک وقت ہنستے اور روتے ہوئے اطیب کی ائرفورس میں کمیشن ملنے کی خوش خبری سنائی تھی۔

''صبیحہ آج میں بہت خوش ہوں۔ آج میرے ہونے کا جواز مل گیا ہے۔ آج سے میں وطن کے ایک جاں نثار کی ماں ہوں اور پتا ہے صبیحہ ابھی میری نند کا فون آیا تھا۔ اس نے کہا کہ بھابی جی جھولی پھیلاؤ تو میں مبارک بادوں سے بھر دوں۔ تم نے ہماری نسل سنوار دی ہے۔ تم نے ہمیں فخر کرنے کے قابل بنا دیا۔ صبیحہ آج تک تو میں ایک خامیوں وغلطیوں وکمزوریوں سے بھرپور شخصیت تھی۔ آج اطیب نے مجھے سُرخرو کر دیا۔'' یہ چند جملے نہیں تھے یہ صرف خوشی کا اظہار نہیں تھا۔ یہ ایک مکمل اور دکھ بھری کہانی تھی جو ہر دماغ رکھنے والی عورت کی کہانی ہے جو بے دماغ معاشرے میں اَن فٹ اور ناکارہ رہتی ہے۔ لبنیٰ اکثر بچوں اور بچوں کی تربیت کے حوالے سے ڈسکس کرتی کہ ''آپ کے بچے تو بڑے ہیں ناں آپ ان مرحلوں سے گزر چکی ہیں۔ آپ بتائیں میں کیا کروں؟'' ایک مرتبہ اس کا فون گرمی کی بھری دوپہر میں آیا۔

''خیریت...... اس وقت؟'' میں نے تشویش سے پوچھا کہ ہماری گفتگو کا سیشن عموماً ناشتے کے دوران ہوا کرتا تھا جب میاں اور بچے دفتر اور اسکولوں کو سدھار چکے ہوتے تھے اور ظالم سماج کی دخل اندازی سے بے فکر ہو کر ہم دونوں ماسیوں پر نگاہ رکھے اپنی باتیں کیا کرتے تھے۔

''ہاں پہرہ دے رہی ہوں۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔

''پہرہ......؟'' میں حیران ہوئی۔

''ہاں قاری صاحب محترم بچوں کو قرآن پڑھا رہے ہیں۔'' پتا چلا کہ نئے قاری صاحب آئے ہیں پرانے والے کو فارغ کر دیا ہے کہ وہ اطیب کو کچھ ایسے مسائل سے آگاہ فرما رہے تھے جو دس سال کے بچے کے سر پر سے گزر گئے۔ بچے نے ماں سے وضاحت چاہی تو ماں کے ہوش اُڑ گئے۔ محترم قاری صاحب کو فارغ کیا گیا اور نئے قاری صاحب کا انتظام کیا گیا اور پھر بچوں کے قرآن ختم ہونے تک اور قرآن پاک کی دوہرائی کے دوران ماں نے دوپہر کی نیند اپنے اوپر حرام کر لی۔ بچوں کے مسائل اس کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ بن جاتے۔ بچوں کی خوشیاں، کامیابیاں اس کے اندر نئی توانائیاں بھر دیتیں۔ کراچی میں N.O.R.E.I میں رہائش اس کے لیے بڑی پُرراحت رہی۔ نیول بیگمات کا حلقہ ان کی چھوٹی موٹی سرگرمیاں، گیٹ ٹو گیدرز صبح شوہر کا منہ دیکھ کر اور شام بچوں کو دیکھ کر کرنے والی لبنیٰ کے لیے بڑے غنیمت تھے۔ گاہے بہ گاہے ایک چیلنج اس کو چست رکھتا تھا۔ ظفر بھائی کے اسلام آباد ٹرانسفر پر وہ ملے جُلے جذبات میں گھری ہوئی تھی۔ بہن بھائیوں سے نسبتاً قریب ہو جانے کی خوشی، ایک نئے شہر میں جا بسنے کی ایکسائٹمنٹ، اتنے برسوں سے کراچی جیسے شہر میں رہنے کے بعد اب اسلام آباد روانگی پر بڑے ملے جلے تاثرات تھے اس کے۔ اسلام آباد جا کر اسے کراچی یاد آتا۔ کراچی کے پڑوسی، نوکر، موسم سب سے بڑھ کر کراچی میں ملی آسانیاں اسے یاد آتیں اور پھر وہ زندگی کے دھندوں میں زندگی کے چکروں میں ایسی الجھی کہ ہمارے رابطوں میں ذرا ذرا سا وقفہ آنے لگا لیکن برتھ ڈے پر وش کرنا وہ نہ بھولتی۔ پہل وہ ہی کر جاتی کہ میں نمبروں، تاریخوں کو یاد رکھنے کے معاملے میں زیرو ہوں پھر ظفر بھائی نے ریٹائرمنٹ لے لی۔ ہر ایماندار افسر کی طرح انہوں نے بھی اپنی چادر جھاڑ جھٹک کر دیکھی اور کچھ حدود قائم کر لیں۔ ان حدود میں کُل وقتی ملازموں کا گزر نہ تھا۔ ظفر بھائی اپنا بزنس جمانے کی تگ ودو اور بچے اپنی پڑھائیوں میں مگن تھے اور لبنیٰ ان سب کو تھکن سے بچانے کے لیے ان تھک محنت کر رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ جھنجلا جاتی کہ یہ عورت کا خاصّہ ہے کہ اسے ایک کندھا سر رکھ کر ستانے کو چاہیے ہوتا ہے پھر سے تازہ دم ہو جانے کو۔ منیٰ اگر پوزیشن ہولڈر ڈاکٹر ہے تو ماں کی دی ہوئی آسانیوں کی بدولت۔ اسامہ اور اطیب کی کامیابیاں بھی ماں کی انتھک محنت کے باعث ہی ہیں کہ اس نے منیٰ کو ہاتھ کے چھالے کے مانند پالا پوسا۔ شہزادیوں کی طرح اسے آسانیاں، راحتیں دینے کی کوشش کی ہے۔ کئی سال سے وہ اصرار کر رہی تھی آپ اسلام آباد آئیں کئی مرتبہ پروگرام تو بنا مگر پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ گزشتہ برس چھوٹی بیٹی کو ایک امتحان دینے اور ورکشاپ اٹینڈ کرنے اسلام آباد جانا پڑا۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور یوں برسوں بعد میرا لبنیٰ سے ملنا ہوا۔ میں نے کال بیل بجائی تو ٹیرس پر سے لبنیٰ کا ہنستا ہوا چہرہ نمودار ہوا۔ وہی کھنکتی ہنسی۔

''میں نیچے آ کر آپ کو ریسیو نہیں کر سکتی بہت موٹی ہو گئی ہوں، آ جائیں۔'' خوشی لبنیٰ کی آنکھوں سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ اس نے بے انتہا اہتمام کیا ہوا تھا۔ منیٰ کا امتحان نزدیک تھا یا شاید ہو رہا تھا۔ وہ بھی اپنی کتابیں لیے ہمارے پاس بیٹھی تھی۔ لبنیٰ بار بار کچن میں جاتی اور پھر پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ واپس آتی۔ اسے عرصے سے شوگر ہے۔ یہ تو مجھے پتا تھا لیکن مجھے اس کا چہرہ بہت سُوجا ہوا لگا۔ وہ مجھے صحیح نہیں لگی لیکن میں نے ذکر کرنا یا اظہار کرنا مناسب نہیں جانا کہ وہ ڈاکٹر بیٹی کی ماں ہے یقیناً اسے زیادہ بہتر علم ہوگا اور پھر ہم دونوں کچن میں ہی چلے گئے۔ آخر منیٰ نے آ کر کہا۔ ''ماما آپ بیٹھیں، کھانا میں لگاتی ہوں۔'' ظفر بھائی حالات کے پیشِ نظر کل وقتی ملازم یا ملازمہ رکھنے کے حق میں نہیں تھے کہ آس پاس چند واقعات ایسے ہو چکے تھے کہ ملازم تنہا خاتونِ خانہ کو بے ہوش کر کے لوٹ کر یا قتل کر چکے تھے۔

''سارا دن اکیلی ہوتی ہوں۔ دونوں بچے پڑھائیوں میں مصروف رہتے ہیں اطیب کہوٹہ میں، ظفر آفس میں اور میں گھر میں کچن کی نذر۔'' اس نے حسبِ عادت ہنستے ہوئے بتایا۔ وہ پورا دن ہم نے ایک ساتھ گزارا اس کا چلنا پھرنا مشکل تھا۔ ٹانگ میں ہلکا ہلکا درد شروع ہو چکا تھا جو وہ اپنے بے تحاشا بڑھتے وزن کا باعث سمجھ رہی تھی۔

''بے چارے ظفر کچھ نہ کچھ کر دیتے ہیں کام۔'' وہ بتا رہی تھی۔ ''یہ لیں یہ ساگ بھی گھوٹا ظفر نے ہے۔ باقی میں نے بنایا ہے۔'' وہ منیٰ اور اطیب کی شادیوں کے حوالے سے متفکر تھی۔ ''میں تو کسی کام جوگی نہیں ہوں کھانا بنا لوں وہی بہت ہے۔ لڑکا اور لڑکی ڈھونڈنے کہاں اور کیسے جاؤں گی اور ظفر......'' وہ ہنسی۔ ''پتا ہے وہ کہتے ہیں کہ منیٰ کی شادی کی بات کی کسی نے تو گولی مار دوں گا۔ لو بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔'' اس کی ہنسی میں شکایت اور بے بسی تھی۔ ''ان کی بیٹی کوئی انوکھی ہے۔''

''باپوں کے لیے بیٹیاں انوکھی ہوتی ہیں لبنیٰ۔ تمہیں یاد نہیں عزیز بھی بیٹیوں کی شادیوں کے نام پر

بدک جاتے تھے کہ ابھی سے۔"
"ہاں، دونوں خبطی میرے اور آپ کے لیے کیوں رکھے ہیں اللہ میاں نے۔" وہ پھر ہنستے ہوئے شکوہ کررہی تھی۔
"ارے بھئی سارے باپ بیٹیوں کی محبت میں ایسے ہی خبطی ہوجاتے ہیں۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "جب اللہ میاں نے کسی کا وقت لکھا ہوا اسی وقت ہوتا ہے۔" پتا نہیں مجھے لگا وہ اپنی طرف، اپنی صحت کی طرف سے وہ مایوس سی ہے۔ گزشتہ ایک سال میں اس کی صحت تیزی سے گری بھی۔ اس نے بتایا کہ میرا وزن اور زیادہ ہوگیا ہے۔ میری ٹانگ میں شدید تکلیف ہے اور پھر ایک اس نے منیٰ کے رشتے کی بات بتائی۔ گھر میں ہی ایک چھوٹی سی تقریب میں رشتہ طے ہوا ہے۔ لبنیٰ بہت خوش تھی۔
"دیکھ لیا ناں وقت آیا تو ظفر بھائی کی ساری گولیاں کند ہوگئیں۔" میں نے چھیڑا۔
"واقعی۔" وہ ہنسی۔ "پتا نہیں وہ کیسے مان گئے۔" وہ منیٰ کے منگیتر کا ذکر اور تعریف کرتی رہی۔ اس کے گھر والوں کی باتیں۔ منگنی میں آئی ہوئی چیزوں کے بارے میں اس نے بہت خوشی خوشی بتایا۔
وہ پانچ اگست تھی۔ میں عشا کی نماز پڑھ رہی تھی تراویح کی نیت کرنے ہی لگی تھی غزالہ رشید نے انجم انصار کا جو پیغام دیا اسے سن کر میرے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔
"اتنی جلدی...... اتنی جلدی لبنیٰ...... لو کتابِ زندگی کا ایک اور باب ختم ہوا۔" ہم سب اینڈنگ لائن کی طرف دوڑ رہے ہیں لیکن ہر ایک کا وہاں پہنچنا ہم کو حیران کردیتا ہے کہ اتنی جلدی۔ مالک کی مصلحتیں وہی جانے لیکن اللہ میاں جی وہ تیری شاکر و صابر بندی اگر اپنے بچوں کو دولھا اور دلہن بنے بھی دیکھ لیتی تو تیری قدرت میں کیا کمی رہ جاتی۔ خدا اسے بہت اچھی جگہ عطا فرمائے آمین اور یقیناً وہ اچھی جگہ ہوگی کہ دنیا میں اتنی جسمانی تکلیفیں بیماریوں کی صورت میں اٹھا چکی تھی کہ وہاں یقیناً اس کے لیے آرام ہی آرام ہوگا۔ میری ظفر بھائی سے بات ہوئی ہے لیکن میں باوجود خواہش کے منیٰ اور اسامہ سے بات نہیں کر پا رہی ہوں۔ اطیب نے مجھے پتا ہے خود کو سنبھال لیا ہوگا لیکن منیٰ اور اسامہ یقیناً بہت بکھرے ہوئے ہوں گے۔ منیٰ وہ ماں کی اکلوتی ہمدم و دمساز تھی، سہیلی تھی اور اسامہ سب سے چھوٹا بچہ۔ میرے پاس ان بچوں کو تسلی دینے کے لیے الفاظ نہیں ہر چند کہ موت برحق ہے وقت معین ہے پھر بھی کچھ لوگوں کا جانا بڑا بے وقت لگتا ہے۔ بظاہر بے نیاز اور خشک مزاج نظر آنے والے ظفر بھائی کا نقصان یقیناً سب سے زیادہ ہے۔ انہوں نے لبنیٰ کی بے حد خدمت کرکے اس کی زندگی بھر کے شکوے دھو ڈالے تھے اور میرا نقصان...... میرا نقصان بھی تو ناقابلِ تلافی ہے۔ مجھے ایسی دوست کہاں ملے گی جو درمیان میں لمبے لمبے وقفوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے چھ اکتوبر کی صبح کھنکتی ہنسی ہنستے ہوئے کہے گی۔ "ہیپی برتھ ڈے ٹو یو اینڈ می۔" کس سے باتیں کرکے دل کے بوجھ اس پر لاد کر بے فکر، ہلکی پھلکی ہوجاؤں گی۔ صبر اطیب، اسامہ، منیٰ۔ بیلا باجی، آپا، یمنیٰ، ہانیہ، عامر، بھابی جی صبر...... کہ اسی کا حکم ہے۔ ہم سب کو جانا ہے۔ آج لبنیٰ کل ہماری باری ہے اور صبر کا اجر بہت ہے اور اصل صبر وہی ہے جو اوّل وقت میں کیا جائے۔ لبنیٰ میری یادوں میں تیری ہنسی ہمیشہ کھنکھناتی رہے گی۔

وہ ہوئیں راہیِ ملکِ عدم

نزہت اصغر

زندگی کے اس میلے میں جس تیزی سے لوگ ملتے ہیں اسی تیزی سے بچھڑ بھی جاتے ہیں۔ جب کوئی ہمارا پیارا ہمارے ساتھ ہوتا ہے تو ہم اس کی فرقت کا تصور بھی کبھی ذہن میں نہیں لاتے مگر وہی پیارا جب اچانک ہمارے درمیان سے اُٹھ جاتا ہے تو اس کے "نہ" ہونے کا برسوں یقین نہیں آتا۔
ہماری پیاری رائٹر لبنیٰ عروج اپنے نام کے مانند نرم و ملائم اور ملاحت کی حامل خاتون تھیں جنھوں نے بلاشبہ ہر شعبے میں بہت عروج پایا۔ ایک زمانہ تھا کہ ان کی تحریریں تواتر سے پڑھنے کو ملتی تھیں پھر ان میں کچھ وقفہ آ گیا تھا شاید ان کی گھریلو مصروفیات آڑے آ گئی ہوں۔ ستمبر 2005ء میں جب ہمارے ادارے نے نیا پرچا دلکش نکالنے کی منصوبہ بندی کی تو مجھے اپنے ملک کی تمام قلم کاروں سے رابطہ کرنے کو کہا گیا۔ اس سلسلے میں خطوط بھی لکھے گئے اور بذریعہ فون میرا رابطہ لبنیٰ عروج سے بھی ہوا۔ ہم نے صبیحہ شاہ، رفعت ناہید سجاد، شوکت رانا الطاف، ساجدہ حبیب و بے شمار ان رائٹرز سے رابطے کیے جو اس وقت کم کم لکھ رہی تھیں۔ اسی سلسلے میں ہماری بات لبنیٰ عروج سے بھی ہوئی اور بہت اچھی بات چیت رہی پھر جب میں اپنے میکے کی وجہ سے اسلام آباد گئی تو اس وقت وہ سیکٹر F.10 میں رہ رہی تھیں۔ ان سے فون پر مسلسل رابطہ رہا اور میں نے دلکش میں لکھنے کا پھر اصرار کیا مگر ہماری ملاقات بالمشافہ نہ ہو پائی اس لیے کہ میکے میں کم ہی دن رہنا ہوتا ہے سو تشنگی رہ گئی۔
اب پاکیزہ کے ذریعے ان کی بیماری اور پھر انتقال کی خبر بھی بجلی بن کر گری۔ اتنی ہنس مکھ، ملنسار اور باصلاحیت شخصیت ایک مہلک بیماری کا شکار ہوکر ہم سے ہمیشہ کے لیے جُدا ہوگئیں۔ پروردگار ان کی مغفرت کرے۔ ان کے بچوں کی تسلی کے لیے چند اشعار نذر ہیں گو کہ صبرِ جمیل تو صرف اللہ تعالیٰ ہی عطا کرسکتا ہے۔

موت کی آغوش میں جب تھک کے سوجاتی ہے ماں
پھر کہیں جا کر رضا تھوڑا سکوں پاتی ہے ماں
پیار کہتے ہیں کسے اور مامتا کیا چیز ہے
کون اُن بچوں سے پوچھے جن کی مرجاتی ہے ماں

لبنیٰ آنٹی کی تحریروں کو محفوظ کیا جائے

عظمیٰ آفاق سعید

میں اسکول گرل تھی مگر امی کے ساتھ مصنفات کی تقریبات میں لازمی جایا کرتی تھی اور میری یادوں میں آج بھی Nore کے فنکشنز روشن ہیں۔ جس کی مہمانِ خصوصی مسز انجم میر ہوتی تھیں اور وہاں سب مصنفات اپنی تحریریں پڑھا کرتی تھیں۔ ایک، دو مرتبہ تو میں نے بھی پڑھا تھا...... اور سب نے بے حد حوصلہ افزائی کی تھی جس میں لبنیٰ عروج پیش پیش تھیں۔ بے حد محبت کرنے والی اور ہمہ وقت مسکرانے والی خاتون نے جانے میں بھی جلدی کی۔ ان کا ہر افسانہ کتنا خوب صورت ہے آپ اس ماہ بھی ان کا شامل ہونے والا ایک یادگار افسانہ پڑھیں گے تو اسے پڑھ کر یقیناً آگاہی کے در روشن ضرور ہوں گے اور میں یہ مشورہ ان کے اہلِ خانہ کو ضرور دوں گی کہ آنٹی لبنیٰ عروج کی تمام تحریروں کو کتابی شکل میں لایا جائے اور ان کے افسانوں پر ڈرامے بنائے جائیں۔ آج ہم اپنی پیاری مصنفہ شازیہ چوہدری کے ناول نکھر گئے ہیں گلاب سارے کو جب ٹی وی پر ڈرامے کی شکل میں دیکھتے ہیں تو ایک عجیب سی خوشی ہوتی ہے اور جب لبنیٰ عروج کی تحریریں ڈرامائی شکل میں دیکھیں گے تو اس کو دیکھنے والوں کا دائرہ مزید بڑھ جائے گا۔
اللہ تعالیٰ ان کے اہلِ خانہ کے ساتھ ساتھ ان کے چاہنے والوں کو بھی صبر عطا فرمائے کہ میری امی اور آپ کی باجی انجم انصار جس طرح تڑپ کر روئی تھیں تو ان کو چپ کروانا مشکل ہوگیا تھا اور اس وقت مجھے یہی لگ رہا تھا کہ لبنیٰ عروج سے تو ہماری بڑی قریبی رشتے داری تھی۔ اللہ تعالیٰ ان کو غریقِ رحمت کرے۔ آمین ثم آمین۔

میری دوست میری پڑوسن

حمیرا محسن

رنج کتنا ہی کریں ان کا زمانے والے
جانے والے تو نہیں لوٹ کے آنے والے

لبنیٰ ہنستا مسکراتا معصوم سا چہرہ، بے ریا ہنسی، شفاف آنکھیں، پُرخلوص سی مٹھاس لیے لہجہ۔ میں کیسے مان لوں اتنی جلدی ہمیں چھوڑ گئی اپنے بچوں کو، چاہنے والے زندگی کے ساتھی کو، عزیزوں رشتے داروں کو، دوست احباب قلم کتاب کہانی افسانے پاکیزہ انجم انصار اپنی لکھاری دوستوں کو؟ بعض دکھ اتنے شدید

ہوتے ہیں کہ انسان کی تمام حِسیں فریز ہو جاتی ہیں۔ وہ بہت حساس تھی لیکن اپنے دکھوں پر ہنسی کا پردہ ڈالنا بھی جانتی تھی کبھی کبھی میں اسے ٹوک دیتی۔ لبنیٰ اتنا نہ ہنسا کرو، میں جانتی ہوں تم آج پھر اداس ہو اس پہ اس کا کہنا آپ کو کیسے پتا؟ انجم پیاری کیا بتاؤں اور کیا نہ بتاؤں زندگی بہت سی حقیقتوں سے روشناس کرا گئی لیکن اس کا غم سارا دن ذہن و دل پر دستک دیتا رہتا ہے ابھی تو اس کے بچے کسی مقام پر پہنچے تھے ابھی تو ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھنے کا وقت آیا تھا کہ وہ بیچ راہ میں چھوڑ گئی۔ آہ جانے والوں کو کہاں روک سکا ہے کوئی۔ انجم جی وہ تمہاری صحیح تعریف کیا کرتی تھی کہ تم ایک حساس دل کی مالک ہو۔ تم صاحبِ درد ہو جب میں نے تمہیں یہ خبر دی تو شاید تم کہیں جا رہی تھیں۔ بڑا پُرتکلف لہجہ تھا تمہارا جیسے ہی یہ سانحہ تمہیں پتا چلا تم ایک دم غم کی تصویر بن گئیں اور میں جو آخری دفعہ اس کا پیارا چہرہ اور بے جان وجود دیکھ کر غم سے نڈھال تھی مجھے لگا میں تم سے لپٹ کر دہاڑیں مار مار کر رونے لگی ہوں۔ اللہ تمہیں ہم سب کے لیے جیتا رکھے، آمین، میں بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں پر مجھ میں شاید اپنی بات کہنے کا وہ سلیقہ اور قرینہ نہیں ہے سو معذرت ...... لبنیٰ سے اپنی ذہنی قربت اور دلی لگاؤ کو کسی قیمتی متاع کی طرح سنبھالے بیٹھی ہوں اس کے پھول سے بچوں کے مرجھائے چہرے، ان کی بھیگی آنکھیں، ظفر کی غمزدہ صورت، گھر کی ویرانی یہ سب دیکھنا اور سہہ جانا مجھ سی کمزور اعصاب کی مالک عورت کے لیے بہت بڑی بات ہے لیکن اللہ مجھ سے ہی اتنے امتحان لیتا ہے۔ میری پیاری بہن شبنمی، میری محبوب ماں، میرے شفیق پاپا میری محبتی ساس، میرا جواں کڑیل بھائی بے حد وحساب پیار کرنے والے عزیز اور دوست افق کے اس پار جا چکے ہیں جہاں کوئی سندیسے کوئی آہیں وہاں نہیں پہنچ پاتیں۔ انجم پیاری ایسا نہیں لگتا کہ ہم مرقد سجانے اور برسیاں منانے والے بن کر رہ گئے ہیں۔ اپنوں کو وقت سے پہلے مار دینے والے جان بوجھ کر اپنے پیاروں کی کمزوریوں کو تلاش کرنا اپنے وقت کا بہت بڑا حصہ ان کی کھوج میں لگا دینا اور اپنے دلوں میں عداوتوں کی فصل تیار کرنا جیتے جاگتے اپنوں کو چھوڑ دینا اور موت کی اطلاع ملتے ہی ماتم میں سبقت لے جانا پھر ان کے پیچھے رہ جانے والوں پر اپنے سپاروں کی تعداد بڑھا چڑھا کر بتانا تم خود ہی کہو یہ منافقت اور دو رُخا پن نہیں، ہم زندگی میں بھی محفلیں سجا سکتے ہیں ایک دوسرے سے مل کر خوشی میں خوش اور دکھوں میں دکھی ہو سکتے ہیں ناں۔

بچھڑا کچھ اس ادا سے

فرح طاہر قریشی، ملتان

پیاری انجم آپا! کبھی سوچا نہیں تھا کہ میرے قلم سے اپنی ہی رائٹر بہن کے لیے تعزیت بھرے الفاظ لکھے جائیں گے۔ لبنیٰ عروج جو ادب کی دنیا کا اِک معتبر نام جن کو میں جب سے پڑھ رہی تھی (تھی) کا لفظ لکھتے وقت ہاتھ کانپ جاتا ہے جب سے میں نے ڈائجسٹ پڑھنے شروع کیے ان کی خوب صورت لفظوں اور احساسات سے بنی ان تحریروں کو میں شوق سے پڑھا کرتی تھی اور سوچتی تھی میں جب بھی لکھوں گی تو لبنیٰ عروج جی سے ضرور رابطہ کروں گی اور انہیں بتاؤں گی کہ آپ کی کہانیاں آپ کی تحریریں مجھے کتنی پسند تھیں اور ان سے میں نے کیا کچھ نہیں سیکھا۔ جس نے میرے اندر کی چھپی رائٹر کو بیدار کیا۔ آپ سے میرا رشتہ صرف قلمی رشتہ تھا لیکن ایسا رشتہ جو احساسات اور جذبات کے تانے بانے پر مشتمل تھا۔
آج جب میں خود حلقۂ ادب کی دنیا میں قدم رکھ چکی ہوں تو آپ چلی گئیں۔ میری خواہش میری حسرت بن کر دل کے نہاں خانوں میں کہیں دفن ہو گئی۔ آہ...... لبنیٰ عروج
کاش قدرت نے آپ کو تھوڑی مہلت دی ہوتی تو آپ بھی مجھے رائٹرز کی صف میں کھڑا دیکھ لیتیں جو آپ کو پڑھ پڑھ کر آج اس مقام پر آئی ہے۔ وہ اِک بات جو میں آپ سے کہنا چاہتی تھی (جو ادھوری رہ گئی) آج حسرت بن کر مجھے احساس دلا رہی ہے کہ میں نے دیر کر دی اور آپ نے جلدی کر دی جانے میں...... لبنیٰ آپ جانتی ہیں پاکیزہ میں چھپنے والا آپ کا ناولٹ "محبتوں کے پھیلاؤ" پڑھ کر

میں کتنا خوش ہوئی تھی مجھے جب پتا لگا پڑھ کر کہ آپ کتنی محبت کرنے والی اور محبت بانٹنے والی ہستی ہیں۔ اِک رائٹر اپنی تحریر میں کہیں نہ کہیں خود کو ضرور لکھتی ہے اور اس ناولٹ میں مجھے آپ نظر آئیں، محبت و پیار لٹاتی۔ آپ کی یہ تحریر مجھے تازیست یاد رہے گی۔ یہ حقیقت ہے پیار کے خزانے لُٹانے والوں کو قدرت جلد اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور پیچھے رہ جانے والے تہی داماں رہ جاتے ہیں۔ اس نفسا نفسی کے دور میں تخلیق کار بہت نایاب ہو چکے ہیں۔ ایسے تخلیق کار جو اپنے خیالات واحساسات کو الفاظ کا پیراہن پہنا کر قرطاس پر موتی کی طرح بکھیر دیں۔ آپ بھی ان میں سے ایک تھیں لبنیٰ جی۔ آپ کا یوں چلے جانا اِک عظیم دکھ ہے۔ آپ ہمیشہ ہمارے دلوں میں زندہ رہیں گی اور ہماری نظروں کے سامنے رہیں گی اپنی تحریروں کی صورت میں۔ آپ کا نام ہمیشہ علم وادب کے افق پر جگمگاتا رہے گا۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ آپ کی فیملی اور آپ کے پڑھنے والوں کو صبرِ جمیل عطا کرے۔ لبنیٰ آپ ہمیشہ ہماری دعاؤں میں شامل رہیں گی۔

☆☆☆

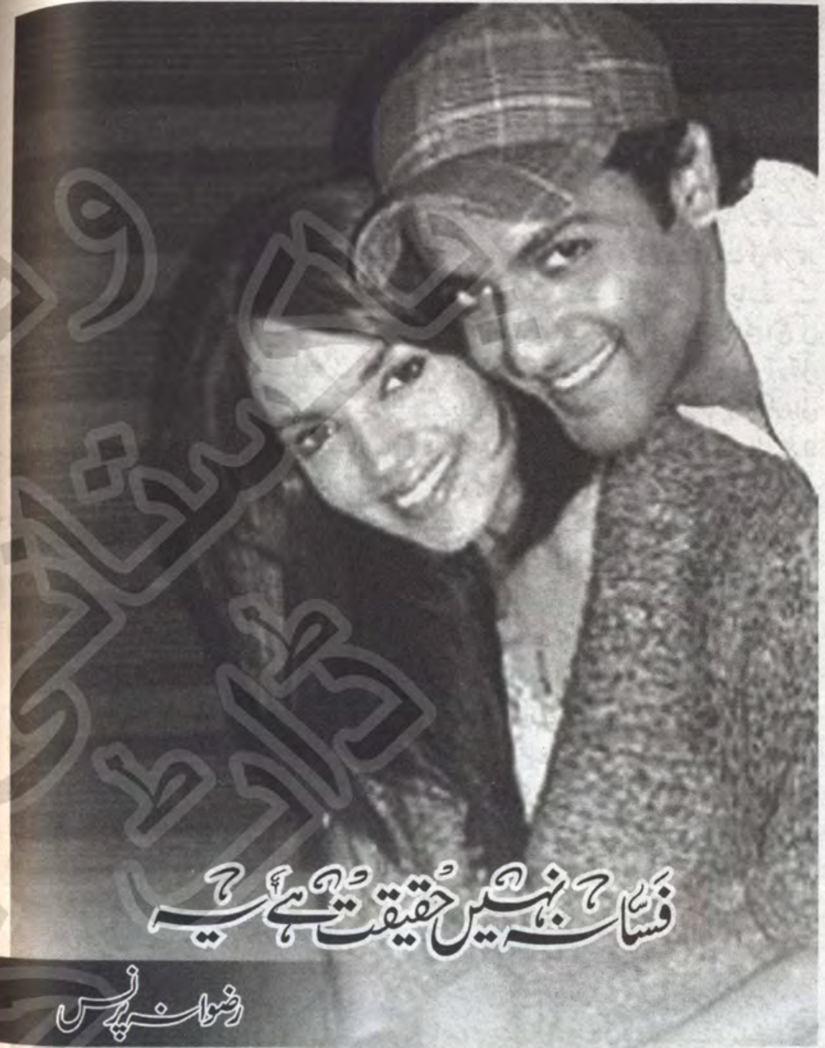
لبنیٰ عروج کو ڈائری لکھنے کی عادت تھی۔ وہ بلاناغہ ڈائری لکھا کرتی تھیں۔ گھر والوں نے ان سے ان کا مرض چھپایا ہوا تھا مگر وہ شروع سے اپنی بیماری کے بارے میں جانتی تھیں۔ اور یہ لبنیٰ عروج کی آخری تحریر ہے۔ اس کے بعد انہوں نے کچھ نہیں لکھا۔ ایک ایسی خاتون...... جو اپنی تکلیف وہ بیماری کو خود بھی اپنے گھر والوں سے چھپاتی رہیں۔ اس بیماری کے ہاتھوں کتنی تکلیف میں تھیں جسے پڑھ کر میری تو آنکھیں بھیگ گئیں۔

لبنیٰ عروج کی آخری تحریر

"7 مئی 2012ء کو رات دو بجے بالکل اچانک کمبل کھینچتے ہوئے میرے اُلٹے بازو کی کہنی اور کندھے کے درمیان کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ وہ کوئی قیامت کا لمحہ تھا درد کا ناقابلِ برداشت حملہ تھا میں بہ آواز بلند چیخ پڑی اسی وقت 1122 والوں کو بلایا، اسٹریچر پر ڈال کر مجھے پی این ایس حفیظ پہنچایا گیا جہاں انہوں نے آپریشن تھیٹر لے جا کر پلاسٹر کر دیا اور اگلے دن fit for discharge لکھ کر کے گھر بھیج دیا۔ گھر آ کر سب کی متفقہ رائے تھی کہ اب کم از کم چار ہفتے تو پلاسٹر رہے گا لہٰذا سب کچھ قسمت کا لکھا سمجھ کر سہہ گئی پھر ایک دن جوش چڑھا کہ سی ایم ایچ جا کر آرتھو پیڈک سرجن بریگیڈیئر سہیل حفیظ کو دکھاؤں۔ وہاں جا کر پھر سے ایکسرے ہوئے اور ڈاکٹر سہیل نے ٹیسٹ کی بھر مار کر دی۔ سارے ٹیسٹ کی رپورٹ آجانے کے بعد انہوں نے کہا اب ایم آر آئی ہو گی۔ سی ایم ایچ کی مشین خراب تھی لہٰذا شفا انٹرنیشنل سے ایم آر آئی کروائی۔ اس کے بعد تجویز ہوا کہ بائیوپسی کروائی جائے اب کل بروز بدھ 11.7.12 کو صبح ساڑھے 9 بجے بائیوپسی ہے۔ اس سے قبل مختلف ٹیسٹ کی رپورٹس کے بعد ڈاکٹرز میرے لیے کینسر تو تجویز کر ہی چکے تھے۔ ڈاکٹرز کا بورڈ بیٹھا اور میجر وارث نے مجھے ڈائریکٹ بتا دیا۔"

وہ مصنفات اور تبصرہ نگار بہنیں جنہوں نے بذریعہ فون لبنیٰ عروج کی رحلت کی خبر سن کر تعزیت کی اور دعائے مغفرت کی ان کے نام یہ ہیں۔ عمیرہ احمد، قیصرہ حیات، عنیقہ محمد بیگ، نگہت سیما، شائستہ زریں، اقبال بانو، شگفتہ شفیق، نسیم نیازی، مسز نزہت اشفاق، صبا نور، نور افشاں، انیلا ناہید، آمنہ حماد، غزالہ رشید، سیما رضا، سائرہ غلام نبی، ذکیہ ایوب، سمیرا حمید فاروقی، نگہت اعظمیٰ، افتخار شوق، شمیم فضل خالق، رفاقت جاوید، شگفتہ یاسمین، شگفتہ ناصر، شگفتہ نرگس، ڈاکٹر ممتاز ضیا، نگینہ بنگش، عطیہ عمر، ناہید بنت نور، شائستہ اعجاز، یاسمین رشید، مسز شمع حسین اور قیصر قدیر، ساجدہ حبیب خرابیِ طبیعت کی وجہ سے اپنے تاثرات نہ بھیج سکیں، ابھی تو پاکیزہ پوری طرح بہنوں کو ملا بھی نہیں ہے مگر میری ٹیلی فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی ہے۔ خطوط کا تانتا بندھا ہوا ہے اور ابھی بے شمار خطوط راستے میں ہوں گے مگر ہر خط اور ہر فون دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ لبنیٰ عروج کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

☆☆☆

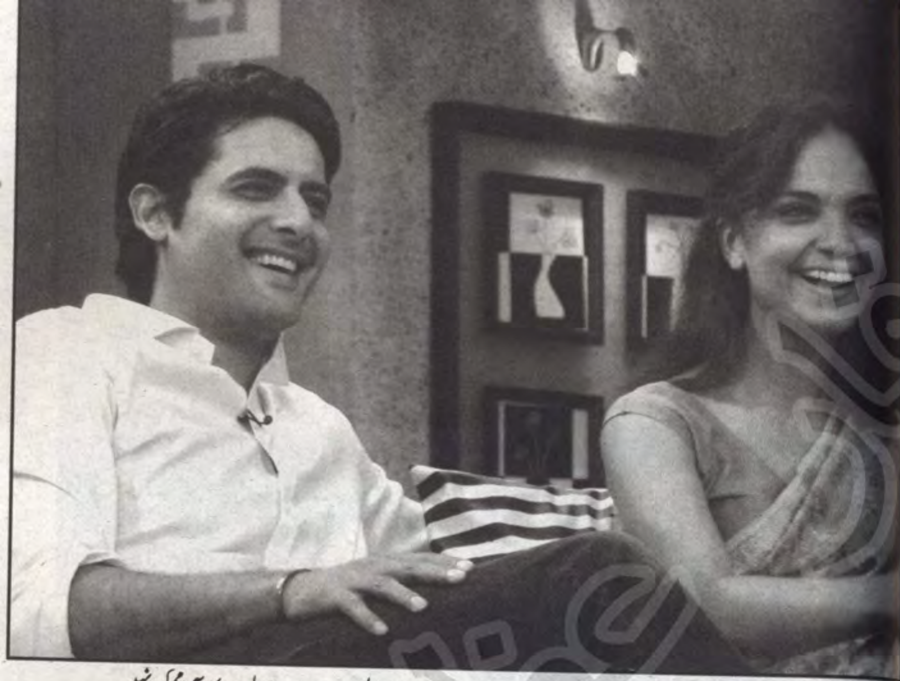


فسانہ نہیں حقیقت ہے یہ

رضوانہ پرنس

کسی فلسفی کا قول ہے کہ بہت سے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے سروں کو اتنا بلند کرتے ہیں کہ پہاڑوں کی چوٹیاں نیچے رہ جاتی ہیں اور ایسے ہی لوگوں میں ہم بنا کسی جھجک کے محبّ مرزا اور آمنہ شیخ کو شامل کرسکتے ہیں۔

عزیز قارئین! لاکھوں دلوں پر راج کرنے والے اس خوب صورت اور مثالی کپل کا بہت دلچسپ افسانہ لے کر رضوانہ پرنس ایک بار پھر آپ کے پسندیدہ سلسلے کے ساتھ حاضرِ خدمت ہے۔ یہ وہ فنکار ہیں جنہوں نے اپنی محنت اور بہترین ٹیلنٹ کی بدولت اتنی جلدی شہرت کی ان بلندیوں کو چھولیا ہے جس کی تمنا لوگ مدتوں کرتے ہیں تبھی تو ان کی یہ خوب



صورت تصاویر (جن کے لیے ہم محبّ مرزا کے بہت شکر گزار ہیں) ہم نے خاص طور پر پاکیزہ کے لیے ان سے حاصل کی ہیں۔

محبّ مرزا سے ہماری ملاقات یاسمین رضا کے خوب صورت سے گھر میں ہوئی جہاں ایک سیریل کی شوٹنگ ہورہی تھی ہمارا ارادہ کافی دنوں سے محبّ اور آمنہ کو اپنے افسانے میں شامل کرنے کا تھا۔ سو آج اس خوب صورت موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم بھی یاسمین کے گھر پہنچ گئے۔ علیک سلیک کے بعد ہم نے محبّ سے پاکیزہ کے مقبول سلسلے فسانہ نہیں حقیقت ہے یہ کا ذکر کرتے ہوئے ان سے اس میں شرکت کی درخواست کی تو محبّ نے مسکراتے ہوئے فوراً ہی ہامی بھر لی۔

" ہماری درخواست پر کہ " اگر آمنہ بھی اس انٹرویو میں شامل ہوجائیں تو ہمارے افسانے کے رنگ مزید نکھر جائیں گے۔" محبّ نے آمنہ کو فون کیا لیکن پتا چلا کہ اس وقت وہ ایک سیریل کی شوٹنگ میں مصروف ہیں۔ اس لیے رات سے پہلے ان کا آنا ممکن نہیں۔

"اصل میں 3 اگست کو ہم لوگ نیویارک ایک انٹرنیشنل فلم فیسٹیول میں شرکت کرنے جارہے ہیں، اسی لیے دن رات ہم دونوں اپنا اپنا کام نمٹانے کی کوشش میں کچھ زیادہ ہی مصروف ہیں میرے خیال میں آپ میری ہی کہانی سے کام چلالیں، فکر نہ کریں اس میں آمنہ کی موجودگی کا احساس برقرار رہے گا ورنہ پھر آپ کو کافی انتظار کرنا پڑے گا۔" محبّ کی بات ٹھیک تھی۔ ہمیں زیادہ انتظار گوارا نہ تھا۔ آمنہ بہت ہی پیاری اور با اخلاق لڑکی ہے جس کی گواہی ہم ہی نہیں اس کے سب جاننے والے بھی دیں گے، اس کی غیر موجودگی محسوس تو بہت ہوئی لیکن محبّ کے خوب صورت اندازِ بیاں نے اس کمی کو بہت حد تک پورا کردیا۔ ویسے قارئین اس پرفیکٹ کپل کی کہانی شروع ہونے سے قبل ہم آپ لوگوں کو یہ ضرور بتانا چاہیں گے کہ آمنہ اور محبّ کی ایک فلم جس کا اردو نام "لمحہ" ہے۔ نیویارک سٹی انٹرنیشنل فلم فیسٹیول کے لیے منتخب

ہوئی ہے جس میں بیسٹ ایکٹریس اِن لیڈنگ رول میں آمنہ کا نام بھی نومینیشن میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ بیسٹ اسکرین پلے بھی مقابلے میں شامل ہے۔ یہ پاکستانی فلم انڈسٹری کے لیے ایک بہت ہی بڑے اعزاز کی بات ہے کہ جس فلم کو یہاں کے لوگوں نے کوئی اہمیت نہیں دی وہ فلم تین نومینیشن کے ساتھ اتنے بڑے فیسٹیول کے لیے امریکا نے لے لی۔ اسی سلسلے میں محبّ اور آمنہ امریکا جارہے ہیں جہاں 10 اگست کو اس فلم کا پریمیئر نیویارک میں ہوگا اور 16 تاریخ کو ایوارڈ نائٹ ہوگی۔ منصور مجاہد کی ڈائریکٹ کی ہوئی اس فلم کا نومینیٹ ہوجانا ہی بہت بڑی بات ہے۔ ہماری دلی دعائیں محبّ اور آمنہ کے ساتھ ہیں۔ انشاءاللہ .... وہ لوگ ضرور ایوارڈ کے ساتھ واپس آئیں گے۔

اچھا جی یہ تو تھی ایک بہت شاندار نیوز اب شروع کرتے ہیں ایک ایسا افسانہ جس میں یقیناً آپ لوگوں کا کھوجانے کو دل چاہے گا۔

''محبّ یہ آپ کا ٹپیکل انٹرویو نہیں ہے بس آپ کو یادوں کے رنگا رنگ پھول چُنتے ہوئے ہمیں بھی اپنے ساتھ ماضی کے باغ میں لے کر جانا ہے۔'' ہماری بات پر محبّ کی چمکتی آنکھوں میں جیسے بیتے ہوئے دن روشن ہوتے چلے گئے۔

''میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ اس لیے میرا بچپن کچھ زیادہ ہی لاڈ پیار میں گزرا ہے۔ ہم صرف دو بہن بھائی ہیں لیکن بہن کے مقابلے میں' میں حد سے زیادہ شرارتی اور ضدی تھا۔ بس جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔ یوں سمجھ لیں میری بات پتھر کی لکیر ہوتی تھی۔''

''اور آپ کے امی ابو آپ کی ہر بات مان بھی لیتے تھے؟'' ہم نے رشک سے پوچھا۔

''بالکل انہیں ماننا ہی پڑتا تھا کیونکہ مجھے کنونس کرنا آتا ہے، logically میری بات انہیں صحیح لگتی تھی۔'' محبّ ہنستے ہوئے بولے۔ ''میرے دماغ میں جو بات سما جاتی بس مجھے وہی کرنی ہوتی تھی۔ جیسے آٹھویں جماعت میں آکر مجھ پر جیسے یہ خبط سوار ہوگیا کہ مجھے cadet college جانا ہے۔ امی، ابو نے بہت سمجھایا لیکن میرے دل و دماغ پر بس یہی دُھن سوار تھی۔ حسن ابدال کے کیڈٹ کالج کے لیے ٹیسٹ دیا۔ اس میں کراچی سے تین ہزار بچے تھے اور سیٹیں صرف تین تھیں۔ ظاہر سی بات ہے کہ سلیکٹ نہیں ہوا پھر اگلا ٹیسٹ pak steel کا تھا جس میں دس سیٹیں تھیں۔ میں پہلے ٹیسٹ میں رہ جانے کی وجہ سے بے حد اپ سیٹ تھا۔ سو اس ٹیسٹ میں پوری جان لگادی اور اللہ نے کامیابی بھی عطا کردی۔''

''واہ پھر تو آپ کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی ہوگی اور آپ کے امی ابو نے بھی سکھ کا سانس لیا ہوگا۔'' ہم نے ہنس کر ان کی طرف دیکھا۔

''ارے جناب کیسی خوشی، ایک ہفتے میں ہی چودہ طبق روشن ہوگئے۔'' محبّ کے اس جواب پر ہم نے بہت حیرانی سے ان کی طرف دیکھا کہ ان کے چہرے کے تاثرات تو کچھ اور ہی کہانی سنا رہے تھے۔

''آپ سوچ نہیں سکتیں کہ وہاں ایک اسٹوڈنٹ کو کتنی سخت اور ڈسپلنڈ زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ میں جو اپنی امی کا بہت چہیتا اور لاڈ پیار میں بگڑا ہوا بچہ تھا میرے تو چودہ طبق روشن ہوگئے۔ میرے تصور میں بھی نہیں تھا کہ ہر کام ہر بات کا ٹائم مقرر تھا۔ ایک سیکنڈ اِدھر اُدھر نہیں ہوسکتا تھا۔ سونے، جاگنے سے لے کر کھانے پینے ریسٹ کرنے وغیرہ وغیرہ ایک مقررہ ٹائم میں کرنا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ بے شمار دوسری سختیاں......''

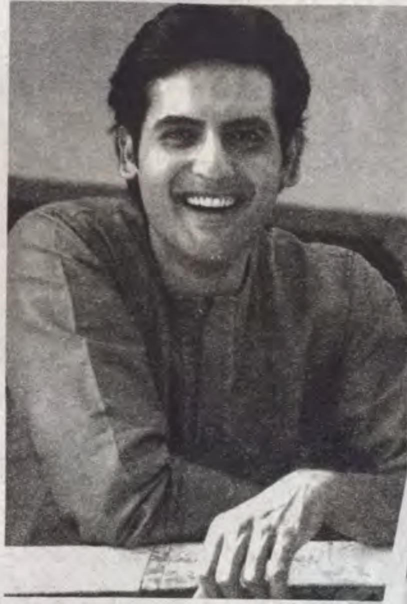
''پھر آپ ان باتوں کے عادی ہوگئے ہوں گے؟'' ہماری بات پر وہ ہنس دیے۔

''ارے میں تو اتنا گھبرا گیا کہ میں نے گھر خط لکھ ڈالا کہ میں نے جو فیصلہ کیا تھا وہ صحیح نہیں تھا حقیقت یہ ہے کہ میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ مجھ سے اتنی سختیاں برداشت نہیں ہورہیں۔ آپ لوگوں کو اور اپنے گھر کو بہت مس کررہا ہوں۔ میرے لیے میرا گھر

امپورٹنٹ ہے۔'' محبّ کی نگاہوں میں جیسے پوری جزیات کے ساتھ کیڈٹ کالج میں گزارے ہوئے مناظر گھوم رہے تھے۔

''پھر آپ کا خط پڑھ کر آپ کے والدین تو پریشان ہوگئے ہوں گے؟''

''بالکل! انہوں نے جواب میں لکھا کہ فوراً واپس آجاؤ لیکن میں نے کہا کہ نہیں میں سال پورا کر کے ہی آؤں گا۔ میں اپنے آپ کو اتنا کمزور ثابت کروا کے واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔''





''تو پھر اس ایک سال نے آپ کی شخصیت پر کافی گہرے اثرات مرتب کیے ہوں گے؟''

''بالکل جی، وہ سال میری پرسنلٹی کی امپروومنٹ کا سال تھا۔ مجھ میں بے حد کانفیڈنس آیا۔ اس ایک سال میں، میں نے کپڑے دھونا اُستری کرنا، بٹن ٹانکنا اور دوسرے مختلف کام بھی خود کیے۔ سارا دن مصروف رہتے تھے۔ کھانے کے لیے بھی ہمیں صرف بیس منٹ ملتے تھے اور ہاں سب سے خطرناک مرحلہ تو وہ آرمی پریڈ ہوتی تھی۔'' محبّ ایک لمحے کو خاموش ہوگئے جبکہ ہم مکمل طور پر ہمہ تن گوش تھے۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ مزید تفصیل.... بتاتے ہوئے بولے۔ ''یہ پانچ چھ گھنٹے کا بہت سخت پروسس ہوتا تھا، اس پریڈ میں چھوٹی سی چھوٹی حرکت پر کڑی نظر رکھی جاتی تھی۔ گردن ذرا سی ٹیڑھی ہوجاتی یا ہاتھ پیروں کی حرکت آنکھوں کی جنبش حتیٰ کے انگوٹھے یا گھٹنے ذرا سے بھی غلط مڑجاتے تو خیر نہیں تھی۔'' محبّ نے کھڑے ہوکر باقاعدہ ایکٹ کرکے بتایا تو ہم سچ مچ حیران رہ گئے کہ یا اللہ جس پریڈ کو ہم لوگ محض دیکھتے ہیں۔ ان بچوں نے اس کے لیے کتنی سختیاں جھیلی ہوتی ہیں۔

''محبّ ذرا یہ تو بتائیں کہ غلطی پر آخر کیا سزا ملتی تھی؟'' ہمارے سوال پر وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

''اسمبلی میں سب کے سامنے غلطی کرنے والوں کی باقاعدہ ڈنڈے سے پٹائی ہوتی تھی۔''

''کیا......!'' ہم تقریباً چیخ ہی اٹھے۔ ''قسم سے محبّ آپ کی کہانی سن کر بچے کیڈٹ کالج کو ایک خوفناک چیز سمجھنے لگیں گے۔''

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ بچے کو رف اینڈ ٹف بنانے کی یہ ٹریننگ ہی تو آگے چل کر اس کے کام آتی ہے۔"

"اچھا تو جب ایک سال کے سخت ترین وقت کے بعد جب آپ واپس گھر آئے ہوں گے تو اپنا گھر جنت سے کم تو نہ لگا ہوگا؟" ہم نے ہنستے ہوئے ان سے پوچھا۔

"ارے نہ پوچھیے جنت سے بھی بڑھ کر محسوس ہو رہا تھا اپنا گھر...... ایسا سکون محسوس ہوا تھا جسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔" محبّ کے لہجے میں اس وقت بھی جیسے ڈھیروں سکون امڈ آیا۔

"چلیں اب آپ کے لڑکپن کے دور سے نوجوانی کے دور میں قدم رکھتے ہیں۔" ہم نے ان کے افسانے کو مزید آگے بڑھانا چاہا حالانکہ درمیان میں کافی ڈسٹربنس ہو رہی تھی کیونکہ شوٹنگ بھی جاری تھی لیکن محبّ بہت دل جمعی سے اپنی یادیں ہم سے شیئر کر رہے تھے۔

"جب میں بیچلرز کر رہا تھا تو کالج میں ایک ڈرامیٹک سوسائٹی بن رہی تھی جس کا مجھے ہیڈ سلیکٹ کر لیا گیا۔ اسی زمانے میں، میں اور میرے دوست عدیل نے یہ سوچا کہ کیوں نہ اس کو اپنا کیریئر بنایا جائے۔ ویسے بھی ان دنوں میرے فائننشل حالات ٹھیک نہیں تھے۔ مجھے فیس بھی ارینج کرنا تھی لیکن میں نے ہمیشہ حالات کو بہت بہادری سے فیس کیا ہے سو اس وقت بھی بجائے الجھنے اور پریشان ہونے کے ہم نے اس کا حل یہ ڈھونڈا کہ ایک تھیٹر گروپ بنانے کا پروگرام بنایا اور اس کا نام drama baz theater company for youth رکھا۔ پہلے پلے میں ہم اٹھارہ لوگ اکٹھا ہوئے اور جم کر کام کیا۔ یہ پلے تین دن چلنا تھا لیکن سات دن تک لوگ دیکھنے آتے رہے جس سے ہمت اور حالات دونوں کو بہت تقویت ملی اور دلچسپ بات یہ ہے ان اٹھارہ بیس لوگوں میں سے واحد میں شوبز میں آیا۔"

"کیا آپ کے والدین نے آپ کے شوبز میں آنے پر کوئی اعتراض کیا؟"

"بالکل نہیں بلکہ انہوں نے مجھے فل سپورٹ دی اور اس فیلڈ میں مجھے اپنے ٹیلنٹ پر پورا بھروسا تھا۔ میں نے کوئی اور کام یا جاب اس وقت کرنے کا سوچا تھا اور نہ اب سوچ سکتا ہوں۔" محبّ کے لہجے میں اتنی قطعیت تھی کہ ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔

"یعنی آپ شوبز کے علاوہ کچھ اور کرنے کا کبھی نہیں سوچیں گے؟"

"میں اور کوئی کام کر ہی نہیں سکتا، یہ میری مجبوری ہے۔"

"آپ جس طرح سے سب ٹی وی چینلز پر چھائے ہوئے ہیں تو آپ کو سوچنے کی بھلا فرصت بھی کہاں۔" ہم نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ بھی مسکرا دیے۔

"ان مصروفیات سے پہلے جب میں نیا نیا اس فیلڈ میں آیا تھا تب بھی میرے خیالات یہی تھے۔ میری آمدنی اسی فیلڈ سے شروع ہوئی تھی۔"

"اچھا جی لوگ یقیناً اس افسانے میں آپ کی ہیروئن کی انٹری کے منتظر ہوں گے لیکن اس سے پہلے یہ بتائیں کہ تھیٹر سے آپ کی ٹی وی پر کیسے انٹری ہوئی؟" ہمارے سوال پر محبّ کی آنکھوں میں یادوں کے جگنو ایک بار پھر چمکنے لگے۔

"اصل میں ہوا یہ کہ میرا تھیٹر پلے ڈائریکٹر خالد احمد نے دیکھا تو مجھے آڈیشن کے لیے بلا لیا اور پھر ایک پلے "فیصلہ" میں مجھے رول دے دیا جس کی ہیروئن ساحرہ کاظمی کی بیٹی ندا کاظمی تھیں۔ ڈرامے کے پہلے ہی سین کے بعد ندا کاظمی نے مجھ سے کہا کہ اماں ایک سیریل بنا رہی ہیں آپ بھی آڈیشن دے دیں۔ (ساتھ ہی اس انٹرویو کے دوران عدنان صدیقی بھی شاٹ دینے کے بعد وہیں آ کر بیٹھ گئے تھے اور محبّ کی کہانی کو خاصی دلجمعی سے سن رہے تھے) میں اس کی آفر پر بہت کنفیوز ہو گیا کیونکہ تھیٹر میں کام کرنے کی وجہ سے میری آواز اور ایکسپریشن بہت loud تھے اور مجھے Tone down کرنے میں مشکل ہو رہی تھی لیکن میں نے ہمیشہ کی طرح اپنے اندر... کانفیڈنس پیدا کیا اور ندا سے کہا کہ مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔" محبّ کی آنکھوں میں جیسے وہ دن پوری جزیات کے ساتھ روشن ہوتا چلا گیا جب وہ ندا کے ساتھ پہلی بار پی ٹی وی اسٹیشن گئے تھے۔

"میں ندا کے ساتھ دھڑکتے دل سے ساحرہ کاظمی کے آفس گیا۔ ندا نے دروازہ کھولا تو سامنے ہی اپنی ٹیبل کے پیچھے ساحرہ کاظمی بیٹھی ہوئی تھیں اور ان کے ساتھ ہی مجھے عدنان صدیقی، ثانیہ سعید، ساجدہ سید اور آغا جعفر بھی بیٹھے ہوئے نظر آئے۔"



"اوہ گاڈ پھر تو آپ مزید نروس ہو گئے ہوں گے۔" اس منظر کا تصور کر کے جیسے ہمیں بھی گھبراہٹ سی محسوس ہوئی۔

"ارے آپ نروس ہونے کی بات کر رہی ہیں، میں تو تقریباً بے ہوش ہو رہا تھا۔ خیر میرا چھوٹا سا تعارف ہوا۔ ساحرہ کاظمی نے مجھے بیٹھنے کو کہا اور بولیں۔ "ہم لوگ ایک قسط پروڈکشن کر رہے ہیں جب تک آپ یہ سین پڑھ لیں۔" انہوں نے مجھے ایک اسکرپٹ تھما دیا۔ وہ سین ایک لڑکی کے ساتھ تھا جو بیٹھی ہوئی اسے پڑھ رہی تھی۔ چونکہ میں تھیٹر سے ہوں اور میری عادت تھی کہ میں اسکرپٹ پڑھتا نہیں بلکہ اسے یاد کر لیتا تھا سو اس دن بھی میں نے تھوڑی سی دیر میں اسکرپٹ یاد کر لیا۔ کچھ دیر بعد ساحرہ کاظمی نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے اسکرپٹ سے سین پڑھنے کو کہا۔"

"یا اللہ محبّ، اس وقت کیا حال ہو رہا تھا آپ کا؟ عدنان ذرا آپ بھی بتائیں کیونکہ آپ بھی وہاں موجود تھے۔" ہم نے سامنے بیٹھے ہوئے عدنان صدیقی سے پوچھا تو وہ ہنس دیے۔

"بہت ہی زیادہ نروس تھے یہ، گھبراہٹ سے برا حال تھا۔" عدنان کی بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے محبّ پھر اسی دن میں واپس لوٹ گئے۔

"جب ساحرہ نے مجھے اسکرپٹ پڑھنے کو کہا تو کمرے میں بیٹھے ہوئے سب لوگوں کے چہرے میری طرف مڑ گئے۔ میں کھڑا ہو گیا اپنی بے پناہ گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے بس میں نے صرف یہ سوچا کہ اس وقت کمرے میں کوئی نہیں ہے صرف میں اکیلا ہوں۔ میرے ساتھ کھڑی ہوئی لڑکی دیکھ کر پڑھ رہی تھی لیکن میں بغیر دیکھے زبانی اپنے ڈائیلاگ بولتا چلا گیا تب

ساحرہ کاظمی نے بے اختیار میز پر زور سے ہاتھ مارا اور عدنان کی طرف دیکھتے ہوئے بے ساختہ بولیں۔

''عدنان ایسے کرتے ہیں reading '' ہمارے ساتھ عدنان بھی بے ساختہ ہنس دیے۔

''ہاں یار اس دن تم نے ہم سب کو اپنی پرفارمنس سے بہت امپریس کردیا تھا۔'' عدنان صدیقی کا کمنٹ مسکرا کر سنتے ہوئے محبت نے کہانی کو آگے بڑھایا۔

''ساحرہ کاظمی کے اس ڈرامے کا نام زیب النسا تھا جس میں عدنان صدیقی ہیرو تھے اور ندا کاظمی ہیروئن...... مجھے اس میں ندا کے بہنوئی کا کردار دیا گیا تھا۔ اس کے بعد میرے ایک کے بعد ایک ڈرامے آتے گئے۔ جس میں ایک بڑا سیریل ہم سفر (پرانا والا) مجھے عدنان صدیقی کی وجہ سے ملا۔'' محبت کی بات پر عدنان جو شاٹ دینے کے لیے دروازے تک پہنچ چکے تھے بے اختیار مڑے۔

''ارے نہیں یار، اس میں تمہارے زبردست ٹیلنٹ کا دخل تھا۔'' انہوں نے محبت سے محبت کو ٹوکا۔

''نہیں، یہ حقیقت ہے کہ پہلے دن سے یہ میرے ساتھ ہیں اور اب بھی on and off یہ میرے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کی وجہ سے مجھے اس فیلڈ میں ہمیشہ بہت تسلی اور تقویت رہی ہے۔'' محبت نے بہت خلوص سے اعتراف کیا۔

'' ارے زیادہ تعریف مت کرو لوگ جل جائیں گے۔'' عدنان نے مسکراتے ہوئے براہ راست ہم پر چوٹ کی اس سے پہلے کہ ہم کوئی جواب دیتے وہ باہر نکل گئے۔

'' اچھا محبت اس فیلڈ میں آپ کو demotivate کرنے والے لوگ بھی ملے؟'' ہمارے سوال پر ان کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔

''ہاں بہت ملے لیکن میں انہیں یاد نہیں رکھنا چاہتا کیونکہ مجھے اپنے اوپر یقین تھا اس لیے ایسے لوگ میری ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن پائے۔'' محبت کا اپنے اوپر یقین اور اعتماد ان کی پرسنالٹی میں ہمیں سب سے زیادہ اچھا لگا۔

''اچھا محبت آپ اتنی ینگ ایج میں شوبز کی اس رنگین دنیا میں آئے جہاں آپ کا کافی حسن کے جلوؤں سے واسطہ پڑا ہوگا کبھی ایمان متزلزل ہوا؟'' ہمارا سوال تھوڑا سا کڑوا ضرور تھا لیکن یہ افسانہ اس ذکر کے بغیر کچھ ادھورا سا بھی تو رہ جاتا۔ محبت کے پر اعتماد چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

''بالکل جناب، بہت سے خوب صورت چہروں نے مجھے اپنی طرف راغب کیا۔ دوستی بھی ہوئی لیکن جلد ہی مجھے احساس ہوجاتا تھا کہ ہماری پرسنالٹی ہمارے خیالات ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہیں جسے میرا ذہن، میرا دل قبول کرتا ایسی شخصیت ابھی تک مجھے نہیں ملی تھی لیکن پھر......'' ہم نے بے اختیار محبت کی بات درمیان میں کاٹ دی۔

''اوہو یعنی افسانے میں ہیروئن کی انٹری ہو ہی گئی۔'' محبت نے ہنستے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اسی اثنا میں عدنان صدیقی بھی آکر بیٹھ گئے تھے اور ان کے علاوہ یاسمین رضا اور پروڈکشن کے کچھ اور لوگ بھی افسانے کے اس دلچسپ موڑ کو پوری توجہ سے سن رہے تھے۔

''یہ اس وقت کی بات ہے جب میں بچے من کے سچے شوٹ کررہا تھا۔ اس میں ایک نئی ڈائریکٹر اپائنٹ ہوئی جو امریکا سے فلم میکنگ کی ڈگری لے کر آئی تھی اور انہوں نے اس شو کو جو کافی پرابلم سے گزر رہا تھا ٹھیک کرنا تھا اور ہوسٹ کو بھی ڈائریکٹ کرنا تھا چاہے وہ وارڈ روب کا معاملہ ہو، بات کرنے کا انداز ہو یا بچوں سے انوالومنٹ شو کرنے کا طریقہ سب کچھ انہیں ٹھیک کرنا تھا اور میں جو اس پروگرام کا ہوسٹ تھا مجھ سے ان ڈائریکٹر صاحبہ کا رعب برداشت نہیں ہورہا تھا۔ میں کپڑے اپنے اسٹائل سے پہننا چاہتا لیکن محترمہ کا آرڈر کچھ اور ہوتا۔ مجھے سخت الجھن ہوتی غصہ آتا لیکن ڈائریکٹر صاحبہ کو اپنی ہی کرنی ہوتی تھی۔''

''اور یہ خفگی آہستہ آہستہ پسندیدگی میں بدل گئی؟'' ہم نے شرارت بھرے لہجے میں بات کاٹی۔

''ہاں، یہ کافی عرصہ hate love کی یہ ریلیشن شپ ہمارے درمیان چلتی رہی۔ 70,65 قسطوں کے بعد ایک دن میں نے بالکل اچانک آمنہ سے کہا۔ مجھ سے شادی کرلو۔'' محبت نے بہت مزے سے بتایا۔

''ارے، تم نے ڈائریکٹ آمنہ سے یہ کہہ دیا تھا۔'' ہمارے کچھ کہنے سے قبل عدنان صدیقی نے بہت حیرانی سے پوچھا۔

''یعنی کہ کافی بہادری کا ثبوت دیا آپ نے۔'' ہم نے بھی امپریس ہوکر محبت کو دیکھا۔

''ارے جناب آمنہ کا جواب تو اس سے بھی زیادہ جی دار تھا۔ عام لڑکیوں کی طرح شرمانے یا گھبرانے کے بجائے اس نے صرف یہ جملہ کہا کہ اگر مجھ سے شادی کرنی ہے تو میرے باپ سے مل لو۔''

''بھئی کیا انوکھے انداز تھے آپ دونوں کے۔'' ہم بے ساختہ ہنس دیے۔ ''پھر آپ کیسے ملے اپنے ہونے والے سسر سے؟''

''بس یہ بھی ایک کہانی ہے، اس وقت جب میں نے آمنہ کو پروپوز کیا۔ ہمارا شو بچے من کے سچے highest rated show تھا۔ میں نے آمنہ کے فادر کو پہلے فون کیا اپنا انٹروڈکشن کرایا تو جواباً انہوں نے مجھے اپنے آفس بلالیا۔''

''اوہ گاڈ، بالکل فلمی سچویشن!'' ہم نے بہت ایکسائٹڈ ہوکر محبت کو دیکھا۔

''بالکل جناب اور صرف پہلی ملاقات میں معاملہ سیٹ نہیں ہوا۔ ڈھائی ڈھائی گھنٹوں کی پانچ ملاقاتیں کیں انہوں نے اور وہ بھی آفس میں۔ ہر طریقے سے تول لیا تب جا کر ہاں کی۔''

''بہت strict انسان لگ رہے ہیں تمہارے سسر۔'' عدنان صدیقی نے حیران ہوکر محبت سے کہا تو وہ ہنس دیے۔

''ہاں، بہت ہی سخت...... اتنے کہ پانچ سٹنگ کے بعد بھی مطمئن نہیں لگ رہے تھے مجھ سے کہا کہ اگر شادی کرنی ہے تو ڈیڑھ ماہ کے اندر اندر کرنی ہوگی، میں نے بھی فوراً جواب دیا کہ ٹھیک ہے ایسا ہی ہوگا۔''

''ارے باپ رے بہت فوجی ٹائپ کے سسر سے واسطہ پڑا تھا آپ کا۔'' ہمارے ہمدرد لہجے پر محبت نے مسکرا کر صفائی دی۔

''ہاں لیکن اب تو بہت شدید دوست ہیں میرے۔''

''شدید دوست......؟'' ہم محبت کی اس نئی اصطلاح پر بے ساختہ ہنس دیے۔

''جی ہاں، اتنے شدید کہ ہر بات وہ مجھ سے شیئر کرتے ہیں یہاں تک کہ آمنہ کو اگر کچھ خاص کہنا ہو تو وہ ڈائریکٹ اپنے ابا سے بات کرنے کے بجائے مجھ سے سفارش کرواتی ہے۔''

''اوہ، یعنی آپ نے اتنے زبردست طریقے سے دل جیت لیا ہے ان کا لیکن کیا آپ کی ساس سے آپ کا کوئی انٹرویو نہیں ہوا تھا۔'' یہ سوال بھی ہمارے نزدیک اہم تھا۔

''بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے۔'' محبت مسکرائے۔

''ان سے بھی میری کافی طویل ملاقات ہوئی۔ مجھ سے تو کچھ نہیں کہا لیکن آمنہ کو بتایا کہ مجھے محبت پسند آیا ہے۔'' محبت کے اس جواب پر بھی ایک سوال اور ہمارے ذہن میں کھٹک رہا تھا۔

''محبت آپ کے امی، ابو کو بھی تو شاید کوئی اعتراض ہوا ہو؟''

''نہیں، مجھے انہیں منانے میں کوئی خاص دقت نہیں پیش آئی تھی۔ ویسے بھی میں ان کا بہت لاڈلا اور چہیتا بیٹا ہوں اور وہ بچپن سے ہی میری ہر ضد پوری کرتے آئے تھے۔'' محبت نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

''یعنی کہ بچپن سے ہی آپ نے ان لوگوں کو اپنی بات منوانے کی عادت ڈلوادی۔'' ہم نے ہنستے ہوئے محبت کو دیکھا۔ ''اچھا جناب اب شادی کے بعد

آپ کی کہانی ایک اور خوب صورت موڑ پر آگئی ہے۔ کیسا لگا آپ کو یہ موڑ؟'' ہماری بات پر محبّ کی آنکھوں کی چمک مزید بڑھ گئی۔

''بہت خوب صورت، بہت اچھا موڑ ہے یہ میری زندگی کا۔ آمنہ بہت محبت اور خیال کرنے والی زندگی کی ہم سفر ہے۔ ہم دونوں میں بہت انڈر اسٹینڈنگ ہے۔''

''آپ دونوں ہی شوبز کے بہت معروف اور مصروف آرٹسٹ ہیں، اس سے آپ کی فیملی لائف پر کوئی اثر تو نہیں پڑتا اور آپ لوگ جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہتے ہیں تو آپ کی امی، ابو کا آپ لوگوں کی اس بزی لائف پر کیا ردِعمل ہوتا ہے؟'' ہم نے ان دو سوالوں میں جیسے اس افسانے کو کافی آگے بڑھانا چاہا۔

''یہ فیکٹ ہے کہ ہم دونوں اتنے بزی رہتے ہیں کہ بہت کم ملاقات ہو پاتی ہے لیکن ان دوریوں میں بھی نزدیکیاں رہتی ہیں۔ ایک دوسرے کو لگاتار میسج کرتے رہتے ہیں۔ رات کو جب ہم لوگ ملتے ہیں تو جب تک ایک دوسرے سے سارے دن کی مصروفیات اور دوسری مختلف باتیں ڈسکس نہ کریں ہم سوتے نہیں ہیں چاہے کام کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو ہم ایک دوسرے سے کبھی لاتعلق نہیں رہتے اور رہی بات میرے والدین کی تو میرے ماں، باپ بہت ہی عظیم لوگ ہیں۔ انہوں نے بچپن سے لے کر اب تک ہر قدم پر میری حوصلہ افزائی کی۔ انہوں نے کبھی ہم لوگوں کی بزی لائف کو ایشو نہیں بنایا۔ میری امی بیوٹیشن ہیں۔ وہ خود بھی بہت بزی رہتی ہیں بلکہ اکثر آمنہ کو کہیں جلدی میں جانا ہو تو اس کا ہیر اسٹائل وغیرہ بھی بنا دیتی ہیں اور جب کبھی آمنہ کو ٹائم ملتا ہے تو وہ امی سے سر میں تیل بھی لگواتی ہے۔ دونوں ساس، بہو کی ریلیشن شپ بہت ہی اچھی ہے۔'' جب محبّ بڑے جذب سے یہ باتیں بتا رہے تھے تو ہمیں ان کے چہرے پر بکھری سچائی اور خوشی صاف محسوس ہو رہی تھی۔

''محبّ ہماری آپ کی امی سے ایک فنکشن میں ملاقات ہوئی تھی تو وہ بھی آمنہ کی بہت تعریف کر رہی تھیں۔ وہ بتا رہی تھیں کہ انہوں نے ہمیشہ ایک تاکید کی آپ لوگوں کو کہ جب بھی باہر جائیں انہیں بتا کر اور خدا حافظ کہہ کر جائیں اور آپ تو خیر ہمیشہ سے ہی اس پر عمل کرتے آئے ہیں لیکن آمنہ نے بھی آ کر اس بات کو ہمیشہ یاد رکھا ہے اگر وہ کبھی بہت سویرے جلدی میں گھر سے جاتی ہے تو راستے سے انہیں فون ضرور کر کے خدا حافظ کہتی ہے اس کے علاوہ بھی وہ اپنی بہو کی بہت سی اچھی عادتوں کا ذکر بہت پیار سے کر رہی تھیں۔ محبّ آپ کے اور آمنہ کے درمیان اگر کوئی کھٹ پٹ ہو جائے تو آپ کی امی کس کا ساتھ دیتی ہیں؟'' ہم نے ان کی امی کا ذکر کرتے ہوئے یہ سوال بھی کر ڈالا۔

''دیکھیں جناب، ہماری کھٹ پٹ یا ناراضی صرف ہمارے کمرے تک ہی محدود رہتی ہے۔ اسے ہم باہر نہیں جانے دیتے۔ اس لیے امی کو کوئی پرابلم پیش نہیں آتی۔ ویسے بھی ہماری لڑائی بہت دیر تک نہیں چلتی۔ لڑائی میں لاؤڈ میں ہی ہوتا ہوں۔ آمنہ ایسے موقع پر خاموش ہو جاتی ہے لیکن ہم زیادہ دیر ایک دوسرے سے خفا نہیں رہتے۔ فاصلے بڑھنے سے پہلے ہی ختم کر دیتے ہیں اور اسی میں زندگی کا حُسن ہے۔ ہماری شادی کو سات سال ہو رہے ہیں اور وقت کے ساتھ ہم ایک دوسرے کو زیادہ سمجھنے لگے ہیں۔'' محبّ نے بہت تفصیل سے جواب دیا۔

''محبّ ان سات سالوں میں کبھی آمنہ نے آپ کو کسی ہیروئن کے ساتھ کچھ زیادہ ہی رومینٹک سین کرتے ہوئے جیلسی کا اظہار کیا کیونکہ ایک آدھ ڈرامے میں آپ ہیروئنز کے ساتھ کافی رومینٹک ہوتے نظر آئے ہیں۔'' ہم نے اپنے حساب سے بہت چبھتا ہوا سوال کیا تھا لیکن محبّ کو تو جیسے وہ مٹھائی کے مانند لگا۔

''لیں، آپ جیلسی کی بات کر رہی ہیں، وہ تو الٹا مجھ پر تنقید کرتی ہے کہ آپ نے وہ سین ٹھیک طرح سے نہیں کیے۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ آپ رومینٹک سین

کر رہے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ...... ویسے بھی اس کو پتا ہے کہ شوٹنگ کے وقت آپ کے چاروں طرف کتنے بے شمار لوگ ہوتے ہیں ایسے میں بھلا کسی کے دل میں کوئی فیلنگ تھوڑی آسکتی ہیں۔ بس سارا دھیان سین اور ایکٹنگ پر ہی ہوتا ہے۔'' محبّ کی اس بات کو ہم نے دل سے تسلیم کر لیا کیونکہ اس وقت بھی جو شوٹنگ ہو رہی تھی وہ کسی مرحلے سے کم نہیں تھی۔ سخت گرمی میں عدنان صدیقی اور عالیشہ طور کا سین شوٹ ہو رہا تھا۔

''محبّ آپ تو خیر موسٹ فیورٹ ایکٹر ہیں لیکن آمنہ نے بھی تیزی سے شہرت کی بلندیوں کو چھوا ہے وہ حیران کُن ہے۔ ٹی وی اسکرین کی سمیتا پاٹیل اور شبانہ اعظمیٰ بن گئی ہیں وہ تو۔ کہیں آپ ابھیمان کے امیتابھ تو نہیں بن جائیں گے۔'' ہمارے شرارت بھرے سوال پر وہ ہنس دیے۔

''دیکھیں جی، ایز این ایکٹر آج وہ جس مقام پر کھڑی ہے اس میں میری فل سپورٹ اور حوصلہ افزائی کا بھی بہت دخل ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ اس کے اندر ٹیلنٹ کا خزانہ بھی چُھپا ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ اتنی اوپر پہنچی ہے۔ شادی کے ڈیڑھ دو سال بعد جبکہ ماڈلنگ میں اس کا بہت نام ہو چکا تھا اور بڑے بڑے فیشن میگزین اور فیشن ڈیزائنرز کے لیے وہ ماڈلنگ کر رہی تھی تب پتا نہیں کیسے آہستہ آہستہ اس کا انٹرسٹ ایکٹنگ کی طرف ہونے لگا۔ وہ اکثر میرے ساتھ بیٹھ کر اسکرپٹ پڑھا کرتی، میں نے اس طرف اس کا رجحان دیکھ کر اس کی حوصلہ افزائی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ میں چونکہ پانچ چھ سال پہلے ہی سے اس فیلڈ میں تھا اس لیے میری گائڈینس بھی اس کے بہت کام آئی اور یوں اس کا زبردست ٹیلنٹ شادی کے بعد ہی اُبھر کر سب کے سامنے آیا۔ اس لیے ابھیمان فلم کا میری کہانی سے کوئی تعلق نہیں۔'' محبّ کے جواب کو ہم نے فوراً تسلیم کر لیا۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ دونوں ہی ماشاءاللہ اتنے زبردست فنکار ہیں کہ مقابلہ مشکل ہے کہ

کون زیادہ اچھا ہے۔" ہماری بات پر سب ہنس پڑے۔ ابھی ہم لوگ آمنہ کے بارے میں بات کر ہی رہے تھے کہ عدنان صدیقی شوٹ کروا کر پسینہ، پونچھتے ہوئے وہیں آ کر بیٹھ گئے اور گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے بولے۔

"مات سیریل میں آمنہ نے میرے ساتھ کام کیا تھا، اس کا رول سمپل تھا لیکن جہاں جہاں اس کو موقع ملا اس نے بتایا کہ وہ کیا ہے۔"

دوستوں ہمارے پاس صفحات کم ہیں اور باتیں بہت زیادہ...... جس میں محبّ اور آمنہ کی کامیابیوں کی بہت لمبی کہانی چھپی ہوئی ہے جنہیں آپ ان کے مختلف انٹرویوز میں یقیناً پڑھ چکے ہوں گے لیکن چونکہ یہ سلسلہ افسانوی انداز لیے ہوتا ہے اور ہمیں اس خوب صورت کپل کے اس دلکش افسانے کو اختتام تک لے جانا تھا۔ کچھ سوالات اب بھی ہمارے ذہن میں تھے۔

"محبّ جوائنٹ فیملی سسٹم میں ساس، بہو، نند بھاوج کے رشتے کبھی کبھی تناؤ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ذرا اس معاملے کو بھی آپ کے افسانے میں شامل کر لیتے ہیں۔"

"اللہ کا بہت شکر ہے کہ ہمارے گھر کا ماحول بہت پُر سکون ہے۔ روایتی جھگڑوں اور سیاست سے بالکل پاک۔ آمنہ کی میری بہن سے بہت اچھی دوستی ہے۔ میری بہن شکاگو میں اپنے شوہر کے ساتھ رہتی ہیں اور انشاء اللہ جب ہم لوگ امریکا جائیں گے تو ایوارڈ کی تقریب کے بعد اس کے پاس جا کر کم از کم ایک ہفتہ رکیں گے اور رہی بات ساس بہو کی تو میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ دونوں ایک دوسرے کی دوست ہیں۔ ہو سکتا ہے کبھی کچھ ہلکا پھلکا تناؤ ہوتا بھی ہو تو مجھ تک نہیں پہنچتا خود ہی حل کر لیا جاتا ہے۔ ماشاءاللہ سے بہت خوشگوار ماحول رہتا ہے ہمارے گھر کا اور اس کا کریڈٹ امی اور آمنہ دونوں کو جاتا ہے۔" محبّ بالکل ٹھیک کہہ رہے تھے گھر کے ماحول کو پُر سکون بنانے میں مردوں سے زیادہ عورتوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔

"اچھا محبّ آخر میں یہ بتائیں کہ اپنی فیملی کو کب تک بڑھانے کا ارادہ ہے اور کیا آپ کے والدین عام ماں باپ کی طرح آپ لوگوں پر اس بات کے لیے پریشر ڈالتے ہیں؟" محبّ ہمارے اس سوال پر بے اختیار مسکرا دیے۔

"ابھی تک ہم لوگ صرف اپنے کیریئر پر توجہ دے رہے تھے لیکن اب سیریسلی سوچ رہے ہیں اور جیسا کہ میں نے کہا میرے امی، ابو بے حد عظیم لوگ ہیں انہوں نے آج تک کبھی ہم پر کوئی پریشر نہیں ڈالا حالانکہ ان کا دل چاہتا ہوگا یا لوگ ان سے پوچھتے ہوں گے لیکن میرے ماں باپ ان لوگوں میں سے ہیں جو اپنے بچوں کو اپنی زندگی جینے دیتے ہیں۔ ہاں کبھی کبھی میرے ابو ہمارے کمرے میں بچے کی خوب صورت سی تصویر یا کوئی کھلونا رکھ کر ایک خوب صورت سا خاموش اظہار کر دیتے ہیں اور میں جواباً ان سے کہتا ہوں۔ "ہاں ہاں ابو میں سمجھ گیا ہوں۔" محبّ نے اتنے مزے سے کہا کہ کمرے میں بے اختیار ہنسی بکھر گئی۔ اب محبّ کو ڈائریکٹر صاحب شوٹ کے لیے بلا رہے تھے اور ہمیں اللہ کے فضل سے ان سے باتیں کرنے کا بہت اچھا وقت مل گیا تھا سو ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔

قارئین: ہمیں امید ہے کہ آپ کو محبّ اور آمنہ کی یہ پیاری سی کہانی پسند آئی ہوگی ارے ہاں ابھی ابھی ہمیں ایک بہت زبردست نیوز ملی ہے کہ جس انٹرنیشنل فلم فیسٹیول کے لیے یہ دونوں امریکا گئے تھے اس میں آمنہ کو بیسٹ ایکٹریس اور ان کی فلم "لمحہ" کو بیسٹ فلم کا ایوارڈ ملا ہے۔ پوری دنیا سے تقریباً بیس ممالک ایوارڈ کی اس دوڑ میں شامل تھے۔ آمنہ کی ایکٹنگ یقیناً ایسی ہی ہوگی کہ اس نے اتنے سارے ممالک کی ہیروئنز کو شکست دے دی، اب اتنی خوب صورت فلم کو دیکھنا ہم سب کا فرض تو بنتا ہی ہے ناں تو جناب اس ہیپی اینڈ کے ساتھ ہم اس افسانے کو ختم کرتے ہیں۔

شادی شدہ بیٹی کی زندگی میں ماں کی مداخلت اور کردار

شائستہ زرّیں

ماں بیٹی کا بندھن بھی عجب ہے جو کہے بنا ایک دوسرے کی بات سن بھی لیتی ہیں اور سمجھ بھی لیتی ہیں...... باہمی دکھ سکھ ان کے دلوں میں الہام کی صورت اترتے ہیں، اکثر بیٹیاں اپنی ماؤں سے اس درجہ قریب اور متاثر ہوتی ہیں کہ لاشعوری طور پر ان کے نقشِ قدم پر چلتی ہیں گویا بیٹیوں کی زندگی کے بگاڑ اور سدھار میں جہاں ان کی اپنی فطرت، مزاج، اخلاق اور عادات کا دخل ہوتا ہے وہاں ماں کی تربیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو اس ضمن میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

جب بیٹی ایک نئی زندگی کے سفر کا آغاز کرتی ہے تو ماں کی تربیت تو بیٹی کے ساتھ ساتھ سفر کرتی ہے لیکن ماں کی ذمّے داری کم ہو جاتی ہے مگر بیٹیوں کی اندھی محبت میں گرفتار ماؤں کی ذمّے داری کئی گنا بڑھ جاتی ہے کیونکہ وہ بیٹیوں کی رخصتی کے بعد بھی ان پر مسلط رہتی ہیں۔ بعض ماؤں کا تو بس نہیں چلتا کہ اپنے نادر مشوروں سے نوازنے کے لیے بیٹی کی سسرال ہی میں ڈیرا ڈال لیں یوں ہر خبر پر پل پل ان کی نظر رہے گی تو بیٹی کو "سمجھانے" میں بھی سہولت رہے گی۔ یہ ماں کی محبت نہیں بلکہ وہ نادان دوستی ہے جس کا "خمیازہ" ان کی لاڈلی بیٹی کو بھگتنا پڑتا ہے، المیہ یہ ہے کہ اب ہمارے معاشرے میں شادی شدہ بیٹی کی زندگی میں ماں کا غیر ضروری عمل دخل بہت بڑھتا جا رہا ہے اور ماں کی اس "دانشمندی" سے گھر ٹوٹنے کے افسوسناک واقعات میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ بیٹی کو تحفظ دینے کی خواہش میں ماں خود اپنے ہاتھوں اسے عدم تحفظ کا شکار بنا دیتی ہے۔ بیٹی کی شادی کے بعد ماں سے اس کا رشتہ ہرگز ختم نہیں ہوتا اور نہ ہی ماں کی تربیت کا عمل رک جاتا ہے۔ شادی شدہ بیٹی کی زندگی میں ماں کا ایسا عمل دخل ضروری ہے جس سے بیٹی کا گھر حقیقی خوشیوں اور تعلق کی پائیداری کے ساتھ آباد رہے۔

ان امور کے پیشِ نظر ہم نے ماؤں اور بیٹیوں دونوں سے معلوم کیا کہ شادی شدہ بیٹیوں کی زندگی میں ماں کا کتنا عمل دخل ہوتا ہے اور اس ضمن میں ماں کا اصل کردار کیا ہونا چاہیے؟

ڈاکٹر فریدہ احمد

بانی و وائس چانسلر اسلامک مشنری یونیورسٹی، ممبر قومی اسمبلی

بچوں بالخصوص بیٹی کی زندگی کے ہر موڑ پر اس کو بنانے اور سنوارنے میں ماں کا کردار بہت اہم ہوتا ہے۔ ماں کی تربیت کا عمل کبھی ختم نہیں ہوتا وہ شادی کے بعد بھی بیٹی کو مشورے دیتی ہے، سمجھاتی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ شادی شدہ بیٹی کی زندگی میں ماؤں کو بے جا مداخلت ہرگز نہیں کرنی چاہیے بلکہ انہیں وہ اعتماد دینا چاہیے کہ وہ سمجھداری اور خوش اسلوبی سے اپنے معاملات خود طے کریں۔ یہ ان کے حق میں زیادہ بہتر ہے اگر اس کے باوجود بھی ضرورت پڑے تو ماں کو اپنا کردار مثبت طریقے سے



ڈاکٹر فریدہ احمد

ادا کرنا چاہیے۔ ایسے موقع پر بیٹی کو صبر، شکر، قناعت اور توکل کا درس دینا چاہیے اس سے بگڑے معاملات سنور جاتے ہیں۔ جو مائیں ایسے موقع پر اپنی بیٹیوں کو اکساتی ہیں تو طلاق تک نوبت آجاتی ہے، بدقسمتی سے آج کل ہمارے معاشرے میں جو طلاق کی شرح میں اضافہ ہو رہا ہے اس کی ایک بڑی وجہ شادی شدہ بیٹیوں کی زندگی میں ماؤں کی بلا جواز مداخلت ہے۔

میری ایک بیٹی اور دو بیٹے ہیں، میں نے جہاں بیٹی کو بہت لاڈ پیار دیا وہاں اس کے ذہن میں شروع ہی سے یہ بات بٹھادی کہ شادی کے بعد کبھی لڑ کر والدین کے گھر نہیں آنا۔ میری اکلوتی بیٹی چھوٹے کنبے سے بیاہ کر بڑے کنبے میں گئی...... رخصتی سے قبل میں نے اس سے کہا تھا کہ تم بہت اکیلی تھیں ناں اللہ نے تمہارے لیے کتنا اچھا کر دیا سسرال میں ماشاء اللہ تمہیں آٹھ بہنیں (نندیں) مل جائیں گی۔ میری بیٹی ماشاء اللہ سسرال میں ..... ہر دلعزیز ہے۔ سب کے ساتھ مل جل کر رہتی ہے وہ لوگ بھی اس سے بہت محبت کرتے ہیں اور سمیعہ بھی اتنی بہنیں پا کر بہت خوش ہے۔ اگر میں اپنی بیٹی کو منفی سوچ دیتی، اس کی سسرال کے معاملات میں بے جا مداخلت کرتی تو صورتِ حال مختلف ہوتی، ماشاء اللہ، میری بیٹی کی شادی کو اٹھارہ سال ہو گئے ہیں وہ بہت پُرسکون اور خوش و خرم زندگی بسر کر رہی ہے اللہ اسے ہمیشہ شاد و آباد رکھے (آمین)

بشریٰ رحمٰن

ادیبہ، ممبر قومی اسمبلی

میرا خیال اور ذاتی تجربہ یہی ہے کہ ایک لڑکی کی تربیت میں اس کی پیدائش سے لے کر اور اس کے گھر بسانے تک اس کی اپنی ماں کا 90% حصہ ہوتا ہے۔ بچپن ہی سے بچیوں کی کردار سازی پر زور دیں، ان کی تربیت ایسی کرنی چاہیے کہ شروع ہی سے انہیں یہ احساس دلائیں کہ انہیں دوسرے گھر جانا ہے، سسرال میں جگہ بنانے اور دل جیتنے کے لیے بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔ شوہر اور سسرال والوں کو خوش رکھنے اور اچھی بہو بننے کی اسے تعلیم دیں۔ جب بیٹی بیاہ کر سسرال جاتی ہے تو وہ بالکل الگ ماحول



بشریٰ رحمٰن

میں جاتی ہے کوئی لڑکی ایسی نہیں کہ جسے سسرال میں مسائل نہ ہوں، ایسے میں ماں کا کردار اور بھی اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ اگر بیٹی ذرا ذرا سی بات پر ماں سے شکایت لگائے گی تو ماں جو پہلے ہی بیٹی کے معاملے میں بہت جذباتی ہوتی ہے، بددل ہو جاتی ہے۔ بیٹی جذبات میں آ کر غلط فیصلے کرتی ہے تو ماں اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہے، سسرال سے الگ رہنے کی ترغیب دیتی ہے کہ تم بچوں کو لے کر ہمارے گھر آجاؤ، دفع کرو، لعنت بھیجو وغیرہ وغیرہ ایسے میں بیٹی جو پہلے ہی سسرال والوں کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی وہ ماں کی شہ پا کر سسرال سے الگ رہنے کی ضد کرتی ہے۔ لڑکا تو اپنے ماں باپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہے اسی ضد بحث میں بات اتنی بڑھتی ہے کہ معاملہ طلاق پر جا کر ختم ہوتا ہے لیکن ایسی مائیں بھی ہیں کہ بیٹی جب شوہر اور سسرال والوں کی شکایت ماں سے کرتی ہے تو وہ اسے سمجھاتی ہیں کہ ”بیٹا! تم سے زیادہ مسائل ہمیں پیش آئے تھے ہم نے ان مسائل کے ساتھ زندگی گزاری اور کامیاب رہے، تم بھی اپنے گھر کے تمام مسائل وہاں رہتے ہوئے خود حل کرنے کی کوشش کرو“۔ جب ماں بیٹی کی حوصلہ شکنی کرتی ہے تو وہ دوبارہ ماں سے شکایت نہیں کرتی۔

میرا مشاہدہ یہی ہے کہ 65% گھر لڑکی کی ماں کی وجہ سے اور 35 فیصد لڑکے کی ماں کی وجہ سے برباد ہوتے ہیں چونکہ بیٹی کی پیدائش سے لے کر اس کی تربیت شروع کرنے کے عمل سے اس کی شادی تک اس کی ماں کا کردار بہت اہم ہوتا ہے کیونکہ ایک وقت آتا ہے جب لڑکی خود اپنی ماں بن جاتی ہے خواہ یہ کسی بھی عمر میں ہو وہ یہ محسوس کرتی ہے کہ شعوری و لاشعوری طور پر میں وہی تو کر رہی ہوں جو میری ماں کرتی چلی آ رہی ہے۔ سو ماں کو چاہیے کہ اپنا اچھا اور خوب صورت روپ لڑکی کے اندر ڈالیں تاکہ وہی بیٹی جب کل ماں بن کر اپنی بیٹی کی تربیت کرے اور اسے مشورے سے نوازے تو مثبت سوچ کے ساتھ...... یوں بھی دنیا بھر میں کوئی بھی مقام ایثار و قربانی کے بغیر کوئی عورت حاصل کر سکتی ہے نہ مرد۔ شادی شدہ زندگی میں لڑکی کو اپنا گھر بنانے اور بچوں کی خاطر بہت ایثار کرنا پڑتا ہے اور یہ تربیت بیٹی ماں ہی سے حاصل کرتی ہے۔

ممتاز قریشی

سیاستداں، سماجی رہنما

شادی شدہ بیٹیوں کی زندگی میں ماؤں کا عمل دخل آج کل بہت بڑھ گیا ہے ہر چھوٹی چھوٹی بات میں مائیں اپنے گھر کے لحاظ سے بیٹیوں کو مشورے دیتی ہیں کہ ہمارے گھر کا یہ رواج ہے تو تم بھی ایسا ہی کرو یہ نہیں سوچتیں لڑکی جس گھر میں بیاہ کر گئی ہے وہاں کے کیا رسم و رواج ہیں کہ بیٹی کو اب اسی گھر میں رہنا ہے۔ ماں اگر سمجھدار ہے تو وہ بیٹی کو اچھے مشورے دے گی۔ میکے کے رسم و رواج بھلا کر سسرال کے رسم و رواج اپنانے کی تلقین کرے گی



ممتاز قریشی

کہ اب تمہیں اسی گھر میں بسنا ہے اور ان ہی کو اپنانا ہے لیکن کیا کیا جائے ان ماؤں کا جو خود اپنے گھر میں بھی حکومت کر رہی ہیں، بہوؤں اور بیٹوں پر بھی ان کی حکمرانی ہے اور بیٹی' داماد پر بھی حکومت کرنا چاہتی ہیں اور اسی کشمکش میں بعض اوقات نوبت طلاق تک آجاتی ہے اور ہمارے معاشرے میں طلاق کی بڑھتی ہوئی شرح کا ذمے دار...... میں ایسی ہی عاقبت نا اندیش ماؤں کو سمجھتی ہوں۔ اگر ماں سمجھدار ہوگی تو وہ اپنی بیٹی کو ایسی نصیحتیں کرے گی جس پر عمل کر کے وہ اپنے گھر میں بسی رہے۔ اس لیے میں ان لڑکیوں کی ماؤں سے جو لڑکوں کی مائیں بھی ہیں، کہتی ہوں کہ جو غلط تربیت اور مشورے آپ اپنی بیٹی کو دے رہی ہیں اگر ایسا آپ کی بہو کی ماں بھی کرے تو گھر کا ماحول کیا ہوگا؟ میں ایسی تمام خواتین سے جو شادی شدہ بیٹیوں کے معاملات اور زندگی میں مداخلتِ بے جا سے زہر گھول رہی ہیں پُر زور اپیل اور التجا کرتی ہوں کہ اپنی بیٹیوں کی زندگی میں اپنا عمل دخل بند کر کے ان کو ان کے اپنے گھر کے حساب سے چلنے دیں اگر لڑکی سسرال والوں کی یا شوہر کے کسی رویے کی شکایت کرے یا اسے کوئی تکلیف ہو تو ماں کا فرض ہے کہ اسے سمجھائے کہ سمجھداری سے یہ مسئلہ حل کرے اور برداشت سے کام لے نہیں تو اس کا گھر بگڑے گا اور ان کی بیٹیوں کی ہنستی بستی زندگی محض ان کی دخل اندازی کی وجہ سے غم والم میں بدل جائے گی جو بہت دکھ اور افسوس کی بات ہے۔

غزالہ یاسمین

سابقہ اناؤنسر پی ٹی وی کراچی سینٹر

بیٹی کی شادی کے بعد ماں کی محبتیں بھی وہی رہتی ہیں سمجھانے کا عمل بھی وہی رہتا ہے لیکن شدت میں کمی آنی چاہیے تا کہ بیٹی اپنے حالات کے مطابق اپنی زندگی میں تبدیلی لا سکے، سچ یہ ہے کہ ماؤں کا عمل دخل بہت ہوتا ہے۔ جب بیٹی بیاہ کر دوسرے گھر جاتی ہے تو ماحول اور لوگ مختلف ہوتے ہیں۔ میکے میں اگر پندرہ لوگ ہیں تو وہ ان کے مزاج اور عادات سے بچپن ہی سے واقف ہوتی ہے جبکہ سسرال میں موجود پانچ لوگوں کو بھی سمجھنے میں وقت لیتی ہے۔ ایسے میں ماں کو چاہیے کہ بے جا مداخلت کے بجائے بیٹی کو سمجھائے کہ وہ اپنے شعور سے گھر میں نکھار اور سدھار لائے مگر خرابی نہ لائے یہاں تک تو عمل دخل درست ہے لیکن جہاں ماں بیٹی کی محبت میں یہ بھول جاتی ہے کہ اس کی مداخلت کے کتنے برے اثرات اس کی بیٹی کی زندگی پر مرتب ہوں گے وہاں وہ غلطی کر جاتی ہے۔ بعض مائیں یہ نا سمجھی بھی کر جاتی ہیں کہ اِدھر بیٹی نے سسرال کی کوئی بات



غزالہ یاسمین

ماں سے کہی اُدھر ماں نے ایک اجلاس بلا لیا اور اس پر باہم تبصرے شروع ہو گئے اس سے معمولی بات بھی گمبھیر ہو جاتی ہے۔ ماں سمجھداری سے مداخلت کر کے بات ختم بھی تو کر سکتی ہے۔ بیٹی میں بھی تحمل ہونا چاہیے، شادی کے بعد بیٹی اپنے گھر کے ہر معاملے

میں ماں کو انوالو نہ کرے اس سے بنتی بات بھی بگڑ جاتی ہے۔

زبیدہ طارق

ماہر پکوان

ماں کو چاہیے کہ بیٹی کی شادی کے بعد اس کی زندگی میں مداخلت نہ کرے، بیٹی سسرال میں اپنا نصیب لے کر جاتی ہے.... بعض مائیں بیٹی کے گھر کے معاملات میں اس حد تک دخل اندازی کرتی ہیں



زبیدہ طارق

کہ گھر میں کس کس چیز کی کمی ہے، غیرت مند شوہر یہ بے عزتی برداشت نہیں کر پاتے اس سے بیٹی اور داماد کے تعلقات خراب ہوتے ہیں اور کبھی کبھی بات بڑھ کر طلاق پر ختم ہوتی ہے اگر بیٹی کبھی ماں سے کسی شے کی کمی کا شکوہ کرے تو ماں کو اسے سمجھانا چاہیے کہ ماں، باپ کو تو جو دینا تھا وہ دے دیا اب وہ ہمیشہ تمہارا گھر تو نہیں چلائیں گے۔ جو تمہارا نصیب ہے تمہیں مل رہا ہے۔ اس پر اللہ کا شکر ادا کرو اور ذرا ذرا سی بات پر اپنا گھر خراب نہ کرو۔ ماں تو صرف دعائیں دے سکتی ہے۔

شاہانہ جاوید

صاحبزادی محسن بھوپالی

شادی شدہ لڑکیوں کی زندگی میں ماؤں کا عمل دخل بہت ہوتا ہے کیونکہ لڑکی نئے ماحول کو ایک دم قبول نہیں کرتی تو وہ اپنی ماں سے ہر بات شیئر کرتی ہے، اب یہ ماں کی عقلمندی ہے کہ وہ اس کو کیسے ہینڈل کرے کہ بیٹی نئی جگہ سیٹ ہو جائے۔ اچھی مائیں مثبت باتیں بیٹیوں کو سکھاتی ہیں اور عاقبت نا اندیش مائیں بچیوں کو اپنے گھر میں سیٹ ہی نہیں ہونے دیتیں...... اس وجہ سے ان کی بیٹیوں کا گھر خراب ہوتا ہے۔ میرے خیال میں ماں کو اپنا دل تھوڑا مضبوط کر کے بچی کو سسرال میں سیٹ ہونے کا موقع دینا چاہیے تا کہ اس کا دل وہاں لگ جائے۔ بس اس



شاہانہ جاوید

بات پر نظر رکھنی چاہیے کہ بچی کے ساتھ ناحق زیادتی نہ ہو اور اس کو بالکل کولہو کا بیل نہ بنا دیا جائے باقی اس کو اس پودے کی طرح پھلنے پھولنے کا موقع دینا چاہیے جسے ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ لگا دیا جاتا

ہے۔

جہاں ہم نے بیٹیوں اور بیٹوں کی ماؤں سے دریافت کیا وہاں شادی شدہ بیٹیوں سے بھی معلوم کیا اوراب چندآرا شادی شدہ بیٹیوں کی۔

مہناز حسن زیدی

ڈائریکٹر اطلاعات پریس حکومت سندھ

جب تک بیٹی کی شادی نہیں ہوتی تو ماں اس کے ہر معاملے میں بولنے کا حق رکھتی ہے لیکن جب بیٹی رخصت ہو کر دوسرے گھر جاتی ہے تو ماں کو یہ سوچنا چاہیے کہ اب اس کی بیٹی کی پرورش اور تربیت کا وقت گزر گیا۔ جب بیٹی دوسرے گھر چلی گئی تو ماں کو اپنے آپ سے سوال کرنا چاہیے کہ کیا میں نے اسے دوسرے گھر کے لیے تیار کر دیا؟ اور پھر جہاں



مہناز حسن زیدی

کسی بھی معاملے میں میکے اور سسرال والوں کی سوچ ایک دوسرے سے مختلف ہو وہاں میکے والوں خاص طور پر بیٹی کی ماں کو اپنے مشورے اپنے تک محدود رکھنے چاہئیں۔ اگر شادی کے بعد بیٹی مشکل میں ہو یا اسے کوئی مسئلہ ہو، سسرال والوں کی کوئی بات ناگوار گزرتی ہو یا شوہر اور سسرال والوں سے کسی بات میں اختلاف یا رنجش ہو تو اس وقت بیٹی کی ماں کے عمل دخل کی کسی حد تک ضرورت ہوتی ہے لیکن اگر ایسے وقت میں ماں اپنی رائے بیٹی پر مسلط کرتی ہے...... بیٹی ماں کے دکھائے منفی راستے پر چلنے کی کوشش کرتی ہے یا ماں کی غلط باتوں کا اثر قبول کرتی ہے تو مسائل بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ ماں کو چاہیے کہ اس صورتِ حال میں بیٹی کو خود سوچنے، غور کرنے اور فیصلہ کرنے کا موقع دے اور اگر ماں کا مشورہ اتنا ہی ضروری ہے تو وہ بیٹی کو ایسے مشورے دے کہ وہ سسرال میں مثبت ردِعمل کا اظہار کرے کہ گھر بنتا بھی عورت سے ہی ہے اور بگڑتا بھی عورت ہی سے ہے۔ عورت کی ساری زندگی ایک امتحان ہے۔ شادی کے فوراً بعد ہی اس کی قربانیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جسے نہ صرف بیٹی بلکہ اس کی ماں کو بھی قبول کرنا چاہیے۔ اگر بیٹی سمجھتی ہے کہ مجھے اس مقام پر قربانی دینی ہے اور وہ ایسا کرتی ہے تو اس کا گھر بسا رہے گا اس وقت ماں کو بھی ایسے مشورے دینے چاہئیں کہ اس کی بیٹی کا گھر مضبوط بنیادوں پر استوار رہے۔ اس میں دراڑیں نہ پڑیں... کیونکہ یہ بہت بڑی سچائی ہے کہ قربانیوں اور ایثار کا مثبت نتیجہ ایک نہ ایک دن ضرور سامنے آتا ہے۔ اس لیے کٹھن مراحل کو صبر اور تحمل سے طے کریں۔ ماؤں کے غلط اور یکطرفہ فیصلوں سے بھی بیٹی کا گھر خراب ہوتا ہے۔ ماں بیٹی کو اپنی محبت کی زنجیر میں جکڑے رکھنا چاہتی ہے جب وہ بیٹی کو دوسرے گھر بھیجتی ہے تو یہ اس کی ذمے داری ہے کہ بیٹی کو اس کے اپنے گھر میں محبتیں بانٹنا سکھائے۔ اسے سمجھائے کہ جس طرح میکے کے رشتے بہت مضبوط ہوتے ہیں اگر اسی طرح وہ سسرال کے رشتوں کو اپنا لے گی یہ سوچ کر کہ یہ

دائمی رشتے ہیں تو سسرال میں بھی میکے کی طرح اس کی محبت پھلے پھولے گی۔

ڈاکٹر نجمہ فرمان

ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ سماجی بہبود جامعہ کراچی

تعلیم ختم ہوتے ہی مجھے یونیورسٹی میں ملازمت مل گئی یوں گھرداری کا زیادہ موقع نہ مل سکا۔ میرا تجربہ اور خیال تو یہی ہے کہ شادی شدہ بیٹیوں کی زندگی میں ماں کا بہت عمل دخل ہوتا ہے جیسے میری شادی کے ابتدائی دنوں میں میری اماں نے مجھے تلقین کی ہمیشہ اچھے اور ریشمی کپڑے پہنا کرو جبکہ مجھے کاٹن کے کپڑے پہننے کی عادت تھی، اماں نے یہ بھی سمجھایا کہ بہت زیادہ کپڑے لتے پر پیسے خرچ نہ کرو۔ وہ وقتاً فوقتاً کھانا پکانے کی ترکیبیں مجھے فون پر بتاتیں اور ساتھ ہی سمجھاتی بھی جاتیں کہ اگر پہلے سے چیزیں تیار کر لو تو وقت پر پریشانی نہ ہو۔ مثلاً کچے قیمے کے کباب بنا کر فریزڈ کر دو۔



ڈاکٹر نجمہ فرمان

پلاؤ بنانا ہے تو یخنی پہلے تیار کر کے رکھ لو، بریانی کا مسالا بنا کر رکھ لو اور دیگر چھوٹی چھوٹی باتیں جن پر عمل کرنے سے آج میں ملازمت کے ساتھ ایک خوش باش زندگی بسر کر رہی ہوں اور آج تک میں نے وہی طریقے اپنائے ہوئے ہیں۔ اماں نے مجھے ہمیشہ تلقین کی اپنی ساس کا بہت زیادہ خیال رکھو، میری ساس بہت سخت گیر طبیعت کی مالک تھیں۔ میں نے بہت زیادہ الجھن میں رہنے کے بعد جب اماں سے اس کا تذکرہ کیا تو اُن کے الفاظ مجھے آج تک یاد ہیں انہوں نے کہا۔ ''ساس نے جو کچھ کہا وہ تمہیں اتنا زیادہ برا لگا مگر ان کی یہ بات دوسروں کو اتنی بری نہیں لگے گی۔ ساس کبھی بری نہیں ہوتی ہاں اس کا انداز ضرور برا ہو سکتا ہے لیکن وہ دل کی بری نہیں ہو سکتی''۔ اماں نے میری شادی شدہ زندگی میں مداخلت ضرور کی لیکن میری رہنمائی کی نیت سے۔ آج جب کہ میری بیٹی یونیورسٹی کی طالبہ ہے تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ اماں کی مداخلت نے میری زندگی میں خوشی کے کتنے رنگ بکھیر دیے' یہ رنگ اپنے مثبت طرزِ عمل سے میں بھی تو اپنی بیٹی کی زندگی میں بھر سکتی ہوں۔ موجودہ معاشرتی مسائل، خاندانی مسائل، آپس کی رنجشیں اور زمانے کے نئے رنگ ڈھنگ کے سبب ہر لڑکی اور ہر لڑکے کو شادی کے بعد ایڈجسٹمنٹ میں بہت دشواری محسوس ہوتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ لڑکی کی ماں اس ایڈجسٹمنٹ کے لیے مثبت اور فعال کردار ادا کرے۔ عموماً شادی کے ابتدائی دنوں میں لڑکی اور لڑکا دونوں ہی الگ الگ تجربے سے گزر رہے ہوتے ہیں۔ ایسے میں انہیں ہر موڑ پر صحیح رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ ان کے مستقبل کا راستہ زیادہ ہموار ہو سکے۔ زندگی کی وہ تمام الجھنیں جس سے بیٹی مستقبل میں نبرد آزما ہو سکتی ہے ماں کو ان تمام احتیاطوں کے بارے میں بیٹی کو ضرور بتانا چاہیے۔ مثلاً گھر میں ایک وفا شعار بیوی کے ساتھ

اسے وفا شعار بہو بن کر بھی رہنا ہے۔ ایک گھریلو خادمہ کے علاوہ ایک اپ ٹو ڈیٹ لڑکی کے طور پر اور شوہر کے مزاج اور مرضی کے مطابق اپنا روپ سنوار کر گھر میں رہنا ہے تا کہ میاں خوشدلی سے گھر میں آئے۔ ایک ماں کو یہ تمام باتیں ذہن میں رکھتے ہوئے گاہے گاہے بیٹی کی رہنمائی کرتے رہنا چاہیے اور جہاں اس میں جھول دیکھے کان پکڑ کر بیٹی کو سیدھے راستے پر لے آئے، بیٹی کے ساتھ داماد کی بھی رہنمائی کرے اور اسے غلط اور صحیح کی پہچان کرائے۔ اگر ماں شادی شدہ بیٹی کی زندگی میں اس طرح مداخلت کرتی ہے تو اس کی زندگی میں زہر نہیں شیرینی گھول دیتی ہے۔

تابندہ لاری

نعت خواں، صحافی، ہیڈ آف پروموشن اینڈ پی آر حبیب آئل

میں سمجھتی ہوں کہ شادی شدہ بیٹی کے گھریلو معاملات میں اس کی ماں کو دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے۔ عموماً مائیں شادی شدہ بیٹیوں سے کرید کرید کر ان کے گھر کے حالات معلوم کرنا چاہتی ہیں شاید وہ ایسا اپنی بیٹی کی محبت میں کرتی ہوں لیکن اس کا فائدہ تو کچھ نہیں ہوتا ہاں نقصان ضرور ہو سکتا ہے، میں مشترکہ خاندانی نظام کا حصہ ہوں لیکن میری امی نے میری شادی شدہ زندگی میں کبھی کسی قسم کا دخل نہیں دیا اور کبھی میں نے کوئی بات کہی بھی تو انہوں نے سن کر بھی ان سنی کر دی ایسی کوئی رائے یا مشورہ نہیں دیا جس سے مجھے شہ ملے۔ عارفین مجھے رات کو امی کے گھر نہیں رہنے دیتے تھے جب میں امی سے شکایت کرتی تو وہ مسکرا کر خاموش ہو جاتیں، میں امی سے کہتی آپ عجب ساس ہیں داماد سے کچھ تو کہیں لیکن امی کچھ نہیں کہتیں، ماؤں کو شادی شدہ بیٹیوں کے گھریلو معاملات میں بولنے سے گریز کرنا چاہیے۔ خاص طور پر میاں بیوی کے



تابندہ لاری

درمیان ہونے والی چپقلش میں بالکل بھی دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے کیونکہ شوہر کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو یہ بات اسے ناگوار ضرور گزرے گی لیکن اس کے ساتھ ہی موجودہ حالات و واقعات کی روشنی میں، میں یہ بھی کہوں گی کہ بیٹیوں کو بیاہنے کے بعد ماؤں کو بالکل بے نیاز بھی نہیں ہونا چاہیے اگر کوئی بیٹی مظلومیت کا اظہار کر رہی ہے اور یہ دو ایک بار ہے تو کوئی بات نہیں لیکن جب یہ مستقل معمول بن جائے تو اس جانب دھیان ضرور دینا چاہیے اور پھر حالات کا جائزہ لے کر غیر جانبداری سے بیٹی کو ایسی رائے دینی چاہیے جس سے اس کا گھر خوشیوں کے ساتھ بسا رہے۔ یہ حقیقت ہے کہ آج کل گھر ماؤں کی بے جا مداخلت سے خراب ہو رہے ہیں اور اس کی بڑی وجہ ڈیمانڈ ہوتی ہے۔ صرف مائیں ہی نہیں بعض اوقات شادی شدہ بہنیں بھی اپنے شوہر کی خوبیاں اور ان کی جانب سے دی گئی سہولتوں کا ذکر کر کے بہنوں کو اکساتی ہیں ایسے موقع پر لڑکی کی سمجھداری سے گھر بسا رہتا ہے ورنہ گھر اجڑنے

میں دیر بھی نہیں لگتی۔ اگر شادی شدہ بیٹی اپنی لامحدود خواہشات پر بند باندھ لے تو کسی بھی قسم کی تلخی کی نوبت نہیں آئے گی۔ ماں کو چاہیے کہ اپنی بیٹی کو حالات کا مقابلہ کرنے کی سمجھ اور قوت دے۔ آخر ہماری ماؤں نے بھی تو اچھے برے حالات دیکھے ہی ہیں تو پھر کیوں نہ ہم بھی اپنے وسائل دیکھتے ہوئے اپنی خواہشات پوری کریں۔ میں سمجھتی ہوں صرف بیٹی ہی نہیں بیٹے کی ماں کا کردار بھی بہت اہم ہے، اگر میاں بیوی کے درمیان کوئی اختلاف یا رنجش ہو تو دونوں کی مائیں مل بیٹھ کر حالات سدھاریں ورنہ بقول شاعر

دلوں کی الجھنیں بڑھتی رہیں گی
اگر کچھ مشورے باہم نہ ہوں گے

شازیہ انور

اسسٹنٹ ایڈیٹر مصالحہ ٹی وی فوڈ میگ

ہمارے معاشرے میں بیٹیوں کو انتہائی کمسنی سے جو جملہ سب سے زیادہ سننے کو ملتا ہے وہ اس کے "پرائے گھر" جانے کے حوالے سے ہوتا ہے۔ اپنی لاڈلی بیٹیوں کو پیدا ہونے کے بعد سے ہی ان کے گھر جانے کے لیے تیار کرنے والی مائیں بیٹیوں کو بیاہنے کے بعد خوشیوں اور شادمانی کی متمنی ہوتی ہیں یہ تمنا ہی شاید ان سے بیٹیوں کی نجی زندگی میں عمل دخل کا سبب بنتی ہے اگر یہ عمل دخل اچھے اور برے کی تمیز کرانے کی حد تک رہے تو بیٹیوں کی زندگی سنور جاتی ہے لیکن جہاں مائیں ضرورت سے زیادہ ہی بیٹیوں کی زندگی کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کرتی ہیں وہاں معاملہ بگڑتا نظر آتا ہے۔ ماؤں کے بے جا عمل دخل سے بسا اوقات بہت خوفناک نتائج سامنے آتے ہیں۔ میرا ذاتی تجربہ یہ کہتا ہے کہ ماؤں کو بیٹیوں کی زندگی میں کم سے کم دخل دینا چاہیے۔ اگر اس کو اپنی سسرال میں کچھ مسائل ہیں تو میکے میں بھی یہی مشکلات پیش آتی ہوں گی ایسے موقع پر بیٹی کی



شازیہ انور

حوصلہ افزائی کر کے اچھا وقت آنے کی تسلی دی جائے تو بہتر ہے اور اس وقت اس کے ذہن میں سسرال والوں کے خلاف منفی خیالات پیدا کرنا اس کی ازدواجی زندگی سے کھیلنے کے مترادف ہو سکتا ہے۔ شادی شدہ بیٹیوں کی زندگی میں اگر ان کی ماں کا عمل دخل بڑھتا جا رہا ہے تو یہ کردار بیٹے کی ماں بھی ادا کر رہی ہے۔ بیٹوں کی شادیوں کے بعد ماؤں کا ان کی زندگیوں میں بے جا عمل دخل اکثر اوقات بیٹوں کی شادی شدہ زندگی کو ناکام بنانے کا سبب بن کر رہ جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں بیٹیوں کی امانت اور بیٹوں کی سرمایہ کاری سمجھ کر پرورش کی جاتی ہے۔ انتہائی لاڈ پیار سے پالے ہوئے بیٹوں کی شادی کے بعد شاید بیٹے کی ماں عدم تحفظ کا شکار ہو جاتی ہے یا پھر اُن کے دل میں یہ خوف ہوتا ہے کہ ان کی عمر بھر کی پونجی کل کی آئی لڑکی لے اڑے گی۔ یہی خیال انہیں شادی شدہ بیٹوں کی زندگی میں بے جا دخل دینے پر متحرک کرتا ہے ایسے میں بیٹا ماں اور بیوی کے درمیان پھنس کر ذہنی دباؤ

کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ لیکن نہ بیوی اور نہ ہی ماں اس بیچارے کا خیال کرتی ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر مائیں تحمل سے کام لیتے ہوئے بیٹوں کو ازدواجی زندگی کا آغاز کرنے دیں تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حالات ان کی موافقت میں آجاتے ہیں۔ شادی شدہ بیٹوں کی زندگیوں میں بحیثیت بزرگ اچھا، برا سمجھانے کی حد تک عمل دخل ٹھیک ہے لیکن بے جا روک ٹوک، میاں بیوی کے تعلقات پر نکتہ چینی اور جلنا کڑھنا بالآخر لڑائی جھگڑے پر منتج ہوتا ہے۔ یہیں سے دلوں میں کدورتیں جنم لیتی ہیں اور دوریاں پیدا ہوتی ہیں جو لڑکی اپنا سب کچھ چھوڑ کر ایک شخص کے سہارے نئی زندگی گزارنے کی خواہاں ہوتی ہے۔ وہ اپنی آنکھوں میں جو خواب سجا کر آتی ہے وہ اسی وقت شرمندۂ تعبیر ہو سکتے ہیں جب اس کی ساس، ماں والا طرزِ عمل اختیار کرے۔

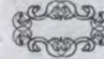
ساس اپنی بہو سے تو بیٹی بننے کی توقع رکھتی ہے لیکن اپنے دل کو ماؤں کی طرح وسیع نہیں کر پاتی جبکہ اگر وہ بہو کو بیٹی کا درجہ دے تو شاید بہت سے مسائل حل ہو جائیں۔ یہاں میں بہو کی نازک مزاجی کو بھی قصوروار سمجھتی ہوں جو ماؤں کی مار سہہ کر بھی بے مزہ نہیں ہوتیں اور ساس کا ایک جملہ بھی انہیں تیر کی طرح لگتا ہے۔

قارئین:: سروے میں شریک تمام خواتین کی رائے یہی ہے کہ شادی شدہ بیٹیوں کے نجی معاملات میں ان کی ماؤں کو بے جا دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے کہ یہ وہ زہر ہے جس کا کوئی تریاق نہیں۔ جب اوائل عمر سے ہی ہر لڑکی کے ذہن میں یہ بات بٹھائی جاتی کہ اسے اپنے گھر جانا ہے یہ دہلیز پرائی ہے......

تو بیٹی کو اپنے گھر کا صحیح مفہوم بھی سکھا دینا چاہیے کہ محض گھر والا ہی نہیں گھر والے بھی اس کے اپنے ہیں، بے شک بدلتے وقت کے تقاضے کچھ اور ہیں لیکن جب اخلاقی اقدار روبہ زوال ہوتی ہیں تو سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ معاملہ میاں بیوی کے مابین ہونے والی ان بن کا ہو یا سسرال والوں سے کسی بھی اختلاف کا، بیٹی کی ماں کے کانوں تک جب یہ بات پہنچتی ہے تو اسے بیک وقت ماں، رہنما، استاد، مصلح اور بے لوث محبت کرنے والے دوست کا کردار ادا کرنا چاہیے۔ مشورے کی اہمیت تو ہمارے مذہب میں بھی ہے اور بیٹی کو ماں سے بڑھ کر درست مشورہ بھلا اور کون دے سکتا ہے!

اول تو ماؤں کو شادی شدہ بیٹیوں کے معاملات میں دخل اندازی کرنی ہی نہیں چاہیے لیکن اگر یہ مداخلت اتنی ہی ناگزیر ہے تو ماں کو جوش سے زیادہ ہوش سے کام لینا چاہیے، بعض مائیں اور میکے والے شوہر اور سسرال والوں کو ''مزہ چکھانے'' کی نیت سے ہی سہی بیٹی کو میکے بیٹھ جانے کا مشورہ دیتے ہیں اور ایسا کرتے وقت وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ہر تجربہ ہر وقت اور ہر ایک کے ساتھ کامیاب نہیں ہوتا۔

یوں نادان دوستی کا نتیجہ کبھی کبھی بیٹی کو اپنا بسا بسایا گھر اپنوں کے ہاتھوں اجڑوانے کی صورت سامنے آتا ہے اور پھر عمر بھر کا پچھتاوا اسے آنسو نہیں لہو رلواتا ہے کہ برے وقت میں تو سایہ بھی جدا ہو جاتا ہے اور بہت زیادہ اپنائیت کا احساس دلانے والے بھی اسے قصوروار سمجھنے لگتے ہیں...... عمر بھر کے طعنے تشنے اور عدم تحفظ کا احساس اسے بے موت مار دیتا ہے۔ اپنے بھی غیر بن جاتے ہیں۔ سو ماں اور دیگر میکے والوں کو چاہیے کہ وہ بیٹی کو سمجھائیں کہ پتھر اپنی جگہ پر بھاری ہوتا ہے۔ بیٹی کو مشورے ضرور دیں لیکن ایسے مشورے جن پر عمل کر کے وہ خود کو مظلوم سمجھ کر نفسیاتی مسائل کا شکار نہ ہو بلکہ اس کی زندگی اور گھر ارضی جنت کا نمونہ بن جائیں۔ اسی میں ماں کی جیت بھی ہے اور بیٹی کی خوشی بھی۔



شادی مبارک

رابعہ فیاض قادری

یہ قصہ ہے ہمارے دیور کی شادی کا جو شادی کے نام سے یوں بھاگتے تھے جیسے بکرا قسائی کو دیکھ کر بھاگتا ہے مگر ہم گھر والوں نے اتحاد کیا اور ان کے لاکھ نخرے دکھانے کے باوجود ان کی شادی کی ڈیٹ فکس کر دی۔ ہمارا اشتیاق اس لیے بھی زیادہ تھا کہ یہ ہمارے اکلوتے دیور ہیں اور ہمارے گھر کی فی الحال یہ آخری شادی تھی تو ہم نے سوچا اس موقع سے فائدہ اٹھائیں اور دل بھر کے ارمان نکال لیں۔ ہم سے بڑی دو جیٹھانیاں ہیں جن کی شادی کو کافی سال ہو گئے ہیں ان کے بچوں کا بھی شوق و ولولہ دیکھنے والا تھا۔ تقریب سے ایک ہفتہ پہلے ہماری سب سے بڑی نند زاہدہ باجی پنڈی سے آگئیں ساتھ ان کی شادی شدہ بیٹی اسما اپنے چھوٹے سے بیٹے حسنین کے ساتھ تھی۔ ان کے آتے ہی رونق لگ گئی اور اب گھر شادی والا گھر لگنے لگا۔ میری باقی تینوں نندیں بھی آگئیں اور اس رات ہم نے اپنی دیورانی اسما کی مہندی لے کر جانا تھی۔ دلہن کا گھر نزدیک ہی تھا سو ہم جلد ہی پہنچ گئے۔ پیلے کاٹن کے سوٹ میں اسما بہت پیاری لگ رہی تھی مگر کلف کا دوپٹا ہونے کی وجہ سے کچھ پریشان بھی تھی۔ میں نے اس کا دوپٹا پنوں کی مدد سے سیٹ کر دیا پھر اس کو لا کر صوفے پر بٹھایا گیا۔ گھر گھر کے لوگ تھے باہر سے کسی کو نہیں بلایا تھا ماشاء اللہ ہماری اپنی فیملی اتنی بڑی ہے کہ سب اکٹھے ہوتے ہیں تو لگتا ہے کوئی تقریب ہو رہی ہو۔ یہی حال میرے میکے کا بھی ہے اللہ تعالیٰ نظرِ بد سے بچائے آمین۔ پہلے تو ہماری جیٹھانی روزینہ باجی نے ڈھولک سنبھالا اور ہم سب نے مل کر اپنی تانیں لگائیں۔ خوب گانے گائے گئے۔ لڑکی والے خاموش بیٹھے ہمیں سنتے رہے اور مسکراتے رہے۔ (بڑا حوصلہ تھا بھئی) پھر رسم شروع ہوئی تو پتا چلا کہ دلہن کو جو دوپٹا اوڑھانا ہے وہ ہم بھول گئے ہیں جو ہماری سب سے چھوٹی نند اپنے شوہر کے ہمراہ جا کر لے آئیں ابھی رسم کا ارادہ کیا تھا کہ پتا چلا دلہن کی چوڑیاں شوکیس پر رکھی رہ گئی ہیں پھر گھر بھاگے اس دن پتا چلا کہ سمدھیانہ قریب ہو تو کتنا فائدہ ہوتا ہے۔ یونہی ہنستے مسکراتے رسم ادا ہو گئی۔ پھر اسما کے گھر والوں نے قورمے اور زردے سے ہماری تواضع کی۔ بھوک بہت لگ رہی تھی سو کھانا مزید مزے کا لگا تھوڑی دیر اور بیٹھ کر ہم لوٹ آئے۔ دو دن کے بعد ہمارے گھر مہندی کی رسم تھی اس دن میں نے خاص طور پر غرارہ پہنا تھا بالوں میں رولر لگوائے اور جھمکیاں بھی پہنیں تو سب مجھے دیکھ کر آداب کرنے لگے۔ ان کی بھانجیاں بولیں آج مامی پکی لکھنؤ والی لگ رہی ہیں خیر سب نے تعریف کی ویسے مزے کی بات ہے کہ میرا پورا سسرال پنجابی ہے تمام بہویں اور داماد بھی ان میں بس ایک میں اردو اسپیکنگ ہوں۔ تو کبھی کبھی ہٹ کے ڈریسنگ کرنا اچھا لگتا ہے۔

شام کو دلہن والے آگئے۔ ان کا خوب اچھا استقبال کیا۔ ان لوگوں نے امتیاز بھائی کی رسم کی پھر ہم سب نے بھی باری باری مٹھائی کھلائی ارے میں بتانا تو بھول گئی کہ آج کے دن ہی ان کے ماموں کی بیٹی فوزیہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ پنڈی سے آئیں اور ان کے خالہ کے بیٹے جو میری چھوٹی جیٹھانی کے بھائی بھی ہیں لاہور سے آئے۔ رسم کے بعد کھانا کھلایا اور سب مہمان رخصت ہوئے اس تاکید کے ساتھ کہ کل 10 بجے تک بارات ضرور لے آنا۔

آج 14 اکتوبر بروز جمعہ یعنی بارات کا دن تھا ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر سب کپڑے استری کرنے اور نہانے میں لگ گئے کہ وقت کم اور مقابلہ سخت تھا میرے میاں اور میرے جیٹھ الیاس بھائی کی دھمکی تھی کہ جو 10 بجے تک تیار نہ ہوا اسے گھر چھوڑ جائیں گے اور اسی ڈر سے ہم 7 بجے ہی پارلر پہنچ گئے مگر ہائے نصیب وہاں بھی لائٹ نہیں تھی اور جنریٹر خراب تھا خدا خدا کر کے لائٹ آئی اور ہم سب تیار ہوئے۔ آج میں نے وائٹ اور بلیک کلر کی فراک پہنی تھی جس پر وائٹ کام تھا۔ خیر سب تیار ہو کر جلدی جلدی بارات لے کر چلے۔ پہلے گھر میں دولھا کو سلامی دی سب نے۔ میرے بیٹے علی رضا نے آج شیروانی پہنی تھی آف وائٹ کلر کی کیونکہ علی رضا خیر سے شہ بالا بنے تھے اور اپنے پاپا کی گود میں چڑھے چاچو کے ساتھ ساتھ تھے۔ ایک اور بھی شہ بالا تھے وہ ہمارے دوسرے جیٹھ کے اکلوتے بیٹے زین تھے۔ بارات نکلی اور گھر کے قریب گراؤنڈ میں دلہن والوں نے انتظام کیا تھا کہ قریب کی وجہ سے آسانی رہے گی دونوں فیملیز کو۔ بارات کا استقبال ہوا۔ شیروانی اور کلاہ پہنے آج ہمارے دیور بہت جچ رہے تھے۔ پہلے نکاح ہوا۔ نکاح ہمارے پیر صاحب جناب ڈاکٹر مجید اللہ قادری صاحب نے پڑھایا۔ نکاح کے بعد وہ چلے گئے کہ انہیں ایک شادی اور اٹینڈ کرنا تھی، ہم سب لوگوں سے مل ملا رہے تھے۔ آج ہماری بہنیں اور امی وغیرہ بھی آئی ہوئی تھیں پھر کھانا شروع ہوا کھانا کافی مزے



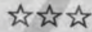
امتیاز احمد ہمراہ اسما ارشد

کا تھا کھانے سے لطف اندوز ہوئے تھے کہ دولھا دلہن کو اسٹیج پر بٹھا دیا گیا۔ دلہن بن کر اسما بہت پیاری لگ رہی تھی۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ وہ اسما ہے جو ہمیشہ سادہ رہتی ہے۔ آج تو ریڈ لہنگے، بیش قیمت جیولری اور سلیقے سے کیے گئے میک اپ کی وجہ سے اس کی چھب ہی نرالی تھی۔ دونوں ساتھ بیٹھے بہت جچ رہے تھے۔ تھوڑی بہت رسمیں ہوئیں۔ مووی بنوائی اور ہم دلہن لیے گھر لوٹ آئے۔

اگلے روز ولیمہ تھا جس میں اسما نے پنک اور اسکائی بلیو کلر کا شرارہ پہنا تھا میں نے آج سی گرین کلر کی ساڑی باندھی تھی، علی اور ان کے پپا نے پینٹ شرٹ پہنی اور ان کی بھتیجیاں اریشہ، ماہم، جویریہ اور ماریہ نے فراکیں پہنیں اور مجھ سے ناراض ہوئیں کہ چچی آپ نے کل فراک پہن کر ہماری آج کی شو خراب کر دی آج بھی سب بہت اچھے لگ رہے تھے۔ کل والے گراؤنڈ میں ہی آج ولیمہ تھا۔ اور ہم ابھی تیار ہی ہو رہے تھے کہ اسما کے ابو کا فون آ گیا، وہ لوگ آ جائیں؟ میرے شوہر بولے پہلے ہم تو پہنچ جائیں۔ ہمارے پہنچتے ہی وہ لوگ آ گئے دراصل اسما کے گھر میں اس کی امی ابو تین بھائی اور ایک بھابی ہیں اور ایک چھوٹا بھتیجا سو اس لحاظ سے وہ لوگ جلد

تیار ہو گئے تھے جبکہ ہمارے گھر میں خیر سے تین پینتیس افراد تھے سو اس لحاظ سے تیار ہونے میں ٹائم لگا تھا۔ خیر آج سب بہت خوش اور اچھے لگ رہے تھے۔ دولھا صاحب سوٹ میں اپنی بیگم کے برابر براجمان تھے۔ جو آج بھی بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ سب سے ملتے ملاتے اور خوش گپیاں کرتے ٹائم گزر گیا۔ اور کھانا لگ گیا۔ کڑاہی گوشت، بریانی، رائتہ سلاد اور لبِ شیریں سے سب کی تواضع کی گئی تصویریں کھنچیں، مووی بنی اور دلہن والے رخصت ہوئے تو ہم سب گھر والوں نے بیٹھ کر کھانا کھایا۔ دولھا دلہن بھی ساتھ ہی تھے کھانا کھا کر ہم سب نے گھر کی راہ لی۔

اور یوں شادی اختتام کو پہنچی۔ اسما بہت ہی اچھی بہو ثابت ہوئی ہے اور ہمارے گھر کے لیے ایک خوشگوار اضافہ ہے۔



شادی میرے نخریلے بھیا کی

صبا سجاد

لفظ شادی بھی کتنا خوشگوار لفظ ہے اور اگر عملی طور پر بھی شادی کی کوئی تقریب اتنی ہی خوشگوار ہو تو بہت ہی مزہ آتا ہے۔

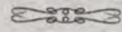
میرے چھوٹے بھائی محمد مجتبیٰ عباس کی شادی اسی سال جولائی کے پہلے ہفتے میں انجام پائی۔ میں چونکہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ دبئی میں مقیم ہوں اس لیے چھٹیوں کے جان لیوا انتظار سے گزرنا پڑا مگر اس دوران...... میں اپنی تیاری کرتی رہی تاکہ شوہر صاحب سے عین وقت کی تیاری کی بابت کچھ سننا نہ پڑ جائے خیر جون کے آخری ہفتے میں ہم سب کراچی آ چکے تھے۔

میری والدہ، بڑی بھابی انجم اور بہن ثنا مرتضیٰ کافی حد تک بری کی تیاری کر چکی تھیں باقی ہم نے آ کر ہاتھ بٹا دیا۔

8 جولائی کو مایوں کی تقریب تھی۔ ہمارے خاندان والوں کا پہلی جولائی سے آنا جانا لگا رہا۔ اس مرتبہ کراچی کے موسم میں خوشگواریت ذرا دیر سے آئی مگر یہاں کی شامیں تو ہوتی ہی ٹھنڈی ہیں۔ جن گھروں میں ابھی تک آنگن ہیں وہ ہی اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ مایوں کی رنگا رنگ تقریب رات دس بجے کے بعد شروع ہوئی۔ اسکول، کالج کی چھٹیاں تھیں سو کسی کو ناگوار نہ گزرا۔ ابھی ہمارے پورے مہمان آئے بھی نہیں کہ دلہن والے (جو ہمارے رشتے دار ہی ہیں) مٹھائی، پھل، مہندی کے



مہوش پارو، دبئی



پسند

اسے بارش پسند ہے
اور مجھے بارش میں وہ
اسے ہنسنا پسند ہے
اور مجھے ہنستا ہوا وہ
اسے زندگی پسند ہے
اور مجھے جیتا ہوا وہ
اسے بہت کچھ پسند ہے
اور مجھے صرف اور صرف وہ

شاعرہ: قمر شمس الحق، جھنگ صدر

سجے تھال اور جانے کیا کچھ لیے چلے آئے۔ہم نے بھی ان کا استقبال مٹھائی کھلا کر اور ہار پھول پہنا کر اور نچھاور کر کے کیا۔

ہمارا یہ بھائی بہت ہی نخریلا اور شرمیلا ہے مگر مایوں کی تقریب میں اس کے سارے نخرے ہوا ہوگئے اور وہ سائرہ (دلہن) کی بہنیں، کزنز اور سہیلیاں دیکھ کر بڑے موڈ میں آگیا اور تمام رسمیں خوب انجوائے کیں۔خاص طور پر ابٹن، مہندی کی رسم جن میں اکثر دولھا کوشش کرتے ہیں کہ کوئی ان کے چہرے پر ابٹن نہ لگا پائے مگر اس موقع پر ہمارا بھائی نخریلا نہیں بلکہ مسکین بنا رہا۔ پیلے رنگ کا کُرتہ اور خوب صورت گولڈن اسٹول میں وہ بہت پیارا لگ رہا تھا۔

ہم سب نے رنگا رنگ پراندے ڈال رکھے تھے۔ چھوٹی بچیاں تو یہ سب خوب انجوائے کررہی تھیں۔اسی رات رت جگے کا پروگرام تھا۔جس میں شادی بیاہ کے گیت گائے گئے اور مزیدار خاندانی قصے، لطائف اور شعر و شاعری کے دور چلتے رہے۔ ساتھ ساتھ چائے، ناشتے، کولڈ ڈرنکس سے بھی لطف اندوز ہونے۔اس محفل کا اختتام حمد و نعت اور سلام و منقبت پر ہوا اور آخر میں ایک بزرگ کزن نے دعائیہ کلمات ادا کیے۔

اگلے روز بارات تھی۔ہم گھر والوں نے اپنے اپنے کپڑے ان تقریبات سے پہلے ہی پریس کر کے لٹکا دیے تھے۔امی نے اسٹور میں ہینگرز کا انتظام کر رکھا تھا کہ لوڈشیڈنگ کے باعث پریشانی نہ ہو۔ ہم ساڑھے نو بجے بارات لے کر نکلے۔دولھا آف وائٹ پر میرون اور گولڈن کام کی شیروانی اور میچنگ کلاہ پہنے کوئی شہزادہ لگ رہا تھا۔ویسے ہر بہن کے لیے اس کا بھائی شہزادہ ہی ہوتا ہے۔مزے کی بات کہ ہمارے بھائی کو سلیم شاہی پسند نہیں وہ اسی پر مُصر رہا کہ یہ نوک سے مُڑے ہوئے کیوں ہوتے ہیں سیدھے کُھسّے کیوں نہیں ہوتے۔ خیر بارات کا استقبال گلستانِ جوہر کے ایک وسیع و عریض لان میں بہت خوب صورتی سے کیا گیا۔ہم نے بطورِ خاص آرمی بینڈ کا انتظام بھی کرایا تھا۔

دلہن سرخ کامدار لہنگا سوٹ پہنے گھبرائی لجائی سی ڈریسنگ روم میں بیٹھی تھی۔ہم نے اندر جا کر اسے تسلی دی کہ ابھی آرام سے بیٹھو، دولھا کے پہلو میں بیٹھ کر شرما لینا۔نکاح دو روز پہلے ہوچکا تھا بس اب چند رسوم تھیں اور سب سے بڑھ کر مووی بننے کی رسم کہ جس نے تقریبات کو اور تاخیر سے بنا دیا ہے شکر ہے کہ ساڑھے بارہ بجے تک ہال کی انتظامیہ ہال خالی کرنے کا آخری نوٹس دے دیتی ہے۔ان رسوم کے بعد پُرتکلف دعوتِ طعام سے سب کی پذیرائی ہوئی اور رات ایک بجے کے قریب رخصتی کا عمل شروع ہوا اور ایک بڑی کوسٹر اور چند گاڑیوں میں باراتی واپس روانہ ہوئے۔

گھر آ کر رسمیں انجام پائیں جن میں دودھ سے پیر دھلانا، کھیر چٹائی اور دو رکعت شکرانے کے نفل جو دولھا کو سب کے سامنے پڑھنا ہوتے ہیں، شامل ہیں۔

ولیمہ دو روز بعد رکھا گیا تھا تاکہ کچھ آرام بھی ہوجاتا اور چوتھی کی رسم بھی انجام پا جائے۔احوال کافی طویل ہوگیا بس یوں سمجھ لیں کہ ولیمے میں چونکہ ہم میزبان تھے اس لیے غرارہ، ساڑی اور شرارے کو بالائے طاق رکھ کر ہم نے چوڑی دار پاجامہ اور اے لائن فراک زیب تن کیا۔آج ہمارا نخریلا بھائی شاندار سوٹ پہنے گلے میں ہار ڈالے تمام مہمانوں کے استقبال کے لیے مستعد تھا۔تقریب کے اختتامی مرحلے میں اس نے اپنی دلہن کا ہاتھ پکڑا اور خاندان کے تمام بزرگوں کے پاس بطورِ خاص لے گیا جو اسٹیج تک اٹھ کر نہیں آسکتے تھے۔اس کا یہ انداز سبھی کو بہت بھایا۔ یوں ہمارے پیارے بھائی کی شادی کی تقریب اختتام کو پہنچی۔ خدا اس جوڑے سمیت تمام شادی شدہ جوڑوں کو خوش و خرم و شاد و آباد رکھے۔

آمین!



بہنوں کی محفل

مدیرہ

☆عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ!

حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانہ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

☆عزیز بہنو......دلہن نمبر کے ساتھ حاضر ہوں جو لبنیٰ عروج کے نام کیا گیا ہے۔ہمارے افسانوں کی دلہن کی رخصتی تو ہوگئی ہے مگر وہ اپنی تحریروں کے ذریعے ہمیشہ ہم سب کے دلوں میں رہیں گی اور ان کی اصلاحی تحریریں یقیناً ان کے لیے صدقۂ جاریہ بھی ثابت ہوں گی۔ میں لبنیٰ عروج کے نمبر کی تیاری ہی کر رہی تھی کہ ایک صدمہ اور مل گیا۔میاں چنوں سے شاعرہ افتخار شوق نے مجھے فون پر اطلاع دی کہ پروفیسر فرزانہ سلیم انتقال کر گئیں۔فرزانہ سلیم گزشتہ بائیس سالوں سے نہ صرف پاکیزہ کی مراسلہ نگار تھیں بلکہ آج سے پندرہ یا سولہ سال قبل اپنے شوہر اور بیٹے کے ساتھ مجھ سے ملنے میرے گھر بھی آئی تھیں۔دبلی پتلی، لمبی سی فرزانہ میاں چنوں کے ایک کالج میں لیکچرار تھیں اور ان کے ڈاکٹر شوہر ان کے دل و جان سے عاشق نظر آئے۔وہ لوگ تھوڑی دیر ہی میرے پاس ٹھہرے مگر ان سے مل کر مجھے دلی خوشی ہوئی تھی۔فرزانہ کو شاعری سے بہت دلچسپی تھی اس لیے ان کے مراسلات ہمیشہ شاعری پر ہی محیط ہوا کرتے تھے اور اب وہ صرف 43 سال کی عمر میں داعیِ اجل کو لبیک کہہ گئیں۔اللہ تعالیٰ ان کے لواحقین کو اور ہم سب کو صبر عطا فرمائے اور مرحومہ کی مغفرت فرمائے، آمین۔اپنی ان دونوں رائٹرز کا صدمہ کافی گہرا تھا کہ ایک اور خبر نے بھی دہلا سا دیا۔پاکیزہ کی سابقہ بیوٹی کلینک کی انچارج ثروت جو اب زینیا حسن کے نام سے لکھتی ہیں اور معروف صحافی صفیہ رشید خاں کی سب سے چھوٹی بہن بھی ہیں کی سولہ سال کی بیٹی آمنہ انتقال کر گئی۔زینیا کی یہ بے حد لاڈلی، خوب صورت اور ذہین بیٹی تھی۔جس کے انتقال کے بعد اس کا میٹرک کا رزلٹ آیا تو اس نے اپنے اسکول میں ٹاپ کیا تھا اور اے ون گریڈ میں میٹرک پاس کیا تھا۔اللہ تعالیٰ ہماری مصنفہ زینیا حسن کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور یہ سانحہ سہنے کی ہمت اور طاقت بھی عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔ میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں کہ میں پے در پے یہ خبریں سن کر بیمار ہوگئی ہوں۔لوگ جن سے ہم باتیں کرتے ہیں یا جو ہر وقت ہمارے رابطے میں رہتے ہیں......ان کی اہمیت کسی طرح بھی خون کے رشتوں سے کم نہیں ہوتی۔ میں نے جب لبنیٰ کے بیٹے اطیب کے تاثرات پڑھے تو میں کتنی ہی دیر روتی رہی ہوں اور مجھے اس کی ہر سطر سے ایک غم زدہ بیٹا دکھائی دیتا رہا ہے۔جس طرح مائیں اپنے بچوں کی دیوانی ہوا کرتی ہیں جنہیں اپنے بچوں کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا ہے اسی طرح بچوں کو بھی اپنے والدین اور بالخصوص اپنی ماؤں سے بہت محبت ہوا کرتی ہے اور لبنیٰ عروج کا شمار ان ماؤں میں ہوتا ہے جو اپنے بچوں کی دوست، غم گسار اور راز دان ہوا کرتی ہیں۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ موت کا ذائقہ ہر نفس نے چکھنا ہے۔ کسی نے جلدی اور کسی نے دیر سے مگر اس کی تیاری ہم سب کو پہلے سے ہی کرنی چاہیے کہ کیا پتا کب زندگی کی شام ہوجائے۔

دلہن نمبر کے حوالے سے تمام پرانی، نئی دلہنیں اور نئی زندگی میں قدم رکھنے والیوں کے لیے ایک چھوٹا سا مشورہ یا نصیحت کروں گی کہ اگر ہماری کوئی تعریف کرتا ہے تو اس کی وجہ ہماری زبان ہے اور اگر کوئی ہمیں برے لفظوں میں یاد کرتا ہے تو اس کی وجہ بھی ہماری زبان ہی ہے۔آپ ہمیشہ یاد رکھیے جب زبان قینچی اور تلوار جیسے ہتھیار بن جائیں تو کسی گولہ بارود اور ایٹمی دھماکوں کی ضرورت باقی نہیں رہتی کیونکہ اس کا لگاوا دل و دماغ تو کیا روح تک کو چیر ڈالتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے آنکھیں دو دی ہیں کہ زیادہ دیکھو، کان دو دیے ہیں کہ زیادہ سنو، ہاتھ دو دیے ہیں کہ زیادہ کام کرو مگر زبان ایک دی ہے کہ کم بولو۔بس کم بولیے سوچ سمجھ کر بولیے۔فالتو باتیں نہ بولیں جتنا کم بولیں گی لوگ آپ کو اتنا ہی عقل مند سمجھیں گے۔

☆☆☆

اور اب آیئے سرگرمیوں پر نظر ڈالنے سے پہلے درودِ ابراہیمی پڑھتے ہیں جو نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد

صرف تین بار آیت کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالم اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔ (ابھی پڑھ لیجیے)

لاالہ الاانت سبحانک انی کنت من الظالمین

مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ چار ستمبر کو عالمی یوم حجاب منایا گیا۔ پاکستان میں بھی منایا گیا۔ پیاری بہنو! حجاب مسلم خواتین کا فخر و امتیاز ہے۔ اس کو پہن کر نہ صرف سکون ملتا ہے بلکہ احساسِ تحفظ بھی رہتا ہے اور سب سے بڑی بات اس کو پہن کر لڑکی شہزادی سی لگتی ہے کہ حجاب خواتین کو ایک توقیر عطا کرتا ہے۔ اب ہر ماں اپنی کسی بچی کو بغیر حجاب کے ہرگز باہر نہیں جانے دے گی۔ (انشاءاللہ)

☆ ہماری بے حد پیاری صداکارہ، اداکارہ اور مصنفہ نیلوفر عباسی کی پاکیزہ میں دھوم مچادینے والی یادداشتیں اب کتابی صورت میں شائع ہوگئی ہیں۔ اس کتاب کی تقریبِ رونمائی انشاءاللہ دسمبر میں کراچی میں ہوگی۔ (مبارک باد) ٹائٹل حسین ترین...... اس پر نیلوفر عباسی کی خوب صورت ترین تصاویر ہیں۔ تصاویر تو اندر بھی ہیں جو نیلوفر کی زندگی کے خوب صورت سفر کے ہر اہم سنگ میل کی طرف اشارہ کررہی ہیں۔ اور کتاب کا نام ہے کہی ان کہی کتاب کا انتساب نیلوفر کے ممی اور ڈیڈی کے نام ہے۔ نیلوفر عباسی کے یادوں کے موسم کس قدر خوب صورت ہیں یہ تو آپ کو کتاب پڑھ کر ہی پتا چلے گا مگر نیلوفر نے لکھا ہے کہ یہ کتاب آنے کا سبب عذرا رسول، قمر علی عباسی اور انجم انصار کی فرمائش ہے۔ یہ فرمائش کیا تھی...... اس کے لیے آپ بھی اپنی یادوں کا دریچہ کھولیے۔ عمدہ صفحات کی تعداد 296 ہے اور کتاب کی قیمت صرف 400 روپے۔ کتاب منگوانے کا پتا یہ ہے۔ ویلکم بک پورٹ، مین اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر 021.32639581

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری بہن سیدہ آصف نقوی کے ہاں شادی کے بارہ سال بعد فرزند ہوا ہے۔ جس کا نام احسن نقوی رکھا گیا ہے۔ (مبارک باد)

☆ پروفیسر شیریں سلیم، لاہور کی بیٹی صدف جواد کے ہاں شادی کے آٹھ سال بعد پیاری سی بیٹی ہوئی ہے جس کا نام عنایا عادل رکھا گیا ہے۔ (مبارک باد)

☆ لندن میں مقیم پاکیزہ کی مستقل قاری رعنا امتیاز کے ہاں جڑواں بیٹے ہوئے ہیں۔ جن کے نام حسن اور حسین رکھے گئے ہیں۔ (بہت مبارک باد اور بچوں کے نام بھی بہت پسند آئے ہیں)

☆ جناب بیگم محمد یاسین کے بیٹے انجینئر شارق یاسین کی شادی ڈاکٹر سعدیہ کنول بنت خدا بخش کے ساتھ 24 ستمبر کو اسلام آباد کے مقامی ہوٹل میں ہورہی ہے۔ (بے حد مبارک باد)

☆ ایک متمول اور اعلیٰ تعلیم یافتہ سندھی فیملی کا لڑکا عمر 28 سال مقیم کراچی۔ تعلیم ایم بی اے کے لیے ایک خوش شکل، تعلیم یافتہ لڑکی کا رشتہ درکار ہے۔ لڑکی کی عمر 22 سے 24 سال تک کی ہو۔ ذات پات کی کوئی قید نہیں۔ لڑکی کے والدین اس سیل نمبر پر رابطہ کرسکتے ہیں 0321-2458316۔

☆ میرے بیٹے عمیر صدیقی کی ساس اور میری سمدھن مسز شجاع ان دنوں سڈنی میں بسترِ علالت پر ہیں ان کی کُلّی صحت اور زندگی کے لیے دعا کریں۔

☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار اور شاعرہ مسز شمع حسین، ٹورنٹو کے بیٹے سید ریحان حسین کے ولیمے کی تقریب ٹورنٹو میں یکم ستمبر کو منعقد ہوئی۔ جس میں مہمانوں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی شاعرہ، تبصرہ نگار اور مصنفہ شگفتہ شفیق ان دنوں کینیڈا گئی ہوئی ہیں اور وہاں ان کے اعزاز میں تقریبات ہورہی ہیں۔ (ماشاءاللہ)

☆ معروف مصنفہ عطیہ عمر نے ماہِ شوال میں نفلی اعتکاف کیا۔ (سبحان اللہ)

☆ معروف مصنفہ سیما مناف کا پاکیزہ میں دھوم مچادینے والا ناولٹ بہاراں ہے ان دنوں ایک نجی چینل پر مقبولیت کے ریکارڈ توڑ رہا ہے۔ (مبارک باد)

☆ ہماراٹی وی سوپ چاندنی پیر سے جمعرات تک شام ساڑھے سات بجے ایک نجی چینل پر دکھایا جارہا ہے۔ آپ کی باجی انجم انصار کا دوسراٹی وی سوپ اٹکھیلیاں ہر پیر اور منگل کو شام ساڑھے سات بجے اور دن میں دو بجے ایک دوسرے نجی چینل پر دکھایا جارہا ہے اور پسند کیا جارہا ہے۔ (ماشاءاللہ)

☆ شاعرہ اور پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار سعدیہ ہما شیخ نے پولیٹیکل سائنس میں فرسٹ ڈویژن میں ایم اے کرلیا ہے۔ ان کے حوالے سے دوسری نیوز یہ ہے کہ ان کی پیاری بیٹی حور نعمین فیصل نے آل پاکستان کینگرو مقابلے میں نہ صرف اول پوزیشن حاصل کی بلکہ گولڈ میڈل بھی حاصل کیا ہے۔ (بے حد مبارکاں)

☆ پاکستان میں خواتین سفرنامہ نگاروں میں نمبرون پر آنے والی سلمیٰ اعوان کی کتاب کہانیاں دنیا کی شائع ہوگئی ہے جس میں دنیا کی ہی کہانیاں ہیں...... سلمیٰ اعوان چونکہ بنیادی طور پر ایک اچھی افسانہ نگار بھی ہیں۔ اس لیے دنیا کی کہانیوں میں وہ ہر کردار کی تہ تک اتر جاتی ہیں اور منظر نگاری میں انہیں کمال حاصل ہے۔ (ماشاءاللہ) اس خوب صورت کتاب کی قیمت صرف 350 روپے ہے۔ کتاب منگوانے کا پتا یہ ہے۔ دوست پبلی کیشنز۔ پلاٹ نمبر۔ 110 اسٹریٹ۔ I.9/2.15 اسلام آباد۔

☆ معروف سفرنامہ نگار کے اشرف کا نیا سفرنامہ سقراط کے شہر میں کتابی صورت میں آگیا ہے۔ یہ سفرنامہ موجودہ یونان کے بارے میں ہے لیکن انہوں نے عظیم شخصیات کے ان تصورات کا بھی تذکرہ کیا ہے جو ہماری تاریخ کا حصہ ہیں۔ اس دلچسپ اور بالتصویر کتاب میں یونان کی اقدار کی تاریخی اہمیت کا بھی اندازہ ہوجاتا ہے۔ صفحات سفید ساٹن جیسے ہیں اور قیمت صرف دس ڈالر یا دو سو پچاس روپے۔ کتاب منگوانے کے لیے یا کتاب کے بارے میں اپنی رائے دینے کے لیے کتاب کے مصنف سے اس ایڈریس پر رابطہ کرسکتے ہیں۔ 1375۔ یونیورسٹی ایونیو۔ برکلے۔ کیلی فورنیا۔ 9470۔ یو ایس اے kashraf@ix,net com.com

☆ نوجوان قلم کارہ ثمینہ سید کے افسانوں کا پہلا مجموعہ کتابی صورت میں شائع ہوگیا ہے جس میں ان کے چودہ افسانے شامل ہیں۔ ان کی کہانیاں گو معاشرتی کہانیاں ہی ہیں مگر اندازِ تحریر خوب صورت اور سحر انگیز ہے اور چند موضوعات تو خاصے چونکا دینے والے بھی ہیں۔ کتاب کی قیمت صرف 150 روپے ہے۔ کتاب منگوانے کا ایڈریس یہ ہے۔ سیوا پبلی کیشنز: 133 سرکلر روڈ شاہ عالم چوک، لاہور۔ فون نمبر 7671975

☆ معروف مصنفہ رضوانہ پرنس کا ٹی وی کے لیے خصوصی ڈراما دکھ میں سکھ ایک نجی چینل سے دکھایا گیا اور بے حد پسند کیا گیا۔ (مبارک باد) رضوانہ پرنس کا ٹی وی سیریل بہت جلد آن ایئر جائے گا (ماشاءاللہ)

☆ اکتوبر کا مہینہ اس لیے خاص الخاص کہلاتا ہے کہ اس ماہ ان پیاری شخصیات کی سالگرہ ہے۔ (آپ سب کو بے حد مبارک باد)

☆ 16 اکتوبر کو صبیحہ شاہ کی سالگرہ ہے۔

☆ 16 اکتوبر کو ہی ہماری لبنیٰ عروج کی سالگرہ ہوتی تھی (اور اس دن آپ سب نے انہیں دعاؤں کے تحفے ارسال کرنے ہیں)

☆ 11 اکتوبر کو پاکیزہ کی تبصرہ نگار پروین وحید کی سالگرہ ہے۔

☆ 17 اکتوبر کو ڈاکٹر ندا نوید سیٹھی کی سالگرہ ہے۔

☆ 31 اکتوبر کو میرے پیارے بھائی احمد نعیم صدیقی کی سالگرہ ہے۔

☆ پاکیزہ کی قاری نیلوفر اور ان کے بھائی تقی حیدر کی اس ماہ سالگرہ ہے۔

☆ اکتوبر کے ہی کسی دن ہماری شاعرہ فریدہ خانم کی سالگرہ ہے۔

☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار صائمہ شاہ، راول پنڈی ان دنوں بسترِ علالت پر ہیں ان کی کلی صحت کے لیے دعا کریں۔

☆ افسانہ نگار نزہت جبیں ضیا کے شوہر کا ہرنیا کا آپریشن ہوا ہے۔ اب وہ بفضلِ خدا بہتر ہیں۔ (ماشاءاللہ)

☆ افسانہ و ڈراما نگار اور ناول نگار رفاقت جاوید، اسلام آباد کا دوسرا ناول ان دنوں زیرِ طبع ہے۔ (پیشگی مبارک باد)

☆ شاعرہ سیدہ ہما شاہ کا پہلا شعری مجموعہ مجھے چاہو شائع ہوگیا ہے۔ ہما نئی نسل کی نمائندہ شاعرہ ہیں جس کے شعروں میں نہ صرف دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے بلکہ آنکھوں سے پھسلتے آنسو بھی درِدل پر دستک سی دیتے ہیں۔ ہما ایک خوش فکر شاعرہ ہے جس کی شاعری میں حالات کی دھوپ چھاؤں بھی صاف دکھائی دیتی ہے۔ اس خوب صورت مجموعے کی قیمت صرف 160 روپے ہے جسے آپ روبی پبلی کیشنز، الحمد مارکیٹ، اردو بازار، لاہور سے حاصل کرسکتے ہیں۔

☆ شاعرہ فاطمہ نجیب کا پہلا مجموعہ کلام تم ابرِ گریزاں ہو کتابی صورت میں بڑے اہتمام کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ فاطمہ نجیب ایک کہنہ مشق شاعرہ ہیں۔ بات کہنے کا سلیقہ بہ خوبی جانتی ہیں۔ ان کا اندازِ بیان سادہ اور موثر ہے اور زندگی سے ہم آہنگ ہے۔ ڈاکٹر کوثر سلیم اور رضیہ خاں کی آرا نے اسے مزید مستند بنادیا ہے کتاب کی قیمت صرف 500 روپے ہے۔ منگوانے کا پتا یہ ہے علم و عرفان پبلشرز، الحمد مارکیٹ، 40 اردو بازار، لاہور۔

٭٭٭

انتقالِ پُرملال

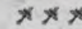
☆ افسانہ نگار سلمیٰ غزل کے بھائی عبدالوہاب خان کا لندن میں انتقال ہوگیا ہے۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری اور معروف بزنس مین خواجہ شکیل احمد کی اہلیہ نسرین شکیل کراچی میں وفات پاگئیں۔

☆ پاکیزہ کی تبصرہ اور مراسلہ نگار پروفیسر فرزانہ سلیم، میاں چنوں چل بسیں۔

☆ پاکیزہ سے وابستہ ہماری پیاری مصنفہ صائمہ قیصر کی والدہ محترمہ لاہور میں انتقال کرگئیں۔

نوٹ: تمام مرحومین کے لیے ایک مرتبہ سورۂ حمد اور تین بار سورۂ اخلاص پڑھ کر ان کی مغفرت کے ساتھ دعا کریں کہ ان تمام مرحومین کو اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔



✍ ذکیہ ایوب، کراچی سے۔ ”عید کے بعد عیدی کی صورت میں پاکیزہ ملا۔ لبنیٰ عروج کے انتقال کی خبر کے ساتھ دو خوش خبریاں بھی اس شمارے کی زینت ہیں۔ رفعت سراج کا ناول اور عمیرہ احمد کا انٹرویو جو آپ نے کرنا ہے۔ عکس میں کہانی نے نیا موڑ لیا ہے۔ شیر دل اور شہر بانو کی علیحدگی سب کچھ تجسس سے بھرپور ہے۔ اسما قادری کی تحریر بہت اچھی لگی۔ کرن احمد کا ملن کی رات بھی مناسب تھا۔ زندگی بہت گہرا لکھ رہی ہیں ناہید۔ شکر ہے ثریا اور نادر میں انسانیت ہے جو تسنیم کے والدین کا ساتھ دے رہے ہیں۔ نظارت نصر کا افسانہ واقعی سچ تھا۔ سکینہ فرخ کا مکمل ناول بہت ہی زبردست تھا۔ ماہم کا کردار لڑکیوں کے لیے بے مثال تھا۔ بعض جملے بہترین لگے، شاباش۔ زاہدہ پروین کی تحریر بس اچھی تحریر تھی۔ عید کے مہینے میں رمضان کی مصروفیات عجیب لگیں۔ سدرۃ المنتہیٰ نے اپنے ماحول کی خوب عکاسی کی۔ سدرہ تم اپنی تحریروں میں بے حد خوب صورت جملے استعمال کرتی ہو۔ شمیم فضل خالق کا فریبِ محبت اچھا تو تھا مگر حقائق سے دور لگا کہ موت تو برحق ہے۔ گزشتہ افسانہ زیادہ اچھا تھا۔ رفاقت جاوید کا سرپرائز عید کے حوالے سے مناسب تحریر لگی۔ شیریں حیدر کی انٹری اچھی لگی مگر کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ تحریر رمضان سے پہلے شائع ہوتی تاکہ لوگوں کی معلومات میں اضافہ ہوتا۔ بہنوں کی محفل میں اس دفعہ بہت سی بہنوں نے کافی سالوں کے بعد شرکت کی ہے۔ بہت سے نام مدتوں کے بعد نظر آئے اور اچھا لگا۔ انجم تمہاری محبت میں ایک ایسی کشش ہے جو عمر رسیدہ بہنوں کو بھی اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اب اپنا کوئی ناول جلدی سے لے کر آجاؤ۔ اسے پڑھنے کے لیے اور کتنا انتظار کرنا پڑے گا۔ عظمیٰ کو بھی لکھنے کی طرف مائل کرو۔“ (بہت بہتر)

✍ مسز نزہت اشفاق، کراچی سے۔ ”اگست کا شمارہ پسند آیا۔ تمام افسانے اور ناول ڈھیرے ڈھیرے پڑھے۔ روحانی مشورے بہت عمدہ جارہے ہیں اور اس کے لیے میں اپنی آزمودہ چیزیں بھی ضرور بھجواؤں گی۔ مصنفہ لبنیٰ عروج کے انتقال کا سن کر بہت افسوس ہوا۔ گزشتہ ماہ ہی تو ان کا افسانہ پاکیزہ میں شائع ہوا ہے۔ اچھی مصنفہ بہت جلدی چلی گئیں۔“ (اللہ ان کے لواحقین کو صبر عطا فرمائے، آمین)

✍ فیروزہ بیگم، کراچی سے۔ ”انجم تم سے جب یہ پتا چلا کہ لبنیٰ عروج اب ہم میں نہیں رہیں تو ایک دھچکا سا لگا۔ اپنی تحریروں سے لوگوں میں زندگی کی شمع روشن کرنے والی کی اپنی شمع بجھ بھی گئی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت

الفردوس میں مقام عطا فرمائے، آمین۔ زندگی واقعی پانی کا بلبلہ ہی ہے۔ کس نے کب جانا ہے کسی کو نہیں پتا۔ اس لیے ہر ایک کو ہر ایک سے محبت اور عزت کے ساتھ ملنا چاہیے۔“ (بالکل کہ یہ تو طے ہے کہ ہر نفس نے موت کا ذائقہ چکھنا لازمی ہے مگر کب اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا مگر اچھا اخلاق ایک ایسا گُر ہے کہ اگر کوئی اچھے میں یاد نہ کرے تو برائی میں بھی یاد نہ رکھے)

✍ ثانیہ حبیب، بستی پیر سے۔ ”پاکیزہ پسندیدہ ماہنامہ ہے پڑھ کر مزہ آتا ہے اور آپ سے بات کرکے خوشی ہوتی ہے۔ میں اپنی کزن کے لیے دعا کرنا چاہتی ہوں جو بیمار ہے۔ مجھے بہنوں کی محفل سب سے زیادہ اچھی لگتی ہے۔ پاکیزہ کے تمام ناول اے ون ہیں۔ لبنیٰ عروج کے انتقال کی خبر سن کر بے حد افسوس ہوا۔“ (پیاری ثانیہ آپ کی کزن کی صحت یابی کے لیے ہماری تمام بہنیں دعا کریں گی)

✍ ثریا وحید، لاہور سے۔ ”باجی کراچی کی بہنیں کتنی خوش نصیب ہیں۔ سب آپ سے مل لیتی ہوں گی۔ میرا دل بھی چاہتا تھا کہ کاش میں کراچی میں ہوتی تو آپ کی اچھی سی دعوت کرتی۔ میں اپنی رخصتی کے بعد کراچی چکر لگاؤں گی اور آپ سے اور دیگر مصنفات سے ملنا چاہوں گی۔“ (آپ کراچی ضرور آیئے مگر گڑیا دعوتیں کھانے کی تو میں کبھی شوقین ہی نہیں رہی۔ ابھی ہماری پیاری مصنفہ نگہت اعظمی نے اپنے ہاں لنچ پر جہاں بہت ساری رائٹرز کو بلایا تھا وہاں مجھے بھی بڑی محبت سے مدعو کیا تھا مگر میں نہیں جاسکی تھی۔ ہاں آپ کا جب بھی کراچی آنا ہو تو میرے غریب خانے پر تشریف لائیں کہ مجھ سے ملنا کوئی اتنی اہم بات نہیں ہے)

✍ پروفیسر شیریں تسلیم، لاہور سے۔ ”عید نمبر پسند آیا۔ شیریں حیدر کی تحریر کافی عرصے کے بعد پڑھی پسند آئی۔ سدرۃ المنتہیٰ نے بہت اچھا لکھا۔ سکینہ فرخ نے اچھا نہیں بلکہ بہت اچھا لکھا۔ دونوں ناول کمال کے ہیں۔ انجم تم سے یہ کہنا ہے کہ اپنا افسانہ ہی لے آؤ کہ عادت جو ہوچکی ہے تمہاری تحریریں پڑھنے کی۔ ہاں ناول کب لکھ رہی ہو؟“ (پہلے میں افسانہ دوں گی اور ناول تو بہت خوب صورت پڑھنے کو مزید ملیں گے)

✍ خالدہ نسیم، یوکے سے۔ ”آپ کی خیریت اور مصروفیت رسالہ پڑھتے ہوئے معلوم ہوجاتی ہے اور اگر تصویر نظر آجائے تو سمجھیں ملاقات بھی ہوجاتی ہے۔ اس بار پاکیزہ بالکل وقت پر ملا۔ پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ اداریہ، جلترنگ اور تقریب کا آنکھوں دیکھا حال عظمیٰ کی ڈائری کی حمد و نعت سب بہت اچھا لگا۔ دلہن نمبر کے لیے یہ ضرور کہوں گی کہ صرف زیور، خوب صورت جوڑا پہن کر دلہن بن جانا ہی کافی نہیں ہوتا۔ اصل زندگی تو بعد کی ہے اور سب لڑکیوں کو ہمیشہ اپنے شوہر کے ساتھ سسرال والوں کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔“ (بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ)

✍ نور افشاں، شکار پور سے۔ ”سب سے پہلے پاکیزہ ڈائری میں حمد، نعت اور کوئی حدیث پڑھنے کے بعد میں پڑھتی ہوں مجھے کچھ کہنا ہے جو ہر مہینے بہت اچھا اور سبق دینے والے ٹاپک پر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اگست کے شمارے میں روحانی مشورے، پاکیزہ سندیسے، جلترنگ سب کچھ زبردست تھا اس مرتبہ جلترنگ والا خاکہ لوڈشیڈنگ، بہت حقیقت کے قریب لگا۔ عکس کی تعریف کے لیے تو میرے پاس الفاظ ہی نہیں مگر عمیرہ جی آپ کی اتنی اسمارٹ اور انٹیلی جنٹ ہیروئن عکس فاطمہ کو کبھی نماز ادا کرتے نہیں دکھایا؟ زندگی ناول پڑھ کے بہت اچھا لگتا ہے اس میں نمبر ون تقدیم کا کیریکٹر اور دوسرے نمبر پر حجاب کا اچھا لگتا ہے۔ پاکیزہ اتنا اچھا ڈائجسٹ ہے کہ میں بتا نہیں سکتی پلیز آپ اپنا اور عمیرہ احمد کا انٹرویو دیں تصویروں کے ساتھ اور باجی میں آپ سے ناراض ہوں آپ نے اب تک اپنا کوئی ناول پی ٹی وی کے لیے کیوں نہیں دیا؟ اور کانچ سی لڑکی کے بعد دوسرا ناول کیوں نہیں لکھا اب تک؟ اور پلیز بالوں کو لمبا کرنے کے ٹوٹکے بھی دیں۔ آپی رخ چوہدری کے کزن کی شہادت کا بھی بہت دکھ ہوا۔ اللہ پاک ان کو صبر دے آمین، اور امینہ جی کو صحت، آمین۔“ (آپ کی رائے پہنچائی جارہی ہے۔ بال لمبے کرنے کے لیے بالوں میں ہر وقت تیل ڈالو اور کس کر چوٹی بناؤ)

✍ افتخار شوق، میاں چنوں سے۔ ”فرزانہ سلیم میاں چنوں کی دردناک موت کا دلی افسوس ہے۔ مشترکہ دکھ ہے اس لیے آپ کو اطلاع دینا ضروری سمجھا۔ اپریل 2012ء سے بیمار تھی بہت سی بیماریوں سے جنگ لڑتے لڑتے 10 اگست 2012ء کو ہم سے بچھڑ گئی۔ زندہ دل شخصیت میاں چنوں کی پہچان خوب صورت لب و لہجے کی مالک۔ کالج میں مختلف پروگرام کی کمپیئرنگ کرتے ہوئے مخصوص انداز۔

اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے جن کی ماں ان سے 42 سال کی عمر میں جدا ہو گئی۔ پاکیزہ کے سبھی سلسلے اچھے ہیں۔ عکس لاجواب ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ زندہ کردار ہمارے سامنے ہوں۔ ڈی سی او صاحب کے ساتھ خانیوال میں ایک میٹنگ کے دوران میں نے کہا کہ سرشیر دل تو آپ ہیں عکس کدھر ہے۔ ساتھ ہی میں نے پاکیزہ کی تحریر کا حوالہ دیا، بہت ہنسے۔'' (پسندیدگی کا شکریہ)

✍ گیتی آرا، کراچی سے۔ ''باجی! سمجھ میں نہیں آرہا کہ کہاں سے شروع کروں۔ آپ سب کو عید کی مبارک باد دوں یا اپنے اوپر ٹوٹنے والی قیامت کا مژدہ سناؤں۔ شفیق باپ کی اچانک موت نے ہمیں نیم پاگل سا کر کے رکھ دیا ہے۔ وہ باپ جو اپنی لاڈلی بیٹی کی صورت دیکھے بنا ایک پل جی نہ پاتا تھا وہ یوں اچانک ہی اس کے بنا منوں مٹی تلے جا سویا اور ابھی باپ کی موت کا غم ہلکا بھی نہ ہوا تھا کہ باپ جیسی شفیق ہستی ہمارے چچا جگر کے کینسر میں مبتلا ہو کر اپنی بھتیجی کا ساتھ چھوڑ گئے جو اُن کی صورت، اندازِ تکلم میں اپنے باپ کو دیکھا کرتی تھی۔ باجی آپ سے درخواست ہے کہ اگر آپ میرے والد مرحوم اور چچا کے لیے مغفرت کی دعا اور پاکیزہ کے تمام قارئین ان کے نام سے ایک ایک سپارہ بھی پڑھ لیں تو ڈھیروں سپارے میرے پیاروں کے نام سے ختم ہو جائیں گے اور یہ نہ صحیح تو فاتحہ پاکیزہ کے تمام قارئین ان کے نام سے کر دیں تو بے حد مشکور ہوں گی۔'' (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

✍ مسز فرح امجد، لاہور سے۔ ''میری طرف سے تمام میری پاکیزہ بہنوں کو مبارک باد یں جن کے سیریل ٹی وی چینلز پر دکھائے جا رہے ہیں اور جن کی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ آپی لبنیٰ عروج کی وفات کی خبر پڑھ کر تو میرا دل ہی دہل گیا۔ اتنی پیاری اور خوب صورت رائٹر اتنی جلدی اپنے دائمی سفر پر روانہ ہو گئی یقین ہی نہیں آرہا۔ اللہ تعالیٰ لبنیٰ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور درجہ بہ درجہ ان کے درجات بلند کرے، آمین۔ لبنیٰ کے عزیز و اقارب کے ساتھ پاکیزہ بہنیں بھی اُن کے دکھ میں برابر کی شریک ہیں۔ آپی عکس اور زندگی بہت خوب صورتی سے آگے بڑھ رہے ہیں ویسے تو تمام پاکیزہ تحریریں ہی ہماری جان ہیں۔'' (نوازش)

✍ فریدہ افتخار، پشاور سے۔ ''امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ عرصہ دراز کی غیر حاضری کے بعد حاضرِ خدمت ہو رہی ہوں۔ 6 ماہ بیٹے کے پاس امریکا میں گزارے اچھا وقت کٹا۔ رمضان شریف اور عید بیٹی کے ساتھ رہی' ہماری سمدھن صاحبہ بھی آئی ہوئی تھیں سو ہمارا رمضان شریف کا بابرکت مہینہ سب کے ساتھ بالخصوص نواسوں کے ساتھ بے حد اچھا گزرا اور اب ہم ہیں اپنے پیارے ملک کے پیارے شہر میں۔ وہ الگ بات کہ بجلی کی لوڈ شیڈنگ سے کوفت ہو رہی ہے۔ باہر ملکوں میں یہ مشکلات نہیں ہیں۔ جون، جولائی کے شمارے دبئی میں نہ مل سکے۔ اب آتے ہی ماہِ اگست کا شمارہ پڑھنے کو ملا۔ سلمیٰ غزل صاحبہ کی کہانی ہم الزام صفحہ نمبر 184 سطر نمبر 8 کی تحریر دل دُکھا گئی۔ انہوں نے پٹھانوں کی خاصیتیں سخت دل، بے رحم اور ضدی گنوائیں۔ من حیث القوم آپ کسی پر اس طرح کا لیبل نہیں لگا سکتیں۔ 1000 میں سے ایک آدھ کیس ایسا ہوتا ہوگا مگر بظاہر کرخت، اکھڑ نظر آنے والے پٹھان مہذب نرم دل، نرم خو، رحم دل سونے پہ سہاگہ مہمان نواز ہوتے ہیں۔ سخت مزاجی' اکھڑ پن انہیں اپنی چند روایات کو سامنے رکھ کر دکھانا پڑتا ہے، اس وقت جب ان کی عزت آبرو پر آنچ آئے۔ نہ پٹھان عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں جس کا اکثر ہی افسانوں میں بھی ذکر ہوتا ہے۔ عورت بیاہ کر لاتے ہیں تو اس کی عزت آن کی پاسداری میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ میرے مرحوم شوہر اعلیٰ تعلیم یافتہ، مہذب اور نفیس انسان تھے ایک بار جو ان سے مل لیتا ان کا گرویدہ ہو جاتا۔ میں نے ساری زندگی ان جیسا مہذب شخص نہیں دیکھا۔ آپ کہیں گی کہ میں پرسنل ہو گئی ہوں۔ ہرگز نہیں، پٹھان اتنے خراب ہوتے تو ہماری لکھاری بہنیں اپنی کہانیوں میں دُرّانیوں، آفریدیوں کا ذکر فخر سے نہ کرتیں۔ آپ کو پٹھان مزدوری کرتے، بھٹے بیچتے، بوٹ پالش کرتے، چوکیداری کرتے (غربت کی وجہ سے) تو نظر آئیں گے مگر بھکاری ہاتھ پھیلائے کبھی نظر نہیں آئیں گے۔'' (باتیں ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ)

✍ سلمیٰ غزل، کراچی سے۔ ''ستمبر کے پاکیزہ میں فائزہ فیروز کا تبصرہ پڑھ کر دل دُکھ سے بھر گیا۔ میں تو کسی کی دل آزاری کے بارے میں لکھنا تو دور کی بات سوچنا بھی گناہ سمجھتی ہوں پھر بھی ان تمام لوگوں سے معذرت خواہ ہوں جن کی دل آزاری ہوئی اس وضاحت کے ساتھ کہ میں خود یوسف زئی پٹھان ہوں۔ نانا، دادا کا تعلق افغانستان سے تھا پشتو

اسپیکنگ اور میرے نانا اسی طرح کے ملتے جلتے حالات سے مجبور ہو کر میری امی اور ماموں کو لے کر انڈیا شفٹ ہوئے تھے۔ یہ کہانی میری امی نے بچپن میں سنائی تھی جس کو میں نے افسانوی رنگ دیا۔ میں تو خود پورا پاکستان ہوں۔ ٹھٹھہ میں پلی بڑھی سندھی روانی سے بولتی ہوں۔ میاں پنجابی، ایک بہو گجراتی ایک پنجابی اور داماد پٹھان۔ میں کیسے تعصب میں مبتلا ہو سکتی ہوں۔ میرے کالج کے ساتھی میرے پڑوسی اور میرے جاننے والے میرے کھلے ذہن اور وسیع النظری کی مثال دیتے ہیں اور گواہ ہیں۔ امید ہے اس وضاحت سے میری بہنوں کی تشفی ہو گئی ہوگی' میں بہنوں کی دل آزاری پر معذرت خواہ ہوں۔'' (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے۔ ہم سب ایک ہی گلدستے کے پھول ہیں۔ ہم سب ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اس لیے ہر بہن کو چاہیے کہ اپنی تحریروں کے ذریعے محبت بانٹیں نہ کہ ان میں کمی لاتے جائیں)

✍ یاسمین کنول، پسرور سے۔ ''آپ کا خلوص ہمیں بار بار کھینچ لاتا ہے۔ پاکیزہ کی روحِ رواں آپ ہیں۔ آپ کی سوچ آپ کی لگن اس کے ورق ورق سے عیاں ہے۔ پتا نہیں کب میں نے غزل بھجوائی تھی لیکن آپ نے ردی کی ٹوکری میں نہیں ڈالی۔ پاکیزہ اگست 2012ء کی زینت بنائی جس کے لیے دل کی گہرائیوں سے مشکور ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت سلامتی کے ساتھ لمبی عمر عطا فرمائے اور پاکیزہ کو مزید ترقی دے، آمین۔ باقی پاکیزہ حسبِ معمول بہتر سے بہترین کی طرف گامزن ہے۔ تمام سلسلے لاجواب ہیں۔'' (پیاری یاسمین ہم ہر تحریر اور ہر تصویر کو بڑی احتیاط کے ساتھ سنبھال کر رکھتے ہیں اور اچھی تحریریں بے شک تاخیر سے شائع ہوں مگر وہ ضرور شائع ہوتی ہیں)

✍ ارم کمال، فیصل آباد سے۔ ''ستمبر کا کلرفل شمارہ ہاتھوں میں آیا تو لگا کہ عید کے بعد ڈبل عید آ گئی۔ سرورق نہایت دیدہ زیب تھا کہ نظریں ہٹانے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ سب سے پہلے لبنیٰ عروج کے بارے میں پڑھا دل کو بے حد شاک لگا ابھی تو اختر بیگانہ کی جدائی کا زخم بھی ہرا تھا کہ لبنیٰ عروج بھی خالقِ حقیقی سے جا ملیں اللہ تعالیٰ کی مصلحت اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے گھر والوں کو صبرِ جمیل عطا کرے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام مرحمت فرمائے، آمین۔ سب سے پہلے عمیرہ احمد کی کہانی عکس پڑھی یہ اتنی زبردست ہے کہ لگتا ہے ہم بھی اسی کا ایک کردار ہیں اگرچہ کہانی عام زندگی سے ہٹ کر ہے مگر عمیرہ جی کے قلم میں جادو ہے۔ عمیرہ جی تسی آ گئے تے چھا گئے او، ناہید سلطانہ اختر کے قلم کی جولانیاں بھی عروج پر ہیں۔ اس کے علاوہ عظمیٰ افتخار اور رفاقت جاوید کے اوسط درجے کے افسانے تھے۔ سب سے زبردست افسانہ شیریں حیدر کا عید کہتے ہیں جسے بہت ہی سبق آموز افسانہ تھا ویل ڈن شیریں حیدر ہر لفظ نے اپنی گرفت میں جکڑ کر رکھا۔ روحانی مشورے میں بے حد قیمتی تحفے تھے جو میں نے فوراً ڈائری میں نوٹ کر لیے۔ جلترنگ نے ہمیشہ کی طرح ٹینشن دور کر کے باغ و بہار کر دیا پورا شمارہ رنگ برنگے رنگوں سے لشکارے مار رہا تھا اور اس کی کرنیں ہمارے دلوں کو منور کر رہی تھیں۔'' (نوازش)

✍ پروین افضل شاہین، بہاولنگر سے۔ ''سرورق واقعی جاذبِ نظر تھا۔ افسانوں میں عید کہتے ہیں جسے، سرپرائز، کوئی شہر ایسا بساؤں میں، راستوں کی تلاش میں' مجھے ہے حکم اذاں، دونوں ہی سلسلے وار ناولز بھی خوب پسند آ رہے ہیں۔ ہمیں بہت دکھ ہو رہا ہے کہ آج لبنیٰ عروج ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ ہم سب اللہ کے ہیں اور ہمیں اس کے پاس جانا ہے کسی نے پہلے اور کسی نے بعد میں۔ ہماری دعا ہے اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت میں جگہ دے، آمین۔ آج کل میری دوستیں مجھے کہتی ہیں ادھو پروین تم وہی ہو جسے ہم موٹاپے کی وجہ سے سنڈا فاس کہتے تھے مگر اب تم گنے جیسی پتلی ہو گئی ہو میں انہیں کہتی ہوں میں سنڈا فاس جب تھی جب مجھے ملتانی سوہن حلوا پاکیزہ کی طرف سے ملتا تھا مگر اب نہ ملتانی حلوا ہے نہ ہی موٹاپا۔'' (دبلی عورتیں بھی لڑکیاں نظر آتی ہیں مت حلوے کھاؤ پھر بھینس ہو جاؤ گی)

✍ سمیرا کنول، ڈیرا غازی خان سے۔ ''دلہن سے سجا سرورق بہت پیارا تھا۔ خاص طور پر ماڈل کا لباس اور میک اپ۔ سب سے پہلے اداریہ پڑھا اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ تمام امتِ مسلمہ میں اتحاد و یگانگت پیدا کر دے، آمین۔ اس کے بعد بہنوں کی محفل پر جا پہنچی جو ہمیشہ کی طرح زوروں پر تھی۔ لبنیٰ عروج صاحبہ کے انتقال کی خبر پڑھ کر دلی دکھ اور رنج ہوا۔ اللہ مرحومہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے، آمین اور ان کی فیملی کو بھی صبرِ جمیل عطا کرے۔ محترمہ یاسمین ناز صاحبہ کا خط پڑھ کر عجیب سا لگا۔ بہنوں کی محفل تو پاکیزہ کی جان ہے۔ آپ نے یہ کیسے کہہ دیا کہ اس کی جگہ کوئی ناولٹ لگایا جائے۔ آپ کا مشورہ ہمیں احمقانہ ہی لگا (بہت معذرت کے ساتھ) بہنوں کی محفل تو پاکیزہ کا مہمان خانہ ہے۔

جہاں ہماری پیاری میزبان مدیرہ انجم باجی ایک اچھے میزبان کی طرح تمام آدھی ملاقات کرنے والی بہنوں کا بہت اچھے طریقے سے خیال رکھتی ہیں۔ جس طرح میٹھی عید ہو اور سویاں نہ ہوں بالکل اسی طرح پاکیزہ ہو اور بہنوں کی محفل نہ ہو۔ سب سے پہلے عکس پڑھی جو منفرد اور اچھوتی کہانی ہے اور عمیرہ آپی کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ جب سے پاکیزہ میں کہانی عکس شروع ہوئی ہے تب سے پاکیزہ کے قارئین میں بے شمار اضافہ دیکھنے میں آرہا ہے۔ بہ الفاظ دیگر پاکیزہ کی ریٹنگ بہت ہائی لیول تک جا پہنچی ہے (ماشاءاللہ) اس کے بعد مکمل ناول پڑھا جو ایک ہی تھا مجھے ہے حکم اذاں سکینہ فرخ کا بس سو سو لگا۔ افسانوں میں اسما قادری خود آگہی کے ساتھ آئیں۔ ویلڈن اسما جی خوش رہیں۔ ناولٹ ویسے تو دونوں ہی اچھے تھے لیکن مجھے زیادہ نگہت سیما کا کوئی شہر ایسا بساؤں میں بہت پسند آرہا ہے۔ نگہت سیما حساس لکھاری ہیں جو ہمیشہ سچ پر لکھتی ہیں۔ سلام عید زاہدہ پروین ہلکی پھلکی تحریر کے ساتھ نظر آئیں۔ باقی فریبِ محبت شمیم فضل خالق سرپرائز رفاقت جاوید عید کہتے ہیں جسے شیریں حیدر نے بھی اچھے افسانے لکھے۔ خصوصی مضامین دونوں اچھے تھے۔ دین کی باتیں تو ہوتی ہی بہترین ہیں۔ ناہید سلطانہ اختر کا ناول زندگی دھیرے دھیرے آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے حجاب کی شادی سیف علی خان سے ہوگی اور ہاں انجم باجی، اگر ہو سکے تو ہومیو کلینک والا سلسلہ بند کر دیں کیونکہ کم و بیش ایک ہی سوال و جواب شائع کیے جاتے ہیں اس کی جگہ اگر بزمِ پاکیزہ دوبارہ شروع کریں گی تو ہمیں بے انتہا خوشی ہوگی۔ ویسے اس ماہ کا جلترنگ مجھ سے زیادہ میری امی کو پسند آیا۔ خصوصاً ہمت۔ مجموعی طور پر عید کا پاکیزہ اے ون رہا۔" (شکریہ)

✍ امینہ عندلیب، سلانوالی سے۔ "آپ سے ابھی فون پر بات ہوئی۔ لبنیٰ عروج، فرزانہ سلیم کی ابدی جدائی کی خبر بہت غمزدہ ہے۔ پھر ہماری وہ بہنیں جو ہم سے کتنے برس پہلے ہمیں چھوڑ گئیں ان کی بھی یادیں دل کو غمزدہ تو کرتی ہیں۔ لبنیٰ عروج نے جب بھی لکھا بے حد اچھا لکھا بہنوں سے ہمیشہ داد وصول کی۔ ہنس مکھ، کیوٹ سی آپی کو اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، جب ہمارے پیارے ہم سے بچھڑ جائیں اس سفر پر تو ہم ان کے لیے یہ تحفہ تو بھیج سکتے ہیں۔ تمام بہنیں 1000 پہلا کلمہ 100 بار سورۂ اخلاص، 3 بار سورۂ فاتحہ ہر بہن پڑھے اور کسی بہن یا آپ کو جمع کروا دیں سوا لاکھ کلمہ آسانی سے پڑھا جا سکتا ہے اور ان کی روح کو ایصال کیا جائے۔ نیکی کا کام ہے دو دن میں آسانی سے پڑھ سکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اجر دے گا آج سے شروع کریں یہ کام۔ میری طرف سے 1000 پہلا کلمہ، 100 سورۂ اخلاص، 3 بار سورۂ فاتحہ میں پڑھ چکی ہوں۔ جس بہن کو بات اچھی لگی عمل کیجیے اور جن کو نہیں پلیز مائنڈ نہ کرنا۔ باجی شبِ قدر میں نے آپ کے نام سے تمام بہنوں کے نام بھی کاغذ پر لکھے سب کے لیے بہت دعائیں کیں۔ اندرون بیرون ملک تمام بہنوں کے نام لے کر۔ باجی پاکیزہ نے ہمیں ایک پلیٹ فارم پر جمع کر رکھا ہے۔ باجی انجم کا تمام بہنیں خیال رکھا کریں ان کی صحت اب اچھی نہیں رہتی۔ اللہ تعالیٰ ہماری پیاری باجی کو سلامت رکھے، آمین۔ باجی یہ سال میرا آنسو سے شروع ہوا اور اب تک آنسوؤں پر چل رہا ہے مجھے باجی بہت دکھ ملے ہیں اور ملتے رہیں گے۔ میں نے کبھی کسی کا برا نہیں چاہا کسی کا بلا مقصد دل نہیں دکھایا۔ اس عید پر اتنا روئی کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتیں۔ صرف یہ دکھ کہ میرا کوئی نہیں لوگوں نے اس لیے مجھے دکھ دینے کی ٹھان لی ہے۔ ہائے باجی یہی معاشرہ دکھ دیتا ہے یہی بدنامیوں کا طوق گلے میں ڈالتا ہے۔ میں تھک گئی باجی میں تھک گئی۔ نہ میں بدلہ لیتی ہوں اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والا ہے۔ باجی کوئی ایسی دعا بتا دیں میرا دل و دماغ سکون میں رہے۔ میرے پاس اگر کمی ہے تو رشتوں کی اور پیار کی۔ باجی میں ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب ہوں۔ دعا کرنا میں ایمان کے ساتھ دنیا سے جاؤں۔ تنگ آ کر انسان بہت کچھ کر سکتا ہے۔ میں آپ سب بہنوں کے لیے دعا کرتی ہوں۔ بس کسی کا خدارا بلاوجہ دل نہ دکھاؤ، آنسو نہ دینا۔" (پیاری امینہ اللہ تمہیں کلی صحت عطا فرمائے اور تم ہمیشہ خوش رہو، آمین)

✍ حرا رشید خان، کراچی سے۔ "پاکیزہ کے تمام اسٹاف کو، ہر رائٹر کو، قارئین کو میری طرف سے بہت بہت عید الفطر کی خوشیاں اور سوغات مبارک ہو۔ میرا پہلا خط پاکیزہ کی زینت بنا مجھے تو یقین ہی کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ خط پڑھ کر میں ایسی اچھلی جیسے کسی کو کرنٹ لگتا ہے۔ وہاں گڑھا بھی پڑ گیا ہے۔ خیر فوراً شکرانے کے نفل ادا کیے۔ اب ذرا پاکیزہ میں شامل کہانیوں کی بات ہو جائے۔ نمرہ احمد آپ کا تو جواب ہی نہیں دل چاہ رہا تھا کہ اڑ کر آپ کے پاس پہنچ جاؤں اور آپ سے کچھ سیکھوں۔ میں بہت بڑی فین ہوں براہِ کرم میری دوستی قبول کریں۔ نبیلہ ابر راجا آپ کی تعریف کرنا سورج کو چراغ

دکھانے کے مانند ہوگا۔ آپ تو تعریفوں کی محتاج ہی نہیں۔ خیر میں کس کس کا نام لوں۔ سب ہی تو اعلیٰ ہیں۔ پورا پاکیزہ اپنے نام کی طرح تھا بہت مزہ آیا پڑھ کر۔ آخر میں سب کو بہت بہت خوشیاں مبارک۔ سدا خوش رہیں۔" (شکریہ)

✍ راحت وفا، لاہور سے۔ "کیسی ہیں آپ! خدا تعالیٰ آپ کو ہمیشہ شاد و آباد رکھے۔ آپ نے تو مجھے بھلا ہی دیا۔ زیادہ نہیں تو دو چار قدم کا تو ساتھ ہے ناں ہمارا آپ کا۔ پاکیزہ ہمیشہ کی طرح بہت اچھا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے اور ترقی دے۔" (گڑیا دو چار قدم کا نہیں بہت طویل ساتھ ہے۔ بے شک تم نے لکھنا دیر سے شروع کیا مگر پڑھتی تو رہی ہو)

✍ سارہ، اسلام آباد سے۔ "میرا نام سارہ ہے اور میں اسلام آباد میں رہتی ہوں۔ میں اپنی زندگی میں پہلی دفعہ کسی ڈائجسٹ میں خط لکھ رہی ہوں بہت عجیب لگ رہا ہے۔ میں عمیرہ احمد کی بہت بڑی فین ہوں اور اب ان ہی کی وجہ سے پاکیزہ لینا شروع کیا ہے۔ عکس بہت فٹ جا رہا ہے مگر میں بالکل بھی نہیں چاہتی کہ عکس کی شادی شیر دل سے ہو۔ میں رائٹرز میں صرف عمیرہ احمد کو ہی جانتی تھی مگر پاکیزہ کی وجہ سے اور بھی بہت سے رائٹرز کو جاننے لگی ہوں۔ ناہید سلطانہ اختر کا زندگی بہت زبردست جا رہا ہے۔ نمرہ احمد کا لاپتا بھی بہت اچھا لگا خاص طور پر اس کا اختتام۔ نمرہ احمد کے ٹاپک بھی کافی الگ ہوتے ہیں۔ عقیلہ حق کا حصارِ محبت بہت اچھا اور سچا لگا۔ آپ کا پورا پاکیزہ ہی بہت زبردست ہوتا ہے۔ آپ سب کی محنت خوب نظر آتی ہے۔ بہنوں کی محفل پڑھ کر بہت مزہ آتا ہے۔ میری دو چھوٹی بہنیں ہیں اور وہ مجھ پر بہت ہنستی ہیں کہ میں لوگوں کے خط بھی پڑھتی ہوں مگر ان کو کیا پتا کہ یہ خط پڑھ کر کتنا مزہ آتا ہے اور ساتھ ساتھ سب کی رائے بھی مل جاتی ہے۔" (اس محفل میں خوش آمدید۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ خط مکمل تبصرے کے ساتھ بھیجو گی)

✍ انجم مشیر، کراچی سے۔ "اگست 2012ء کا مجھے کچھ کہنا ہے ہمیشہ کی طرح دل میں اتر جانے والی بات کہ میں نے یہ جانا کہ یہ میرے دل میں بھی ہے۔ عکس آہستہ آہستہ منزل کی طرف رواں دواں ہے عمیرہ احمد خوب صورت لفظوں کا چناؤ اور استعمال ماشاءاللہ .... نوشین اختر کا جیا کی امی ماں کی طاقت اور محبت کا منہ بولتا ثبوت۔ یاسمین نشاط اختر کا تشنگی کا سفر ایمان کو تازگی بخشنے والی تحریر کہ خدا ہر برائی پر غالب ہے اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر۔ نگہت سیما کا کوئی شہر ایسا بساؤں زمین پر خدا بننے کی کوشش کرنے والے ایک اور فرعون کا افسانہ تابندہ جبیں کا ایکس اسٹوڈنٹ اپنی جنت میں خوش نہ رہنے والوں کے منہ پر طمانچہ۔ ناہید سلطانہ اختر کا زندگی آپ جو پہلے ہی دل پسند ہیں اب اور کیا کہیں بہت خوب اوہو انجم مشیر بھی براجمان ہیں شکریہ انجم۔ قرۃ العین ...... سچ تو یہ ہے سمجھوتے کی ایک راہ کہ ازدواجی زندگی کی گاڑی بڑھتی رہے نوجوان نسل کے لیے سبق آموز تحریر دل کا درد چھپا کر کیسے جیتے ہیں بڑوں کا مان رکھنا کتنا سکون دیتا ہے۔ دُرِ نایاب سو سو ہی تھا۔ صائمہ اکرم کا موسمِ گل حیران ہے معاشرے میں بڑھتی برائیوں کی ایک حقیقت آمیز شکل بہت اثر انگیز تحریر ہے۔ خدا ایسے فتنوں سے بچائے، آمین۔ بہنوں کی محفل میں بڑا خوب صورت ماحول ہے کتنی پیاری پیاری بہنوں کے خطوط...... اللہ کرے محفل ہمیشہ سجی رہے اور آخر میں تھکے ذہنوں کو سکون اور مسکراہٹیں بخشنے کے لیے جلترنگ کا ٹانک حاضر ہے بہت زبردست۔ اگست 2012ء کا عکس بہترین منظر ہے حال سے ایک دم ماضی کا سفر بڑا سسپنس رہا کہ عکس کس کی دلہن بنی۔ حصارِ محبت عقیلہ کی تحریر کچے کانوں کے مردوں کے لیے ہی ہے۔ نگہت سیما کا کوئی شہر ایسا بساؤں میں سیمل کی ننھی سی جان اور یہ نئی آفت۔ صلہ شبانہ شوکت واقعی اصل سے سود پیارا ہے اور ناہید سلطانہ اختر کی زندگی نے پھر کروٹ لی ہے۔" (پسندیدگی کا شکریہ)

✍ عظمیٰ عنبرین، ڈی جی خان سے۔ "عمیرہ احمد بہت کامیابی سے عکس کے کرداروں سے انصاف کر رہی ہیں۔ شہباز حسین کے بچپن کے چونکا دینے والے پہلو سامنے آئے۔ ناہید سلطانہ اختر کی تحریر زندگی بھی اچھے طریقے سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اس بار واقعات نے نیا مگر متوقع موڑ لیا۔ فرحانہ ناز ملک کیا حال ہے یار بہت دنوں سے تم سے رابطہ نہیں ہوا۔ تمہارے گھر آنے کی بات ہوئی تھی مگر پھر وہی پرگننسی کے مسائل میری کنڈیشن تو تم دیکھ ہی گئی تھیں۔" (ہاں اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے حالوں میں)

✍ صائمہ سجاد بنگش، کوہاٹ سے۔ "پاکیزہ نیٹ سے ڈاؤن لوڈ کر کے پڑھ لیا گرمی اتنی شدید تھی کہ باہر نکلنا مشکل تھا رمضان میں۔ اللہ بھلا کرے صائمہ اکرم کا جنہوں نے پاکیزہ کا لنک جلدی سے میل کر دیا اور ڈاؤن لوڈ کر کے پڑھ لیا۔ عنیزہ سید کا ناول ہمیں بہت دور سفر پر لے گیا۔ بیس پچیس سال پرانے سفر جہاں سے ہم سب کا بچپن شروع ہوتا ہے۔ لبنیٰ

دوپہریں اور اتفاق سلوک والا دور اب تو سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ عنیزہ سید نے بہت کچھ یاد کرا دیا۔ نگہت سیما ناولٹ اچھا جا رہا ہے۔ بعض مرد اپنی بیویوں کو اپنی پراپرٹی سمجھتے ہیں ساری عمر جوتی تلے دبا کر ہی رکھنا چاہتے ہیں۔ جلترنگ ہر دفعہ کی طرح لاجواب تھا۔ بعض مہمان واقعی لسوڑہ ہوتے ہیں۔ ناگہانی آفات کی طرح نازل ہو جاتے ہیں اور ان کے لیے ہر چیز اپ ٹو ڈیٹ رکھنی پڑتی ہے۔ کھانا پینا اور فل ٹائم کمپنی اور پھر ساتھ باندھ کے بھی دینا پڑتا ہے۔ اللہ بچائے ایسی مشکلات سے۔ نبیلہ ابر راجا کا درد واقعی دل دکھانے والا درد تھا۔'' (پسندیدگی کا شکریہ)

✍ عقیلہ حق، کراچی سے۔ ''عکس کی تو کیا بات ہے، زبردست جا رہا ہے۔ ان تمام بہنوں کا شکریہ جنہوں نے حصارِ محبت کو پسند کیا۔ ڈاکٹر ممتاز نے پسند کیا مجھے بہت خوشی ہوئی میں اکثر سوچتی تھی کہ ڈاکٹر ممتاز میرے افسانوں پر رائے نہیں دیتیں۔ خیر اللہ نے یہ خواہش بھی پوری کی۔ ہماری ایک بہن نے لکھا کہ آپ کی محبتوں نے ہم سب کو ایک ڈور میں باندھ رکھا ہے تو یہ حقیقت ہے کہ آپ سے بات کر کے مجھے بہت اچھا لگتا ہے لیکن میں صرف آپ کو اس لیے زیادہ فون نہیں کرتی کہ آپ بہت مصروف رہتی ہیں۔ لبنیٰ عروج کے انتقال کی خبر نے مجھے ہلا کر رکھ دیا کئی دفعہ پڑھا لفظوں کو بار بار پڑھا کہ کہیں کوئی غلطی نہ ہو۔ اف......! میں آپ کو اپنا دکھ بتا نہیں سکتی مجھے اس قدر صدمہ پہنچا ہے کہ لفظ کم ہیں بیان کرنے کے لیے۔ میں کالج لائف سے لبنیٰ عروج کو پڑھتی ہوں اور بے حد پسند کرتی ہوں میں آج تک ان سے ملی نہیں لیکن اب ایک امید تھی کہ کیونکہ میرا شمار بھی رائٹرز میں ہونے لگا ہے تو انشاءاللہ کہیں نہ کہیں تقریب میں ملاقات ضرور ہو گی لیکن افسوس میری خواہش حسرت بن گئی۔ اللہ مرحومہ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، آمین۔ ویسے انجم باجی لبنیٰ عروج کو بیماری کیا تھی (کینسر ہو گیا تھا) ذکیہ ایوب صاحبہ، آپ کے شوہر کی برسی ہے۔ انشاءاللہ میری دعاؤں میں وہ شامل رہیں گے۔ اللہ آپ کو ان کی جدائی سہنے کی ہمت عطا کرے، آمین۔ فریدہ جاوید صاحبہ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ ناہید سلطانہ صاحبہ کی تحریر کے کیا کہنے۔ ان کی تعریف تو سورج کو چراغ دکھانے جیسی ہے۔ سدرۃ المنتہیٰ نے بہت اچھا لکھا۔ افسانے سارے عید کے اعتبار سے اچھے اور مناسب تھے لیکن مجھے سب سے زیادہ شمیم فضل خالق کا فریب محبت پسند آیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ باقی افسانے اللہ نہ کرے اچھے نہیں تھے کہ پاکیزہ میں جو چیزیں شائع ہوتی ہیں معیاری ہوتی ہیں کہ انجم باجی بہت توجہ سے ایک ایک تحریر کو پڑھتی ہیں۔'' (شکریہ)

✍ حافظہ موُن شاہ، سرگودھا سے۔ ''ماہِ اگست کے شمارے کا سرورق بہت خوب صورت تھا۔ یہ پاکیزہ کا خاصہ ہے کہ ماڈل سر پر دوپٹا اوڑھے مشرقیت کا نمونہ لگتی ہے۔ اب آتے ہیں تبصرے کی طرف عقیلہ حق کی کہانی حصارِ محبت سبق آموز رہی۔ کوئی ایسا شہر بساؤں میں نامور لکھاری کی تحریر ہے مگر مجھے دوسرے حصے میں شائع ہونے والے اس جملے پر اعتراض ہے کہ اللہ میاں نے اسے غلطی سے لڑکا بنا دیا ہے (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) میری یہ حیثیت نہیں کہ میں نگہت جی پر تنقید کروں لیکن ایسا جملہ کہنا، لکھنا، پڑھنا گناہ ہے اور اگر عقیدہ ہو تو صریحاً کفر اللہ تعالیٰ کی ذات تمام نقائص سے منزّہ و مبرّا ہے بلاشبہ یہ بات ہر کوئی جانتا ہے کہ مگر ہمیں اس قسم کے جملے لکھنے، بولنے سے احتراز کرنا چاہیے۔ اگرچہ دل میں ہمارا عقیدہ یہ نہیں ہے مگر ہم نے کہہ کر تو گناہ کر دیا ہے ناں پلیز برا نہ مانیے گا۔ صلہ مختصر تحریر تھی اچھی تھی۔ عنیزہ سید اور نمرہ احمد کی تحریریں رسالے کی جان تھیں لیکن کاش لالہ رخ کی تنہائی ختم ہو جاتی۔ سلمیٰ غزل کی.... کہانی بھی خوب رہی۔ دھوپ چھاؤں بھی پسند آئی۔ درد پڑھ کر اداس ہو گئے۔ تہی دست اور بیٹیاں پھول ہوتی ہیں بہت ہی اچھی تھیں۔ یوں رسالہ مجموعی طور پر اچھا رہا۔ اپنے سلسلوں سمیت چھا گیا اور بہنوں کی محفل میں اپنا خط پا کر خوشی ہوئی۔'' (شکریہ)

✍ عذرا کنول، ڈیرا غازی خان سے۔ ''سرورق ہمیشہ کی طرح خوب صورت و دلکش تھا۔ انجم باجی ہماری پیاری مصنفہ لبنیٰ عروج کی پُرملال انتقال کی خبر سن کر تو میں ساکت رہ گئی۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنی پیاری محبت سے گندھی ہوئی زندہ دل مصنفہ ہم سے بچھڑ گئیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے گھر والوں کو صبر عطا کرے، آمین۔ عمیرہ احمد بہت خوب صورتی سے عکس کو اختتام کی طرف لے جا رہی ہیں۔ نگہت سیما کا کوئی شہر ایسا بساؤں میں حقیقت پر مبنی ایک اچھوتی کہانی ہے جسے پڑھ کر آنکھیں خود بہ خود نم ہو جاتی ہیں۔ ویری ویل ڈن نگہت جی اتنا خوب صورت ناول لکھنے پر مبارک باد۔ ناہید سلطانہ اختر کی کاوش زندگی ایک سبق آموز کہانی ہے جس سے سیکھنے کو بہت کچھ ملے گا۔ ناہید سلطانہ اختر صاحبہ معاشرے سے روشناس

کروانے کا بہت بہت شکریہ۔ سکینہ فرخ کا ناول مجھے ہے حکم اذاں بہت زبردست تھا۔ افسانوں میں اسما قادری کی خود آگہی، کرن احمد کی ملن کی رات، رفاقت جاوید؛ سرپرائز سبقت لے گئے۔ عظمیٰ افتخار اور شیریں حیدر کے افسانے بھی اچھے لگے۔ جلترنگ ہمیشہ کی طرح لاجواب انجم باجی غمزدوں کو مسکرانے پر مجبور کرنے کا فن صرف آپ کو آتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں اور ہاں انجم باجی آپ کی کتاب چاندنی بہت مشکل سے ملی تھی اور پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ ان دنوں ایک نجی چینل پر چاندنی چل رہا ہے۔'' (پسندیدگی کا شکریہ)

✍ بشریٰ باجوہ، اوکاڑہ سے۔ ''لبنیٰ عروج کی وفات کا پڑھ کر یقین ہی نہیں آ رہا ہے۔ لبنیٰ عروج کی بہت سی تحریریں پڑھی ہیں۔ پاکیزہ کے لیے لبنیٰ عروج کی وفات بہت افسوس ناک ہے۔ جن رائٹرز کے ڈرامے ٹی وی پر آ رہے ہیں وہ ہم دیکھ رہے ہیں ان کو مبارک باد۔ ان کے نام دیکھ کے ہمیں بھی بے حد خوشی ہوتی ہے۔ سب کے تبصرے بہت اچھے لگے فریدہ خانم، نوین اقبال، غزالہ راؤ، فریدہ فری کی شاعری بے حد پسند آئی۔ میرا انتخاب میں سعدیہ خاور، ثمانہ کا انتخاب زبردست لگا۔ سندیسے میں شائلہ سہیل منور شہزادی کے سندیسے اچھے لگے۔ میں اکثر گنگناتی ہوں میں فرزانہ رحمٰن، صائمہ امین، رافعہ شہاب، حنا عزیز کا انتخاب پسند آیا۔ جلترنگ ہمیشہ کی طرح لبوں پر مسکراہٹ بکھیر گیا۔ زندگی میں تسنیم کے گھر والوں پر رحم آ رہا ہے۔ تسنیم کے غلط قدم اٹھانے پر اس کے والدین پہ جو گزر رہی ہے وہ دل پر اثر کرتی ہے۔ دیکھیے عباد صاحب کب اپنی منزل کو پاتے ہیں۔ نگہت سیما کے ناولٹ میں یمل کے حوصلے پہ رشک آتا ہے۔ نوشیرواں کا کیریکٹر بہت خوب صورت ہے۔ باقی تمام مستقل سلسلے اچھے رہے۔'' (شکریہ)

✍ ام ایمان، کوٹ چھٹہ سے۔ ''میں ایم اے ایم ایڈ ایک اسکول میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہی ہوں۔ تین بچوں کی اماں جان ہوں لیکن پڑھنے پڑھانے سے دلچسپی کم ہونے کے بجائے بڑھی ہے۔ گزشتہ دو سالوں سے پاکیزہ کا خوب صورت ساتھ بھی ہم سفر ہے۔ آپ کی خوب صورت اور دلنشین محفل کا حصہ بننے کو دل بہت کرتا ہے جب بھی نیا پاکیزہ پڑھوں بعد میں مصروفیات اتنی ہو جاتی ہیں کہ ٹائم ہی نہیں ملتا لیکن اس بار کا رسالہ پڑھ کر رہا نہیں گیا تو قلم ہاتھ میں تھام لیا۔ سب سے پہلے تبصرہ تو پہلے پہل اس ناول کا نام لوں گی جس نے رسالہ پڑھنے پر مجبور کیا جی ہاں صحیح پہچانے عمیرہ احمد کی بات کر رہی ہوں جن کے ہاتھ میں گویا جادو کا قلم ہے۔ اس کے بعد زندگی جو بہت دلچسپ موڑ پر ہے۔ پچھلے ماہ نمرہ احمد کا ناولٹ بہت پسند آیا۔ اس دفعہ کے افسانوں میں شیریں حیدر، عظمیٰ افتخار اور نمرہ احمد کے افسانے بہت پسند آئے۔

نکہت سیما کا ناولٹ اچھا جا رہا ہے لیکن اگر زیادہ طویل نہ ہو تو۔ سدرۃ المنتہیٰ کا ناولٹ بھی اچھا لگا۔ آپ کا جلترنگ ہر دفعہ کی طرح اس بار بھی بہت پسند آیا۔'' (شکریہ)

✍ جبیں ہاشمی، بھیرہ سے۔ ''اس ماہ کا شمارہ عید کے حوالے سے زبردست تھا اور ٹائٹل بھی منفرد تھا۔ دین کی باتیں سے لے کر پاکیزہ ڈائری تک پورا پاکیزہ اچھا لگا۔ جلترنگ میں ہمت اور میں نہ ہاروں گی پڑھ کر مزہ آیا۔ پاکیزہ ڈائری میں انعم حنیف سے مل کر بہت اچھا لگا۔ اس بار بہنوں کی محفل میں ہم غیر حاضر تھے بلکہ پورے شمارے میں نہیں تھے تو رونق ہی نہیں تھی ہے ناں (ظاہر ہے بھئی) لبنیٰ عروج کے انتقال کی خبر سن کر بہت روئے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے، آمین۔ پاکیزہ کے تمام سلسلے اچھے ہیں۔ تمام رائٹرز اپنی مثال آپ ہیں۔ پاکیزہ ان لوگوں کے لیے مشعلِ راہ ہے جن کی زندگی گھروں تک محدود ہے' ان کہانیوں میں ہمارے اردگرد ہماری زندگی سے وابستہ کئی باتوں کا عکس ہوتا ہے جو ہمیں بہت کچھ سکھاتا ہے۔ اس لیے پاکیزہ کے لیے اور پیاری سی آپی انجم انصار کے لیے ڈھیروں دعائیں۔'' (جزاک اللہ)

✍ فصیحہ آصف، ملتان سے۔ ''ستمبر کا پاکیزہ فطرت کے سارے رنگوں کا مجموعہ لگا۔ عید نمبر کی مناسبت سے بھلا بھیٔ آپ کی محنت روز بروز نکھرتی جا رہی ہے۔ اداریہ بھی ہمیشہ کی طرح آبدار موتی ایسے الفاظ سے جگمگا رہا تھا۔ عکس کی قسط نمبر 14 تمام اقساط پر بازی لے گئی۔ شہر بانو نے ضرورت سے زیادہ ہٹ دھرمی اور تیزی دکھائی کہ شیر دل کے صبر پر ترس آیا۔ نکہت سیما کی کیا بات ہے۔ جس نازک موضوع کو چنا سینہ شق ہونے لگتا ہے اور آنکھیں برس پڑتی ہیں۔ پلیز نوشیرواں کو نہ کچھ کیجیے گا ورنہ آنسو نہ تھمیں گے ہمارے نہ سیمل کے۔ ملن کی رات ساحرہ کے لیے خوشبوؤں کا پیغام لے کر آئی۔ سکینہ فرخ کی تحریر میں اگر ماہم مستقبل کے لیے ہارون کا انتخاب کر لیتی تو اچھا تھا کیونکہ ہر جگہ ہارون نہیں ملے گا۔ فریبِ محبت نے توڑ ڈالا۔ انعم کے حوصلے وہمت کی داد دینی پڑتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی کو بھی ایسی آزمائش میں نہ ڈالے۔ میری عید تم سے ہے اور شیریں حیدر کی بے حد معلوماتی اور کارآمد تحریر عید کہتے ہیں جسے کئی خواتین کی آنکھیں کھول گئی ہوگی خود میرے جاننے والوں میں بھی ایک خاتون نے ایک بار کہا کہ جو زیور ہم استعمال کرتے ہیں یعنی پہنتے ہیں بس اس کی زکوٰۃ واجب ہے جو صندوق میں بند پڑے ہیں اس پر ادائیگی نہیں، سمجھانے پر بھی وہ اپنی بات پر مُصر رہیں اللہ پاک ہی ہدایت دے انہیں۔ شائستہ کا سروے ہمیشہ کی طرح منفرد رہا جو عید کے بارے میں سہانی یادیں تازہ کر گیا۔ لبنیٰ عروج پر آپ کی مختصر تحریر افسردہ کر گئی۔ اکتوبر میں یقیناً ان کے بارے میں تفصیل اور خاندان کی تصاویر شامل ہوں گی۔ جلترنگ میں چلو چلو نے خوب مزہ دیا۔ میں نہ ہاروں گی بھی کسی طرح کم نہ لگا بہت مزیدار انداز میں آپ لکھتی ہیں۔'' (شکریہ)

✍ فریدہ جاوید فری، لاہور سے۔ ''ستمبر کا پاکیزہ ملا ٹائٹل پہ اچھی ماڈل ہے۔ انجم ہم آپ کی محفل میں اپنے بیٹے مقصود احمد کے ساتھ آئے ہیں۔ بیٹھنے کو نہیں کہیں گی ویسے تو ہم نے اپنے بیٹے کو باہر بٹھا دیا ہے۔ یہ پاکیزہ میں لکھنے والیاں کیا آسمان سے اُتری ہیں جو اتنا اچھا لکھ لیویں ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک اچھی تحریریں ہیں اب کس کس کی تعریف کروں۔ شیریں حیدر اور شمیم فضل خالق نے تو بھیا کمال کر دیا۔ ہمیں عمیرہ احمد کا عکس بہت پسند ہے۔ ام مریم اور فاطمہ ندا رضوی بھی اچھا لکھے ہیں۔ عظمیٰ افتخار نے بہت ہی اچھا لکھا ہمیں تو بارش کے افسانے اچھے لگے ہیں ہم تو اپنی بیٹیوں کے ساتھ خوب نہاویں ہیں۔ انجم ایک راز کی بات بتاؤں ہوں پہلے تو سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر اب آگیا ہے بھلا ہمارا کیا قصور ہووے ہے کہ ہم چار نمازیں تو پڑھ لیویں ہیں مگر عشا کے وقت اونگھتے اونگھتے سو جاویں ہیں اب تو ہم نے توبہ کر لی ہے عشا کی نماز روزانہ پڑھیں ہیں۔'' (بہت اچھی بات ہے)

☆ اور اب اجازت دیجیے اس دعا کے ساتھ اللہ ہم سب کو جن وانس کے شر سے محفوظ رکھے اور ہمیں دونوں جہانوں میں خیر عطا ہو، آمین ثم آمین۔

دعا گو
آپ کی اپنی باجی
انجم انصار

پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید



حمدِ باری تعالیٰ

تیرے رحم و کرم کا آسرا ہے
ہتھیلی پر دیا جلتا ہوا ہے
گناہوں سے مرا دامن بھرا ہے
بجز اشکوں کے میرے پاس کیا ہے
تیری ہی روشنی ہے ساتھ ہر دم
وگرنہ پاس میرے کیا دھرا ہے
میں تیرا نام جب لیتی ہوں دل سے
مقدر پاؤں میرے چومتا ہے
تجھ سے میرا یہ کیسا تعلق ہے
مجھے معلوم ہے تو جانتا ہے

شاعرہ: حمیرا راحت
مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

اے پیارے نبی ﷺ میری اک عرض ہے سن لینا
اک بار سہی لیکن میرے خواب میں آجانا
جب آپ کو دیکھوں گی پلکوں کو جھکا لوں گی
آنکھوں میں چھپا لوں گی پھر دل میں بسا لوں گی
اے پیارے نبی ﷺ میری دنیا کو سجا جانا
اک بار سہی لیکن میرے خواب میں آجانا
تفصیل گناہوں کی جب سامنے پاؤں گی
احساسِ ندامت ہے رو رو کے بتاؤں گی
اے پیارے نبی ﷺ میری دنیا کو بچا لینا
اک بار سہی لیکن میرے خواب میں آجانا
دامن کو گناہوں سے جب پاک میں کر لوں گی
پھر عشقِ نبی ﷺ دل میں چپ چاپ بسا لوں گی
اے پیارے نبی ﷺ مجھ کو قدموں میں جگہ دینا
اک بار سہی لیکن میرے خواب میں آجانا
مدہوش نہیں ہوں میں سب ہوش کی باتیں ہیں
نوری ہیں مری راہیں یہ نور کی باتیں ہیں
اے پیارے نبی مجھ کو کچھ نور عطا کرنا
اک بار سہی لیکن میرے خواب میں آجانا
محشر میں اگر ان کو نزدیک میں پاؤں گی
آکاش کے روزن میں اک دیپ جلاؤں گی
اے پیارے نبی ﷺ مجھ کو اپنوں میں ملا لینا
اک بار سہی لیکن میرے خواب میں آجانا

شاعرہ: ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی
مرسلہ: مسز شمع حسین، ٹورنٹو

عید کا تحفہ

سرکارِ مدینہ سرورِ قلب وسینہ فرماتے ہیں کہ جو شخص عید کے دن تین سو مرتبہ سبحن اللہ وبحمدہ پڑھے اور فوت شدہ مسلمانوں کی ارواح کو اس کا ثواب ہدیہ کرے تو ہر مسلمان کی قبر میں ایک ہزار انوار داخل ہوتے ہیں اور جب وہ پڑھنے والا خود مرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی قبر میں ایک ہزار انوار داخل فرمائے گا۔
یہ ورد دونوں عیدین میں کیا جا سکتا ہے۔
(مکاشفۃ القلوب)

دل زندہ رہے گا

حضرت محمد ﷺ کا فرمانِ عالیشان ہے جس نے عیدین کی رات یعنی شب عید الفطر اور شب عید الضحیٰ طلبِ ثواب کے لیے قیام کیا اس دن اس کا دل نہیں مرے گا جب جس دن لوگوں کے دل مر جائیں گے۔
ابن ماجہ
از: تسنیم رضا ذوالفقار، فیصل آباد

اللہ کی رحمت اور انسان کے گناہ

ایک دن حضرت موسیٰ نے اللہ سے کہا کہ میں آپ کی رحمت اور انسان کے گناہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ اللہ نے فرمایا اے موسیٰ پیچھے دیکھو۔ حضرت موسیٰ نے دیکھا تو ایک بہت بڑے سمندر کے اندر ایک درخت پر ایک چڑیا اپنے منہ میں مٹی لے کر بیٹھی ہے۔ آپ نے کہا یہ کیا؟ اللہ نے فرمایا یہ سمندر میری رحمت ہے اور یہ درخت دنیا یہ چڑیا انسان اور اس کے منہ میں جو تھوڑی سی مٹی ہے وہ اس کے سارے گناہ ہیں۔ اگر یہ اپنا منہ کھول کر مٹی (گناہ) پانی میں گرا دے تو میری رحمت کو فرق نہیں پڑتا۔ تو کیوں نہ انسان توبہ کرے اور میں معاف نہ کروں۔ انسان تو نادان ہے...... اللہ پاک ہم سب کو معاف فرمائے، آمین۔

از: جمیرا ہاشمی، بھکر

فرمانِ رسول ﷺ

1۔ مرد کا بہترین خزانہ پاک دامن بیوی ہے۔
2۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا آئینہ ہے۔
3۔ مظلوم کی بددعا سے ڈرو کیونکہ اس کی بددعا شعلے کی طرح آسمان پر جاتی ہے۔
4۔ اگر کاہل ہو گئے تو حق ادا نہ کر سکو گے۔
5۔ سچائی نجات بخشتی ہے۔

مرسلہ: منیزہ نعیم، راولپنڈی

اللہ تعالیٰ سے دعا

☆ اے اللہ ہم پر سے جھوٹ کے لبادے ہٹا کر سچائی کے لبادے اوڑھا دے۔
☆ اے اللہ بے شرمی کا گہنا اتار کر شرم و حیا کا گہنا پہنا دے۔
☆ اے اللہ نیکی میں آگے کر دے اور برائی سے پیچھے کر دے۔

از: مسز فرح امجد، لاہور

دل کی باتیں

☆ محبت کسی ایسے شخص کو تلاش نہیں کرتی جس کے ساتھ رہا جائے...... محبت تو ایسے شخص کو تلاش کرتی ہے جس کے بغیر نہ رہا جائے۔

☆ لوگوں کو اکثر یہ کہتے سنا ہے زندہ رہے تو پھر ملیں گے مگر...... تم سے مل کر ایسا لگا ملتے رہے تو زندہ رہیں گے۔

☆ جب دیواروں میں دراڑیں پڑتی ہیں تو دیواریں گر جاتی ہیں اور جب...... دلوں میں دراڑیں پڑتی ہیں تو دیواریں بن جاتی ہیں

مرسلہ: ظلِ شاہین، رحیم یار خان

انٹرویو کارنر

نام روبینہ حیات مغل ہے۔ میں نے 90ء سے 98ء تک پاکیزہ مستقل پڑھا۔ اپنے مراسلات بھیج کر بہت دفعہ اپنی جگہ بھی بنائی جس کا ثبوت ایک پیارا سا پاکیزہ ایوارڈ ہے جو آج بھی میرے پاس موجود ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب مجھے ایوارڈ ملا تو میری مرحومہ والدہ بے حد خوش ہوئی تھیں اس کے بعد غمِ زندگی اور غمِ روزگار نے جب بھی فرصت دی تو سب سے پہلے پاکیزہ ہی پڑھا۔ میں دل کی مریضہ ہوں مگر میری زندہ دلی اور ہنس مکھ طبیعت کی وجہ سے لوگوں کو یقین ہی نہیں آتا کہ میری جان کو یہ روگ لگا ہوا ہے۔ بہار کا موسم میرا پسندیدہ ہے اور اس سے بھی زیادہ برسات کا موسم مجھے پسند ہے۔ پھول اور پھول جیسے بچے مجھے بہت اچھے لگتے ہیں مگر بچے پسند ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ میرے گھر بچوں کی لائن لگ گئی ہے۔ بڑی منتوں مُرادوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے دو عدد بیٹوں بلال اور علیان سے نوازا جو کہ میری جان ہیں، جان تو میری اپنے بہن بھائیوں میں بھی اٹکی رہتی ہے میں ایک گورنمنٹ ادارے میں جاب کرتی ہوں اور اپنے سسر میجر (ر) اختر مسعود کو دیکھ کر اکثر سوچتی ہوں کہ فرشتے اگر انسان کا روپ دھارتے تو وہ میرے سسر جیسے ہوتے۔ میرا تعلق کشمیر کے گاؤں نکیال سے ہے اور مجھے اپنے کشمیری ہونے پر ناز ہے۔ مجھے شعر و شاعری بے حد پسند ہے ہر اچھا شعر میری ڈائری کی زینت بنتا ہے وصی شاہ، پروین شاکر اور فراز کی شاعری کا لفظ لفظ مجھے پسند ہے۔ مجھ میں ایک خامی ہے کہ میں بہت حُسن پرست ہوں، میری دلی دعا ہے کہ پاکیزہ دن دُگنی رات چوگنی ترقی کرے اور مجھے پھر سے اس میں تھوڑی تھوڑی جگہ ملتی رہے...... آخر میں اپنے ڈھیر سارے پسندیدہ شعروں میں سے ایک شعر پر ختم کرتی ہوں۔

ہوائیں سرد ہو جائیں یا لہجے برف ہو جائیں
ہم اس کی یاد کی چادر خود پر تان لیتے ہیں

از: روبینہ حیات مغل، کراچی

پریشانیاں

ایک صاحب کو جب وزارت کی پیش کش کی گئی تو انہوں نے فوراً اپنی حسین بیوی کو فون کیا۔
''کیا تم ایک وزیر کی بیوی کہلانا پسند کرو گی؟''
بیوی نے جواب دیا۔ ''یقیناً لیکن آپ کون صاحب بول رہے ہیں۔''

☆☆☆

ہالی وڈ کے ایک ایکٹر کی شادی تھی۔ راستے میں ایکٹر کی کار خراب ہو گئی۔ اس نے فون کیا اور کہا۔
''جیکی! میری کار خراب ہو گئی ہے، دیکھو جب تک میں نہ آ جاؤں تب تک کسی سے شادی نہ کرنا۔''

مرسلہ: سامعہ تبسم، ملتان

جواز

ایک معمولی شکل صورت کی عورت نے اپنے خوب صورت شوہر سے کہا۔
''تم نے ہر طرف یہ جھوٹی خبر کیوں پھیلا رکھی ہے کہ میں لاکھوں کی جائداد اور کاروبار کی تنہا وارث ہوں۔''
شوہر نے جواب دیا۔ ''تم سے شادی کرنے کا کوئی نہ کوئی جواز تو مجھے پیش کرنا ہی تھا۔''

مرسلہ: عنبر وسیم، گوجرانوالہ

مہنگائی

ایک اجنبی، کسی عورت کے پیچھے کپڑوں کی دکان میں داخل ہوا۔ یکا یک عورت نے ایک چیخ ماری۔ اجنبی فوراً دکان سے نکل بھاگا مگر بھاگتے ہوئے ایک پولیس والے کے ہاتھوں پکڑا گیا۔ تلاشی لینے پر پتا چلا کہ وہ مسلح ہے اور پولیس کو ڈکیتی کی ایک واردات میں اس کی تلاش تھی۔
دکاندار نے عورت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ''محترمہ اگر آپ نہ چیختیں تو میں لُٹ جاتا مگر آپ نے یہ کیسے جانا کہ وہ ڈاکو ہے۔'' عورت نے جواب دیا۔ ''میں تو اس نگوڑے کو جانتی بھی نہیں۔ میں تو ساڑی کی قیمت سن کر چیخی تھی۔''

کنجوس

ایک کنجوس آدمی پٹرول پمپ گیا اور بولا۔
''میری موٹر سائیکل میں ایک روپے کا پٹرول ڈال دو۔'' پمپ والا بولا۔ ''اتنا زیادہ پٹرول ڈال کر کہاں جانے کا پروگرام ہے۔''
کنجوس آدمی۔ ''ارے بھائی جانا کہاں ہے ہمیں تو بس پیسے اڑانے کا شوق ہے۔''

مرسلہ: مصباح رضا، فیصل آباد

غزل

کسی گناہ کا انجام لگے ہے مجھ کو
زندگی زہر بھرا جام لگے ہے مجھ کو
تیری آنکھوں میں نمی دیکھ کے تسکین ہوئی
یہ میرے صبر کا انعام لگے ہے مجھ کو
گھروں کو لوٹ کے آنے میں کتنا وقت لگا
منتظر اپنے در و بام لگے ہے مجھ کو
درد و غم اتنے تسلسل سے مجھے ملتے ہیں
اپنے احباب کا اکرام لگے ہے مجھ کو
تیرے اندر کا خلا کیوں نہیں بھر جاتا کرن
تو، تو ویسے ہی تشنہ کام لگے ہے مجھ کو

شاعرہ: مہناز کرن، پشاور

جلترنگ

انجم انصار



پیاری دلھنیا

''دلہن جب عشق کے طفیل ملے تو لڑکے گھر والوں کو گھاس نہیں ڈالا کرتے، وہ تو یہی چاہتے ہیں کہ بس میں ہوں، میری بیوی ہو اور میرا کمرا ہو۔'' مہمان خواتین ساجد کی شادی میں آئی ایک دوسرے سے باتیں بگھار رہی تھیں۔

''ٹھیک کہہ رہی ہو...... ہمارا بیٹا بھی اپنے حجرے سے نہیں نکلا کرتا...... رات کو کمرے میں جائے گا تو اگلے دن کے دو بج جائیں گے مجال ہے کہ کمرے میں سے طلوع ہو۔''

''اے ہے...... کیا اس کا دل نہیں گھبراتا ہوگا یوں کمرے میں محصور ہو کر۔'' کسی نے ہنس کر کلی میں پھندنا لگایا۔

''جب ہر وقت کان میں مِن مِن کرنے والی ہو تو دل کاہے کو گھبرائے گا۔''

''ہاں بھئی...... اب ایسا ہی ہوتا ہے۔ شادی سے پہلے بیٹا، بیٹا بھی ہوتا ہے اور بھائی بھی۔ شادی کے بعد وہ صرف میاں جانی اور پاپا جانی بن کر رہ جاتے ہیں۔'' ایک قہقہہ......

نکلے تیری تلاش میں

''ارے باجی ایسی اچھی اچھی لڑکیاں میرے پرس میں پڑی ہوتی ہیں، آپ اپنے بیٹے جاوید کی شادی کی ہامی تو بھریں۔'' راشدہ نے تیسری مرتبہ جُھنجھ سے کہا۔

''کیا کہا...... پرس میں پڑی ہوتی ہیں؟''

حمیدہ بیگم نے حیرت سے کہا۔

''ہاں اور کیا، میری الماری کی درازوں میں بھی بہت لڑکیاں پڑی ہوئی ہیں۔'' وہ روانی سے بولیں۔

''کیا تم پوسٹ مارٹم بھی کیا کرتی ہو؟'' یکبارگی وہ خوف زدہ سی ہوگئیں۔

''ارے پوسٹ مارٹم تو لڑکے والیاں کیا کرتی ہیں، میں تو لڑکیاں دکھانے کا کام کرتی ہوں، یوں میرے گھر کا چولھا بھی جلتا رہتا ہے۔''

''راشدہ تمہیں معلوم ہی ہے جاوید ہمارا اکلوتا بیٹا ہے، ہمیں اس کی پسند کے حساب سے دبلی پتلی سی لڑکی چاہیے۔ تعلیم بھی بس صرف بی اے ہو، عمر بیس، بائیس سال تک کی ہو اور گھر والے نیک اور شریف ہوں، لڑائی جھگڑے والے نہ ہوں۔ جاہلانہ انداز اور جاہلانہ رسموں کے حامی نہ ہوں۔ میں عید کے چاند اپنے بیٹے کی شادی کرنا چاہتی ہوں۔''

''ارے آپ کے لڑکے کے لیے ایسی لڑکیاں دکھاؤں گی کہ آپ کو انتخاب کرنا مشکل ہو جائے گا۔ آپ ایک دن میں پانچ لڑکیاں دیکھیں اور خوش ہو جائیں، جاوید کی چاروں بہنوں اور ان کے بچوں کو بھی اپنے ساتھ لے کر جائیں اور خوب مزے کیجیے اب لڑکیاں دیکھنے کے لیے لوگ پوری پوری سوزوکی میں بھر کر جایا کرتے ہیں...اور میری خالہ تو بس بھر کرلے کر گئی تھیں......اور......!''

''نہیں راشدہ ہمیں لڑکیاں نہیں صرف ایک

اچھی سی لڑکی دکھا دو، نہ ہمیں جہیز کی تمنا ہے اور نہ ہی عالی شان دعوت کی۔ بس لڑکی اچھی ہو، بیٹا میرا دبلا پتلا سا ہے تو اسی کی مناسبت سے لڑکی چاہیے۔ ہمیں نہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی چاہیے اور نہ ہی بھاری بدن کی۔'' حمیدہ بیگم نے راشدہ کو ایک مرتبہ پھر سمجھایا۔

''باجی آپ سب لوگ ایک ساتھ چلیں تا کہ سب ایک ساتھ لڑکی کو دیکھ لیں۔''

''ہم دونوں کی جو رائے ہوگی وہی سب لوگوں کی ہوگی، بار بار... جا کر ہمیں لڑکی دیکھنا پسند نہیں ہے۔''

''باجی جیسی آپ کی مرضی...... آپ کو میں ان لوگوں سے پوچھ کر بتاؤں گی کہ کس دن ان کے ہاں جانا ہے۔''

راشدہ کو گئے ہوئے ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے کہ اس کا فون آ گیا۔

''باجی آپ کل شام تیار رہیے گا، لڑکی والوں کے ہاں جانا ہوگا۔''

حمیدہ بیگم مقررہ وقت پر بیٹی کے ساتھ تیار تھیں۔ راشدہ جب انہیں لینے آئیں تو ان کی تیاری ان سے زیادہ تھی۔ میک اپ میں لت پت ہونے کے ساتھ ساتھ وہ آرٹیفشل جیولری سے بھی لدی پھندی تھیں اور جب وہ لوگ ان کے گھر پہنچے تو انہیں جہازی سائز کے بڑے سے ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا۔ گھر تو شاید تین سو گز پر محیط تھا مگر ڈرائنگ روم کی لمبائی چوڑائی سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہزار گز کی کوٹھی کا ڈرائنگ روم ہے۔ بیش قیمت قالین پر نئے اور جدید انداز کے صوفے رکھے ہوئے تھے، پردے بھی ریموٹ کنٹرول سے چل رہے تھے۔ وسیع ڈرائنگ روم میں دو، دوٹن کے دوا ے سی کمرے میں خنکی پیدا کر رہے تھے۔ ایک مستطیل سی پینٹنگ چھت کی دیوار سے وسط تک آ رہی تھی۔ ڈرائنگ روم سے ایک امیرانہ انداز ظاہر ہو رہا تھا۔

''راشدہ نے تو بتایا تھا کہ مڈل کلاس لوگ ہیں مگر یہ لوگ تو خاصے امیر معلوم ہو رہے ہیں۔'' حمیدہ بیگم سوچ رہی تھیں اور دل ہی دل میں الجھ رہی تھیں ان کے بیٹے نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ اپنے سے بڑے گھرانے کی لڑکی کا انتخاب مت کیجیے گا کہ اسے ہمارے گھر آ کر کسی تکلیف یا پریشانی کا احساس نہ ہونے پائے۔

''اگر لڑکی اچھی لگی تو کوئی مضائقہ نہیں بھائی کو سمجھا لیں گے۔'' بہن ڈرائنگ روم کی سجاوٹ دیکھ کر خاصی مرعوب ہوگئی تھی۔

لڑکی کا انتظار کرتے کرتے حمیدہ اور ان کی بیٹی تھک گئیں ابھی وہ اٹھنے کا قصد ہی کر رہی تھیں کہ ایک لمبی چوڑی اور خوب بھاری بدن کی لڑکی دونوں ہاتھوں سے ٹرالی دھکیلتے ہوئی لائی جیسے ریڑھی چلا رہی ہو۔

ٹرالی کے تینوں درجے کھانے پینے کی چیزوں سے بھرے ہوئے تھے۔

''باجی یہ شاہی ٹکڑے کھائیں، ہماری شاہدہ نے بنائے ہیں۔'' حمیدہ کا تو لڑکی کو دیکھ کر ہی رنگ فق ہو گیا تھا، ان کا تو ٹرالی کی جانب نظر بھر کر دیکھنے کو دل نہیں کر رہا تھا شرما حضوری میں تھوڑا بہت چکھا۔

اس اثنا میں راشدہ لڑکی کی تعریفوں کے پُل باندھتی رہیں۔

''یہ سینری شاہدہ نے بنائی ہے، صوفوں پر دھرے کُشن شاہدہ کی مہارت کا شاہکار ہیں۔''

''ہماری بیٹی ایم اے پڑھی ہے، بہت لائق فائق ہے۔''

''اچھا ایم اے ہے۔ ہمیں تو راشدہ نے کہا تھا

کہ لڑکی بی اے ہے۔" حمیدہ کی بیٹی نے حیرت سے کہا۔

"ارے بیٹا تم ایم اے کی سند پھاڑ کر پھینک دینا پھر تو یہ بی اے ہی کی رہ گئی ناں۔"

"ارے سند بھی کوئی ضائع کی جاتی ہے۔" جاوید کی بہن نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

"جس کو ہماری بیٹی کی سند سے تکلیف ہو، وہ پھاڑ کر پھینک دے اور جس کو نہیں ہے وہ اپنے خاندان میں بہو کی تعلیم کی خوب شو مارے۔"

حمیدہ اور ان کی بیٹی کا بہ دقت وہاں وقت گزرا اور اگلے دن جب راشدہ ان کے ہاں آئیں اور اپنی باچھوں سے پان کی پیک صاف کرتے ہوئے ٹھسے سے بولیں۔

"باجی رشتہ دینے کب چلوگی......؟"

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا؟" حمیدہ نے غصے بھرے لہجے میں کہا۔

"دماغ کی خرابی کیسی...... میں نے اتنی اچھی لڑکی دکھائی، ایسے پیسے والوں کے ہاں لے کر گئی پھر بھی آپ لوگ خوش نہیں؟"

"ہم نے ایسی لڑکی کہا تھا تم سے دِکھانے کے لیے تم نے جاوید کو نہیں دیکھا کہ وہ کیسا ہے؟ اس لڑکی کی.... جاوید کے ساتھ کوئی مناسبت تھی بھلا؟"

"جی، میں نے تو کہا تھا حمیدہ باجی کو دبلی پتلی سی لڑکی کی تلاش ہے۔ ان کے لڑکے کی عمر بھی کم ہے مگر لڑکی والوں نے کہا تم ایک دفعہ حمیدہ بیگم کو ہمارے ہاں کسی طرح گھیر کر لے آؤ تو وہ کسی دوسرے گھر جانا بھول جائیں گی۔"

"کیوں بھول جائیں گے، کیا پاگل ہیں ہم؟" حمیدہ کو غصہ آگیا۔

"وہ لوگ کہہ رہے تھے کہ ہمارا ڈرائنگ روم اتنا شاندار ہے اس کو دیکھ کر ہی ان لوگوں کے پسینے چھوٹ جائیں گے۔ موٹی لڑکی کا کیا ہے جوائنٹ فیملی سسٹم میں جا کر اچھی اچھی موٹی لڑکیاں سینک سلائی سی ہو جاتی ہیں۔"

"ان کے ڈرائنگ روم سے ہم ایسے مرعوب نہیں ہوئے تھے کہ دماغی حالت ہی بگڑ جاتی۔" حمیدہ بڑبڑا رہی تھیں۔

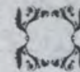
مگر اصل پریشانی تو اس وقت ہوئی جب اگلے دن لڑکی والوں کا فون آیا اور ان سے کہا گیا۔

"ہمارے پیسے کیا حرام کے تھے جو آپ کھا چاٹ گئے اور رشتہ دیتے ہوئے دم نکل رہا ہے؟ آپ جیسے لوگوں نے تو زبان کے ذائقے کے لیے یہ وتیرا بنا رکھا ہے کہ لڑکیاں دیکھیں اور ہائی ٹی کا مزہ لیں۔"

"یہ سب میزبانی کے لیے ہم نے تو آپ سے نہیں کہا تھا۔" حمیدہ کو یہ جملے بولتے ہوئے شرم کے ساتھ غصہ بھی آرہا تھا۔

"آپ کے لڑکے کی مالی حالت کیا اچھی ہے آپ نے دوسروں کو بے عزت کرنے کا ٹھیکا ہی لے لیا ہے۔" وہ جاہلانہ انداز میں بول رہی تھیں۔

اور حمیدہ ان کا فون کاٹ کر سر پکڑے بیٹھی تھیں اور جاوید سے انہوں نے کہہ دیا تھا۔ "تم اپنے لیے خود لڑکی دیکھ لو، جس سے شادی کرنا چاہو ہمیں بتا دینا ہم وہیں رشتہ دے آئیں گے۔ یہ لڑکی ڈھونڈنا تو بہت مشکل کام ہوتا ہے جو بعض لوگوں کو بالکل نہیں آتا...... اور مجھے بھی نہیں آتا۔" وہ یہ حقیقت اپنے آپ کو باور کرا رہی تھیں۔





میرا انتخاب

آمنہ حماد

ہر شے اپنے عروج پر پہنچ کر زوال پذیر ہو جاتی ہے۔ غم بھی جب حد سے بڑھتا ہے تو اس کی شدت اتنی محسوس نہیں ہوتی جبکہ عشق کا غم کچھ لوگوں کو ہر خیال سے، ہر چیز سے ماورا کر دیتا ہے تو کچھ لوگ عشق کا غم اٹھانے کے بعد اور زیادہ حساس ہو جاتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی چراغ حسن حسرت اس غزل میں بیان کر رہے ہیں۔ ان کے اس بیان کو میمونہ عزیز نے کراچی سے منتخب کیا ہے۔

غزل

یارب غمِ ہجراں میں اتنا تو کیا ہوتا
جو ہاتھ جگر پہ ہے وہ دستِ دعا ہوتا
اِک عشق کا غم آفت اور اس پہ یہ دل آفت
یا غم نہ دیا ہوتا یا دل نہ دیا ہوتا
امید تو بندھ جاتی ، تسکین تو ہو جاتی
وعدہ نہ وفا کرتے ، وعدہ تو کیا ہوتا
غیروں سے کہا تم نے ، غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا ، کچھ ہم سے سنا ہوتا

محبت وہ آفاقی جذبہ ہے جو کٹھن حالات میں بھی اپنا آپ منوا لیتا ہے اور اس کی راہ میں آنے والی تمام مزاحمتیں دم توڑ جاتی ہیں۔ محبت میں انتظار بھی کبھی کبھی ایک آزمائش بن جاتا ہے۔ حجاب عباسی بھی کچھ ایسے ہی کٹھن لمحوں میں الجھی نظر آرہی ہیں۔ اس نظم کو ماریہ رفیق نے رحیم یار خان سے منتخب کیا ہے۔

انتظار

ایک ہی تواتر سے لفظ لفظ لکھ کر
داستاں رقم کردی
خشک تھی زمیں دل کی
آنسوؤں نے نم کردی
جبر کی فضاؤں میں، تیرگی کی بانہوں میں
ان کہی سی باتوں کا
ان کہی کہانی کا سلسلہ تو رہتا ہے
آگہی کے صحرا میں
وقت کا مسافر کب، رک کے بات سنتا ہے
بے نشان رستوں پر چھاؤں کے تعاقب میں
دور ہوتا جاتا ہے
دور ہوتا جاتا ہے
اور میں اکیلی ہی
پھر امیدِ فردا پر
سنگِ میل سے ٹِک کر
انتظار میں گم ہوں

کبھی ایسا ہوتا ہے ہم ایسے لمحۂ تسخیر میں کسی سے ملتے ہیں کہ اس لمحے کے سحر سے نکل نہیں پاتے۔ دل سے کوئی نقش کبھی مٹتا نہیں ہلکا یا گہرا ہو جاتا ہے۔ یہ رنگ احمد فراز کی اس غزل میں بھی نمایاں ہے۔ سیالکوٹ سے فائزہ رضا کا انتخاب۔

غزل

تھا عبث ترکِ تعلق کا ارادہ یوں بھی
عشق زندہ نہیں رہتا ہے زیادہ یوں بھی

اِک تو ان آنکھوں میں نشہ تھا بلا کا اس پر
ہم کو مرغوب ہے کیفیتِ بادہ یوں بھی
سو گئے ہم بھی کہ بیکار تھا رستہ تکنا
اس کو آنا ہی نہیں تھا شبِ وعدہ یوں بھی
کچھ تو وہ حُسن پشیماں ہے جفا پر اپنی
اور کچھ اس کے لیے دل تھا کشادہ یوں بھی
کُوچ کر جاتے ہیں ہم کوئے محبت سے فرازؔ
ان دنوں چاک گریباں ہیں زیادہ یوں بھی

دکھ، درد، بے کلی اور چبھن نے جب لفظوں کا روپ اختیار کیا تو شاعری نے جنم لیا...... زندگی میں بعض لمحے ایسے آتے ہیں جب دل پر بوجھ بڑھ جاتا ہے ......ایسے میں شاعری مونس وغم گسار کی حیثیت سے ساتھ دیتی ہے...... طارق نعیم کی یہ نظم بھی ایک ایسے ہی غم گسار کے روپ میں ہے۔ اسلام آباد سے جرا مختار کا انتخاب۔

سوالوں کے سمندر میں ڈوبتی محبت

کبھی ڈوبے ہو تم جاناں محبت کے سمندر میں
سمندر جس کی گہرائی محبت جیسی ہو کر بھی
محبت سے بہت کم ہے
چلو چھوڑو سمندر کو
کسی دریا کی بابت پوچھتے ہیں ہم
کہ جس کی موج میں آ کر
خود اپنے آپ کو تم نے بُھلا دیا ہو
کوئی وعدہ نبھایا ہو
کہیں ساحل کی گیلی ریت پر تم نے
کسی کا نام لکھا ہو
کوئی چہرہ بنایا ہو
چلو دریا بھی کیا
کوئی کہو اس جھیل کا قصہ
ان آنکھوں سے
کسی کی یاد کا کنکر گرایا ہو
پھر اُن بنتے بگڑتے دائروں کے ختم ہونے تک
کوئی پیمانہ خود اپنے آپ سے جس کو چھپایا ہو
چلو اس کو بھی چھوڑو

یہ بتاؤ
کیا کبھی تم نے کسی کا ہجر دیکھا ہے
کسی کے دل میں اترے
یا کسی کے دل سے اترے ہو
کسی کی آنکھ میں
یا آنکھ کی دہلیز پر بیٹھے ہوئے آنسو میں ڈوبے ہو

شکستِ اعتمادِ ذات ایسا احساس ہے کہ اس سے دوچار ہو کر آدمی کسی کام کا نہیں رہتا...... محبت میں ایسے مواقع آتے ہیں...... جو انسان کو توڑ دیتے ہیں۔ اسی احساس کی طرف متوجہ کرتی پروین شاکر کی غزل جسے ہانیہ عزیز نے کراچی سے منتخب کیا ہے۔

غزل

جلا دیا شجرِ جاں کہ سبز بخت نہ تھا
کسی بھی رُت میں ہرا ہو یہ وہ درخت نہ تھا
وہ خواب دیکھا تھا، شہزادیوں نے پچھلے پہر
کہ اس کے بعد مقدر میں تاج وتخت نہ تھا
ذرا سے جبر سے میں بھی تو ٹوٹ سکتی تھی
مری طرح سے طبیعت کا وہ بھی سخت نہ تھا
مرے لیے تو وہ خنجر بھی پھول بن کے اٹھا
زبان سخت تھی، لہجہ کبھی کرخت نہ تھا
اندھیری راتوں کے تنہا مسافروں کے لیے
دیا جَلا تو ہُوا کوئی ساز درخت نہ تھا

گئے وہ دن کے مُجھی تک تھا مرا دکھ محدود
خبر کے جیسا یہ افسانہ لخت لخت نہ تھا

راستوں کی ویرانی .... اور جلتی دھوپ انسان کو ماضی میں دھکیلتی ہے اور وہ اپنے گزرے ہوئے وقت کو یاد کرتا ہے۔ اس سے اپنے حال کا موازنہ کرتا ہے۔ ایسی ہی کوشش احمد ضیا کرتے نظر آرہے ہیں۔ اس کوشش کو حنا عزیز نے کراچی سے منتخب کیا ہے۔

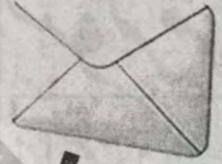
اے عمرِ رواں

اے عمرِ رواں!
آ پاس میرے
اِک راز کی بات بتانی ہے
اِک خواب سنانا ہے تجھ کو
اِک درد کی ٹیس جو دل میں ہے
اِک رنگ دکھانا ہے تجھ کو
اے عمرِ رواں!
آ پاس میرے
یہ نیم شبی کی خاموشی
یہ نیند کی پلکیں بوجھل سی
اِک خوف سا ذہن ودل میں ہے
تنہائی میری چپکے سے کہے
اے عمرِ رواں!
آ پاس میرے
تجھ سے یہ فقط کہنا ہے مجھے
رفتار کو اپنی دھیما رکھ
اِک شخص سے ملنا ہے مجھ کو
ملنے کی گھڑی جو ٹھہری ہے
دو چار صدی یا اب کے برس
اے عمرِ رواں!
آ پاس میرے

☆☆☆

سندیسے

پاکیزہ بہنیں



شادی

شادی ایک جُوا ہے
مگر یہ کھیل ہر شخص
کھیلنا چاہتا ہے
چاہے وہ کھلاڑی ہو یا
نہ ہو اور اسے اس
کھیل سے کوئی لگاؤ بھی
ہو یا نہ ہو......

شاعرہ: عظمیٰ آفاق
مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

بھیا آجانا

برکھا تو رک گئی ہے
مگر اماں کی آنکھوں کا
ساون نہیں رکے گا
بھیا تم آپا کی شادی
میں ضرور آجانا!

از: مسز شمع حسین، ٹورنٹو

دلہن کے نام

ہر دلہن پیاری ہوتی ہے
ہر دلہن اچھی لگتی ہے
مگر وہ اس وقت مزید پیاری لگنے لگتی ہے جب اس کے وجود سے خوشیاں اس کی پوری سسرال کو مسحور کرنے لگتی ہیں۔

از: منور شہزادی، گوجرانوالہ

نندوں کے نام

شادی کی مووی دیکھتے ہوئے کبھی دولھا کی بہنوں کو بھی غور سے دیکھنا، ان کے چہرے کی خوشیاں کیسے جگ مگ جگ مگ کر رہی ہوتی ہیں۔ بہنیں بھائیوں سے بہت پیار کرتی ہیں مگر اپنی آنے والی بھاوج سے بھی تو پیار کر کے دیکھیں۔ وہ بھی ان کو ان کی بہنوں سے زیادہ چاہے گی۔ آزمائش شرط ہے۔

مرسلہ: فریدہ خانم، لاہور

ابو جان کے نام

وہ رشتہ جس نے مجھے
حالات کی گردش میں آنے سے روکا
ہر گستاخی ہر غلطی
پہ ٹوکا
بچایا ہر آندھی ہر طوفان سے
اور دیا اِک ٹھنڈی
ہوا کا جھونکا
یہ نام یہ مقام سب میرے
ابّی جان نے سونپا

شاعرہ: سارہ اصغر، پنجاب

گلاب سا چہرہ

وہ کون کیمیا گر تھا جو بکھیر گیا
میرے گلاب سے چہرے پہ زرد اُداسی

سیدہ فرزانہ عرفان، حجرہ شاہ مقیم

یہ دل

کیسا موسم ہے یہ خدا جانے
اپنے گھر میں بھی جی نہیں لگتا

شاعرہ: فریدہ فری یوسف زئی، لاہور

اسکول اور بچے

اسکول: وہ عمارت ہے جہاں چھٹی والے دن امن وسکون ہوتا ہے۔
طالب علم: جن کا دماغ ہر وقت شرارت سوچتا ہے۔
کلاس روم: وہ کمرا جہاں شیطان بھی پناہ مانگتا ہے۔
اسمبلی: جہاں صبح کے وقت تمام بچے اکٹھے ہو کر شرارتوں کا منصوبہ بنایا کرتے ہیں۔
امتحان: وہ واحد چیز جس سے بچے ڈرتے ہیں۔
نتیجہ: مرہم پٹی کرنے والوں کی عید۔
گرمیوں کی سالانہ چھٹیاں...... گھر والوں کے صبر کا سالانہ امتحان۔

از: رفعت مبین رفی، کراچی

عاشق بنایا آپ نے

آنکھوں میں کجلا لگایا آپ نے
بالوں میں گجرا سجایا آپ نے
یہ خمار کتنا پُر بہار ہے
توبہ! کیا جلوہ دکھایا آپ نے
ہوگیا ہے دیوانہ کیوں ماجد
نقاب جو ہٹایا آپ نے
گہری ہو رہی ہے رات
زلفوں کو لہرایا آپ نے

شاعر: ڈاکٹر ماجد بشیر ماجد
مرسلہ: زم زم وہاڑی

انک

ایک لڑکے کے موبائل میں خالی میسج آیا تو اس نے اس نمبر پر فون کیا اور پوچھا۔ ''کیا آپ کے موبائل کی انک ختم ہو گئی جو بغیر لکھے میسج بھیج دیا۔''

تالیاں

☆ مچھر کا بچہ پہلی بار اڑا۔ جب وہ واپس آیا تو اس کے باپ نے پوچھا۔ ''پہلی بار اڑ کر کیسا لگا؟''
بچہ بولا...... ''ابو! ابو بہت مزہ آیا' ہر کوئی مجھے دیکھ کر تالیاں بجا رہا تھا۔''

پروین افضل شاہین، بہاولنگر



روبینہ حیات مغل، کراچی

وقت کا کیا ہے یہ بھی تو گزر جائے گا
ہم کیوں ترے پاس آکر تجھ سے تجھی کو مانگیں
یہی سوچ کر اپنی بھیگی پلکیں جھکالیتی ہوں
لوگ مری آنکھوں میں تیرے چہرے کا عکس نہ پالیں
ممتاز اپنی قسمت میں تو رہنا ہی ہے تشنہ
کیوں عذاب خواہشوں کے ہم اپنے دل میں پالیں

شاعرہ: ممتاز خانم، کراچی

جواب

کیوں انتظار
ان دیکھی آہٹوں کا
من چاہی چاہتوں کا
مڑ مڑ کر دیکھا کریں
پریتم تیرا گمان
ارد گرد پھیلی فضا
کیا جواب دیں؟
چھیڑتی ہواؤں کا

شاعرہ: طلعت رانا، چیچہ وطنی

میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی



☆افشین......کراچی
دل میں عجیب طرح کی خوشیاں بکھر گئیں
وہ دل رُبا سا شخص ہمیں جب کبھی ملا

☆عنبرین نیاز......چکوال
ترا احسان ہے ہجرِ مسلسل بخشنے والے
نکھرتا جارہا ہے فن میرا تیری سزاؤں سے

☆سمیعہ شیخ......سکھر
ایک مدت ہوئی تازہ ہیں تری یاد کے زخم
یہ نہیں اب کسی تریاق سے بھرنے والے

☆ماریہ رضا......لاہور
ایسے نہ اپنی زلف کی زنجیر کر مجھے
میں آسماں کا چاند ہوں تسخیر کر مجھے

☆شاہین رحمٰن......کوئٹہ
جسے یہ ضد تھی محبت میں فاصلہ نہ رہے
وہ کہہ رہا ہے کہ اب فاصلہ ضروری ہے

☆میمونہ عزیز......کراچی
بے کیف سہی بے رنگ سہی اِک لہر تو اب بھی آتی ہے
دل لاکھ شکستہ ہو پھر بھی یادوں کا بُھلانا مشکل ہے

☆مہر بانو......چکوال
کُنجِ غربت میں کبھی گوشۂ زنداں میں تھے ہم
جانِ جاں جب بھی ترے آنے کا موسم آیا

☆تہذیب غیاث......جہلم
خیال ان کا بھی آیا کبھی تمہیں جاناں
جو تم سے دور بہت دور جی رہے تھے الگ

☆فصیحہ آصف خان......ملتان
نظر سہمی ہوئی سانس ٹھہری ہوئی
بن تیرے عجب سی بے قراری ہے

☆سعدیہ خاور......لاہور
اتر رہے ہیں کسی خواب کے سمندر میں
جہاں ہے ناؤ وہاں بادباں بنانا ہے
تعلقات محبت میں ڈھلنے والے ہیں
سو اِک زمانہ ہمیں درمیاں بنانا ہے

☆زینت ضیا......حیدر آباد
خوشبو کی طرح پھیلے گی یہ بات کبھی تو
بخشے گا ہمیں شرفِ ملاقات کبھی تو
اب تک کی ملاقاتیں ہیں آئندہ کی خاطر
مل جائیں گے آپس میں خیالات کبھی تو

☆عظمیٰ امجد......شیخوپورہ
کہیں آنکھوں سے چھلکنے نہیں دیتے تجھ کو
اپنی وحشت میں ترے خواب سنبھالے ہوئے لوگ

☆ثمینہ جہانگیر......سیالکوٹ
جلتے صحرا میں اُگائے جن کے ہاتھوں نے شجر
کیا غضب ہے آج وہ خود جل رہے ہیں دھوپ میں

☆فریحہ شہاب......کراچی
آپس میں رسم و راہ کا فقدان ہوگیا
دیوانہ وار ملنے کی عادت نہیں رہی
تعبیر بن کے خواب کی آتے وہ خواب میں
افسوس ان کو اتنی بھی فرصت نہیں رہی

☆ناہید......لاہور
مار ڈالے گا اسے جرم کا احساس ندیم
قتل کر کے جسے مقتول پہ سبقت نہ ملی

☆شازیہ وہاب......لالہ موسیٰ
موسم نے بال و پر تو سنوارے بہت مگر
اُڑتے کہاں کہ ہم تو اسیرِ کمند تھے

☆فوزیہ علی......کوٹ غلام محمد
اس تشنگی کے ساتھ کہ آئے گی اب بہار
ہم نے تمام عمر بتادی خزاں کے سنگ

☆کلثوم شاہد......میر پور خاص
اب تو پہچان کا معیار جُدا ہے اے دوست
بے رُخی سے جو ملے گا وہی اپنا ہوگا

☆فاطمہ نثار......کراچی
حیرت نہ کیجیے یہ اصولِ تضاد ہے
دھوکا وہیں پہ ہوگا جہاں اعتماد ہے

☆عروبہ شاہد......خانیوال
کچھ خواب میری جاگتی آنکھوں کو بخش کر
وہ آندھیوں میں ریت کے گھر دے گیا مجھے

☆زریں زریاب......پشاور
گھر سے چلا تو دل کے سوا پاس کچھ نہ تھا
کیا مجھ سے کھو گیا ہے مجھے کیا ملال ہے
پھر کوئی خواب دیکھوں کوئی آرزو کروں
اب اے دلِ تباہ ترا کیا خیال ہے

☆روحا فیاض......میاں چنوں
میں پاسکا نہ کبھی اس خلش سے چھٹکارا
وہ مجھ سے جیت بھی سکتا تھا جانے کیوں ہارا

☆ماہین جبار......راول پنڈی
تمہیں بھی یاد نہیں اور میں بھی بھول گیا
وہ لمحہ کتنا حسیں تھا مگر فضول گیا

☆بشریٰ......اوکاڑہ
اس سے پہلے کہ رُت بدل جائے
اپنے سارے گلاب لے جانا

☆سیرینا راض......کراچی
اِک نگاہِ خود شناس مجھ سے ہوئی جو روشناس
اپنے ہر اِک سوال کا خود ہی جواب ہوگئی

☆فرزانہ شاہ......کوٹ ادو
محبتوں کے کِھلے جب گلاب آنکھوں میں
کسی کے خواب رہے بے حساب آنکھوں میں

☆قرۃ العین......کراچی
دل اِک خون کے قطرے سے زائد نہ تھا مگر
آنسوؤں نے اس کو بھی طوفاں بنا دیا
وہ قیس تھا کہ جس نے بیاباں کو گھر کیا
ہم نے تو اپنا گھر ہی بیاباں بنا دیا

☆فہمیدہ شاہد......چکوال
زندگی ختم ہوئی دوست جہاں ختم ہوئے
رہ گئی عمر تو جا ہے وہ جہاں تک پہنچے

☆شائستہ علی......بھکر
یوں تو پتھر کی بھی تقدیر بدل سکتی ہے
شرط یہ ہے کہ اسے دل سے تراشا جائے

☆نگہت......جہلم
بھری بہار میں اب کے عجیب پھول کھلے
نہ اپنے زخم ہی مہکے نہ دل کے چاک سِلے

☆مدیحہ شاہ......قصور
فرازؔ غم بھی ملتے ہیں نصیب والوں کو
ہر اِک کے ہاتھ کہاں یہ خزانے لگتے ہیں

☆یاسمین آزاد......آزاد کشمیر
یہ مصلحتِ وقت ہے یا کرب کی شدت
ہونٹوں پہ ہنسی آنکھوں میں اشکوں کے بجائے

☆مسرت کیفی......اوکاڑہ
میری خطاؤں میں میری سمجھ کا دخل نہیں
میں جو بھی کرتا ہوں بے اختیار کرتا ہوں

☆مائرہ شاہ......اسلام آباد
نہ جانے میرے تعاقب میں کون کون آئے
میں اپنے نقشِ کفِ پا اُبھارتا جاؤں
جو میرے پاس ہے اپنے لیے بچا رکھوں
جو میرے پاس نہیں تجھ پہ وارتا جاؤں

خوش ذائقہ

پاکیزہ بہنیں



رول پسندے

اشیا﴾ پسندے، ایک کلو۔ ادرک، لہسن، دو کھانے کے چمچ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ پیاز درمیانی، دو عدد (کچی پسی ہوئی)۔ تلی ہوئی پیاز، آدھی پیالی۔ لال مرچ، ایک کھانے کا چمچ۔ سفید زیرہ، ایک کھانے کا چمچ۔ گرم مسالا، ایک کھانے کا چمچ۔ دہی، ایک پیالی۔ کچا پپیتا پسا ہوا، دو کھانے کے چمچ۔ بھنے ہوئے چنے، چار کھانے کے چمچ۔ خشخاش، دو کھانے کے چمچ۔ ثابت دھنیا، ایک کھانے کا چمچ۔ ہرا دھنیا، آدھی گٹھی۔ ہری مرچیں، چار سے چھ عدد۔ تیل، آدھی پیالی۔

ترکیب...... پسندوں کو ہلکا ہلکا کچل کر اس پر پپیتا مل دیں اور انہیں ایک سے دو گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ دھنیا، زیرہ، چنے، خشخاش الگ پیس لیں پھر ہرا دھنیا، ہری مرچیں اور پیاز کو ملا کر پیس لیں۔ فرائنگ پین میں ایک کھانے کے چمچ تیل کو ایک سے دو منٹ گرم کریں اور اس میں یہ تمام مسالا ڈال کر خوشبو آنے تک بھونیں۔ چولھے سے اتار کر ٹھنڈا کر کے اس میں نمک ملائیں اور ہر پسندے میں ایک کھانے کا چمچ مسالا رکھ کر پسندے کو رول کر دیں۔ ٹوتھ پک یا دھاگے کی مدد سے اچھی طرح بند کر لیں۔ پین میں بقیہ تیل ڈال کر اس میں ادرک، لہسن ڈالیں اور ایک سے دو منٹ فرائی کریں پھر اس میں تھوڑا ثابت زیرہ، لال مرچ، گرم مسالا، تلی ہوئی پیاز اور دہی ملا دیں۔ اچھی طرح بھونتے ہوئے بچا ہوا مسالے کا مکسچر اور پسندے شامل کر دیں۔ تیل علیحدہ ہونے پر ایک سے ڈیڑھ پیالی پانی ڈال کر ڈھک دیں اور درمیانی آنچ پر پکنے دیں۔ پسندے گل جائیں تو گرم مسالا چھڑک کر ہلکی آنچ پر پانچ سے سات منٹ دم پر رکھ دیں۔ ڈش میں نکال کر ہرا دھنیا، پودینہ، ہری مرچیں چھڑک کر پیش کریں۔ اس ترکیب سے گائے کے گوشت کے علاوہ... مرغی کے گوشت کے بھی پسندے تیار کیے جاسکتے ہیں۔

میمونہ عزیز...... کراچی

سنگاپوری رائس

اشیا﴾ چاول، تین پیالی (پہلے سے ابال کر رکھے ہوئے)۔ نوڈلز، ایک پیالی (ابلے ہوئے)۔ چکن بون لیس، دو پیالی تیل، دو کھانے کے چمچ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ کٹا ہوا لہسن، ایک چائے کا چمچ۔ چائنیز نمک، ایک چائے کا چمچ۔ سفید مرچ، ایک چائے کا چمچ (پسی ہوئی)۔ چینی، ایک چائے کا چمچ۔ سفید سرکہ، تین کھانے کے چمچ۔ سویا ساس، تین کھانے کے چمچ۔ مایونیز، ایک پیالی۔ ٹماٹو کیچپ، دو کھانے کے چمچ۔

ترکیب﴾ پھیلی ہوئی کڑاہی میں تیل ڈال کر ایک منٹ درمیانی آنچ پر گرم کر لیں پھر اس میں لہسن ڈال کر ایک منٹ ہلکا سا فرائی کریں۔ چکن ڈال کر تیز آنچ پر اتنی دیر فرائی کریں کہ اس کا اپنا پانی خشک ہو جائے پھر چاول ڈال کر دو چمچ کی مدد سے اچھی

طرح گرم ہونے تک فرائی کریں۔ چاول فرائی کرتے ہوئے ساتھ ساتھ نمک، چائنیز نمک، سفید مرچ، چینی، سرکہ اور سویا ساس ڈالتے جائیں۔ اچھی طرح مگر احتیاط سے چاول فرائی کر کے ڈش میں نکال لیں۔ چاول کی ڈش میں کناروں پر ابلے ہوئے نوڈلز ڈالیں اور درمیان میں مایونیز کریم (مایونیز میں ٹماٹو کیچپ ملا ہوا) ڈال کر پیش کریں۔

نوٹ﴾ اگر پسند کریں تو بند گوبھی، گاجر اور ہری پیاز (ہر چیز آدھی پیالی) باریک کٹی ہوئی لے کر چاول فرائی کرتے ہوئے ملا لیں۔

سعدیہ خاور...... لاہور

آلو بڑیاں

اشیا﴾ ہری مونگ کی دال، آدھا کلو۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ پسا ہوا لہسن، ایک کھانے کا چمچ۔ پیاز کچی، دو عدد درمیانی (پسی ہوئی)۔ آلو، دو عدد (چھوٹے ٹکڑے کیے ہوئے)۔ پسی لال مرچ، ایک کھانے کا چمچ۔ پسا ہوا دھنیا، ایک چائے کا چمچ۔ ہلدی، ایک چائے کا چمچ۔ تیل، آدھی پیالی۔

ترکیب﴾ دال کو دھو کر تین سے چار گھنٹوں کے لیے بھگو دیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر دال کو دونوں ہاتھوں میں لے کر اچھی طرح ملیں تو اس کا چھلکا نکل جائے گا۔ ساری دال کا چھلکا نکال کر اسے بغیر پانی کے باریک پیس لیں۔ ایک چوکور سوتی کپڑا لے کر اس کے درمیان میں کاج سا بنا لیں۔ پسی ہوئی دال اس میں ڈال کر اسے پوٹلی کی طرح پکڑ لیں اور اسے ٹرے میں دبا دبا کر چھوٹی چھوٹی بڑیاں نکال لیں۔ اسے دھوپ میں رکھ کر اچھی طرح خشک کر لیں کم از کم ایک دن دھوپ میں رکھیں۔ پتیلی میں تیل کو درمیانی آنچ پر ایک سے دو منٹ گرم کریں۔ اس میں لہسن، لال مرچ، دھنیا اور ہلدی ڈالیں اور ہلکا سا پانی کا چھینٹا دیتے ہوئے خوشبو آنے تک بھونیں۔ پیاز ڈال کر تیل علیحدہ ہونے تک فرائی کریں پھر آلو ڈال کر اچھی طرح بھونیں اور آدھی پیالی پانی ڈال کر آلو گلا لیں۔ اب بڑیاں ڈال کر انہیں گلا لیں اور ایک پیالی پانی ڈال کر ہلکی آنچ پر دم پر رکھ دیں۔ ڈش میں نکال کر ہری مرچیں اور ہرا دھنیا باریک کاٹ کر چھڑک دیں اور گرم گرم چپاتی یا ابلے ہوئے چاولوں کے ساتھ پیش کریں۔

عائشہ اقبال...... حیدر آباد

کھجور کا حلوا

اشیا﴾ کھجور تازہ، آدھا کلو۔ دودھ، دو کلو۔ دال چنا، ایک پاؤ۔ چینی، تین چھٹانک۔ گھی، ایک پاؤ۔ کیوڑا، دو چمچ بڑے۔ گری پستہ، آدھا تولہ۔ گری بادام، آدھی چھٹانک۔ الائچی سبز، چند دانے۔

ترکیب﴾ کھجور تازہ اور بڑی بڑی ہونی چاہیے۔ انہیں اچھی طرح دھو کر صاف کر لیں اور ان کی گٹھلیاں نکال لیں۔ چنے کی دال بھی دھو کر صاف کر لیں اور دودھ میں ڈال کر ابالنے کے لیے رکھ دیں۔ جب دال گل جائے تو دودھ خشک کر کے اتار لیں اور اسے سل پر باریک پیس لیں۔ اب صاف ہاتھوں سے کھجوروں کو مسل لیں اور پسی ہوئی دال اس میں ملا دیں پھر ایک برتن میں گھی ڈالیں اور دال ملی کھجوریں اس میں ڈال دیں اور انہیں خوب بھونیں۔ اس کے بعد اس میں چینی ڈال دیں اور بھونتے جائیں۔ جب آمیزہ تیل چھوڑ دے اور چینی کا پانی خشک ہو جائے تو اس میں الائچی کے دانے پیس کر ڈال دیں اور کیوڑا ڈال کر اتار لیں۔ اب پستہ کاٹ کر اور بادام چھیل کر اور باریک کاٹ کر اس کے اوپر ڈال دیں اور کھانے کے لیے پیش کریں۔

صائمہ امین...... کراچی



روحانی مشورے

ادارہ



اَللّٰھُمَ اِنّی اسُالُكَ عِلمًا نا فِعا وَرِزقًا طیِّبًا وعَمَلًا متقبلا

ترجمہ: "اے اللہ! میں تجھ سے ایسا علم جو نفع بخش ہو اور حلال اور صاف روزی مانگتا ہوں اور وہ عمل جو تیرے دربار میں مقبول ہو۔"

یہ دعا آپ ﷺ فجر کی نماز کے سلام پھیرنے کے بعد مانگا کرتے تھے۔ بہت مختصر اور بہت مبارک دعا ہے۔ طلبہ وطالبات، علما ومعلّمات اور احبابِ دعوت کو اس دعا کا فجر کے بعد معمول بنالینا چاہیے۔

اَللّٰھمّ اَجِرنِی مِنَ النَّارِ

ترجمہ: "اے اللہ! مجھے جہنم سے نجات عطا فرما۔"

حضرت حارثؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ہماری طرف سرگوشی فرمائی اور فرمایا: جب تو مغرب کی نماز سے فارغ ہوجائے تو سات مرتبہ یہ دعا مانگا کر، جب تو نے یہ دعا مانگ لی اور (اگر) اسی رات تیرا انتقال ہوا تو تیرے لیے آگ سے چھٹکارا لکھا جائے گا اور جب تو فجر کی نماز پڑھ لے تب بھی یہی دعا مانگا کر اگر اس دن میں تیرا انتقال ہوگیا تو تیرے لیے جہنم سے چھٹکارا لکھ دیا جائے گا۔

سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ عَدَدَ خَلْقِہٖ وَرِضَا نَفْسِہٖ وَزِنَةَ عَرْشِہٖ وَمِدَادَ کَلِمَاتِہٖ

ترجمہ: "اللہ کی پاکی اور اس کی تعریف (بیان کرتا ہوں) اس کی مخلوق کی تعداد کے برابر اور اس کی ذات کی رضا کے موافق اور اس کے عرش کے ہم وزن اور اس کے کلمات کی سیاہی کے بمقدار۔"

اُم المومنین حضرت جویریہؓ ارشاد فرماتی ہیں:

"ایک مرتبہ حضور ﷺ جب کہ وہ اپنے مصلے پر تھیں ان کے ہاں سے نکل کر گئے پھر چاشت کے بعد لوٹے اور حضرت جویریہؓ ابھی تک اسی حالت میں بیٹھی تھیں۔ حضور ﷺ نے پوچھا: تو ابھی تک اسی حالت پر ہے اپنی جگہ سے اٹھی نہیں؟ تو انہوں نے کہا: جی ہاں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: میں نے تجھ سے جدا ہونے کے بعد یہ (مذکورہ بالا) چار کلمات تین مرتبہ کہے، اگر ان کو ان تمام کلمات کے ساتھ جو تو نے آج کہے ہیں وزن کردیا جائے تو وہ چار کلمات ان پر غالب ہوجائیں۔"

آنحضرت ﷺ نے حضرت ابو الدرداءؓ سے فرمایا: میں تمہیں ایک ایسی چیز بتاتا ہوں جو دن رات ذکر کرنے سے بہتر ہے، وہ یہ ہے۔

سُبْحَانَ اللّٰہِ عَدَدَ مَا خَلَقَ وَسُبْحَانَ اللّٰہِ مِلْءَ مَا خَلَقَ وَسُبْحَانَ اللّٰہِ عَدَدَ کُلِّ شَیْءٍ وَسُبْحَانَ اللّٰہِ مِلْءَ کُلِّ شَیْءٍ وَسُبْحَانَ اللّٰہِ عَدَدَ مَا اَحْصٰی کِتَابُہٗ وَسُبْحَانَ اللّٰہِ مِلْءَ مَا اَحْصٰی کِتَابُہٗ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَدَدَ مَا خَلَقَ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ مِلْءَ مَا خَلَقَ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَدَدَ مِلْءَ کُلِّ شَیْءٍ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَدَدَ مَا اَحْصٰی کِتَابُہٗ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ مِلْءَ مَا اَحْصٰی کِتَابُہٗ:

ترجمہ: "اللہ کی تسبیح ہے ان چیزوں کے شمار کے برابر جو اس نے پیدا فرمائی ہے اور اللہ کی تسبیح ہے ان چیزوں کے بھر دینے کے برابر جو اس نے پیدا فرمائی ہے اور اللہ کی تسبیح ہے ہر چیز کی تعداد کے برابر اور اللہ کی تسبیح ہے ہر چیز کے بھر دینے کے برابر

اور اللہ کی تسبیح ہے ہر اس چیز کی تعداد کے برابر جسے اس کی کتاب نے شمار کیا اور اللہ کی تسبیح ہے ہر اس چیز کے بھر دینے کے برابر جسے اس کی کتاب نے شمار کیا اور اللہ کے لیے سب تعریف ہے ان چیزوں کے شمار کے برابر جو اس نے پیدا فرمائی ہے اور اللہ کے لیے سب تعریف ہے ان چیزوں کے بھر دینے کے برابر جو اس نے پیدا فرمائی ہیں اور اللہ کے لیے سب تعریف ہے ہر چیز کی تعداد کے برابر اور اللہ کے لیے سب تعریف ہے ہر اس چیز کی تعداد کے برابر جسے اس کی کتاب نے شمار کیا اور اللہ کے لیے سب تعریف ہے ہر اس چیز کے بھر دینے کے برابر جسے اس کی کتاب نے شمار کیا۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّ النَّبِیّ مُحَمَّد اِغفِرلِیْ ذَنْبِیْ وَاذْھِبْ غَیْظَ قَلْبِیْ وَاَجِرْنِیْ مِنْ مَضلّاتِ الْفِتَنِ مَا اَحْیَیْتَنَا

ترجمہ: اے اللہ! نبی محمد ﷺ کے پروردگار! میرے گناہ بخش دے اور میرے دل سے غصہ نکال دے اور جب تک تو مجھے زندہ رکھے گمراہ کرنے والے فتنوں سے اپنی پناہ میں رکھ۔

یہ دعا ہر اس شخص کو کثرت سے مانگنی چاہیے جس کو بے جا اور زیادہ غصہ آتا ہو۔

☆☆☆

حضرت کعبؓ فرماتے ہیں: حضرت داؤدؑ ہر صبح کو یہ درج ذیل دعا مانگتے تھے تین مرتبہ اس کی تکرار فرماتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ عَالِمَ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَةِ اِعْصِمْنِیْ فِیْ ھٰذَا الْیَوْمِ مِنْ شَرِّ کُلِّ مُصِیْبَةٍ نَزَلَتْ مِنَ السَّمَآءِ وَاجْعَلْنِیْ فِیْ کُلِّ خَیْرٍ یَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ

ترجمہ: اے اللہ! چھپی اور کھلی چیزوں کے جاننے والے، آج کے دن آسمان سے جو مصیبت نازل ہو اس کے شر سے میری حفاظت فرما اور جو خیر (بھلائی) آسمان سے نازل ہو وہ مجھے عطا فرما۔"

حضرت حسن بصریؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت سمرہ بن جندبؓ نے فرمایا: "میں تم سے ایک حدیث نہ بیان کروں جو میں نے حضور پاک ﷺ سے متعدد مرتبہ سنی ہے، اسی طرح حضرت ابوبکر صدیقؓ سے متعدد مرتبہ، اسی طرح حضرت عمرؓ سے متعدد بار سنی ہے؟" میں نے کہا "ہاں!" انہوں نے فرمایا "صبح شام جو شخص اسے پڑھے گا کوئی دعا نہیں کرے گا مگر یہ کہ اللہ تبارک تعالیٰ اس کی دعا کو قبول فرمائے گا۔" راوی (سمرہ) نے کہا: "میں نے عبد اللہ بن سلامؓ سے ملاقات کی اور کہا تم کو ایک حدیث نہ سناؤں جو میں نے حضور پاک ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ سے متعدد مرتبہ سنی ہے؟" انہوں نے کہا: "ہاں، سنائیے۔" میں نے حدیث (مذکورہ) بیان کی۔ انہوں نے کہا: "قسم خدا کی! میرے ماں باپ قربان جائیں اللہ کے رسول پر۔ یہ وہ کلمات ہیں جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو عطا کیے تھے، وہ ہر دن سات مرتبہ اسے پڑھتے تھے پھر جو بھی سوال کرتے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اسے پورا فرماتا۔" وہ کلمات یہ ہیں۔

اَللّٰھُمَّ اَنْتَ خَلَقْتَنِیْ وَاَنْتَ تَھْدِیْنِیْ وَاَنْتَ تُطْعِمُنِیْ وَاَنْتَ تَسْقِیْنِیْ وَاَنْتَ تُمِیْتُنِیْ وَاَنْتَ تُحْیِیْنِیْ

ترجمہ: "اے اللہ! تو نے مجھے پیدا کیا اور تو نے مجھے ہدایت دی اور تو ہی مجھے کھلاتا ہے اور تو ہی مجھے پالتا ہے اور تو ہی مجھے موت دے گا اور تو ہی مجھے (دوبارہ) زندہ کرے گا۔"

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْبَرَصِ وَالْجُنُوْنِ وَالْجُذَامِ وَسَیِّءِ الْاَسْقَامِ

ترجمہ: "اے اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں برص سے، جذام سے اور جنون سے اور تمام بُری بیماریوں سے۔" بُری بیماریوں سے بچنے کے لیے اس دعا کو صبح کے علاوہ فرض نمازوں کے بعد بھی مانگیں۔

☆☆☆

شوابے ہومیو کلینک

اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، پوسٹ بکس نمبر 733 کراچی۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

آنکھوں کی کمزوری

محمود احمد.........منظور کالونی کراچی

سوال: ۔میری عمر تقریباً ۱۷ سال ہے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری دُور کی نظر کافی کمزور ہے۔ آنکھیں ٹیسٹ کروائیں.... تو 4 نمبر نکلا۔ میں چاہتا ہوں کہ میری نظر بالکل ٹھیک ہوجائے کیونکہ میں فرسٹ ائیر D.H.M.S کا طالب علم ہوں اس لیے مجھے بہت پریشانی ہوتی ہے کیونکہ مجھے بورڈ پر لکھا ہوا صاف نظر نہیں آتا حالانکہ میں آگے بیٹھتا ہوں۔ میں نے ایک ہومیو پیتھ ڈاکٹر سے پوچھ کر بائیرون کی cineraria maritima بھی استعمال کی تھی لیکن کچھ دِن کے بعد میری آنکھوں میں درد ہونے لگا اور آنکھیں لال بھی ہوگئیں.... تو میں نے انہی ڈاکٹر کو بتایا تو اُنہوں نے دوا بند کردی۔ برائے مہربانی میرے لیے کوئی ایسی دوا تجویز کریں کہ میری نظر بالکل ٹھیک ہوجائے۔

جواب: ۔آپ ڈاکٹر ولمار شوابے کی cineraria maritima استعمال کریں۔ ساتھ میں Calc. Fluor. 12X اور Physostigma 200 کے 5 قطرے دِن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔

ٹوکن

برائے شوابے ہومیو کلینک

نومبر 2012

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ________

پتا: ________

____

پیٹ کی خرابی

محمد یونس...........نارتھ کراچی

سوال: ۔ مجھے عرصہ پانچ چھ سال سے ایک

بیماری لاحق ہے۔ ایلوپیتھک یونانی علاج کروایا جس سے فائدہ بھی ہوتا تھا لیکن اخراجات کی زیادتی کی وجہ سے علاج بند کرنا پڑتا تھا۔ ہومیو پیتھک علاج بھی کروایا لیکن مدت طویل اور فائدہ دیر سے ہونے کی وجہ سے چھوڑنا پڑا۔ اب آپ کا رسالہ پڑھ کر دوبارہ ڈھارس بندھی ہے۔

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے منہ سے سڑے ہوئے کھانے کی بو آتی ہے اور کوئی بھی ثقیل اور بادی چیز کھانے سے بُو اور تیز ہوجاتی ہے اور زبان پر سفید تہ جمی رہتی ہے۔ قبض کی شکایت عرصہ پانچ چھ سال سے ہے، دو، دو، تین، تین دِن رہتا ہے۔ چھوٹا کام بھی ایک بڑی مہم نظر آتی ہے۔ بعض اوقات سستی بہت غالب رہتی ہے کام کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ دماغ میں تھکاوٹ کا احساس ہوتا ہے اور قضائے حاجت کے وقت کافی زور لگانا پڑتا ہے جس کی وجہ سے منی کے قطرے نکل پڑتے ہیں۔ بعض اوقات قطرے بہت کثرت سے نکلتے ہیں۔ زیادہ بات کرنے اور زیادہ کام کرنے سے اعصابی کمزوری شروع ہوجاتی ہے اور بغیر سوچے سمجھے حرکات وسکنات ہوتی ہیں۔ مثلاً جھٹکے سے یا جلدی سے کوئی چیز اُٹھانا یا رکھنا اور بعض اوقات بغیر سوچے سمجھے بات کرنا۔

جواب: ۔محترم! آپ علاج کے ساتھ ساتھ غذا پر بھی توجہ دیں۔ غذا سادہ اور زود ہضم استعمال کریں۔ موسم کے حساب سے جو بھی پھل میسر ہو اُس کا استعمال کریں۔ صبح سویرے اُٹھ کر نماز پڑھیں اور اس کے علاوہ ورزش بھی کیا کریں یا صرف جاگنگ (ہلکے ہلکے دوڑنا) کرلیا کریں۔ رات کا کھانا سونے سے کم از کم دو گھنٹے پہلے کھایا کریں اور اس کے بعد ٹہلا کریں۔ کم از کم آدھ میل۔ مندرجہ ذیل ادویات کے علاوہ کوئی اور دوا استعمال نہ کریں۔ Merc,Sol.6 صبح ناشتے کے بعد اور شام 5 بجے اور Alumin 6 رات سونے سے پہلے لیں۔ 21 دِن بعد کیفیت سے آگاہ کریں۔

مُٹاپا

قیصر عزیز.............گلشن اقبال کراچی

مریضہ کی عمر 26 سال ہے۔ انہیں گرمی سے الرجک ہے، مُٹاپا بے انتہا ہے۔ گرم چیز کچھ بھی کھالیں تو جلن شروع ہوجاتی ہے۔ جلن سینے میں زیادہ ہوتی ہے مگر پیشاب میں جلن بے انتہا ہوتی ہے۔ پیشاب شروع ہوتے ہی جلن ہونے لگتی ہے۔ جلن کی شکایت بہت پرانی ہے۔ کمر میں درد بھی کبھی ہوتا ہے جس میں زیادتی صبح کے وقت ہوتی ہے۔ سیلان الرحم بہت زیادہ ہوتا ہے اور بدبودار ہوتا ہے۔ اس کی رنگت سیاہ مائل براؤن ہوتی ہے۔ مریضہ کو غصہ جلدی آجاتا ہے، پیاس ٹھیک ہے، حیض ٹھیک ہوتا ہے، بھوک بہت لگتی ہے۔ مریضہ گھر کا کوئی کام نہیں کرتی سوائے اپنی بیمار والدہ کی خدمت کرنے کے۔ چلتی پھرتی بہت ہے، غیر شادی شدہ ہے، نظر کمزور ہے، نیند نہ آنے کی شکایت اکثر و بیشتر رہتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب آپ کوئی ایسی دوائی تجویز کردیں کہ کم از کم ان کا مُٹاپا جلد از جلد ختم ہوجائے کیونکہ مریضہ اپنے مُٹاپے کی وجہ سے زیادہ پریشان ہیں۔

جواب: ۔آپ مریضہ کو صبح ناشتے کے بعد 5 قطرے Rus Tox-200 کے اور Cantharis 200 رات کو سوتے وقت دیں۔ Kreoste 30 کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر دِن میں تین مرتبہ استعمال کرائیں۔ روغنی اشیا اور شکر سے پرہیز کرائیں۔ ہلکی پھلکی ورزش کرائیں خاص طور پر صبح یا شام کو ضرور کرائیں۔ فروٹ اور سبزیوں کا استعمال زیادہ کرائیں اور گوشت کا استعمال کم کرائیں۔

بال نہیں اُگتے

محمد اعراف انور............راولپنڈی

سوال: ۔ ڈاکٹر صاحب میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں

ایک سترہ سالہ نوجوان ہوں پھر بھی میرے سینے، ناف، بغل میں اور چہرے پر بال نہیں ہیں جب کہ میرے سر پر اچھے خاصے بال ہیں اور یہ بہت جلدی بڑھتے ہیں۔ میری ناف کے نیچے بھی بال بہت کم ہیں بہت نیچے کے حصے میں اور بہت عرصے میں اُگتے ہیں۔ میری داڑھی مونچھوں کا تو پوچھیے نہیں یہ تو نظر ہی نہیں آتی۔ دوستوں کے کہنے پر میں نے ان پر اُسترا پھروالیا ہے مگر پھر بھی بال اُگتے ہی نہیں ہیں اور قریب سے دیکھنے پر بھی نظر نہیں آتے۔ اس کے علاوہ میرے پاؤں پر بھی بال نہیں ہیں اور بہت کم ہیں نظر ہی نہیں آتے۔

میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میں بہت پتلا ہوں میرا وزن 130 پاؤنڈ ہے مگر میری ٹانگیں اور ہاتھ خاصے پتلے ہیں اور چہرہ بھی....کمزور اور پچکا ہوا ہے جس کی وجہ سے میں بچہ لگتا ہوں۔ میرا سینہ 29 انچ ہے میں بالغ بھی ہوگیا ہوں اور مجھے جنسی طاقت بھی حاصل ہے۔ میرے دوست میرا بہت مذاق اُڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم ابھی بچے ہو۔ اس کی وجہ سے میں بہت احساسِ کمتری میں مبتلا ہوں۔ داڑھی مونچھیں نہ ہونے کی وجہ سے میں کسی سے اعتماد سے بات نہیں کرسکتا۔ اس کے علاوہ اور بہت سے واقعات رونما ہوئے ہیں جن کی وجہ سے میں بہت احساسِ کمتری میں مبتلا ہوں اور سخت مصیبت میں ہوں۔ ڈاکٹر صاحب آپ براہِ کرم مجھے اس مصیبت سے چھٹکارا دلائیے اور میرے مرض کا علاج بتائیے، میں آپ کا بے حد مشکور ہوں گا۔

جواب:۔ آپ کا مسئلہ ذرا برابر بھی تشویشناک نہیں ہے جیسا کہ آپ سمجھتے ہیں۔ بالوں کا جسم پر کم یا زیادہ تعداد میں نکلنا خاندانی ہوتا ہے کہ ماں باپ کی طرف سے خاندان میں اگر جسم پر کم بال ہوں گے تو آگے اولاد میں بھی کم بال ہوں گے۔ نیز ایک ہارمون کی کمی یا زیادتی کی وجہ سے بھی بال کم یا زیادہ نکل سکتے ہیں۔ رہی بات مذاق اُڑانے کی تو لوگ اُن کو بھی نہیں چھوڑتے جن کے جسم پر بہت بال ہوتے ہیں یا اُن کی داڑھی بھی ہوتی ہے۔ آپ اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کریں اور اس قسم کی باتوں سے پریشان نہ ہوں بلکہ اپنے اندر ایسی خصوصیات پیدا کریں کہ لوگوں کا دھیان اس طرف نہ جائے۔ ایسی ورزشیں کریں جو ٹانگوں کے عضلات بنائے۔ نیز انڈا، دودھ، مکھن، مچھلی، گوشت اور موسمی پھلوں، سبزیوں اور ڈرائی فروٹ کا استعمال کریں.....اس کے ساتھ Thyroidinum 30 کے پانچ پانچ قطرے دن میں چار مرتبہ لیں۔

بال گر رہے ہیں

رفعت تقی.................کراچی

سوال:۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ کچھ عرصے سے میرے بال گر رہے ہیں۔ پہلے میرے بال بہت زیادہ گھنے تھے لیکن اب بہت ہلکے ہوگئے ہیں۔ میرے سر میں خشکی بھی ہے اور اکثر نزلہ بھی رہتا ہے۔ میرے بال بڑھنا بالکل بند ہوگئے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ میرے بال لمبے اور گھنے ہوجائیں۔ ازراہِ کرم جلد از جلد طبّی مشورے سے نواز کر شکریہ کا موقع دیں۔

جواب:۔ آپ Nat Mur 30 (ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی) کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ استعمال کریں۔ روزانہ رات کو سونے سے پہلے زیتون یا سرسوں کے تیل سے سر پر مساج کریں کم از کم پانچ منٹ تک۔ اس کے بعد برش سے بال صاف کیا کریں، دِن میں اکثر بالوں کو برش کیا کریں۔ بال دھونے کے لیے اچھا شیمپو استعمال کریں۔ کھانے میں انڈا، دودھ اور سبزیوں کا استعمال کریں۔

سورائسس

ہارون رشید.................کراچی

میں ضلع سوات کا رہنے والا ہوں اور سی مین ہوں۔ میں 1984 سے ایک جلدی تکلیف میں مبتلا

ہوں۔ ایلو پیتھک ڈاکٹروں نے اس مرض کا نام PSORIASIS (سورائسس) بتایا ہے۔ کراچی میں جلد کے جتنے بھی ڈاکٹر ہیں میں نے اُن سے علاج کرایا ہے لیکن ہر ایک نے یہ کہا ہے کہ ایسے مرض کا خاتمہ ممکن نہیں ہے، صرف اس کا دوا کے ساتھ کنٹرول ہے اور یہ مرض آپ کو ایک یا دو سال کے بعد دوبارہ ہوگا۔ ڈاکٹر کے مشورے کے بغیر ایک مرہم اسٹور سے خرید کر استعمال کرنا شروع کیا جس کی وجہ سے میرا یہ مرض باقی جسم سے ختم ہوا لیکن سر پر باقی رہا جو اَب بھی باقی ہے۔ میں کچھ دِن بعد اس ڈاکٹر کے پاس پنڈی دوبارہ گیا تو ...... اس نے مجھے اسی مرہم کا استعمال کرنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ ابھی اس مرض کا مکمل خاتمہ نہیں ہوا ہے، صرف کنٹرول ہوا ہے۔ ابھی یہ مرض میرے پورے سر پر باقی ہے۔ سر پر سرخ سرخ داغ موجود ہیں، جو کبھی چھلکے بن کر گر جاتے ہیں۔ میں وہ دوا اب بھی استعمال کر رہا ہوں۔

جناب والا! کسی نے مجھے بتایا کہ آپ ہومیو پیتھک ڈاکٹر سے علاج کرائیں تو میں آپ کی خدمت میں یہ خط ارسال کر رہا ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ اس کا جواب پاکیزہ میں شائع کر کے مجھے مشورہ دے دیں گے۔ میں آپ کا پاکیزہ باقاعدگی سے پڑھتا ہوں۔

جواب:۔ شفا دینے والی... ذات اللہ تعالیٰ کی ہے، اتنے زیادہ پریشان نہ ہوں۔ یہ کوئی خوفناک بیماری نہیں۔ اپنی غذا کا خیال رکھا کریں کسی بھی چیز میں بے اعتدالی نہ کریں۔ صفائی کا بھی خیال رکھا کریں، نماز پڑھا کریں اور اللہ سے اچھی اُمید کے ساتھ دُعا کریں۔ Petroleum200 کے تین قطرے ایک چمچ پانی میں رات سوتے وقت اور Hydro cotyle..... کے 15 قطرے دِن میں تین دفعہ ایک چوتھائی کپ پانی میں ڈال کر استعمال کریں، ایک ماہ بعد حالت سے مطلع کریں۔



قد بڑھانا ہے

مروت حسین............لاہور

سوال: میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا قد تقریباً 5 فٹ 4 انچ ہے۔ میری خواہش ہے کہ میرا قد مزید بڑھے۔ اس سلسلے میں آپ میری مدد فرمائیں اور شکریہ کا موقع دیں۔

جواب:۔ مروت حسین صاحب آپ نے اپنی عمر نہیں لکھی ہے۔ ویسے قد آپ کا مناسب ہے اگر آپ مزید قد بڑھانا چاہتے ہیں تو اس کے لیے آپ کو روزانہ صبح سویرے اُٹھ کر ورزش کرنا ہوگی خصوصاً لٹکنے والی، ساتھ ساتھ کھانے پر بھی خاص توجہ دینی ہوگی۔ اپنی غذا میں روغنیات، لحمیات اور کاربوہائیڈریٹ کا مناسب استعمال کرنا ہوگا۔ جن کو ہم متوازن غذا کہتے ہیں۔ اس سے ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ مرغن غذائیں کھانی ہیں مرغن غذائیں کھائیں گے تو صرف موٹے ہوں گے۔ ہر کام وقت پر کرنے کی عادت ڈالیں اور زیادہ فکر نہ کریں۔ مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Thyroidinum 3X صبح اور شام استعمال کریں جبکہ Pituitrin 6 دوپہر اور رات کو استعمال کریں۔

موسم تبدیل ہو رہا ہے خیال رکھیے گا

ستمبر، اکتوبر وہ مہینے ہیں جن کے بعد سردیوں کا موسم آتا ہے۔ ان مہینوں میں درجہ حرارت کبھی بہت زیادہ ہوجاتا ہے تو کبھی بہت کم۔ کبھی دِن میں گرمی ہوتی ہے تو رات میں ٹھنڈک ہوجاتی ہے۔ اس طرح موسم میں تو بہت جلد تغیر آتا ہے لیکن ہمارا جسم اس تغیر کو فوراً قبول نہیں کر پاتا جس کی وجہ سے ہم بیمار ہونے لگتے ہیں۔ اس موسم کی تبدیلی سے بچے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور وہ لوگ بھی جو کمزور ہوتے ہیں۔ اِس موسم میں کسی کو نزلہ، زکام، کھانسی اور دمہ کا مسئلہ ہوجاتا ہے تو کسی کو

بخار، جسم میں درد اور کچھ لوگوں کا تو بلڈ پریشر بھی بڑھ جاتا ہے۔ کچھ لوگوں میں شوگر کنٹرول سے باہر ہوجاتی ہے۔ اس موسم میں دِل کے مسائل بھی بڑھ جاتے ہیں اور گردوں کی تکالیف بھی۔

اب سوال یہ ہے کہ ہم موسم کی اس تبدیلی پر کیا تدابیر اختیار کریں کہ ان بیماریوں سے بچ سکیں؟ یہ احتیاطی تدابیر مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔صاف پانی کا استعمال کریں۔ 8 سے 10 گلاس پانی روزانہ پئیں لیکن یاد رکھیں کہ کھانے کے ساتھ اور فوراً بعد بالکل نہ پئیں۔

2۔ٹھنڈا گرم یا گرم ٹھنڈا نہ کریں اس کا مطلب یہ ہے کہ پسینے کو ہوا نہ لگائیں، نہا کر پنکھے یا اے سی میں نہ آئیں، دُھوپ سے یکدم پنکھے یا اے سی میں نہ آئیں۔ اسی طرح اے سی سے یکدم دُھوپ میں نہ جائیں۔ لُو چل رہی ہو تو پانی پی کر باہر نکلیں۔ لُو سے آکر پہلے نارمل جگہ اپنے آپ کو 10 منٹ تک نارمل کریں۔ نل کے پانی سے ہاتھ منہ دھو کر پھر پانی پئیں اور پھر اے سی یا پنکھے میں آئیں۔

3۔متوازن کھانوں کا استعمال کریں۔ خصوصاً شوربے والے لیکن مرغن نہ ہوں۔

4۔ورزش یا چہل قدمی کم از کم ایک گھنٹے روزانہ کا اہتمام ضرور کریں۔ یاد رکھیں صبح کا وقت ورزش کے لیے بہترین ہے۔ شام کو بھی بہتر ہے لیکن مغرب سے پہلے باغ میں اور مغرب کے بعد میدان بہتر رہے گا۔

5۔کپڑوں کا استعمال موسم کی مناسبت سے کریں اپنی پسند یا نا پسند سے نہیں۔ کیونکہ درجہ حرارت آپ کے جسم پر اثر انداز لازمی ہوتا ہے چاہے ہم اس کو محسوس کریں یا نہ کریں۔

6۔اسی طرح نہانے کے لیے پانی کا درجہ حرارت بھی موسم کے درجہ حرارت کے حساب سے ہونا چاہیے نیم گرم پانی ہمیشہ مناسب رہتا ہے۔

7۔رات کا کھانا کھا کر فوراً نہ سوئیں اس طرح ہاضمہ صحیح رہے گا۔ پیٹ اور ویٹ دونوں کنٹرول میں رہیں گے۔

8۔بارش کے موسم میں قدرے ٹھنڈ بڑھ جاتی ہے، رطوبت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ لوگ اس موسم میں پانی کم پیتے ہیں جس کی وجہ سے گردے و بلڈ پریشر کے مسئلے بڑھ جاتے ہیں۔ کھانے پر توجہ زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے ... بدہضمی، قے اور دست کی بیماری ہوجاتی ہے۔ گندے پانی میں نہانے سے جلدی مسائل پیدا ہوجاتے ہیں۔ گندا پانی ٹینک میں چلا جائے یا اس کی آمیزش ہوجائے تو اس سے بھی قے اور دست جیسے مسئلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بارش کے بعد سیلاب کا مسئلہ یا پھر پانی کی نکاسی کا مسئلہ عموماً ہوجاتا ہے جس کے بعد گندگی کی انتہا ہوجاتی ہے، مکھیوں اور مچھروں کی بہتات ہوجاتی ہے۔ ہیضہ اور ملیریا عام ہوجاتے ہیں۔ ان مسائل سے نمٹنے کے لیے ہمیں اپنی مدد آپ کے تحت پہلے ہی ایک ٹیم تیار کرلینا چاہیے اور بارش میں اور بارش کے بعد ہونے والے مسائل سے جلد از جلد نمٹ لینا چاہیے قبل اس کے کہ یہ مسائل بیماری اور صحت کے لیے مسئلہ بن جائیں۔

باقی اس ضمن میں کوئی اور سوال یا بیماری ہو تو ہمیں لکھ بھیجیں ہمارا جواب پاکیزہ کے ذریعے آپ تک پہنچ جائے گا۔ اپنی صحت کا خیال رکھیے کہ یہی سب کچھ ہے اور ہمیں اپنی دُعاؤں میں یاد رکھیے گا۔